دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

مدیر

حبیب الرحمٰن قاسمی

سے آراستہ ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ گئی، کتاب کی زبان اگرچہ قدیم ہے جس کی بنا پر جاہل طبقہ کو بعض جگہ الجھن ہوگی، لیکن اپنے مضامین کے لحاظ سے نہایت اہم اور لائق قدر ہے۔

(۲) نام کتاب :۔ معاشرتی حقوق و فرائض۔ تالیف :۔ مولانا عبدالرؤف خاں فیض آبادی۔ ناشر :۔ مکتبہ قاسمی ۲/۶۰۳ حافظ منزل غیبی نگر بھیونڈی ضلع تھانہ۔ صفحات :۔ ۹۲ اشاعت :۔ بار دوم ۱۹۹۱ء / ۱۴۱۲ھ، قیمت /۸ روپے۔ ملنے کے پتے، مکتبہ صداقت مبارک پور اعظم گڑھ۔ مکتبہ الفیض جلال پور فیض آباد۔ مکتبہ نعمانیہ دیوبند، طباعت اور کاغذ متوسط۔

اجتماعی زندگی میں صالح معاشرہ کی حیثیت وہی ہے جو انفرادی زندگی میں جسمانی صحت کی ہے، اگر آدمی کی صحت درست ہے تو پھر کارگاہ حیات میں وہ اپنی سعی و کاوش سے کامیابی و کامرانی کی منزلیں طے کر سکتا ہے، لیکن اگر وہ جسمانی اعتبار سے معذور اور بیمار ہو تو وہ حرکت و عمل سے عاجز ہو جاتا ہے اور زندگی کے میدان میں اس کا وجود عدم کے مرادف ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح اگر کسی قوم کا معاشرہ صحت مند اور درست ہے تو لازمی طور پر اس کی اجتماعی حیات قوی و پائیدار ہوگی اور بصورت دیگر اس کی اجتماعیت منتشر ہو کر اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہے، اس لئے اسلام نے صالح معاشرہ کے وجود پر کافی زور دیا ہے، اس کتاب میں صالح معاشرہ کس طرح وجود میں آتا ہے، معاشرتی حقوق و فرائض کے عنوان سے اسی کی تفصیل بیان کی گئی ہے، انداز تحریر صاف ستھرا اور قریب الفہم ہے۔

(۳) نام کتاب :۔ ایک مجلس کی تین طلاقیں۔ تالیف :۔ مولانا محمد اصغر قاسمی۔ ناشر :۔ شعبۂ اشاعت مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ غازی آباد، اشاعت ۱۹۹۳ء، طباعت و کاغذ عمدہ۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ادھر ایک سال سے ہمارے یہاں اخبار و رسائل کا موضوع بنا ہوا ہے اور خاص طور پر ان لوگوں نے جنھیں نہ دین کا صحیح علم ہے اور نہ دین کی کوئی فکر، اس مسئلہ میں کافی دلچسپی دکھائی اور اس کی آڑ میں مسلم خواتین کو ورغلانے اور حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت پر ابھارنے کی کوشش کی لیکن علمائے امت نے ان کی اس دین بیزار مہم کو متفقہ طور پر مسترد کر دیا، زیر نظر کتاب اسی موقع پر مرتب کی گئی ہے جس میں جمہور کے مسلک کی صحت اور حقانیت کو دلائل شرعیہ سے ثابت کیا گیا ہے، عام طبقہ کیلئے یہ کتاب تین طلاقوں کے مسئلہ کو سمجھنے کیلئے مفید اور بہت کارآمد ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

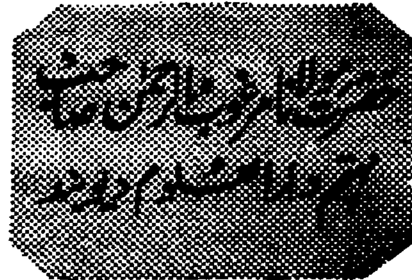
دارالعلوم

جلد نمبر ۷۸ | شمارہ نمبر ۳

ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق مارچ ۱۹۹۳ء

فی شمارہ ۶/- | زر سالانہ ۶۰/-

نگراں



مدیر



سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۲۵۰/- روپے

پاکستان سے ۱۰۰/- ″

بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/- ″

یہاں پر اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔



ختم خریداری کی اطلاع

ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں
چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اسلئے وی پی نہیں کی جائے گی
پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤ والا
براہ شجاع آباد، ملتان، کو اپنا چندہ روانہ کریں
ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے

منیجر



مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

دارالعلوم دیوبند میں جدید طلبہ کیلئے ضروری قواعد داخلہ

برائے ۱۴۱۳ و ۱۴ھ

قدیم طلبہ کی ترقی و تنزل

ذمہ داران مدارس عربیہ سے درخواست:-

حامداً و مصلیاً! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبۂ عزیز کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت فرمائی ہے، آپ کا ارشاد گرامی ہے

إِنَّ رِجَالاً يَأْتُونَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الْأَرْضِ يَتَفَقَّهُونَ فِي الدِّينِ فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا.
(رواہ الترمذی)

بے شک بہت سے لوگ زمین کے گوشہ گوشہ سے علم دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لئے تمہارے پاس آئیں گے، جب وہ آئیں تو تم ان کے بارے میں خیر خواہی کی وصیت قبول کرو۔

اس لئے طلبائے عزیز کے ساتھ خیر خواہی تمام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کا فرض اولین

ہے، طلبۂ عزیز کے لئے بہتر تعلیم، عمدہ تربیت، اچھا انتظام اور حسبِ استطاعت راحت رسانی خیر خواہی کے ضمن میں آتی ہے۔ اور الحمد للہ مدرسہ عربیہ کے ذمہ دار اس وصیت پر عمل پیرا ہیں ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کی ترقی، علم وفن کی ترقی دین ودیانت کی ترقی اور مسلمانانِ عالم کی ترقی ہے۔ انہی چیزوں کے پیشِ نظر ذمہ دارانِ مدارس کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا رہا ہے کہ وہ طلبہ کی استعداد سازی پر سب سے زیادہ توجہ صرف فرمائیں اور دارالعلوم میں جس جماعت میں داخلہ کا ارادہ ہے وہاں تک قابلِ اعتماد استعداد کا پیدا ہوجانا دارالعلوم میں حاضری سے پہلے ضروری سمجھیں اور اسی لئے چند سالوں سے ماہ رجبُ المرجب ہی میں ضروری اصول وضوابط کا اعلان کردیا جاتا ہے۔

آپ حضرات سے مخلصانہ درخواست ہے کہ ان چیزوں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں خدّام دارالعلوم کا تعاون فرمائیں۔

عربی درجات میں جدید داخلے کے قواعد

(۱) دارالعلوم دیوبند کے تمام تعلیمی شعبوں کے طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہوگی جن میں دارالافتاء تکمیلات، کتابت، دارالصنائع کے شعبے قدیم طلبہ کیلئے ہیں، بقیہ شعبوں میں قدیم طلبہ کے بعد جو عدد بچے گا اس کو جدید طلبہ سے مقابلہ کے امتحان کے ذریعہ پُر کرلیا جائیگا۔ یعنی ہر جماعت کی مقررہ تعداد کو اونچے نمبرات سے شروع کرکے پورا کیا جائے گا۔

(۲) آنے والے جدید طلبہ سب سے پہلے "فارم برائے شرکت امتحان داخلہ" پُر کرینگے، یہ فارم انھیں دفتر تعلیمات سے ۸؍ شوال کی شام تک دیا جائے گا۔

(۳) سالِ اوّل سالِ دوم کا امتحان داخلہ تقریری ہوگا۔

(۴) سالِ سوم کے امیدوار جدید طلبہ کا نفحۃ الادب اور ہدایۃ النحو کا تحریری امتحان ہوگا بقیہ تمام کتابوں کا تقریری امتحان لیا جائے گا۔

(۵) سالِ چہارم، سالِ پنجم، سالِ ششم، سالِ ہفتم اور دورۂ حدیث کے امیدواروں کا امتحانِ داخلہ تحریری ہوگا، امتحان ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵؍ شوال ۱۴۱۳ھ مطابق ۵، ۶، ۷، ۸؍ اپریل ۱۹۹۳ء

بروز پیر، منگل، بدھ، جمعرات میں لئے جائیں گے

(۶) سال اول عربی کے لئے پرائمری درجہ پنجم کی سند یا اس کے مضامین کی صلاحیت اور فارسی و اردو، اردو رسم الخط اور نحو صرف کی اصطلاحات کی جانچ ہوگی

سال چہارم، سال پنجم، سال ششم، سال ہفتم اور دورۂ حدیث کے لئے پچھلے درجات کی تمام کتابوں کا امتحان تحریری ہوگا۔

سال چہارم کے لئے قدوری، ترجمۃ القرآن، شرح تہذیب، نفحۃ العرب اور کافیہ یا شرح جامی کا کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال پنجم کے لئے کنز، شرح وقایہ، اصول الشاشی، تلخیص المفتاح، ترجمۃ القرآن، سلم العلوم کا تحریری امتحان ہوگا۔

سال ششم کے لئے ہدایہ اولین، نور الانوار، مختصر المعانی، مقامات حریری کا تحریری امتحان ہوگا، سال ہفتم کے لئے جلالین، حسامی، میبذی، دیوان متنبی کا تحریری امتحان ہوگا۔

دورۂ حدیث کے لئے ہدایہ اخیرین، مشکوۃ شریف، بیضاوی شریف، شرح عقائد نسفی۔ نخبۃ الفکر اور سراجی کا تحریری امتحان ہوگا

نوٹ:۔ اپنی سابقہ تعلیم کی کوئی بھی سند کسی کے پاس اگر ہو تو فارم داخلہ کیساتھ منسلک کردیں

(۷) سال اول و دوم میں نابالغ بیرونی بچوں کا داخلہ نہ ہوگا نہ ہی ان درجات میں امداد ہوگی۔

(۸) جو طالب علم اپنے ساتھ صغیر السن بچوں کو لائیگا ان کا داخلہ ختم کردیا جائے گا

(۹) جن امیدواروں کی وضع قطع طالب علمانہ نہ ہوگی مثلاً غیر شرعی بال، ریش تراشیدہ ہونا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہونا یا دارالعلوم کی روایات کے خلاف کوئی بھی وضع ہو ان کو شریکِ امتحان نہ کیا جائے گا۔ اور اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۱۰) سرحدی صوبوں میں آسام اور بنگال کے امیدواروں کو تصدیق نامہ وطنیت پیش کرنا ضروری ہوگا، ______ تصدیق نامہ کی اصل کاپی پیش کرنا ضروری ہے، فوٹو اسٹیٹ کاپی قبول نہیں کی جائے گی، اور یہ تصدیق نامہ وطنیت کسی بھی وقت واپس نہ ہوگا۔

(۱۱) جدید امیدواروں کے لئے سابقہ مدرسہ کا تعلیمی و اخلاقی تصدیق نامہ اور مارک شیٹ (نمبرات

کتب) پیش کرنا ضروری ہوگا۔

⑫ نجی تصدیقات یا سماعت وغیرہ کا اعتبار نہ ہوگا۔

⑬ بنگلہ دیشی امیدوار حسب ذیل علماء کرام کی تصدیق لے کر آئیں۔

(۱) مولانا شمس الدین صاحب قاسمی جامعہ حسینیہ ارض آباد میرپور ڈھاکہ (۲) مولانا فریدالدین صاحب مسعود ڈھاکہ (۳) مولانا معتصم باللہ صاحب مالی باغ بازار ڈھاکہ (۴) مولانا حافظ عبدالکریم صاحب چوکی دیکھی محلہ سلہٹ۔

⑭ کیرالہ کے امیدوار مندرجہ ذیل علماء کی تصدیق لے کر آئیں۔

(۱) مولانا نوح صاحب (۲) مولانا حسین مظاہری (۳) محمد کویا قاسمی۔

تنبیہ:۔ طلباء کو خاص طور سے یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ امتحان کی کاپیاں کوڈ نمبر ڈال کر ممتحن کو دی جاتی ہیں، اس لئے امیدوار صرف انھیں درجات کا امتحان دیں جن کی تیاری وہ کرچکے ہیں، بوقت داخلہ فارم میں جو پتہ لکھا جائے گا اس میں کسی طرح کی ترمیم نہ ہوگی۔

قدیم طلبہ کیلئے :۔

① تمام قدیم طلبہ کے لئے ۲۰ رشوال تک حاضر ہونا ضروری ہے۔

② جو طلبہ تمام کتابوں میں کامیاب ہوں گے ان کو ترقی دی جائے گی، جو طلبہ دو کتابوں میں ناکام ہوں گے ان کا ضمنی امتحان داخلہ امتحان کے ساتھ لیا جائیگا، بصورت کامیابی ترقی دیجائیگی ورنہ بلا امداد سال کا اعادہ کردیا جائے گا۔ اعادۂ سال کی رعایت صرف ایک سال کیلئے ہوگی اگر دوسرے سال بھی اعادہ کی نوبت آئی تو داخلہ نہیں ہوسکے گا۔

③ تجوید، کتابت، اختبار شفاہی کے نمبرات بسلسلہ ترقی درجہ داوسط میں شمار نہ ہوں گے، البتہ فوائد مکیہ اختبار شفاہی، صنف عربی کے نمبرات اجراء امداد کے سلسلہ میں شمار کئے جائیں گے۔

④ حسب تجویز مجلس تعلیمی وظیفۂ تیل کے بقا کے لئے اوسط کامیابی ۳۱ ہونا شرط ہے، اس سے کم پر وظیفۂ تیل بند کردیا جائے گا۔

⑤ تکمیل ادب میں صرف ان فضلاء کا داخلہ ہوسکے گا جن کا دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں اوسط

کامیابی ۴۴ ہو، اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ ہوں، نیز ان امیدواروں کا نحو وصرف اور بلاغت وانشاء کا مستقل امتحان لیا جائے گا، نحو وصرف کیلئے کافیہ اور علم الصیغہ اور بلاغت کے لئے البلاغۃ الواضحہ کے متن سے سوالات مرتب کئے جائیں گے، اور انشاء کیلئے اردو سے عربی میں ترجمے کے سوالات دیئے جائیں گے اس جماعت کے کل تین پرچے ہونگے باقی تکمیلات کیلئے ۴۴ اوسط شرط ہے

(۶) امیدواروں کے زیادہ ہونے کی صورت میں نمبرات اور انٹرویو کو وجہ ترجیح بنایا جائے گا۔

(۷) ایک تکمیل کے بعد دوسری تکمیل میں داخلہ کے لئے ضروری ہوگا کہ امیدوار نے سابقہ تکمیل میں کم از کم ۴۴ اوسط حاصل کیا ہو، اور وہ کسی کتاب میں ناکام نہ رہا ہو۔

(۸) ایک تکمیل کی درخواست دینے والے دوسری تکمیل کے امیدوار نہ ہوسکیں گے، اِلّا یہ کہ ان کے مطلوبہ درجہ تکمیل میں تعداد پوری ہونے کے سبب ان کا داخلہ نہ ہوسکا ہو۔

(۹) دارالافتاء کے فضلاء کا کسی شعبہ میں داخلہ نہ ہوگا۔

(۱۰) جس کی کوئی بھی شکایت دارالاقامہ، تعلیمات یا اہتمام میں کسی بھی وقت درج ہوئی ہے اس کو دورۂ حدیث کے بعد کسی بھی شعبہ میں داخل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۱) کسی بھی شعبہ میں داخلہ لینے والے قدیم فضلاء کو فراغت کے بعد ہی سند فضیلت دی جائے گی۔

(۱۲) کسی بھی تکمیل میں علاوہ افتاء کے داخلہ کی تعداد ۲۰ سے زائد نہ ہوگی اور وہ تعداد مقابلہ کے نمبرات کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔

دیگر شعبوں کے بارے میں

(۱) دارالعلوم دیوبند کا بنیادی کام اگرچہ عربی دینیات کی تعلیم ہے لیکن حضرات اکابر نے مختلف دینی اور دنیوی فوائد اور مصالح کے پیش نظر متعدد شعبے قائم فرمائے، شعبۂ تجوید اردو، عربی، شعبہ خوشنویسی، دارالصنائع وغیرہ ان شعبوں میں داخلے کیلئے درج ذیل قواعد پر عمل ہوگا۔

دارالافتاء (۱) دارالافتاء میں داخلہ کے امیدواروں کے لئے وضع قطع کی درستگی کی اہمیت سب سے زیادہ ہوگی۔ اس میں کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

(۲) دورۂ حدیث سے دارالافتاء کیلئے صرف وہ طلباء امیدوار ہوں گے جن کا اوسط کامیابی ۴۵ رہیگا

(۳) کسی بھی تکمیل سے دارالافتاء میں داخلے کے امیدوار کیلئے سابقہ تکمیل میں ۶۴ اوسط حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۴) ان تمام امیدواروں کا الگ سے ہدایہ اولین و ہدایہ آخرین کا امتحان لیا جائیگا جس کے دو پرچے ہوں گے اور خط و املا کو خاص طور سے دیکھا جائے گا۔

(۵) دارالافتاء میں داخلہ کی تعداد ۲۵ سے زائد نہ ہوگی اور کوشش کی جائے گی کہ معیار مذکور کو پورا کرنے والے ہر صوبہ کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے، لیکن اگر کسی صوبہ سے کوئی امیدوار مندرجہ بالا شرائط کا حامل نہ پایا گیا تو دوسرے صوبوں سے یہ تعداد پوری کر لی جائے گی ان ۲۵ طلبہ کی امداد جاری ہوسکے گی

(۶) دارالافتاء میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہونے والے دو طلبہ کا انتخاب تدریب فی الافتاء کے لئے کیا جائیگا یہ انتخاب دو سال کیلئے ہوگا اور ان کا وظیفہ ۳۰۰ روپے ماہوار ہوگا۔

شعبۂ دینیات، اردو، فارسی، شعبۂ حفظ قرآن :۔

(۱) شعبۂ دینیات اردو، فارسی اور شعبۂ حفظ میں مقامی بچوں کو داخلہ دیا جائے گا۔

(۲) سال اول دینیات اردو اور شعبۂ حفظ میں داخلہ ہر وقت ممکن ہوگا

(۳) بقیہ درجات میں داخلہ ذی الحجہ کی تعطیل تک لیا جائے گا۔

شعبۂ تجوید، حفص، اردو، عربی :۔

(۱) حفص اردو میں وہ طلبہ داخل ہوسکیں گے جو حافظ ہوں، قرآن کریم ان کو یاد ہو اور وہ اردو کی اچھی استعداد بھی رکھتے ہوں، نیز ان کی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو، ان طلبہ میں ۹۰ رکی امداد جاری ہوسکے گی۔

(۲) شعبۂ حفص عربی میں ان طلبہ کو داخل کیا جائیگا جنھیں قرآن کریم یاد ہو اور وہ عربی میں شرح جامی یا سال سوم کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں، ان طلبہ میں دس کی امداد جاری ہوسکے گی

(۳) ان طلبہ کی اوقات مدرسہ میں حاضری ضروری ہوگی۔

قرأت سبعہ عشرہ :-

۱۔ اس درجہ میں داخلہ کے لئے حافظ ہونا ضروری ہے اور یہ کہ وہ عربی کی سال چہارم تک کی جید استعداد رکھتے ہوں ۔

۲۔ اس درجہ میں داخل طلبہ کیلئے حفص عربی سے فارغ ہونا ضروری ہوگا اور ان کی تعداد دس سے زائد نہ ہوگی اور ان دس کی امداد بھی جاری ہو سکے گی ۔

شعبۂ خوشنویسی :-

۱ ۔ اس درجہ میں داخل طلبہ کی تعداد ۳۰ ہوگی اور ان کی امداد جاری ہوسکے گی ۔

۲ ۔ داخلہ کے امیدواروں میں فضلاء دارالعلوم کو ترجیح دی جائے گی

۳ ۔ شعبہ میں مکمل داخلہ کے امیدواروں کو امتحان داخلہ دینا ضروری ہوگا اور اس فن کی ضروری صلاحیت رکھنے والوں کو داخل کیا جائیگا

۴ ۔ قدیم طلبہ اگر فن کی تکمیل نہیں کرسکے ہیں تو ناظم شعبہ کی تصدیق اور سفارش پر ان کا مزید ایک سال کیلئے غیرامدادی داخلہ کیا جاسکے گا بشرطیکہ ان کی کوئی شکایت نہ ہو۔

۵ ۔ جو طلبہ مکمل امدادی یا غیرامدادی داخلہ لیں گے انکو اوقات مدرسہ میں پورے چھ گھنٹے درسگاہ میں بیٹھکر مشق کرنا ضروری ہوگا۔

۶ ۔ جو طلبہ عربی تعلیم کے ساتھ کتابت کی مشق کرچکے ہوں اور ناظم شعبہ ان کی صلاحیت کی تصدیق کردیں تو دورۂ حدیث کے بعد مکمل داخلہ اور امداد میں ان کو ترجیح دی جائے گی۔

۷ ۔ تمام طلبہ کیلئے طالب علمانہ وضع اختیار کرنا ضروری ہے

۸ ۔ پہلے نصف سال میں مقررہ تمرینات کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائے گا۔

دارالصنائع :-

(۱) طالب علمانہ وضع قطع کے بغیر داخلہ نہیں لیا جائیگا (۲) معلم دارالصنائع جن کی صلاحیت کی تصدیق کریں گے ان کو داخل کیا جائے گا (۳) پہلے تین ماہ میں کام کی تکمیل نہ کی گئی تو داخلہ ختم کردیا جائے گا۔ (۴) اس شعبہ میں داخلہ دس سے زائد کا نہیں ہوگا اور ان سب کی صرف امداد طعام جاری ہوسکیگی (۵) اوقات مدرسہ میں پورے وقت حاضر رہ کر کام کرنا ضروری ہوگا

محدثین وفقہاء

حضرۃ العلامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ (مانچسٹر)

جس طرح فقہ اور حدیث میں نسبت تضاد نہیں محدثین اور فقہاء بھی ایک دوسرے کے ہم دوش چلے ہیں، ان میں بھی آپس میں کوئی تخالف نہیں۔ بعض کم علم لوگ فقہ کو اس طرح حدیث کا مخالف بتاتے ہیں جس طرح بعض دوسرے حدیث کو قرآن کے مقابل لا کھڑا کرتے ہیں اور کہتے ہیں حدیث ایک عجمی سازش ہے جو لوگوں کو قرآن سے دور کرنے کے لئے کی گئی ہے (معاذاللہ)

ہم یہاں محدثین اور فقہاء دونوں کو ایک ساتھ ملا کر بیان کرتے ہیں، اس سے علمی دنیا میں ایک ہم آہنگی پیدا ہوگی۔ واللہ الموفق۔

ہم سب سے پہلے سات بڑے فقہاء کا نظریۂ حدیث پیش کرتے ہیں جس سے پتہ چلے گا کہ وہ رائے کو حدیث کے سامنے کس طرح مسترد کرتے ہیں۔

(۱) حضرت امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) (۲) حضرت امام محمدؒ (۱۸۹ھ) (۳) حضرت امام مالکؒ (۱۷۹ھ)
(۴) حضرت امام ابویوسفؒ (۱۸۲ھ) (۵) حضرت امام زفرؒ (۱۵۸ھ) (۶) حضرت امام شافعیؒ (۲۰۴ھ)
(۷) حضرت امام احمدؒ (۲۴۱ھ)

(۱) حضرت امام ابوحنیفہؒ

حضرت امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) فرماتے ہیں۔

اذا جاءنا الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ناخذ بہ واذا جاءنا من الصحابۃ تخیرنا، واذا جاءنا من التابعین زاحمناھم (الانتقاء لابن عبدالبر)

(ترجمہ) جب ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث پہنچے ہم اسی کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور صحابہ سے جب کوئی روایت پہنچے ہم ان میں سے کسی کے پیچھے ہولیتے ہیں، اور جب ہمیں کوئی بات تابعین سے آئے تو ہم ان کے برابر اپنی بات لاتے ہیں (خود اجتہاد کرتے ہیں)

حضرت امام ابوحنیفہؒ یہ بھی فرماتے ہیں ۔

اٰخذ بکتاب اللّٰہ فما لم اجد فبسنۃ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم والآثار الصحاح عنہ التی فشت فی ایدی الثقات عن الثقات فان لم اجد فبقول اصحابہ اٰخذ بقول من شئت واما اذا انتھی الامر الی ابراھیم والشعبی والحسن والعطاء فاجتھد کما اجتھدوا۔

(المناقب للذھبی ص۲۱ ویؤیدہ ما فی تاریخ بغداد جلد۱۳ ص۳۶۸)

ترجمہ :- میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں اگر مجھے وہاں بات نہ ملے تو پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آثار صحیحہ جو ثقہ راویوں کے پاس ثقہ راویوں سے پہنچے ہوں ان کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں اگر میں وہاں بھی بات نہ پاؤں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے جس کی بات چاہوں لے لیتا ہوں، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی، علامہ شعبی، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح تک پہنچے تو میں اسی طرح اجتہاد کرتا ہوں جس طرح ان حضرات نے اجتہاد کیا ہے ۔

ان تصریحات سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنی اور اپنے اساتذہ کی رائے پر حدیث اور آثار صحابہ کو بہرحال مقدم کرتے تھے، اور حدیث کے ہوتے ہوئے محض رائے سے دین کی بات کہنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ آیئے اب حضرت امام محمدؒ ۱۸۹ھ کی شہادت بھی لے لیں ۔

۲ حضرت امام محمدؒ

حضرت امام محمد بن حسن الشیبانیؒ (۱۸۹ھ) اس بحث میں کہ نماز میں قہقہہ ناقض وضوء ہے تحریر فرماتے ہیں ۔

لولا ما جاء من الآثار کان القیاس علی ما قال اھل المدینۃ ولکن لا قیاس مع اثر ولا ینبغی الا ان ینقاد للآثار (الحجۃ علی اہل المدینۃ جلد۱ ص۲۰۴)

ترجمہ :- اگر وہ آثار نہ ہوتے جو وارد ہوچکے تو قیاس وہی چاہتا ہے جو اہل مدینہ کہتے ہیں لیکن حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس جائز نہیں اور اس موقع پر اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ احادیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے ۔

اس سے پتہ چلا کہ ائمہ احناف کے ہاں حدیث بہرحال مقدم رکھی جاتی تھی اور اس کے ہوتے ہوئے

رائے اور قیاس سے کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

⑦ حضرت امام مالکؒ

ابن ابی حاتم حضرت امام مالکؒ سے اور وہ ربیعہ سے نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا،

ان اللہ تبارک و تعالیٰ انزل الیکم الکتاب مفصلا و ترک فیہ موضعا للسنة و سن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ترک فیھا موضعا للقیاس (الدر المنثور جلد ۲)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف کتاب مفصل بھیجی اور اس میں سنت کیلئے جگہ رکھ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتیں قائم کیں اور ان میں اجتہاد کی راہیں رکھ لیں۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ فقہاء نے اجتہاد اور قیاس کو کبھی سنت کے مقابل نہیں رکھا، اسے ہمیشہ سنت کے بعد ہی رکھا ہے۔

⑧ حضرت امام ابو یوسفؒ

حضرت امام ابو یوسفؒ (۱۸۲ھ) نے خلیفہ ہارون الرشید کو لکھا کہ:

اے امیر المؤمنین اپنے عمال کو حکم دے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کے مطابق فیصلہ کریں۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا وہ خط بھی تھا جو آپ نے خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور کو لکھا تھا۔

میں پہلے قرآن کے مطابق پھر سنت رسول کے مطابق، پھر حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ دیتا ہوں، پھر دوسرے صحابہ کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں ان میں اگر اختلاف ہو تو پھر اپنی رائے سے ان میں سے کسی کا قول اختیار کر لیتا ہوں

(میزان کبریٰ للشعرانی ص ۶۲) میزان الشریعۃ الکبریٰ ص ۶۲۔

⑤ حضرت امام زفرؒ

حضرت امام زفر بن الہذیل (۱۵۸ھ) حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ قیاس کے ماہر ہیں، آپ بھی فرماتے ہیں

لا ناخذ بالرأی ما دام الاثر و اذا جاء الاثر ترکنا الرای (الجواہر المضیئۃ جلد ۲ ص ۳۴۵ الفوائد البہیۃ ص ۷۶)

ترجمہ:۔ جب حدیث موجود ہو ہم رائے پر نہیں چلتے اور جب حدیث آجائے تو ہم نے رائے قائم کی بھی ہو تو اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

جب امام زفرؒ بھی رائے اور قیاس کو حدیث اور اثر کے مقابل نہیں سمجھتے تو اور کوئی فقیہ قیاس کو اس سے اونچا درجہ کیا دے سکتا ہے۔

گیارہویں صدی تک یہی آواز سننے میں آرہی ہے کہ حدیث و اثر کے سامنے رائے اور قیاس کا کوئی وزن نہیں، شارح مشکوٰۃ مجدد مائۃ دہم ملا علی قاری رحمۃ ربہ الباری لکھتے ہیں۔

اس قیاس پر جو بے بنیادی کا احتمال رکھتا ہے مقدم کیا جائے ہاں ان کی روشن رائے یہی ہے اور وہ ان کی بڑی منقبت ہے کہ وہ صرف ظاہر حدیث سے تمسک نہیں کرتے بلکہ اس کے اندر ایسے معنی پر غور کرکے دقت نظر سے کام لیتے ہیں ۔ فقہاء احناف کا یہ قوی مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف بھی تو اسے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ صرف اکابر ائمہ فقہ کے فیصلے تھے، فقہاء بعد بھی ان کے مطابق چلے ہیں لیجئے اب ہم فقہ حنفی کا مزاج حضرت علامہ شامیؒ (۱۲۵۲ھ) کے حوالے سے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، دوسری صدی میں جو کچھ کہا گیا اس کی آواز گیارہویں اور تیرہویں صدی میں بھی سنی جارہی ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

نقل العلامۃ بیری فی اول شرحہ علی الاشباہ عن شرح الھدایۃ لابن شحنۃ ونصہ اذا صح الحدیث وکان علی خلاف المذھب عمل بالحدیث ویکون ذلک مذھبہ ولا یخرج مقلدہ عن کونہ حنفیا بالعمل بہ فقد صح عنہ انہ قال اذا صح الحدیث فھو مذھبی وقد حکی ذلک ابن عبد البر عن ابی حنیفۃ وغیرہ من الائمۃ ونقلہ ایضا الامام الشعرانی عن الائمۃ الاربعۃ

(ردالمحتار جلد ۱ ص ۶۳ و ص ۳۵۸)

ترجمہ:۔ علامہ بیری نے الاشباہ کی شرح کے شروع میں علامہ ابن شحنہ کی شرح ہدایہ سے نقل کیا ہے کہ جب حدیث صحیح طریق سے ثابت ہو جائے اور وہ اپنے فقہی مذہب کے خلاف ہو تو عمل حدیث پر کیا جائے گا، اور یہی آپ کا مذہب شمار ہوگا اور حدیث پر عمل کرنے سے کوئی شخص حنفی ہونے کے دائرہ سے نہیں نکلتا، کیونکہ امام ابوحنیفہ سے صحیح طریق سے یہ بات پہنچی ہے، آپ نے فرمایا جب کوئی

حدیث صحیح طریق سے ثابت ہو جائے تو اسے ہی میرا مذہب سمجھو، علامہ ابن البر المالکی نے بھی امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے ائمہ فقہ سے یہ بات نقل کی ہے، علامہ شعرانی یہ بات ائمہ اربعہ سے نقل کرتے ہیں۔

ان مذھبھم القوی تقدیم الحدیث الضعیف علی القیاس المجرد الذی یحتمل التزییف (مرقاۃ جلد ۱ ص ۳) نعم من رأی ثاقبھم الذی ھو معظم مناقبھم انھم ما تشبثوا بالظواھر بل رققوا النظر فیھا بالبحث عن السرائر۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب بھی لکھتے ہیں۔

وذکر ابن حزم الاجماع علی ان مذھب ابی حنیفۃ ان ضعیف الحدیث اولی عندہ من الرأی والقیاس (دلیل الطالب ص ۸۵)

ترجمہ:۔ ابن حزم لکھتے ہیں اس بات پر اجماع ہے کہ ابو حنیفہ کے ہاں ضعیف حدیث بھی رائے اور قیاس پر مقدم ہے۔

⑥ حضرت امام شافعیؒ

حضرت امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) مجتہد مطلق تھے آپ نے حدیث کی کوئی بڑی کتاب (جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم) نہیں لکھی، مسند امام شافعی ایک چھوٹی سی کتاب ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام شافعی علم حدیث میں ان محدثین سے کم تھے، آپ کی زندگی کا موضوع فقہ رہا ہے اس لئے بطور فنکار محدث کے آپ حدیث کی کوئی بڑی کتاب نہ لکھ سکے، تاہم آپ کی کتاب "الام" میں سینکڑوں احادیث آپ نے روایت کی ہے، آپ ہمیشہ سنت کے علمبردار رہے تعالیٰ امت کو آپ نے حدیث کے بعد رکھا ہے، حضرت علامہ ذہبیؒ (۷۴۸ھ) آپ کو الامام العلم، حبرالامۃ، اور ناصر السنۃ لکھتے ہیں، علامہ حافظ ابن حجرؒ (۸۵۲ھ) لکھتے ہیں

کان اصحاب الحدیث رقوداً حتی ایقظھم الشافعی" (توالی التاسیس ص ۵۹)

ترجمہ:۔ اصحاب الحدیث سوئے ہوئے تھے، امام شافعیؒ نے انھیں جگایا۔

یعنی محدثین روایت حدیث میں مصروف رہے پڑھنے پڑھانے کا کام فقہاء کرتے رہے، امام شافعیؒ نے محدثین کو جگایا وہ اس فن کے لئے اٹھے اور اس کی باقاعدہ تدوین کی، صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ سب کتابیں ان کے بعد لکھی گئی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے علم حدیث کم تھا، پچھلوں نے

پہلوں سے ہی یہ علم لیا ہے، نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ امام شافعیؒ صرف حدیث کو دیکھتے تھے، تعامل امت کو نہ لیتے تھے، ایسا ہرگز نہیں، آپ نے بیس رکعت تراویح کا فیصلہ تعامل امت سے ہی تو کیا ہے۔

حضرت امام ترمذیؒ (۲۷۹ھ) لکھتے ہیں۔

قال الشافعی ھکذا ادرکت ببلدنا بمکة یصلون عشرین رکعة (صحیح ترمذی جلد ۱ ص۹۹)

ترجمہ۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں، اسی طرح میں نے اپنے شہر مکہ میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھتے ہی پایا ہے

امام شافعیؒ اپنے زمانے کی بات جس انداز میں لکھ رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان سے سالہا سال پہلے بھی مسجد حرام میں بیس رکعت تراویح ہی پڑھی جاتی تھیں

⑤ حضرت امام احمدؒ

حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) نے امام ابو یوسف اور امام شافعیؒ کی شاگردی کا شرف پایا ہے، آپ امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداؤد کے استاذ تھے، ائمہ اربعہ میں آپ چوتھے امام ہیں، سعودی عرب کے علماء آل شیخ سب ان کے مقلد ہیں، آپ کا نظریہ حدیث امام ابو حنیفہؒ کے نظریہ حدیث سے ملتا ہے، حافظ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں۔

فتقدیم الحدیث الضعیف وآثار الصحابة علی القیاس والرای قول وقول احمد

(اعلام الموقعین جلد ___) وقد قدم الحدیث الضعیف علی القیاس ص۱۰

ترجمہ۔ حدیث ضعیف بھی ہو تو اسے اور آثار صحابہ کو رائے اور قیاس پر مقدم کیا جائے یہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد دونوں کا مذہب ہے۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دین میں رائے سے کام لینا یہ ہرگز امام ابو حنیفہ کا طریقہ نہ تھا حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حضرت امام احمد دونوں کا نظریہ حدیث ایک تھا کہ قیاس اور رائے کو کسی صورت میں حدیث پر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ گو وہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔

یہ اجلہ فقہاء کا نظریۂ حدیث آپ کے سامنے آ گیا۔ اب ذرا محدثین کی جوابی روش بھی دیکھ لیں کہ وہ کس طرح فقہاء کے ساتھ مل کر چلے ہیں۔

محدثین فقہ کے سائے میں

(۱) امام وکیع بن الجراح :- (۱۹۷ھ) علامہ ذہبی آپ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

- ممتاز حافظ حدیث اور چوٹی کے اماموں میں سے ایک امام۔ پختہ کار عالم اور عراق کے محدث:
امام یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ وکیع اپنے زمانہ میں ایسے تھے جیسے اوزاعی رح (۱۵۷ھ) اپنے زمانہ میں امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے وکیع سے افضل کوئی آدمی نہیں دیکھا، رات کو قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے تھے، عبداللہ ابن مبارک کہتے ہیں آج دونوں شہروں کے بڑے عالم وکیع بن الجراح ہیں (تذکرۃ الحفاظ جلد۱ ص۲۳۹)

حضرت امام وکیع بن جراح ائمہ حنفیہ میں سے تھے، (مفتاح السعادۃ جلد۲ ص۱۴ مولیٰ طاش زادہ کبریٰ) اور آپ حضرت امام ابوحنیفہ رح کے قول پر فتویٰ دیتے تھے، علامہ حافظ ابن حجر رح اور علامہ ذہبی لکھتے ہیں ویفتی بقول ابی حنیفۃ رح (ترجمہ) آپ امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

(تہذیب جلد۱۱ ص۱۲۷، تذکرۃ الحفاظ جلد۱ ص۲۸۲، جامع بیان العلم جلد۲ ص۱۴۹)

(۲) امام یحییٰ بن سعید القطان :- (۱۹۸ھ) علامہ ذہبی آپ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

- یحییٰ بن معین فرماتے ہیں مجھے عبدالرحمٰن بن مہدی (۱۶۰ھ) نے کہا تم اپنی آنکھوں سے یحییٰ بن سعید جیسا کوئی آدمی نہ دیکھو گے، علی بن المدینی کہتے ہیں میں نے ان سے بڑا اسماء الرجال کا ماہر نہیں دیکھا، ابن سعد کہتے ہیں کہ آپ ثقہ، حجہ، مامون اور اونچے مرتبے کے حامل ہیں۔
امام نسائی فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر امام مالک، شعبہ اور یحییٰ بن سعید القطان اللہ تعالیٰ کے امین ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ علم میں پختگی امام یحییٰ بن سعید پر ختم ہے (تذکرۃ الحفاظ جلد۱ ص۲۳۴ اردو) حضرت امام یحییٰ ابن سعید القطان بھی فقہ میں حنفی تھے، اور امام ابوحنیفہ رح کے قول پر فتویٰ دیتے تھے، یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) نے بھی ایسا ہی لکھا ہے دیکھئے تاریخ بغداد جلد۱۳ ص۳۴۷۔

علامہ ذہبی رح (۷۴۸ھ) حافظ ابن کثیر (۷۷۴ھ) حافظ ابن حجر رح (۸۵۲ھ) کہتے ہیں کہ

کان یحییٰ القطان یفتی بقول ابی حنیفۃؒ۔ یحییٰ بن سعید قطان امام ابوحنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے
(تذکرۃ الحفاظ ص۲۸۲ جلد ۱، البدایہ جلد ۳ ص۱۰۱، تہذیب جلد ۱۱ ص۱۲۶)

(۳) امام شعبہ بن الحجاجؒ (۱۶۰ھ) امام سفیان ثوریؒ (۱۶۱ھ) کے بقول آپ امیر المومنین فی الحدیث ہیں، آپ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی علمی عظمت اور جلالت شان کے قائل تھے، آپ کو جب حضرت امام صاحبؒ کی وفات کی خبر پہونچی تو فرمایا آج کوفہ پر علم کا چراغ گُل ہوگیا ہے۔ حافظ موصلی تہذیب الکلام میں لکھتے ہیں

کان شعبۃ حسن الرای فی ابی حنیفۃؒ۔ امام شعبہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے
(نقلاً عن الجواہر المنیفۃ للزبیدی ص۵)

محدث ابن حجر مکی (۹۷۴ھ) لکھتے ہیں۔ امام شعبہ کہتے تھے جو لوگ حضرت امام ابوحنیفہ پر طعن کرتے ہیں وہ خدا کے یہاں اس کا نتیجہ دیکھ لیں گے

(۴) امام لیث بن سعدؒ (۱۷۵ھ) آپ امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) کے استاذ حضرت یحییٰ بن بکیر (۲۳۱ھ) کے استاذ ہیں، صحیح بخاری کے رواۃ میں سے ہیں، آپ کی جلالت علم اور ثقاہت پر علماء کا اجماع ہے، آپ بھی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر فتویٰ دیتے تھے اور آپ کے شاگرد تھے، حضرت علامہ عینیؒ (۸۵۵ھ) اور علامہ قسطلانی، شیخ الاسلام زکریا انصاریؒ سے نقل کرتے ہیں کہ

کان اللیث اماماً کبیراً مجمعاً علی جلالتہ وثقتہ وکرمہ وکان علی مذہب الامام ابی حنیفۃ قالہ القاضی ابن خلکان (عمدۃ القاری)	حضرت لیث بڑے امام تھے آپ کی جلالت ثقاہت اور بزرگی مجمع علیہ ہے، آپ امام ابوحنیفہ کے مذہب پر تھے، قاضی ابن خلکان نے ایسا ہی کہا ہے۔

نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں۔ "وے حنفی مذہب بود وقضائے مصر داشت"
(آپ حنفی مذہب کے تھے، مصر کی قضا آپ ہی کے سپرد تھی) (اتحاف النبلاء المتقین ص۲۴۶)

حضرت امام نوویؒ (۶۷۶ھ) لکھتے ہیں کہ آپ مصر کے سب سے بڑے مفتی تھے (تہذیب الاسماء جلد ۲ ص۷۵) آپ حضرت امام ابویوسف کے بھی شاگرد تھے، عبداللہ بن وہب کہتے ہیں کہ

اخبرنی اللیث عن یعقوب عن النعمان عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شداد عن جابر بن عبد اللہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان لہ امام فقراءۃ الامام قراءۃ لہ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸)

ترجمہ:- مجھے لیث بن سعد نے امام ابویوسف سے انھوں نے امام ابوحنیفہ سے، انھوں نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے انھوں نے عبداللہ بن شداد سے انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کی، حضور نے فرمایا جس کا امام ہو تو امام کا پڑھنا اس کا ہی پڑھنا ہے۔

محدثین فقہاء کو اپنے سے آگے رکھتے تھے

سابقہ بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں محدثین اور فقہاء میں کوئی خاص فاصلہ نہ تھا۔ ان میں کسی قسم کا کوئی کھچاؤ تھا۔ دونوں طبقے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ حضرات محدثین اپنے آپ کو حامل فقہ سمجھتے اور فقہا کو اپنے سے آگے کے درجہ میں رکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "رب حاملِ فقہٍ غیر فقیہٍ" ہر وقت ان کے پیش نظر تھا کہ راوی حدیث ہونا اور بات ہے اور فقیہ ہونا اور بات ہے۔

۱۔ دیکھیے حضرت علامہ شعبیؒ (۱۰۰ھ) کس انکسار سے کہتے ہیں:

انا لسنا بالفقہاء ولکنا سمعنا الحدیث فرویناہ الفقہاء (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۸۱ اردو ص ۹۵)

(ترجمہ) ہم فقہاء نہیں ہیں ہم حدیث سنتے ہیں اور آگے بیان کر دیتے ہیں۔

۲۔ حضرت اعمشؒ (۱۴۸ھ) کس عظیم درجہ کے محدث ہیں مگر دیکھیے آپ بھی فقہاء کی کتنی قدر کرتے تھے

یا معشر الفقہاء انتم الاطباء ونحن الصیادلۃ۔ (نشر العرف ص ۱۲۹)

(ترجمہ) اے گروہ فقہاء۔ طبیب تم ہو ہم تو صرف دوائیں ـــــ لگائے بیٹھے ہیں۔

۳۔ حضرت امام سفیان الثوریؒ (۱۶۱ھ) کس درجے کے محدث ہیں یہ علامہ ذہبی سے معلوم کیجیے:

آپ نامور فقیہ اور سید الحفاظ ہیں۔ آپ سے عبداللہ بن مبارک یحیی القطان۔ ابن وہب۔ وکیع اور دوسرے بہت سے لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا۔ امام شعبہ۔ یحیی بن معین اور محدثین کی ایک جماعت نے آپ کو امیر المومنین فی الحدیث کا خطاب دیا ہے۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں۔ میں نے

ایک ہزار ایک سو شیوخ سے علم حاصل کیا۔ ان میں ایک بھی سفیان ثوری سے افضل نہیں پایا
(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۷۳ اردو)

آپ فقیہ کو کیا مقام دیتے ہیں یہ ان سے سنئے:

لو ان فقیہاً علی راس جبل لکان ھو الجماعۃ۔ (شرح السنۃ جلد ۱ ص۲۷۹)

(ترجمہ) ایک فقہ جاننے والا پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو تو وہ اکیلا ایک بڑی طاقت ہے۔

محدثین نے عمران المنقری اور حضرت حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے پہلے عمران نے کہا

"لیس ھکذا یقول الفقہاء" یعنی فقہاء اس طرح نہیں کہتے۔

۴۔ اس پر حضرت حسن بصریؒ نے کہا:

ویحك ورایت انت فقیہاً قط۔ (سنن دارمی جلد ۱ ص۱۰۱)

(ترجمہ) تیری بربادی۔ کیا تو نے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں فقہاء کتنی عزت سے دیکھے جاتے تھے۔

۵۔ حضرت ابن شہاب زہریؒ (۱۲۴ھ) کس مرتبے کے محدث ہیں یہ بات کسی بھی اہلِ علم سے مخفی نہ ہوگی۔ آپ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

ما عبد اللّٰہ بمثل الفقہ۔ (شرح السنۃ للبغوی جلد ۱ ص۲۷۹)

(ترجمہ) اللہ کی عبادت کا بہترین پیرایہ دین میں تفقہ ہے۔

۶۔ حضرت امام وکیع بن الجراح (۱۹۷ھ) لکھتے ہیں:

حدیث یتداولہ الفقہاء خیر من ان یتداولہ الشیوخ۔ (معرفۃ علوم الحدیث ص۱۱)

(ترجمہ) حدیث فقہاء کے ہاتھ لگے اس سے بہتر ہے کہ وہ شیخ الحدیث کے ہاتھ لگے۔

۷۔ حضرت امام ترمذی (۲۷۹ھ) فقہ کی عظمت کا اقرار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

وکذلك قال الفقہاء وھم اعلم بمعانی الحدیث (جامع ترمذی جلد ۱ ص۱۱۸)

(ترجمہ) اور اسی طرح فقہاء نے کہا ہے اور وہ حدیث کے معنوں کو زیادہ بہتر جاننے والے ہیں۔

۸۔ امام ابوداؤدؒ کو دیکھئے کس شرح صدر سے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

رحم اللّٰہ کان ابوحنیفہ اماماً (الانتقاء ص۔ تذکرۃ ص۱۴۰)

۹ - حضرت عبدالرحمن بن جوزی (۵۹۷ھ) محدث جلیل کو کون نہیں جانتا آپ فقہا کو کیا مقام دیتے ہیں یہ بھی دیکھئے:

اعلموا ان فی الحدیث دقائق وآفات لا یعرفہا الا العلماء الفقہاء (دفع شبہ التشبیہ ص۳۶)

(ترجمہ) جان لو کہ حدیث میں کئی باریکیاں اور کئی پیچیدگیاں لپٹی ہیں۔ جنہیں وہ علماء ہی پہچان سکتے ہوں جو فقہاء ہوں۔

۱۰ - علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) کی محدثانہ شان کس سے چھپی ہوگی۔ آپ بھی فقہاء کو بڑا اونچا مقام دیتے ہیں:

فان علم الحلال والحرام انما یتلقی من الفقہاء (فتح الباری جلد ۹ ص۳۱)

(ترجمہ) حلال وحرام کا علم فقہاء سے ہی لیا جاسکتا ہے۔

حضرت امام ابن ماجہ (۲۷۳ھ) اور امام دارمیؒ (۲۵۵ھ) دونوں حضرات امام احمد کے مذہب پر چلتے تھے۔ (دیکھئے الانصاف ص) اور فقہ کے سایے میں چلنا ان کے ہاں عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ دونوں امام حدیث تھے مگر حنبلی مذہب رکھتے تھے۔ محدث ہونا انہیں کسی امام فقہ کی پیروی سے نہ روکتا تھا۔

امام عبدالرحمن نسائیؒ (۳۰۳ھ) کو لیجئے انہوں نے مناسک حج پر فقہ کی ایک کتاب لکھی ہے یہ انہوں نے امام شافعی کے مذہب پر ترتیب دی ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی آپ کو شافعی المذہب لکھا ہے (ابجد العلوم ص۸۱)

امام ابوجعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) نے شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار جیسی عظیم کتابیں حدیث پر لکھی ہیں۔ مگر آپ حنفی المذہب تھے۔ (دیکھئے لسان المیزان جلد ا ص۲۷۶) مولانا مبارک پوری لکھتے ہیں۔ آپ حنفی تھے (دیکھئے مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۹۲) آپ کئی مقامات پر حضرت امام ابوحنیفہ سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ آپ مجتہد فی المسائل تھے مجتہد مطلق نہ تھے۔

حضرت امام بخاری (۲۵۶ھ) بہت سے مسائل میں شافعی المذہب ہیں لیکن کئی مقامات پر انہوں نے امام شافعی کی مخالفت بھی کی ہے اور فقہ حنفی کے مطابق رائے قائم کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک درجے میں مجتہد ہیں آپ کی فقہ آپ کے تراجم ابواب میں ہے۔ فقہ کی عظمت آپ کے ذہن

ہیں کتنی تھی اس کا پتہ آپ کی اس روایت سے چلتا ہے جو آپ نے حضرت ابن عباسؓ سے "کونوا ربانیین" کی تفسیر میں نقل کی ہے۔

کونوا حکماء علماء فقہاء (صحیح بخاری جلد ا ص۱۶)

(ترجمہ) تم ہو جاؤ حکمت کے حاملین، علم کے جانشین اور فقہ کے خوشہ چین۔

امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) حنبلی المذہب ہیں اور صحابہ کے اقوال کو ساتھ لے کر چلتے ہیں انہیں نظر انداز نہیں کرتے۔ اختلاف حدیث میں صحابہ کے عمل کو فیصلہ کن ٹھہراتے ہیں

اذا تنازع الخبران عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نظر الی ماعمل بہ اصحابہ من بعدہ۔ (سنن ابی داؤد جلد ا ص۳۷۶)

(ترجمہ) جب حضورؐ سے کسی موضوع پر دو مختلف روایتیں ملیں تو دیکھا جائے گا کہ آپ کے صحابہ نے آپ کے بعد کیا عمل کیا ہے۔

کیا فقہاء حدیث داں بھی ہوتے ہیں؟

حدیث بیان اور حدیث دان دو علیحدہ علیحدہ منصب ہیں تمام رواۃ حدیث، حدیث بیان ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ حدیث داں بھی ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان میں فرق بتلا چکے ہیں۔ رب حامل فقہ غیر فقیہ (رواہ الشافعی) البتہ فقہاء حدیث دان ضرور ہوتے ہیں۔ حدیث نہ جاننے والا کیسے فقیہ بن سکتا ہے۔

صاحب ہدایہ (۵۹۳ھ) کو ہی لیں حافظ جمال الدین زیلعی (۷۶۲ھ) جیسے جلیل القدر محدث ان کی روایات تلاش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) کئی جگہ سپر انداز ہوتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ یہ حدیث مجھے نہیں مل سکی معلوم نہیں صاحب ہدایہ نے کہاں سے لی ہے۔

علامہ علاء الدین صاحب درمختار (۱۰۸۸ھ) کس درجے کے اونچے فقیہ ہیں مگر دیکھئے وہ ساتھ ساتھ صحیح بخاری کے شارح بھی ہیں۔ علامہ عینیؒ (۸۵۵ھ) جہاں ہدایہ کے شارح ہیں وہیں صحیح بخاری کے شارح کی حیثیت سے بھی معروف و مشہور ہیں۔ علامہ شامیؒ (۱۲۵۲ھ) صاحب درمختار کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولہ تعلیقہ علی صحیح البخاری تبلغ نحو ثلاثین کراسا وعلی تفسیر

البیضاوی (رد المختار للشامی جلد ۱ صـ۳)

(ترجمہ) آپ کی صحیح بخاری پر تعلیقات ہیں جو تیس۳۰ اجزاء میں ہیں اور تفسیر بیضاوی پر بھی آپ کے حواشی ہیں۔

حدیث اور فقہ میں محل خطر کہاں ہے؟

(۱) فقہ کی عبارت حدیث کی نسبت زیادہ سلیس ہوتی ہے (۲) فقہ اپنے موضوع میں تدریجی مراحل سے نہیں گزری۔ حدیث اپنے موضوع میں تدریجی منازل سے گزری ہے اور اس نے ۲۳ سال میں تکمیل پائی ہے (۳) حدیث میں ناسخ و منسوخ کی بحث چلتی ہے لیکن فقہ میں کوئی ناسخ و منسوخ کے فاصلے نہیں۔ (۴) حدیث میں غلطی لائق درگزر نہیں، فقہ میں نادرست اجتہاد پر بھی ایک اجر کا وعدہ ہے۔

اس صورتِ حال میں آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ حدیث اور فقہ میں محل خطر کہاں ہے۔ فقہ کے آزاد مطالعہ میں خطرے کم ہیں، جبکہ حدیث کے آزاد مطالعہ میں خطرے زیادہ ہیں۔ علماء نے فقہ السنۃ میں تو محنت کی ہے اور اس عنوان پر کتابیں لکھی ہیں لیکن سنۃ الفقہ کا عنوان کہیں سے نہ گزرا ہوگا۔

حضرت سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) کس پائے کے محدث ہیں اسے حافظ ذہبی کی زبان سے سنئے:

آپ امام، حجت، حافظ حدیث۔ وسیع العلم۔ اور جلیل القدر انسان تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر امام مالک اور سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز سے علم حدیث ختم ہو جاتا۔ امام عبدالرحمٰن مہدی فرماتے ہیں کہ ابن عیینہ اہلِ حجاز کی احادیث سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے امام بخاری سے سنا ہے فرماتے تھے ابن عیینہ حماد بن زید سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ حدیث کا جاننے والا کوئی نہ دیکھا۔

(تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۲۷۱ اردو)

آپ حضرت امام بخاری (۲۵۶ھ) اور حضرت امام مسلم (۲۶۱ھ) دونوں کے استاد ہیں فرماتے ہیں

الحدیث مضلۃ الا للفقہاء۔

(ترجمہ) حدیث میں بہک جانے کی بہت راہیں ہیں مگر فقہار کے لئے یہ خطرہ نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود بھی فرماتے ہیں:

ما انت بمحدث قوماً حدیثاً لا تبلغه عقولہم الا کان لبعضہم فتنه۔ (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۹)

(ترجمہ) تم کسی قوم کے پاس کوئی حدیث بیان کرو جوان کی سمجھ سے بالا ہو تو وہ ان میں سے بعض کے لئے ضرور فتنہ بن جائے گی۔

بعض کے لئے کیوں کہا؟ - وہ ان سب کے لئے جو اسے نہ سمجھتے ہوں، فتنہ کیوں نہ بنے گی؟ یہ اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعض اس پر براہ راست عمل نہ کریں۔ وہ فقہ کے سایہ میں چلنے والے ہوں۔ اور کسی فقیہ کی پیروی میں وہ اس فتنہ سے بچ جائیں اور جو بعض براہ راست عمل بالحدیث کے قائل ہوں وہ اس گڑھے میں آگریں۔ کسی فقیہ کی راہنمائی میں چلنا وہ عیب سمجھتے ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود پر الزام کہ انہوں نے حدیث کو فتنہ کہا ہے

بعض حضرات جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ نماز میں رکوع کے وقت رفع یدین نہ کرتے تھے۔ ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کو فتنہ کہا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے حدیث کو فتنہ نہیں کہا۔ بلکہ اس شخص کے عمل بالحدیث کو فتنہ کہا ہے جو علم نہ رکھتا ہو اور جہاں اسے کوئی حدیث ملے وہ اس پر عمل کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اسے فقیہہ درجے کے علمار کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور ان سے پوچھے بغیر وہ ظاہر حدیث پر عمل پیرا نہ ہو۔ اس میں بقول حضرت سفیان بن عیینہ اس کے گمراہ ہونے کا بہت اندیشہ ہے۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں امام مالک سے کہا گیا سفیان بن عیینہ کے پاس کئی ایسی احادیث ہیں جو آپ کے پاس نہیں۔ آپ نے کہا اگر میں لوگوں کو وہ تمام احادیث روایت کردوں جو میں نے سنیں تو میں احمق ہوں گا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں انہیں گمراہ کر رہا ہوں۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی لکھتے ہیں آپ نے فرمایا:

انی ارید ان اضلہم إذاً ولقد خرجت منی احادیث لوددت انی ضربت بکل حدیث منہا سوطاً ولم احدث بہا (ترتیب المدارک جلد ۱ ص ۱۸۸)

مجتہد کے درجہ پر پہونچنے والے علماء کیلئے امام مجتہد کی پیروی ضروری نہیں

مجتہد اپنے سے بڑے مجتہد کی پیروی کرے یہ جائز ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کس او نچے درجے کے مجتہد تھے مگر آپ حضرت عمرؓ کی پیروی میں چلتے تھے۔ ان کے اجتہاد کے سامنے اپنے اجتہاد کو چھوڑ دیتے۔ امام ابویوسف اور امام محمد خود مجتہد تھے مگر زیادہ تر حضرت امام ابوحنیفہ کی پیروی میں چلتے تھے۔ یہ جائز ہے لیکن اگر کوئی ایسا نہ کرے تو ہم اسے ملزم نہ گردانیں گے۔

قاسم بن محمد الاندلسی القرطبی (۲۷۶ھ) حضرت امام شافعی کے پیرو تھے جب فقہ میں مہارت حاصل کرلی اور امامت اور اجتہاد کے مرتبہ پر فائز ہوئے تو تقلید چھوڑ دی اور لوگوں کو امام شافعی سے ہٹانے کے لئے کتاب الایضاح فی الرد علی المقلدین لکھی۔ علامہ ابن جریر الطبری (۳۱۰ھ) بھی شافعی المذہب تھے آپ نے اجتہاد کے دائرہ میں قدم رکھا تو کسی خاص مسلک کی تقلید سے کنارہ کش ہوگئے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ غیر مجتہد بھی کسی امام مجتہد کی پیروی سے نکلنے کا مجاز ہے۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ ظاہر حدیث پر عمل کرنا اس کے لئے فتنہ بن جائے۔

حدیث علم کا خزانہ ہے اور کھرا سونا ہے فقہ اس کے کھرا رکھنے اور غلط آلائش سے بچانے کی علمی ضمانت ہے حدیث اور فقہ میں تو اول درجہ حدیث کا ہے۔ مگر محدثین اور فقہاء میں فقہاء پہلے ہیں اور بقول امام ترمذی وہ حدیث کے معنی سمجھنے میں محدثین سے آگے ہیں۔

تاہم یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہی جاسکتی ہے کہ محدثین اور فقہاء میں کوئی علمی فکری اور اعتقادی فاصلہ نہیں۔ تاریخ میں ہر دو طبقے ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ ابن حزم ظاہری کے بعد آٹھ سو سال تک کسی نے فقہ کی ضرورت کا انکار نہیں کیا۔ پہلا شخص جس نے برٹش انڈیا میں فقہ کے خلاف آواز اٹھائی وہ عبدالحق بنارسی تھا جو پہلے ہندو تھا اور معلوم نہیں کس ارادے سے مسلمانوں میں گھس آیا تھا۔

مولانا عین القضاۃ حیدرآبادی ثم لکھنوی

عبدالحی فاروقی شعبۂ علوم اسلامیہ ہمدرد یونیورسٹی نئی دہلی

لکھنؤ کی سرزمین زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کا ہمیشہ گہوارہ رہی ہے۔ شاہانِ اودھ کی فیاضانہ سرپرستیوں اور داد و دہش کے نتیجہ میں کیلائے شعر و سخن کے گیسو بہت سنوارے گئے۔ اور چنگ و رباب کی صداؤں میں نا و نوش کی محفلیں خوب خوب آراستہ و پیراستہ کی گئیں۔ عوام تو عوام تھے خواص کا بھی ایک بڑا طبقہ عیش پسندی اور تن آسانی میں مبتلا تھا۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں دین سے غفلت اور بے حسی کی وبا پوری طرح پھیل گئی تھی۔ مسجدیں عموماً خالی اور غیر آباد رہنے لگی تھیں کہ ان میں نمازی نہ تھے اور نماز کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ محلّہ کے کچھ بوڑھے اور اذکار رفتہ لوگ محض "عاقبت سنوارنے" کے خیال سے مسجدوں میں آجایا کرتے تھے ورنہ بس۔

مدرسوں اور خانقاہوں کا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہ تھا، علماءِ حق اور خاصانِ خدا ضرور وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے مگر ان کا دائرۂ کار تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کی سرگرمیاں ایک مخصوص حلقہ تک ہی محدود رہیں اور عوام تک نہ پہونچ سکیں۔ دینی امور سے غفلت اور لاپرواہی کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں خاص طور سے اس دَور کے سیاسی حالات کا بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ ایک مذہبی مؤرخ کے لئے اودھ کی تاریخ کا یہ دَور کچھ زیادہ خوش کُن نہیں ہے۔

یہ ضرور ہے کہ علماء کے طبقہ میں ایک سے ایک صاحبِ علم و فضل اور اپنے اپنے فن میں یکتائے

یہ مقالہ ابتدائی شکل میں ماہنامہ برہان، دہلی، اپریل ۱۹۷۵ء میں طبع ہوا تھا، اب اس کو مکمل نظرِثانی اور کچھ نئے اضافوں کے بعد دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (مرتّب)

روزگار[1] پیدا ہوتے رہے، ان میں محدّث و مفسّر بھی ہوئے اور صاحبِ تصنیف و تالیف بزرگ بھی، یہاں تک کہ بانیٔ درسِ نظامی ملاّ نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء) بھی اسی خاک سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن لکھنؤ میں وہ دینی فضا پیدا نہ ہو سکی جو دلوں میں معرفتِ الٰہی کی قندیل روشن کرکے عملِ صالح کی طرف طبیعتوں کو مائل کرتی۔ البتہ اب اخیر دور میں استاذ الاساتذہ علاّمہ ابوالحسنات محمد عبدالحی[1] فرنگی محلی رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی ایسی پیدا ہوئی جس نے اپنی علمی و دینی خدمات سے عوام و خواص اور بالخصوص اپنے شاگردوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی، علاّمہ موصوف نے علمی اور دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے انتھک محنت اور کاوش کی، درجنوں کتابیں، رسالے اور حواشی تحریر فرمائے جس سے اہلِ بصیرت کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ خواص اور اہلِ علم کے علاوہ عوام میں بھی پیغامِ رُشد و ہدایت ضرور پہنچے گا۔ مگر آپ کی عمر نے وفا نہ کی اور کُل چالیس[2] سال کی مدتِ حیات پاکر یہ آفتابِ علم و عمل غروب ہو گیا، لیکن اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گیا جن سے علمِ دین اور عام مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچا۔ انہی میں ایک مخصوص شاگرد اور ان کے صحیح علمی جانشین حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحب حیدرآبادی رحمہ اللہ بھی تھے۔ آپ نے لکھنؤ میں مستقل طور پر قیام فرماکر اپنی مسندِ درس آراستہ کی اور لوگوں کے دلوں میں علومِ دینیہ کی طرف رغبت اور شوق پیدا کیا۔ اور خاص طور سے وہ قرآن مجید اور فنِ تجوید و قرأت کی نشر و اشاعت کے لئے ایک ایسی عظیم

---

[1] علاّمہ محمد عبدالحی رحمہ اللہ بن مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی رحمہ اللہ ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۸ء میں باندہ یوپی میں پیدا ہوئے۔ جملہ کتبِ درسیہ اپنے والد ماجد ہی سے پڑھیں، کچھ عرصہ تک والد کے ساتھ حیدرآباد میں مقیم رہے۔ مگر والد کے انتقال کے بعد مستقل طور پر لکھنؤ آکر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو شہرت و قبولیت اپنی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی تھی، آپ کی تصنیفات نہایت اہم اور قیمتی ہیں جن کی تعداد ۱۰۹ تک پہونچتی ہے اور بقولِ بعض ۱۱۰ تک ہے، اکثر و بیشتر شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء میں صرف ۴۰ سال کی عمر میں لکھنؤ میں آپ نے وفات پائی اور باغ مولوی انوار صاحب میں مدفون ہوئے۔

(تذکرہ علماءِ فرنگی محل، مولوی عنایت اللہ فرنگی محلی رحمہ اللہ، صفحہ ۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳)

درسگاہ قائم کر گئے جس کی بدولت نہ صرف لکھنؤ کے گلی کوچے کلام ربانی سے گونج اُٹھے بلکہ ہند و پاک اور بنگلہ دیش کا ہر چھوٹا بڑا شہر و قصبہ یہاں کے قُرّاء اور حُفّاظ کی دلنواز اور روح پرور آوازوں سے معمور ہو گیا۔

وطن، خاندان اور پیدائش

آپ کے آباء و اجداد جیلان کے رہنے والے تھے لیکن ان میں سید محمد سعیدؒ وہ پہلے بزرگ تھے جو ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ریاست بیجاپور میں آکر قیام کیا۔ یہاں تین پشتیں گذار کر آپ کا خاندان مضافات حیدرآباد میں آکر آباد ہوا اور یہیں ایک موضع میں قیام پذیر ہوا جہاں آپ کے والد ماجد سید شاہ محمد وزیرؒ ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ جب آپ سنِ شعور کو پہونچے تو موضع کو چھوڑ کر شہر حیدرآباد میں مقیم ہو گئے۔ شاہ صاحبؒ نے علوم دینیہ کی تعلیم اپنے والد سید محمد جعفرؒ سے حاصل کی اور عملیات میں کمال حاصل کیا[1]۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر ملتا ہے۔ سید محمد وزیرؒ بہت متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ عملیات کی وجہ سے آپ کی بہت شہرت تھی۔ عوام اور خواص ہر وقت آپ سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ حیدرآباد کے نواب ناصر الدولہ بہادر (م ۱۸۵۷ء) آپ کے بیحد گرویدہ تھے۔ یہ زمانہ سیاسی طور پر بڑا پُر آشوب تھا۔ نواب ناصر الدولہ کے فرزند نواب افضل الدولہ نظام الملک آصف جاہ خامس (م ۱۸۶۹ء) بھی آپ کے بڑے معتقد تھے۔ وہ اپنی ولی عہدی کے زمانے میں آپ کے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے، ایک بار حاضر خدمت ہوئے اور دُعا کی درخواست کی، سید صاحبؒ نے ان سے فرمایا، جاؤ! فلاں اور فلاں وقت تم کو حکومت ملے گی۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کے مطابق میر افضل الدولہ حکمرانِ سلطنت ہو گئے۔ اس کے صلہ میں سید صاحبؒ کو حکومت نظام کی جانب سے ایک پورا موضع بطورِ معافی نذر کیا گیا۔ سید صاحبؒ کے اکلوتے صاحبزادہ مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ تھے جو حیدرآباد دکن میں ۳ر نومبر ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے[2]۔ ابھی

---

[1] سوانح سید شاہ محمد وزیرؒ۔ مرتبہ مولوی حافظ افتخار علی ص ۶ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۳ء

[2] مصباح المشائخ۔ مؤلفہ حکیم ہادی رضا خاں ماہر ص ۶ مطبوعہ منبع الطب لکھنؤ ۱۹۲۸ء

مولانا رحؒ کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ نے والد ماجد کو بہت متاثر کیا اور وہ دل برداشتہ ہوکر ساری جائیداد وغیرہ کو ختم کرکے آپ کو لیکر مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں مسلسل گیارہ سال تک مقیم رہے۔ والد کو مولانا رحؒ سے بیحد محبت تھی، ان کی جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ تھی، وہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاکر مولانا کو کھلاتے تھے۔[1]

تعلیم و تربیت

مولانا رحؒ کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی۔ فارسی کی چند کتابیں قاضی محمد اسماعیل مہریؒ سے پڑھیں۔[2] اس کے بعد عربی کی کچھ ابتدائی تعلیم مکہ معظمہ میں حاصل کی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپکے والد آپ کو لیکر ہندوستان واپس آئے۔ کچھ دن بمبئی میں ٹھہر کر یہ معلومات حاصل کیں کہ اچھی اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہندوستان میں کہاں کہاں ہے۔ لہٰذا مختلف علماء و فضلاء کی طرف نظر دوڑائی گئی۔ چنانچہ نگاہِ انتخاب اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ پر پڑی۔ لہٰذا آپکے والد صاحب ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ میں لکھنؤ تشریف لائے اور فرنگی محل کے قریب مسجد ملّا مبینؒ کے نزدیک سکونت اختیار کرکے آپ کو علامہ فرنگی محلیؒ کے حلقہ درس میں داخل کردیا، اس وقت آپکی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔[3] آپ کے علمی ذوق و شوق اور نیکی و دینداری کو دیکھ کر حضرت علامہ بیحد محبت و شفقت فرمانے لگے، یہاں تک کہ اپنا آبائی مکان جوکہ فرنگی محل کے پُل کے سامنے تھا آپ کو رہنے کے لئے دیدیا۔[4] چند کتب درسیہ حضرت علامہ فرنگی محلیؒ کے بعض منتہی طلباء سے بھی پڑھیں جن میں شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ کا نام قابلِ ذکر ہے۔[5] عربی اور فارسی ادب کی

---

[1] مصباح المشائخ۔ مؤلفہ حکیم ہادی رضا خاں ماہر ص۷ مطبوعہ منبع الطب لکھنؤ ۱۹۲۸ء
[2] ماہنامہ النجم لکھنؤ مرتبہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ
[3] قطبِ دوراں مؤلفہ سید اشفاق حسین رضوی ص۵ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔
[4] ماہنامہ النجم لکھنؤ مرتبہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی، جمادی الاول ۱۳۴۳ھ
[5] مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے،
(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

بعض کتابیں شمس العلماء مفتی سید محمد عباس شوستری سے بھی پڑھی تھیں جو اپنے عہد میں ادب کے ممتاز افاضل میں شمار کئے جاتے تھے[1]

روزمرّہ کی زندگی

درسیات سے فارغ ہونے کے بعد مولانا مرحوم نے مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی اور اپنے والد ماجد کے ہمراہ رہنے لگے۔ مولاناؒ تمام عمر مجرّد رہے اور نکاح نہیں کیا، اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرماتے تھے کہ:

"جس عمر میں ضرورت تھی اُس عمر میں والد نے نکاح کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور اب اس عمر میں ضرورت باقی نہیں رہی"[2]

آپ اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے نہ کوئی بھائی بہن نہ تھا اور نہ کوئی رشتہ دار تھے۔ مدرسہ فرقانیہ کے جس کمرے میں آپ کا قیام رہتا تھا اس میں صرف ٹاٹ کا فرش رہتا تھا، دو سیاہ یا کبھی بھورے رنگ کے کمبل تھے جو ایک اوڑھنے اور ایک بچھانے کے کام آتا تھا۔ لباس میں کرتہ پاجامہ، پنج گوشیہ ٹوپی اور حیدرآبادی رومال تھا، نہایت سادہ غذا استعمال کرتے، عام طور سے شوربا اور پھلکا آپ کو بہت مرغوب تھا[3]

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

استاذ کے حکم سے لکھنؤ میں کچھ دنوں درس بھی دیا ہے۔ صاحب علم وفضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب دل بھی تھے متعدد تصانیف اور فارسی اشعار کا ذخیرہ چھوڑا ہے بسنہ ۱۳۲۲ھ میں اجمیر میں بحالت سماع انتقال فرمایا اور وہیں درگاہ خواجہ اجمیریؒ میں مدفون ہوئے۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔ سوانح حیات شاہ محمد حسین الہ آبادی۔ مرتبہ محمد الفاروقی مطبوعہ الہ آباد۔ اور نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۱۲۸ — ۴۲۵ حیدرآباد دکن۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [1] مفتی محمد عباس بن علی الموسوی کے اجداد میں جعفر بن ابی طالب ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہیں مفتی صاحب سنہ ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے، آپکی قابلیت اور درس وتدریس کی بڑی شہرت ہوئی۔ حکومت اودھ نے تاج العلماء اور افتخار الفضلاء کے خطابات سے نوازا۔ پھر شاہی دور ختم ہو جانے کے بعد حکومت برطانیہ نے سب سے پہلے آپ ہی کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ بسنہ ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۹ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا (نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص)

[2] ماہنامہ النجم لکھنؤ مرتبہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ۔ جمادی الاوّل سنہ ۱۳۴۳ھ

[3] قطب دوراں مؤلفہ سید اشفاق حسین رضوی ص ۱۳ نامی پریس لکھنؤ

آپ مہمان نوازی اور تواضع میں بے مثال تھے۔ سال میں چار پانچ مرتبہ دعوت عام کا اہتمام فرماتے، سب سے بڑی دعوت ربیع الاول میں ہوتی تھی جس میں دس بارہ ہزار افراد شریک ہوتے تھے۔ ہر سال حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے سالانہ یوم وفات کے موقع پر شرکت کرنے کے لئے لکھنؤ سے ایک بڑا قافلہ سرہند روانہ فرماتے تھے جس کے لئے ٹرین کی کئی بوگیاں رزرو کرائی جاتی تھیں۔ اس قافلہ میں تقریباً ڈیڑھ سو حفاظ و قراء پندرہ بیس منتظمین، ایک طبیب مع ضروری سامانِ ادویہ، باورچی، سقہ، چپراسی اور حجام وغیرہ شامل ہوتے تھے، ان کے علاوہ چالیس علماء و مشائخ مزید ہوتے تھے۔ پورے ایک ماہ یہ قافلہ وہاں ٹھہرتا تھا اور وہاں بھی ایک بار مولانا کی طرف سے دعوتِ عام کا اہتمام ہوتا تھا اس طرح اس قافلہ کی روانگی اور آمد کے کل اخراجات مولانا خود ہی برداشت کرتے تھے جو کہ اس زمانہ میں چھ سات ہزار روپے سے کم نہ ہوتا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ سے ملاقات

جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ (م ۱۹۲۰ء) اپنی نظر بندی کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے اور تحریکِ آزادیٔ ہند کو مزید طاقتور بنانے کا پروگرام بنایا تو اس سلسلہ میں آپ نے لکھنؤ کا بھی سفر فرمایا اور مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ سے بھی ملاقات فرمائی تھی۔ مولاناؒ آپ کے استقبال کے لئے اپنے کمرہ کے زینہ تک آئے اور خود اپنی نشست گاہ پر بٹھانے کی کوشش کی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے انکار فرمایا۔ مولانا نے فرمایا۔ یہ فقیر کی کملی ہے۔ اس پر تشریف رکھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا، بجائے بزرگاں نشستن خطا است۔ لیکن مولانا کا اصرار جاری رہا۔ مجبوراً حضرت شیخ الہندؒ کو بیٹھنا پڑا۔ دورانِ گفتگو کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی، اس طرح وہ گفتگو توصیغۂ راز میں رہی۔ البتہ کسی طریقہ سے معلوم ہوگیا کہ آپ نے اچھی خاصی رقم تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں شیخ الہندؒ کو مرحمت فرمائی۔[1]

اسی ملاقات کے ضمن میں مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے مولانا سید عین القضاۃؒ کی

---

[1] سوانح مولانا سید عین القضاۃؒ۔ مرتبہ حافظ افتخار علی، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۴ء

وفات پر اپنے اخبار میں تعزیتی نوٹ لکھتے ہوئے لکھا تھا:

"کیا ان کی زندگی ہمارے علماء کے لئے کوئی سبق ہدایت و بصیرت نہیں رکھتی؟ شریعت و طریقت کی جامعیت، علم و فقر کا اجتماع، دُنیا سے بے لوثی، امیروں سے بے نیازی، احکام خدا و رسول کی پابندی، بے نفسی و بے غرضی اور خودداری ان تمام حیثیتوں سے مولانا مرحوم ہمارے علماء کیلئے ایک نمونہ تھے، یہی بے نفسی تھی جس سے مولانا عین القضاۃ کی حکومت دلوں پر تھی۔

ہمارے علماء کو شکایت ہے کہ انگریزی خواں گروہ اُن سے باغی ہوتا جارہا ہے لیکن مرحوم مولانا کو کبھی ایسی شکایت نہ ہوئی اور نہ کسی دوسرے عالم کو جو ان کے نقش قدم پر چلے گا کبھی ہوسکتی ہے۔ خدا انھیں کو بڑھاتا ہے جو اپنے تئیں مٹاتے ہیں اور انھیں کو اُچھالتا ہے جو اپنے تئیں دباتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس کی عظمت و کبریائی میں خواہ مخواہ شریک ہونا چاہتے ہیں اور اسی فکر و تدبیر میں لگے رہتے ہیں تو خدا ان کی تدبیروں کو اسی دنیا میں اُلٹا کر دیتا ہے وله الكبرياء فى السمٰوات و الارض۔ رسولِ خدا حبیبِ کبریاء (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مرتبۂ عبدیت میں کمال حاصل کرچکے تب کہیں مرتبۂ قربِ خاص سے سرفراز ہوئے۔ آج ہمارے لئے اور ہمارے علماء و مشائخ کے لئے اگر صدیق اکبرؓ، عمر فاروقؓ، جنیدؒ و جیلانیؒ ہوجانا ناممکن ہے تو کیا عین القضاۃ لکھنویؒ بن جانا بھی دشوار ہے؟" [1]

طریق درس آپ کے درس دینے کے اوقات صبح و شام تھے۔ دو سبق صبح کو اور ایک سبق بعد مغرب ہوتا تھا۔ آپ کا حلقۂ درس اپنے استاذ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے زمانہ ہی سے شروع ہوگیا تھا اور کافی شہرت ہوچکی تھی، طریقِ درس اور سلیقۂ تعلیم ایسا عمدہ اور دلنشیں تھا کہ جو شخص ایک کتاب بھی آپ سے سمجھ کر پڑھ لیتا اس میں ایک قسم کی استعداد پیدا ہوجاتی تھی اور چند ہی اسباق میں مطالعہ دیکھنے کا سلیقہ آجاتا تھا۔ آپ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ درس دیا کرتے تھے۔ کتاب کے ہر مقام کو سمجھانے میں لب و لہجہ اور تقریر بالکل علامہ فرنگی محلیؒ کے مشابہ تھی۔ ہر کس و ناکس کو درس میں داخل

---

[1] ہفت روزہ سچ لکھنؤ۔ ۱۳ر فروری ۱۹۲۵ء

ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اور اگر کوئی طالب علم ناغہ کرتا یا محنت نہ کرتا تو اس کی طرف نظر التفات کم ہو جاتی تھی[۱]

بیعت و خلافت

آپ کو بیعت کا شرف حضرت شیخ موسیٰ جی ترکیسری رح (۱۸۳۸ء ۱۲۵۴ھ - ۱۸۹۱ء ۱۳۰۹ھ) سے تھا جو سلسلہ نقشبندیہ کے ایک جلیل القدر بزرگ تھے۔ شیخ موسیٰ جی رح کو مولانا نظام الدین رح (م ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ) سے خلافت ملی تھی جو حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی رح (م ۱۸۲۴ء ۱۲۴۰ھ) کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ شیخ موسیٰ جی رح کے تفصیلی حالات میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رح (م ۱۹۶۲ء) نے مکمل ایک رسالہ "کراماتِ موسویہ" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا تھا جو لائق مطالعہ ہے[۲] جس زمانے میں آپ کی طبیعت بیعت ہونے کی طرف مائل ہوئی تو کسی مرشد کی طلب دل میں پیدا ہوئی۔ ہنوز ابھی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ کس سے بیعت ہوں ایک شب آپ کو خواب میں حضرت موسیٰ جی ترکیسری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ انھوں نے خواب میں لکھنؤ اسٹیشن سے ترکیسر تک پہونچنے کی تفصیلی راہ دکھادی۔ چنانچہ اس کے بعد ہی آپ ترکیسر کے لئے روانہ ہو گئے۔ خود فرماتے تھے کہ مجھے اس طرح سب اسٹیشن و مقامات نظر آئے۔ حتیٰ کہ کیم چوکی اسٹیشن پر جو کنواں مجھے نظر آیا تھا اسی پر میں نے فجر کی نماز کے لئے وضو کیا اور نماز پڑھی اور شوق میں پیدل ہی روانہ ہو گیا، پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ بالآخر دس بجے دن میں ترکیسر (ضلع سورت) پہونچ گیا۔ حضرت موسیٰ جی رح کے صاحبزادے مولوی حکیم غلام حسین ترکیسری رح کہتے تھے کہ والد صاحب نے صبح ہی کو اطلاع دیدی تھی کہ ایک مہمان آرہا ہے۔ اس بار مولانا کا قیام ترکیسر میں

---

[۱] ماہنامہ النجم مرتبہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی رح۔ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ

[۲] کراماتِ موسویہ کا پہلا ایڈیشن حضرت مولانا لکھنوی رح نے ۱۳۳۱ھ میں اپنے پریس عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع کیا تھا، اس کے بعد ایک عرصہ تک یہ کتاب نایاب رہی۔ لہٰذا اس کا دوسرا ایڈیشن جناب حاجی اسماعیل محمد مہتر ترکیسری کے صرفہ سے ۱۹۷۹ء ۱۳۹۹ھ میں شائع ہوا پھر اس کا تیسرا ایڈیشن جناب مولانا محمد یعقوب ابراہیم قاضی صاحب اور مولانا احمد بمات صاحب کی تحریک پر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔ (مرتب)

ایک ماہ رہا۔ پھر اس کے بعد اکثر وہاں آتے جاتے رہے اور فیوضِ باطنی حاصل کرتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو خلافت مل گئی۔[1] مولانا کو اپنے پیر کے گھرانے سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ چنانچہ حکیم غلام حسین ترکیسری ابن حضرت موسیٰ جی ترکیسریؒ کے دو صاحبزادے ڈاکٹر محمد موسیٰ لطفی اور محمد یونس صاحب کو لکھنؤ بلاکر اپنے پاس رکھا۔ دونوں بھائیوں نے قراءت، حفظ، فارسی اور عربی کی تعلیم مولانا ہی کی سرپرستی میں حاصل کی۔[2]

مدرسہ عالیہ فرقانیہ کا قیام

جیساکہ عرض کیا جاچکا ہے مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ کا سلسلۂ درس و تدریس ان کے استاذ علامہ فرنگی محلیؒ کی حیات ہی میں شروع ہو چکا تھا جو کہ فرنگی محل کے قریب مسجد مُلّا مبین میں غالباً ہوتا تھا۔ یہ زمانہ ۱۸۹۵ء / ۱۳۱۲ھ کا تھا۔ اس کے بعد آپ کے والد نے ۱۹۰۰ء / ۱۳۱۸ھ کے آس پاس فرنگی محل سے کچھ دُور ہٹ کر محلّہ کٹرہ حیدر حسین میں ایک مکان خرید کر رہائش اختیار کی اور اسی میں بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دلانے کے لئے ایک مکتب کی بھی داغ بیل ڈالی، یہی مکتب آگے چل کر ۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ میں مدرسہ عالیہ فرقانیہ کے نام سے موسوم ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں جب آپ کے والد سید محمد وزیرؒ کا انتقال ہوگیا تو آپ نے مدرسہ کو اپنی نگرانی میں لے لیا اور پھر اسے ہر طرح کی ترقی دینے میں مصروف ہو گئے۔ مدرسہ کے نصابِ تعلیم کی ترتیب ازا بتدا تا انتہا کی کُل مدّت سولہ سال رکھی۔[3] حضرت مولاناؒ کا مسلک ایک معتدل حنفی مسلک تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں کسی دینی معاملہ میں تشدّد نہیں ہے۔ مدرسہ فرقانیہ میں اگرچہ فارسی اور عربی کی پوری تعلیم درسِ نظامی کے مطابق ہوتی تھی مگر فنِ تجوید و قرأت میں مدرسہ کو امتیاز حاصل تھا اور یہی چیز مدرسہ کی شہرت کا سبب بنی۔ مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر لکھنؤ نے اپنے ایک مضمون میں مدرسہ کی اسی خصوصیت کو اس طرح تحریر کیا ہے:

"قرآن کی تعلیم کا رواج تو خدا کے فضل سے ہندوستان میں ہر جگہ ہمیشہ سے تھا اور اب بھی ہے"

---

[1] سوانح مولانا محمد عین القضاۃؒ۔ مرتبہ حافظ افتخار علی صاحب ص ۱۸ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۷۲ء

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۳۹ 〃 〃 〃 〃

مگر قرأت کی تعلیم کا چرچا اس ملک میں نہ تھا۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اس مدرسہ کے ذریعہ ملک بھر میں قرأت کا عام چرچا کر دیا۔ یہی نہیں کہ مدرسہ سے ہر سال قاریوں اور قرأت جاننے والے حافظوں کی ایک معقول تعداد ملک کے ہر حصہ میں پھیل جاتی ہے بلکہ یہاں کے طالب علموں سے قرآن پاک سن سن کر سب جگہ کے لوگوں کو اس ضرورت کی طرف توجہ ہوگئی ہے۔ اور اب جہاں کہیں اسلامی مدرسے بنائے جاتے ہیں یا بڑی مسجدوں میں امام مقرر کئے جاتے ہیں تو لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ مدرسوں اور مسجدوں میں قاری یا قرأت جاننے والے امام مقرر ہوں۔" [1]

اس وقت بھی یہ مدرسہ مولانا مرحوم کی ایک جیتی جاگتی یادگار ہے۔ اس کی وسیع وعریض عمارت لکھنؤ شہر کے وسط میں واقع ہے۔ اس کے متصل ہی مشہور کارخانہ عطر کی عمارت "حنا بلڈنگ" ہے۔ مولانا کی حیات میں ہر طالب علم کو دونوں وقت کی خوراک اور ضروری اخراجات کے لئے وظیفہ بھی ملتا تھا اور ہر ایک کو سردی وگرمی کے لحاظ سے کپڑے بھی مہیّا کئے جاتے تھے۔ جب کوئی بچّہ مولانا کے پاس حاضر ہوتا تو آپ اس سے قرآن پڑھنے کی فرمائش کرتے اور سُنکر فرماتے:

"ہم کو یہ آوازیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور یہی بچّے ہمارے توپ(؟) ہیں۔" [2]

اب تک ہزاروں کی تعداد میں حُفّاظ، قُرّاء اور عُلماء یہاں سے فارغ ہو کر نکل چکے ہیں۔ اور بلا مبالغہ اس برصغیر کے بیشتر حُفّاظ اور قُرّاء کسی نہ کسی حیثیت سے مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ سے نسبت رکھتے ہیں۔[3]

دستِ غیب مولانا مرحوم بہت فیّاض اور مخیر تھے۔ غرباء ومساکین، یتیموں وبیواؤں اور سائلین کے ساتھ بڑی داد ودہش فرماتے۔ نہ جانے کتنے افراد کی

---

[1] ہفت روزہ سچ لکھنؤ ص ۳-۴، ۶ فروری ۱۹۲۵ء

[2] مصباح المشائخ۔ مؤلفہ حکیم ہادی رضا خاں ماہر ص ۱۵

[3] راقم الحروف کو بھی اس مدرسہ سے طالب علمانہ تعلق رہا ہے۔

تو ماہوار تنخواہیں مقرر تھیں جن کو ان کی وفات تک کوئی نہیں جانتا تھا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ اتنے بڑے مدرسہ کے اخراجات، سالانہ دعوتیں اور سرہند کے قافلے کے مصارف ان سب کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ یہ آمدنی کن ذرائع سے ہوتی تھی اب تک کسی کو علم نہیں۔ مولاناؒ نے مدرسہ کے لئے یا اور کسی دوسرے کاموں کے لیے کوئی چندہ وغیرہ کبھی نہیں کیا، اسی وجہ سے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ چنانچہ ایک موقع پر خود ہی فرمایا کہ:

"ہمارے متعلق لوگوں کا عجب خیال ہے کوئی کہتا ہے کہ ہم کیمیا جانتے ہیں، کوئی سمجھتا ہے کہ ہم کو دستِ غیب حاصل ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ ہم تجارت کرتے ہیں، حالانکہ اللہ کے فضل وکرم سے ہم ان سب باتوں سے بَری ہیں۔ ہم نے اصل کو اس لئے مخفی رکھا ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے گا تو وہ اس کی تخریب کے درپے ہوجائیں گے۔ اچھا ہوا کہ ہم کو کیمیا نہ آئی ورنہ ہم سب کو بتلا دیتے۔" [1]

البتہ ثقہ اور باخبر حضرات کا خیال ہے کہ مولانا کے بعض مخصوص معتقدین تھے جو پوشیدہ طور پر ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

تصنیفات وتالیفات

مولانا نے وفات سے بہت عرصہ قبل ہی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا کام موقوف کردیا تھا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ صرف اوقاتِ نماز میں آپ اپنے کمرے سے باہر تشریف لاتے اور نماز سے فراغت ہوتے ہی کمرے میں واپس چلے جاتے، اکثر اوقات کمرے کا دروازہ اندر سے بند رہتا تھا۔ ابتداءً دورانِ درس میں آپ نے چند کتب ورسائل تحریر فرمادیئے تھے بس وہی آپ کی علمی متروکات ہیں۔ اکثر کتابیں شائع ہوچکی ہیں لیکن اب نایاب ہیں، چند رسائل قلمی بھی ہیں، ان میں سے کچھ کتابیں اور قلمی رسائل مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود ہیں باقی بالکل مفقود ہیں۔

۱۔ حاشیہ برشرح ہدایۃ الحکمۃ للمیبذی (عربی) مولانا نے فارغ التحصیل ہونے کے

---

[1] مصباح المشائخ، حکیم ہادی رضا ماہر ص ۴۲

بعد ۱۳۰۲ھ میں یہ کتاب تحریر کی تھی جو بہت مقبول و مشہور رہوئی۔ پونے پانچ سو صفحات پر یہ کتاب مشتمل تھی۔ مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

۲۔ خیر النواہی عن ارتکاب الملاہی (اردو) ۴۴ اصفحات کا یہ رسالہ غنا کے متعلق ایک استفتار کا مدلّل جواب ہے جس میں آیات کریمہ واحادیث نبویہ وبراہین قطعیہ سے غنا کو حرام ثابت کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی بار تصویر عالم پریس لکھنؤ سے شائع ہوا پھر اس کے بعد متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

۳۔ الاغنار فی تحریم الغنار (اردو) اس رسالہ میں بھی آیات قرآنیہ سے حرمت غنا ثابت کی گئی ہے۔ یہ بھی تصویر عالم پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

۴۔ البیان الصائب فی تفسیر علم الغائب (عربی) اس رسالہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ علم غیب محض ذات پاک حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ۱۹۰۲ء میں مطبع مجتبائی لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۵۔ ابراز المکنون فی مبحث العلم بما کان و مایکون (عربی) اس میں مولانا نے محققانہ طور پر اس عقیدۂ فاسدہ کی پُر زور تردید کی ہے کہ حضرت ختم الانبیار صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع ماکان و مایکون کا علم حاصل تھا۔ مطبع مجتبائی لکھنؤ سے ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوا۔

۶۔ التحقیق المجتبیٰ فی غیب المصطفیٰ (عربی) یہ رسالہ اس استفتار کے جواب میں ہے جس میں آنحضرتؐ کے متعلق دریافت کیا گیا تھا کہ آپؐ کو عالم الغیب کہنا جائز ہے کہ نہیں۔ مولانا نے دلائل شرعیہ سے اس کا عدم جواز ثابت کیا ہے۔ مطبع نامی لکھنؤ سے دو بار شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ ازاحۃ الغیب فی مبحث علم الغیب (عربی) یہ رسالہ بھی مسئلہ علم الغیب سے متعلق ہے۔ مولانا مرحوم نے ۱۳۲۶ھ میں جبکہ وہ مکہ معظمہ میں مقیم تھے لکھا تھا جس کو علمار مکہ نے بھی بہت پسند کیا تھا۔ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کرکے اپنے پریس عمدۃ المطابع لکھنؤ سے ۱۳۲۵ھ میں شائع کیا تھا۔

اُس دَور میں اور آج بھی مسئلہ غنا اور مسئلہ علم غیب بڑے زور و شور سے زیر بحث رہا ہے۔ اس میں ایک گروہ نے یہاں تک تشدّد اختیار کر رکھا ہے کہ وہ اپنے مخالف گروہ کو مسلمان

ہی نہیں سمجھا۔ مولانا نے غنا کو حرام اور مسئلہ علم غیب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک محدود دائرے تک ہی ہونا ثابت کیا ہے۔

۸۔ التحقیقات الوثیقہ فی بعض ما یتعلق بالعقیقہ (عربی اردو) اس رسالہ میں عقیقہ کا تفصیلی ذکر ہے اور بتلایا گیا ہے کہ عقیقہ کا قیاس قربانی پر کرنا اصول کی رو سے صحیح نہیں ہے۔ اصح المطابع لکھنؤ سے ۱۳۴۲ھ میں شائع ہوا تھا۔

۹۔ فتویٰ نمازِ تہجد با جماعت در ماہِ رمضان (اردو) اس رسالہ میں رمضان المبارک میں نمازِ تہجد با جماعت ادا کرنے کو جائز ثابت کیا ہے اور آپ خود بھی اس پر عامل تھے۔ یہ رسالہ بھی چھپ چکا ہے۔

۱۰۔ نہایۃ الارشاد الیٰ احتفال المیلاد (عربی) ڈیڑھ سو صفحات کی اس کتاب میں عقلی و نقلی دلائل سے محفلِ میلاد اور اس میں قیام کو مستحب بتایا گیا ہے۔ ۱۳۴۷ھ میں الناظر پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کی یہ رائے ایک انفرادی رائے ہے۔ اس کے رد میں ایک رسالہ مولوی حکیم ظہور الدین احمد عیش سنبھلی نے کشف الافساد عما فی نہایۃ الارشاد کے نام سے ۱۹۳۱ء میں دہلی سے شائع کیا تھا جس میں رسالہ نہایۃ الارشاد کی سخت تنقید کی تھی مگر آپ کا لب ولہجہ نہایت سخت تھا۔ علمی اور دینی اختلاف کا حق ہر شخص کو ہے مگر کسی عالمِ دین کی تضحیک و تذلیل کسی طرح محمود نہیں قرار دی جا سکتی۔

۱۱۔ جواب دربارۂ جواز یا شیخ عبدالقادرؒ شیئاً للہ (اردو) مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۰ء

کچھ غیر مطبوعہ رسائل

مولانا مرحوم کے کچھ غیر مطبوعہ رسائل بھی ہیں جو مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں، ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں:

۱۲۔ نخبۃ المعارف فی تحریم الاغنیہ والمعارف (عربی) یہ رسالہ بھی حرمتِ غنا میں ہے اور مدرسہ فرقانیہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۳۔ جواب استفسار اذان خارج المسجد (عربی) یہ بھی مدرسہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۴۔ الاجوبۃ السدیدۃ والاسئلۃ العدیدۃ (عربی) یہ بھی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۵۔ جواب استفتاء در بارۂ لقاء حسن بصریؒ (اردو) محفوظ ہے۔

۱۶۔ جواب استفتاء در بارۂ مسئلہ علم غیب بذاتِ اقدس حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (اردو) محفوظ ہے۔

وفات مولانا مرحوم کی پوری زندگی اخفا میں گذری اسی طرح ان کی موت بھی بہت عرصہ تک عجیب و غریب معمہ بنی رہی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی موت کا سبب یہ ہوا کہ ایک ایرانی عالم سید اسد اللہ نجفی ان سے ملنے کے لئے آئے اور عربی میں کچھ اشعار جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہیں ان کو سنائے جن میں کچھ معرفت اور کچھ ترکِ دنیا کے مضمون سے متعلق تھے جن کو سنتے ہی مولانا پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور اسی عالم میں آپ کا وصال ہوگیا۔ لیکن لکھنؤ کے ثقہ اور باخبر حلقوں کی رائے اس سے مختلف ہے، وہ موت کا سبب یہ واقعہ نہیں بیان کرتے۔ اس سلسلہ میں ہم مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی رائے بیان کرتے ہیں جو مولانا مرحوم کے بہت ہی قریبی اور خصوصی شاگرد تھے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"۳ رجب یوم چہارشنبہ کو بعد نماز عصر حضرت مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ کئی سال سے حوالیٔ قلب میں درد کا دورہ ہوتا تھا جواب کچھ دنوں سے جلد جلد ہونے لگا تھا اور بعض اوقات تو دن رات کے چوبیسؔ گھنٹہ میں کسی وقت بھی یہ درد مفارقت نہ کرتا تھا۔"

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

"عوام میں عجائب پرستی کا مادّہ بوجہ جہل کے زیادہ ہے اس لئے عجیب اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ آخر وقت میں کچھ عجمی لوگ آگئے تھے انھوں نے حضرت مرحوم کے سامنے کچھ عربی کے اشعار یا کوئی عربی نثر کی عبارت پڑھی تھی۔ اس واقعہ کو ایسے طریقہ سے شہرت دی جارہی ہے کہ گویا سببِ موت یہی ہے (اس کے علاوہ) اور بھی اس قسم کی بہت سی باتیں مشہور کی جارہی رہیں۔"

مولانا لکھنویؒ کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ موت کا سببِ اصلی مرض تھا کوئی اور وجہ نہ تھی۔ بہرکیف ۳ رجب ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو مولانا سید علین القضاۃ صاحب کا ۶۸ سال کی عمر میں لکھنؤ میں وصال ہوگیا اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ چوک لکھنؤ کے چمن میں مدفون ہوئے۔

مولانا کے تلامذہ

مولانا کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے کیوں کہ آپ نے اپنی ساری زندگی درس وتدریس میں ہی گذاری۔ ہم یہاں صرف اُن شاگردوں کے نام لکھیں گے جو خود بھی صاحب تصنیف و تالیف ہوئے ہیں اور آج بھی ان کے ہزاروں شاگرد، مرید اور معتقد موجود ہیں

۱۔ امام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ سابق مدیر النجم لکھنؤ (م ۱۹۶۲ء)

۲۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلیؒ سابق مہتمم مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ۔

۳۔ شمس العلماء مولانا عبدالمجید صاحب فرنگی محلیؒ سابق پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ۔

۴۔ شمس العلماء مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلیؒ بانی مدرسہ قدیمیہ لکھنؤ۔

۵۔ مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلیؒ داماد حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ

۶۔ مولانا عبدالباقی صاحب فرنگی محلیؒ مہاجر مدنی۔

۷۔ مولوی عبدالہادی صاحب فرنگی محلیؒ نبیرہ ملا محمد مبین شارح سلّم و مسلّم

۸۔ مولوی عظمت اللہ صاحب فرنگی محلیؒ استاذ عربی گورنمنٹ کالج غازی پور

۹۔ حکیم خواجہ کمال الدین صاحبؒ

۱۰۔ مولوی محمد ضیاء الحق صاحبؒ نبیرہ مولانا احمد انوار الحق فرنگی محلیؒ

۱۱۔ مولانا شاہ محمد جان صاحب ادیب سابق مہتمم و مدرس اوّل مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ۔

۱۲۔ مولوی حافظ احمد صاحب بہاریؒ مہتمم مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ۔

۱۳۔ حکیم سید احمد حسن صاحبؒ

۱۴۔ حکیم مرزا محمد مہدی صاحب لکھنوی۔

۱۵۔ مولوی حکیم دہاج الحق صاحب فرنگی محلیؒ

۱۶۔ مولوی نجیب اللہ صاحب فرنگی محلیؒ ——— اور

۱۷۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی بھی آپ کے تلامذہ میں سے تھے جن کے متعلق اکبرالٰہ آبادی مرحوم نے کہا تھا ؎

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط
شہید جلوۂ معنیٰ عزیز ہی ہیں فقط

دوسری اور آخری قسط

از۔ مولانا اختر امام عادل۔ استاذ دارالعلوم حیدرآباد

مدارس اسلامیہ

کہفی منشور کی روشنی میں

مدارس اسلامیہ کہفی دفعات کے تناظر میں

اگر آپ قرآن کے ان تینوں دفعات کا جائزہ لیں اور پھر مدارس کے نظام ونصاب پر غور کریں تو دونوں کے درمیان کھلا توافق نظر آئے گا۔

پہلی دفعہ نظر بد سے حفاظت

(۱) سب سے پہلی دفعہ کا پس منظر وہ واقعہ ہے جس میں حضرت موسیٰ حضرت خضر کے رفیق سفر ہیں اور حضرت خضر اسی کشتی کو عیب دار کر دیتے ہیں جس نے ان کو دریا پار کرایا تھا، بظاہر یہ احسان کا بدلہ ظلم سے دینا تھا، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے فوراً اس پر اعتراض کیا اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شيئا امرا (کہف: ۷۱) کیا آپ نے کشتی میں اس لئے چھید کیا ہے کہ کشتی والوں کو غرق کر دیں، یہ تو آپ نے بڑی سخت چیز کر ڈالی۔

اگر اعتراض کرنے والا حضرت موسیٰ جیسا جلیل القدر پیغمبر، اور آشنائے رازِ الٰہی نہ ہوتا بلکہ کوئی عام آدمی ہوتا تو یقیناً حضرت خضر ایسے اعتراضات کی طرف متوجہ نہ ہوتے مگر اعتراض کرنے والا اللہ کا ایک برگزیدہ پیغمبر تھا اور انھی تکوینی رازوں کو سمجھنے کے لئے وہ ان کے پاس آیا تھا پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے اس عمل کی توجیہ سے پہلو تہی کرتے۔

حضرت خضرؑ نے یہ راز فاش کیا کہ میں نے یہ کشتی اس لئے عیب دار کر دی کہ یہ کشتی دریا میں چند محنت کش غریبوں کی تھی، اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی ذریعۂ آمدنی نہ تھا، اور چونکہ آگے ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر اچھی کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا اس لئے میں نے اس کو عیب زدہ کر دیا تاکہ یہ کشتی اس کی نظر بد سے محفوظ رہے اور اس کی طرف اس کو میلان نہ ہو

تاکہ ان غریبوں کو پریشانی نہ ہو اور یہ بیچارے محنت کرکے روزی حاصل کرتے رہیں۔

اس سے یہ زریں اصول نکلتا ہے کہ جب انسان ایسے حالات میں گھر جائے کہ اسکے کمالات اور علم و فن اس کے لئے باعث نقصان بن سکتے ہوں ان کی بنا پر مختلف خطرات پیدا ہوسکتے ہوں اور اس کے مطلوبہ مقاصد ادھورے رہ سکتے ہوں تو اس وقت اپنے پورے نقشۂ علم و فن اور لباس کمال پر ظاہری طور پر کوئی ایسا داغ لگا لینا چاہئے جس کی بنا پر لوگ اس کو ناقص اور عیب دار سمجھ کر یونہی چھوڑ دیں اور اس سے کوئی تعرض نہ کریں، اس طرح خطرات سے بچتے ہوئے وہ اپنی اس مطلوبہ منزل پر پہونچ جائے جس کیلئے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

مدارس پیش منظر میں اب ہمارے مدارس اسلامیہ کو دیکھئے۔ مدارس کا نصاب تعلیم جو مقرر کیا گیا وہ اندرونی طور پر خواہ کتنا ہی کامل و مکمل تھا اور قرآن، حدیث، فقہ، کلام، نحو، بلاغت، صرف، ادب، لغت، تاریخ، اصول وغیرہ تمام اسلامی مباحث کا احاطہ ہوگیا تھا، لیکن ظاہری طور پر پھر بھی ناقص تھا بلکہ نقائص سے بھرپور تھا اس میں عصری علوم و فنون، جدید تہذیب و تمدن، سائنس، جغرافیہ اور موجودہ زبانوں پر مشتمل کتابیں نہیں رکھی گئی تھیں، صاف بات ہے کہ اس نصاب کے فارغ طلبہ ان علوم سے بے بہرہ ہوں گے، پھر وہ اس ماڈرن ماحول میں دنیا کے اندر کیسے جی سکیں گے؟

مدارس کا رہن سہن دیکھئے تو نہایت سادہ اور معمولی، ٹوٹی چٹائیاں، بوسیدہ بوریئے پرانے ڈیسک اور تپائیاں اور مخدوش درسگاہیں، وہی درسگاہ بھی اور وہی رہائش گاہ بھی، کھانا بہت معمولی، لباس اور چہرے سے افلاس ٹپکتا ہوا، روشنی اور ہوا کا معقول نظم نہیں، کوئی ٹیپ ٹاپ نہیں، نہ چمن نہ پارک، نہ فوارہ، نہ خوبصورت ہوسٹل، نہ تفریح گاہ نہ کینٹین نہ میوزیم، نہ اخبارات اور ٹیلی ویژن کا انتظام، کچھ بھی تو نہیں، کھانا کے لئے لائن لگائے ہوئے طہارت کے لئے قطار میں کھڑے، غسل خانے پر نمبر لگا ہوا، ماڈرن دور کے لحاظ سے کتنے نقائص ہیں جو مدارس کے نظام میں موجود ہیں، ایسے ادارے سے نکلنے والے افراد دنیا میں کس کام کے ہوں گے؟ وہ اپنی زندگی کو کیا رخ دیں گے؟ ان کو کہاں ملازمت ملے گی؟ وہ اپنے

اہل وعیال، اور ماں باپ کے اخراجات کہاں سے پورے کریں گے؟ آخر اہل مدارس مسلمان بچوں پر اتنا ظلم کیوں کر رہے ہیں، وہ ان کو ناکارہ اور نکما بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ وہ اپنے نصاب کی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ وہ اپنے ذہن ودماغ میں جدت کی روشنی کیوں نہیں پیدا کرتے؟ وہ اس سائنٹفک ایجادات اور تیز رفتار تمدن کے دور میں صدیوں پرانے دقیانوسی ذہنیت کے حامل کیوں ہیں؟ وہ اپنی چہار دیواری سے باہر نکل کر دنیا کے حالات پر نگاہ کیوں نہیں ڈالتے، اور ان سے سبق لینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

یہ وہ چند اعتراضات ہیں جو مدارس کے متعلق جدید ذہنوں میں قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں، لیکن میں ان اعتراضات کو اسی طرح ظاہر بینی پر مبنی ایک اعتراض سمجھتا ہوں جس طرح حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضر کے کشتی چھید نے پر کیا تھا، مگر یہاں کوئی حضرت موسیٰ جیسا آشنائے راز نہیں، جس کے سامنے اپنے نصاب کے نقائص کے اسباب بیان کئے جائیں، اور جو کھلے ذہن سے اس کی حقیقی لم کو سمجھ بھی سکے۔

ان کو کیا معلوم کہ یہاں جان بوجھ کر نصاب تعلیم اور نظام زندگی میں نقائص پیدا کئے گئے ہیں اور اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ دشمن کی نگاہ بد اس پر نہ پڑے، وہ مدارس کی تعلیم کو اپنے لئے کوئی خطرہ نہ سمجھیں، وہ ان کو بے ضرر چیز سمجھ کر ان کی طرف توجہ ہی نہ کریں اور نہ یہاں کے پڑھے ہوئے لوگوں کو کسی کام کا سمجھ کر ان سے اپنی خدمات لینے کی کوشش کریں، وہ بجا طور پر یہاں سے نکلنے والے فضلاء کو نکما وناکارہ سمجھیں اور اپنے دفتروں میں کوئی چھوٹا بڑا عہدہ نہ دیں بلکہ ان فضلاء میں سے کوئی بزدلانہ جذبے سے متأثر ہو کر کافرانہ نظام سے درخواست بھی کردے تو وہ اس کو مسترد کردیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان مدارس کے فضلاء دین ومذہب کے سوا کسی کام کے نہ رہیں گے، اور پھر وہ چار وناچار دین کی اشاعت اور مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کریں گے، اس طرح دین کے حاملین ہر دور میں باقی رہیں گے، دین کو جیسی قربانیاں دینے والوں کی ضرورت ہے وہ اس کو ہمہ وقت میسر رہیں گے اور ان کی تمامتر محنتوں کا رخ دین ہی کی طرف ہوگا اور ان کا ہر قدم دین ہی کے لئے اٹھے گا اس کے نتیجے میں مدارس کا وہ کھویا منشور پورا ہوگا جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے یہ مدارس کھولے گئے ہیں۔

تبدیلی نصاب کے نتائج

ورنہ جو لوگ اصلاح نصاب کی بات کرتے ہیں ان کے مطابق اگر مدارس کے نصاب میں تمام عصری علوم و فنون داخل کر دیئے جائیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ مدارس باقی رہیں گے اور اپنے مقاصد کو پاسکیں گے ہرگز نہیں یا تو ان کو بند ہو جانا پڑے گا؟ ظلم و ستم کا ہاتھ ان کی جانب بالیقین دراز ہوگا اور بزور ان پر قفل چڑھا دیا جائے گا، یا ان کی ہیئت کذائیہ ایسی بنادی جائے گی اور ان کا گلا اس طرح گھونٹ دیا جائے گا کہ ان کے اندر صدائے لا الٰہ الا اللہ کی گونج نہیں آسکتی۔ مدارس کا نام اور ڈھانچہ رہ جائے گا مگر اندر روح کچھ بھی نہ ہوگی وہ حقیقت میں بے جان ہوں گے، اگر آپ کو یقین نہ آتا ہو تو بہار کے بورڈ کے مدارس کو دیکھ آیئے، وہاں مدارس کی تڑپتی ہوئی لاشوں کا اندوہناک منظر آپ کو صاف نظر آجائے گا اور کفر کا دلخراش قہقہہ بھی سننے کو ملیگا۔

اس وقت ہمارے اسلامی اداروں سے محدث و فقیہ کے بجائے گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ پیدا ہوں گے، اور معمار قوم اور خادم ملت کی جگہ غدار قوم اور سفاک ملت جنم لیں گے، پھر یہاں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند نہیں ہوں گی بلکہ ہیگل، مارکس، نیوٹن، گوئٹے اور لینن کے ناپاک انسانوں کی دھوم مچی ہوگی، اور جو زبانیں اسلام اور پیغمبر اسلام کے دفاع میں کھل سکتی تھیں اس وقت خود انھی زبانوں سے اسلام اور مسلمانوں کے محبوب پیغمبر پر اعتراضات کی بوچھار ہو رہی ہوگی، پھر دین کی کوئی ضمانت نہ ہوگی، اس لئے کہ دین کے محافظ اب گاؤں کی ٹوٹی مسجدوں اور بوسیدہ مکتبوں کے بجائے مرکزی یا ریاستی دار الحکومت کی اسمبلیوں اور کونسلوں میں ہوں گے، مسجد کی امامت پر وہ کرسیٔ وزارت کو ترجیح دیں گے وہ بدحال مسلمانوں کو چھوڑ کر خوش حال غیر مسلم افسروں، امیروں اور لیڈروں سے ملکر فخر محسوس کرینگے یہ وہ قدرتی نتائج ہیں جو نصاب کو بدلنے کے بعد پیدا ہوں گے، کون سا باضمیر مسلمان ہوگا، جو مسلمان رہتے ہوئے ان نتائج کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگا؟ پھر کبھی دور کے کسی بھی مقصد کی تکمیل کب ہوگی؟ اور دین اسلام اور ملت اسلامیہ اپنے مخلص خادموں سے محروم رہ جائے گی؟ کون نہیں جانتا کہ اسلام اور مسلمانوں بلکہ پورے ملک کو جو فائدہ اس ناقص نصاب کے پڑھے ہوئے فضلاء حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، حضرت

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مجاہد حریت حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور بانی جماعت تبلیغ حضرت مولانا الیاس صاحب وغیرہ علماء سے پہونچا ہے، وہ کسی بہتر سے بہتر اور جدید سے جدید نصاب سے پڑھے ہوئے فاضل سے نہیں پہونچا، وہ کون تھا جو ملک و قوم کے لئے ہندوستان سے عرب افغانستان اور ترکی کی خاک چھان رہا تھا، اور مالٹا میں قید بامشقت کی صعوبتیں جھیل رہا تھا وہ کس کا جگر تھا جو انگریز کی عدالت میں سربکفن پہونچا تھا؟ اور مسلمانوں کا مقدمہ اٹھا رہا تھا، وہ کس کی زبان تھی جو ننگی تلوار بن کر دشمنوں کے سروں پر گرتی تھی؟ اور وہ کون تھا جن کی صدائے لاہوتی اور لحن داؤدی نے پوری دنیا کو ایک ہی دھن میں مست کر دیا؟ جس نے توحید و تبلیغ کے خم کے خم انسانیت کو پلانے شروع کئے، جس نے امریکہ و لندن کے گھپ اندھیروں میں اسلام کے چراغ روشن کئے، یہ سارے لوگ انھی ناقص نصاب و نظام والے مدارس سے نکلے ہوئے افراد تھے ؎

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب نازمیں

دوسری دفعہ تعمیر افراد دوسری دفعہ قرآن کے جس واقعہ سے ماخوذ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے اسی سفر میں ایک بچہ سے ملاقات ہوئی تو حضرت خضرؑ نے اس کو قتل کر دیا، ظاہری طور پر یہ یقیناً وحشیانہ حرکت تھی، حضرت موسیٰؑ نے ان کے اس عمل پر بھی اعتراض کیا اقتلت نفساً زکیۃ بغیر نفس ط لقد جئت شیئاً نکرا (کہف ۷۴) کیا آپ نے ایک معصوم جان کو مار ڈالا، حالانکہ اس نے کسی کا خون نہیں کیا تھا، یہ تو آپ نے ایک نامعقول بات کی۔

حضرت خضرؑ نے تشریع سے الگ ہو کر تکوینی نظام کے قانون کے تحت جواب دیا (آیت پہلے نقل کی جا چکی ہے) کہ شرعی قانون کے تحت اگرچہ لڑکے کا قتل روا نہ تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے والدین پکے مومن ہیں، مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر اپنی سرکشی اور کفر سے ان کو تنگ اور پریشان کرے گا اس لئے ہم نے چاہا کہ اس کا خاتمہ کر کے اس کے بدلے کوئی بہتر اور صالح لڑکا اسکے والدین کو دے دیا جائے جو اپنی طبعی سلامتی و شرافت، اور قلبی طہارت و پاکیزگی رکھنے کے ساتھ، قرابتوں اور رشتہ داریوں کی نزاکتیں سمجھنے والا بھی ہو، اور جو والدین کو تنگ کرنے

کے بجائے ان کا پاس ولحاظ اور احترام واکرام کرنا جانتا ہو۔

اس واقعہ سے یہ قیمتی ضابطہ نکلتا ہے کہ کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے صالح عناصر کی تعمیر اشد ضروری ہے، قرآن کی نگاہ میں اگر اپنا بیٹا بھی صالحیت کی نعمت سے محروم ہو تو وہ گردن زدنی کے لائق ہے۔ اور گویا وہ بیٹا ہے ہی نہیں، حضرت نوحؑ کے مکالمۂ رب سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے، انسان کی کوشش یہ رہنی چاہئے کہ اس کی تربیت گاہ سے ہمیشہ ایسے افراد تیار ہوں جو دین وایمان کے صالح جذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ اعزار واقربار کی قرابتوں کا بھی لحاظ کرنے والے ہوں جو تعلقات کو توڑنے کے بجائے جوڑنا جانتے ہوں جو

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

کے صحیح مصداق ہوں، جن کی آواز سے نئے فتنے ابھرنے کی جگہ پرانے فتنوں کے شعلے بھی ٹھنڈے پڑجاتے ہوں جو حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے مفہوم سے آگاہ ہوں، جو اپنے پہلو میں نرم و نازک اور رقت آمیز دل رکھتے ہوئے بھی پہاڑوں سے ٹکرا جانے، اور طوفانوں سے لڑجانے کا عزم وحوصلہ رکھتے ہوں، جو منبر ومحراب کو رونق بخشنے کے ساتھ ساتھ میدان جنگ میں بھی شجاعت وحرارت کی نئی لہریں دوڑا دینے کا گر جانتے ہوں اور جو اپنوں کے لئے پھول اور غیروں کے لئے شعلۂ جہاں سوز بننا جانتے ہوں، جب تک ایسے افراد، اور رجال کار دانشکدوں اور تربیت گاہوں سے نہ نکلیں گے، اس وقت تک نہ تحریک کے منصوبے پورے ہوں گے، اور نہ دین وایمان کا تحفظ آسان ہوگا۔

اس روشنی میں آپ مدارس کا جائزہ لیجئے۔ مدارس سے پڑھ کر جو طلبہ نکلتے ہیں ان سے بڑھ کر طہارت قلبی کا حامل کون ہوسکتا ہے؟ جنھوں نے آٹھ سال تک ریاضت ومجاہدے کی زندگی گذاری ہو، سوکھی روٹیاں اور پتلی دال پر اپنے قیمتی دن کاٹے ہوں اگر کسی کے پاس چشم بینا ہو تو جھانکر دیکھے کہ ان طلبہ اور علمار کو اللہ نے جس شرافت نفس اور غیرت حمیت سے نوازا ہے اس کا عشر عشیر بھی دنیا کی کسی قوم کے پاس موجود ہے؟ ؎

قہاری وجباری وقدوسی وجبروت ؛ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

والدین کا احترام، اور قرابتوں کا پاس ولحاظ کرنے میں بھی کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، یہ اپنی معمولی کمائی پر بھی اپنے والدین اور رشتہ داروں کو فراموش نہیں کرتے، بیوی کا غلام بن کر نہیں رہ جاتے بلکہ ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ شریعت نے والدین، بیوی اور رشتہ داروں کے جو حقوق مقرر کئے ہیں اپنی اسی تھوڑی سی آمدنی میں ان حقوق کو پورے کریں، اقرب رحماء کی عملی تفسیر مدارس کے طلبہ وعلماء سے بہتر کسی اور جگہ ملنی مشکل ہے اگر ہمارے بعض فضلاء کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول سے متاثر ہو کر والدین اور اقرباء کا لحاظ ء رکھ رہے ہوں تو یہ شاذ و نادر واقعات ہیں جو فیصلے کا مدار نہیں بن سکتے، ہم جو باتیں کر رہے ہیں ان کا تعلق عمومیت سے ہے، جب کہ دوسری طرف عمومیت کا حال یہ ہے کہ شادی ہوتے ہی والدین کو بھول جاتے ہیں اور دوسری قرابتوں کا تو پوچھنا ہی کیا؟ الّا ماشاء اللہ، اگر کوئی اس اندھیرے میں بھی قرابت ومحبت کے دیئے جلا رہا ہو تو اس سے ہمیں انکار نہیں، مگر اکثریتی نقطۂ نگاہ سے جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو (قرب رحما) کا جو عملی نقشہ کہنی مدارس کے طلبہ میں نظر آتا ہے وہ کہیں اور مشکل سے دکھائی پڑتا ہے۔

اور ایسا کیوں نہ ہو؟ ان مدارس کی بنیاد ہی اس کہنی آئین پر ہے جس میں طہارت، پاس قرابت کا درس سکھانے کے ساتھ ساتھ تحمل ودیانت کا وعظ بھی جاری ہے اس لئے حالات سے نمٹنے مشکلات کو سہنے اور لوگوں کے درمیان اجتماعی معاملات کو برتنے میں جس قدر مہارت مدارس اسلامیہ کے فضلاء کو ہوتی ہے، وہ کسی دوسری جگہ کم ہی نظر آتی ہے۔

مدارس کے اکاد کا واقعات پر نہ جائیے واقعات عالم کے تناظر میں مدارس کو دیکھئے تو مدارس کا ماحول بہت غنیمت دکھائی دیگا، یہاں یہ نہیں سکھایا جاتا کہ والدین نے ہمیں ولادت کی منزل تک پہونچا کر ہم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ ایک فطری عمل پورا کیا ہے اس لئے ہم ان کے احکام وہدایات کے پابند نہیں اور ان کے اور ہمارے راستے مختلف ہیں، بلکہ یہاں کا اساسی درس یہ ہے کہ خدا کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ تم پر احسان والدین ہی کا ہے، تم ان کے احسانات کا ہزار بہتر سلوک کرکے بھی بدلہ نہیں چکا سکتے اس لئے تم ان کے ناز وانداز سہنے کے پابند ہو اور ان کے غم اور مشکلات میں شریک ہونے کا تم کو حکم دیا جاتا ہے

ورسن لو کر لا تقل لھما اف ولا تنھرھما الآیہ ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، بلکہ وصاحبھما فی الدنیا معروفا الآیہ اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرو ۔ کیا ایسی پاکیزہ تعلیمات کسی اور دانشگاہ سے بھی دی جاتی ہے، ہرگز نہیں۔

دیکھ آئے ہم بھی یاروں کا نگر

بس فقط پرچھائیاں، پرچھائیاں، پرچھائیاں

یہ خالص کہفی مدارس کی تعلیم و تربیت ہے جس کے نمونے دیکھنے ہوں تو ہمارے ماضی وحال کے واقعات پڑھیے یقین آجائے گا کہ کہفی دانشگاہیں اس وقت کی کیسی اہم ترین ضرورت ہیں

تیسری دفعہ جذبۂ ایثار کے ساتھ مقصد کی تکمیل

اب ہم تیسری دفعہ پر نگاہ ڈالتے ہیں، یہ دفعہ سورۂ کہف کے جس واقعہ سے لی گئی ہے وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ حضرت موسیٰ حضرت خضر کی رفاقت میں ایک گاؤں میں پہونچے وہاں ان دونوں حضرات کو شدید بھوک کا احساس ہوا، چاہا کہ بستی والے ان کو مہمان بنا کر کھانا کھلائیں مگر بدبختوں نے کھانا کھلانے سے انکار کر دیا ۔ پھر ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی حضرت خضر نے اہل بستی کے ناخوشگوار سلوک کے بعد بھی یہ گرتی ہوئی دیوار سیدھی کر دی اور اس پر کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کیا ـــ ظاہری قانون کے لحاظ سے ان بداخلاقوں کے ساتھ حضرت خضر کو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا برائی کا بدلہ اسی کے مانند برائی ہے ۔ کا سلوک کرنا چاہیے نہ کہ ان پر احسان کرنا چاہیے اگر وہ اتنے ہی باضمیر ہوتے تو دو بھوکے اجنبیوں کو مہمان بنانے سے انکار نہ کرتے یہ جانیکہ ان دونوں نے خود خواہش کا اظہار بھی کیا ہو، ایسے پتھر دل انسانوں پر احسان کر کے کیا توقع قائم کی جاسکتی تھی؟ اسی ظاہری صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت موسیٰ نے تیسری بار حضرت خضر پر اعتراض جڑ دیا قال لو شئت لتخذت علیہ اجرا (کہف/۷۷) حضرت موسیٰ نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے۔

حضرت خضر نے جواب میں اپنے عمل کی توجیہ یہ فرمائی کہ دراصل یہ دیوار جو گرا چاہتی تھی شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور ان کے نیچے ان کا خزانہ مدفون تھا میں چاہتا تھا کہ ان بچوں کے لئے یہ کنز محفوظ رہے اور جب وہ حد شعور کو پہونچیں تو ان کو صحیح سالم یہ مل جائے، اس لئے میں نے یہ

دیوار سیدھی کردی ۔ تو میرے نیک عمل کا ہدف بستی والے نہ تھے کہ میں مورد اعتراض بنتا، بلکہ میرے نیک سلوک کا مقصد بس ان دونوں یتیموں کے ساتھ ہمدردی اور اس مدفون کنز کی حفاظت تھی، جس کے لئے میں خدا کی جانب سے مامور ہوں۔

اس واقعہ سے جو سنہرا ضابطہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کی تکمیل کیلئے اگر کچھ ظاہری نقصانات بھی اٹھانے پڑیں تو نقصان برداشت کرکے مقصد کو منزل سے ہم کنار کئے بغیر دم نہیں لینا چاہئے، اور اگر کوئی امانت انسان کے سپرد کی گئی ہو تو اس کی حفاظت جان جوکھوں میں ڈال کر بھی کرنی چاہئے۔

کون تھا معمار قوم؟

اس واقعہ اور اس سے نکلنے والے اصول کی روشنی میں کبھی مدارس پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عین اس وقت جبکہ ملک پر مغربیت کی یلغار ہو رہی تھی، یوروپی تہذیب طاعون کی طرح ملک میں پھیل رہی تھی، شیطانی لشکر کا جتھہ کا جتھہ سات سمندر پار کرکے ہندوستان کی بندرگاہوں پر اتر رہا تھا اسلام کے خلاف عسکری ہتھیاروں کے استعمال کے ساتھ فکر و نظر کے تیر بھی چھوڑے جارہے تھے ہر اسلامی عقیدہ و حکم کو مشکوک اور ناقابل اعتماد بنانے کی کوششیں جاری تھیں، اسلامی سلطنت واقتدار کے ستون اکھڑ چکے تھے، مسلمانوں کی عظمتیں قصہ پارینہ بن چکی تھیں اور ہمارے محلات غیروں کی تحویل میں جاچکے تھے۔ بس ایک مسلمانوں کی اجتماعیت و تنظیم کی کمزور دیوار رہ گئی تھی جو وہ بھی گرا چاہتی تھی اور انتشار وافتراق کے شدید جھونکوں کی زد میں تھی اس وقت اس گرتی ہوئی دیوار کو کس کے ہاتھوں نے گرنے سے بچایا؟ اس دیوار کے تلے مدفون خزانے (دین و ایمان) کی کس نے بلا معاوضہ، خالصۃً للہ حفاظت کی؟ ایمانی اعتبار سے کس نے مسلمانوں کو اپنی نسل کشی سے باز رکھا؟ اور ظاہری تمام نقصانات کو اٹھاتے اور برادران وطن کی ہر قسم کی ستم ظریفیوں کو سہتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعی دیوار کو کبھی قلعوں کا سہارا دیا؟ بلاشبہ یہ انھی کبھی مدارس سے پڑھ کر نکلنے والے فضلاء تھے جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی اس ہندوستان میں ایسے آڑے وقت میں حفاظت کی ورنہ کتنے سینے تھے جو ٹوٹ چکے تھے، کتنے دل تھے؟ جو پاش پاش ہو چکے تھے کتنے ہی مضبوط بازو تھے جو شل ہوگئے تھے، کتنی ہی تیر بار نگاہیں تھیں جو مغرب کی چکا چوند تہذیب

کے آگے پتھرا گئی تھیں، کتنی عقلیں تھیں جو حیران تھیں اور کتنے ہی حوصلہ مند بہادر تھے جن کی لاشیں بے گور و کفن سنسان راہوں پر پرندوں اور درندوں کی خوراک بہم پہونچا رہی تھیں کیونکہ انھوں نے جنگ و جہاد ضرور کیا شجاعت و بہادری کے جوہر بھی دکھائے اور جذبۂ صادق سے سرشار دشمنوں کو چیرتے ہوئے گذر بھی گئے مگر وہ کھلی فضا میں تھے آندھیاں تیز چل رہی تھیں مگر ان کے لئے کوئی آڑ نہ تھی اور طوفان شدت اختیار کئے ہوئے تھا، لیکن ان کیلئے کوئی کمین گاہ نہ تھی، نتیجہ وہی ہوا جو ہر ایسے موقعہ پر ہوتا آیا ہے، آندھیاں ان بلند حوصلہ، اور خوش نصیب سورماؤں کو اڑا لے گئیں، اور وہ سرکش ہواؤں کی دوش پر اڑتے ہوئے نامعلوم اندھیریوں میں گم ہو گئے ؎

چراغ اپنی وفا کے بھی کم نہ تھے لیکن
اندھیری شب میں چمکتے چلے گئے وہ بھی

اس کے برخلاف کہفی دانشگاہوں سے نکلنے والے مجاہدین بھی حالات سے نبرد آزما ہوتے وقت کی گردشوں کا مقابلہ کیا اور طوفان سے برسرپیکار ہوئے مگر تیز طوفان اور شدید آندھیاں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اس لئے کہ ان کی پشت پر کہفی مدارس کے زبردست دفاعی قلعے تھے اور اسلامی دانشگاہوں کی مضبوط کمین گاہیں موجود تھیں، جن کی آڑ میں وہ اپنی حفاظت بھی کر رہے تھے اور مقابلہ کے لئے آگے بھی بڑھ رہے تھے، آخر کار سفید فتنے کی آگ فرد ہو گئی اور وہ سات سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب گئی، لیکن لوگوں کو کیا معلوم کہ امت کی گرتی ہوئی دیوار کو بچانے کے لئے انھوں نے اپنے کتنے ظاہری نقصانات وخطرات مول لئے تھے؟ اور اپنے نفس کی تمام خواہشات کی کیسی قربانیاں دی تھیں؟ اگر اندازہ کرنا ہو تو تاریخ آزادی یا تاریخ دیوبند کے واقعات پڑھئے اس میں آپ کو علماء وفضلاء کے ایثار وقربانی، ریاضت ومجاہدہ، اور نقصانات وخطرات کو برداشت کرنے کے انمول نمونے مل جائیں گے، میں مثال کے لئے دو واقعہ ذکر کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے کہ۔

حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ ہی کو میں نے دیکھا ہے کہ جب دیوبند میں حدیث کا درس بغیر کسی تنخواہ کے وہ برسوں دے رہے تھے اسی زمانہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت ہزار روپے ماہوار تنخواہ کے ساتھ پیش ہوئی لیکن یہی نہیں کہ خاموشی کے

ساتھ انھوں نے اس کو مسترد کردیا بلکہ زمانہ تک خود مدرسہ کے ارکین کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔

حضرت شیخ الہند کے متعلق کون باور کرے گا کہ ماہوارہ پچھتر روپے ان کے نام سے جو درج تھے ان میں سے کل پچاس روپے بمد چندہ مدرسہ کو واپس فرمادیتے تھے اور اسی پچاس میں مسرت ونشاط کی قابلِ رشک زندگی تقریباً نصف صدی تک برداشت کرتے رہے۔

کوئی چاہے تو طویل فہرست دیوار کے ان معماروں کی تیار کرسکتا ہے جنھوں نے مسلمانوں کے صالح اسلاف کے موروثی ترکہ کو آئندہ نسلوں تک بغیر کسی معاوضہ یا قلیل ترین معاوضہ کے پہونچانے کا انتظام کیا، نوراللہ

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ضروری اعلان

محترم قارئین حضرات !

بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے "الاحسان نمبر" جو ماہ رمضان وشوال میں شائع ہونا تھا، اب شوال و ذی قعدہ میں شائع ہوگا۔ قارئین نوٹ فرمالیں

منیجر

اقلیت کا سیاسی تجزیہ

مولانا ابوالکلام آزاد

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہئے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتباروں سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے، اس حیثیت کے تصور کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے، ساتھ ہی اس میں تعداد ([illegible]) کیساتھ نوعیت ([illegible]) کا سوال بھی کام کرتا ہے، فرض کیجئے ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے کی دو کروڑ ہے، اب اگرچہ ایک کروڑ، دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لئے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل ([illegible]) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح

معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے، اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے، بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی، لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے، کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کیلئے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کرسکے گی؟

" میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری راہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (FACTOR) ہوں میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔

ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہوچکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے، ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا، اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی، ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا، یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا، اور ہمیشہ کے لئے بس گیا، یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے معادل

کا ملاپ تھا یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا، ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

• ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے، ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی، ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گذر چکی ہیں اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اسکے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے، ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو، ہماری بولیاں الگ الگ تھیں مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگ گئے، ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا، یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی، ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔

احادیث نبوی اور قرآن کریم کی روشنی میں

اہم مشورے

محمد قمرالدین قمر رام نگری

خزاں کو چاہو اگر موسم بہار کرو — خدا سے اپنے تعلق کو استوار کرو

عمل جو نیک ہیں اب انکو اختیار کرو — بدی کے کاموں سے خود کو نہ شرمسار کرو

تمھارے حال پہ خود ہی خدا کو رحم آجائے — کرو دعائیں لجاجت سے بار بار کرو

گذار و رب کی اطاعت میں زندگی اپنی — قبائے زیست عبث یوں نہ تار تار کرو

جو ہو چکے ہیں گنہ ان سے تم کرو توبہ — نہ اب گناہوں سے دامن کو داغدار کرو

ہے راہ قرآں کی سارے جہان سے بہتر — اب اس پہ چلنے کی تم سعی صد ہزار کرو

خدا کا خوف گناہوں کی ڈھال بن جائے — شعارِ زیست کو تقویٰ سے ہم کنار کرو

یہی ہے راہِ ہدایت یہی ہے راہِ فلاح — رسولِ پاک کی سنت کو اختیار کرو

نہیں گر آج تو کل ہوگی رحمتِ رب بھی — نزولِ رحمت و نصرت کا انتظار کرو

خدا جو روٹھ گیا ہے اسے منانا ہے — پڑھو نمازیں پڑھو توبہ بار بار کرو

جہاں میں پھیلا ہے اسلام خُلقِ حسنہ سے — بھلا جو چاہو اسے تم بھی اختیار کرو

یہی ہے سنتِ نبوی شعارِ مصطفوی — کہ دشمنوں سے بھی تم اپنے پریم پیار کرو

قیام امن و اماں ہو تمھارا نصب العین — نہ تم فساد کرو اور نہ لوٹ مار کرو

نہ مشتعل ہو نہ لو اشتعال سے تم کام — سنی سنائی خبر پر نہ اعتبار کرو

کسی پہ ڈھاؤ نہ ظلم و ستم خدا سے ڈرو — نہ گھر جلاؤ کسی کا نہ اتیا چار کرو

وقار و صبر و تحمل ہے شیوہ سوہن — نہ بے قرار ہو خود اور نہ بے قرار کرو

جو بے قصور تمھیں کوئی مارنے آئے — لگاؤ نعرۂ تکبیر بڑھ کے وار کرو

نہیں ہے مومنِ صادق کا بزدلی شیوہ — بہادری سے لڑو اور جاں نثار کرو

جو کامیابی ملے گی تو نصرتِ رب سے — کبھی نہ قوت بازو پہ انحصار کرو

ہے تم پہ کہ پہونچاؤ دین غیروں تک

قمر اب اسکے لئے مال و زر نثار کرو

مسجد جدید دارالعلوم دیوبند

جو اپنی تکمیل کیلئے اہل خیر حضرات کی توجہات کی منتظر ہے

دارالعلوم دیوبند کے ہمدردان و معاونین حضرات کو جیسا کہ معلوم ہے کہ تقریباً چار سال ہوئے طلبہ کی کثرت تعداد کی بنا پر دارالعلوم میں ایک بڑی جدید مسجد کا کام اللہ تعالیٰ کے فضل پر توکل کرتے ہوئے دارالعلوم سے متصل ایک آراضی خرید کر شروع کر دیا تھا۔

الحمد للہ مسجد کا تعمیری کام بہت آگے بڑھ گیا ہے، اور اس وقت فضل خداوندی اور اہل خیر حضرات کی توجہ سے تیسری منزل پر تعمیری کام جاری ہے، اس مسجد سے طلبار دارالعلوم اور دیگر مسلمانوں کے لئے ایک وقت میں مسقف (چھت والے) حصہ میں جہاں چار ہزار نمازیوں کیلئے جگہ ہو جائے گی وہیں اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی طرف سے ایک صدقۂ جاریہ ہوگا اور وہ انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کیلئے مسجد تعمیر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر عطا فرمائیں گے

تعمیری کام جاری رکھنے کیلئے اس وقت سرمایہ کی شدید ضرورت ہے

اسلئے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس مسجد کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ یہ مسجد دارالعلوم کے شایان شان جلد تعمیر ہو سکے۔

پتہ:

ڈرافٹ و چیک کیلئے: "دارالعلوم دیوبند" اکاونٹ نمبر 30076
اسٹیٹ بنک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کیلئے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۲۴۷۵۵۴ پن

باسمہ تعالیٰ

اشاعت خصوصی

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

نگران: حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم

مدیر: مولانا حبیب الرحمن قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

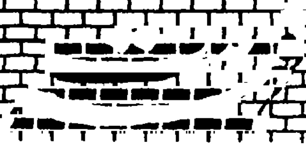
ماہ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ مطابق اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء ☆ قیمت شمارہ ہذا =/۲۵

جلد ۷۸
شمارہ ۴ و ۵، ۶

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۵۰ روپے
پاکستان میں " -/۱۰۰ "
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم " -/۸۰ "

سالانہ
-/۶۰ روپے
فی شمارہ -/۶

Regd. No. SHN. L. 13 N.P.



شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی	۳
۲	تصوف ایک تعارف	" اعجاز احمد اعظمی مدرس شیخ العلوم شیخو پورہ اعظم گڈھ	۸
۳	صوفیت ایک تعارف	" اختر امام عادل، دارالعلوم حیدرآباد	۶۲
۴	سلفی تصوف کتاب و سنت کی روشنی میں	" صبغۃ اللہ صاحب بختیاری	۹۲
۵	احسان وسلوک میں حضرت مدنی کا مقام رفیع	" زاہد الحسینی صاحب پاکستان	۱۳۱
۶	باطن کی پاکیزگی اور اسکے اثرات	" مفتی ظفیرالدین صاحب مفتاحی	۱۶۲
۷	سماع، صوفیاء کرام کی نظر میں	" مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی	۱۶۹
۸	تصوف اور صوفیاء کا مقصد حیات	پروفیسر خلیق نظامی صاحب	۱۸۷
۹	بیعت کا مقصد	" "	۱۹۰
۱۰	ہندوستان کے قدیم اولیاء مشائخ	مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری	۱۹۳
۱۱	حضرت خواجہ معین الدین اجمیری تاریخ کی روشنی میں	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۲۱۸

ختم خریداری کی اطلاع

ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اسلئے وی پی نہیں کی جائے گی

پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤ والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں

ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداران کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے

منیجر



مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

احسان یا بالفاظ متعارف تصوف کیا ہے؟ انسانی روح کا اپنے مطلوب حقیقی سے ملنے کا شدید اشتیاق ہے، تصوف کیا ہے؟ اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال، شریعت اسلامی اس کی اساس اور قرآن و حدیث اس کا سرچشمہ، چنانچہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی کا بڑے واضح الفاظ میں اعلان ہے کہ:

"ایں راہ کسے یابد کہ کتاب بر دست راست گرفتہ باشد و سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بر دست چپ و در روشنائی ایں دو شمع می رود تا نہ در مغاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت"

اس راہ کو وہی پا سکتا ہے جو کتاب اللہ کو داہنے ہاتھ میں اور سنت رسول کو بائیں ہاتھ میں لئے ہو اور ان دونوں چراغوں کی روشنی میں راہ سلوک طے کرے تاکہ گمراہی اور بدعت کی تاریکی میں نہ گرے

حضرت سہل بن عبداللہ تستری جو متقدمین صوفیاء میں امتیازی مقام و مرتبہ کے حامل تھے فرماتے ہیں "اصولنا سبعۃ اشیاء التمسک بکتاب اللہ والاقتداء بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واکل الحلال وکف الاذی واجتناب المعاصی والتوبۃ واداء الحقوق (التاج المکلل) ہمارے سات اصول ہیں کتاب اللہ پر مکمل عمل، سنت رسول کی پیروی، اپنی

ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہونچنے دینا، گناہوں سے بچنا، توبہ واستغفار، اور حقوق کی ادائیگی۔

سلطان الہند شیخ معین الدین اجمیری رہ کا یہ مقولہ تاریخ اجمیر میں درج ہے۔

: اے لوگو تم میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ترک کرے گا وہ شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم رہے گا۔

حضرت میر سید اشرف سمنانی مدفون کچھوچھا ضلع فیض آباد فرماتے ہیں؛

یکے از اہم شرائط ولی است کہ تابع رسول علیہ السلام قولاً و فعلاً و اعتقاداً بود (لطائف اشرفی)

ولی کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے قول، فعل اور اعتقاد میں پیرو ہو

تصوف دراصل وہ رہنما ہے جو سالک کو ہر آن باخبر رکھتا ہے کہ دیکھنا کہیں مقصود نگاہ سے اوجھل نہ ہو جائے وہ ہدایت کرتا ہے کہ جب تو بارگاہ خداوندی میں نماز کے لئے کھڑا ہو اور یہ دیکھے کہ قبلہ رو ہے یا نہیں، جائے نماز اور کپڑے پاک ہیں یا نہیں، تو اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھ کہ تیرا تصور پاک ہے یا نہیں، دل مالک کائنات کی طرف ہے یا نہیں، غرض تصوف ہر ہر قدم پر سالک کو خبردار رکھتا ہے کہ مقصود اصلی خدائے ذوالجلال والاکرام کے خیال سے دل غافل نہ ہونے پائے۔ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے تلامذہ نے ان سے سوال کیا کہ آپ بشر حافی رہ کے پاس کیوں جاتے ہیں وہ تو عالم و محدث نہیں ہیں؟ تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے واقف ہوں مگر بشر اللہ سے واقف ہیں عارف ہندی اکبر الہ آبادی مرحوم نے بہت خوب کہا ہے۔

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت ÷ اللہ رہے پیش نظر یہ ہے طریقت

اس حقیقت کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فقیہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ اے بندے اللہ کا نام لے، اور صوفی بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ کا نام لے مگر اس طرح کہ وہ تیرے دل میں اتر جائے، یعنی صوفی کا منشا یہ ہے کہ صرف زبان سے اللہ کا نام لینا کافی نہیں ہے، زبان کے ساتھ تیرا دل بھی ذاکر ہونا چاہئے حاصل کلام یہ نکلا کہ تصوف یا احسان دل کی نگہبانی کا اصطلاحی نام ہے، حدیث جبرئیل میں "ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" کا جملہ اسی دل کی نگہبانی کی تعلیم اور پیغمبرانہ تعبیر ہے۔ امام العرفا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر جملے سے

احسان یا تصوف کی پوری حقیقت بیان فرمادی ہے کیونکہ راہ تصوف کے تمام جہد و عمل ذکر و فکر محاسبہ و مراقبہ وغیرہ کا منشاء و مقصد یہی ہے کہ دل مشاہدہ و حضور کی متاعِ عزیز سے ہم کنار ہو جائے

تصوف کی مستند کتابوں مثلاً قوت القلوب از شیخ ابو طالب مکی، طبقات الصوفیہ از شیخ عبدالرحمن سلمی، حلیۃ الاولیاء از ابونعیم اصفہانی، الرسالۃ القشیریۃ از امام قشیری — کشف المحجوب از شیخ علی بن عثمان ہجویری مدفون لاہور، تذکرۃ الاولیاء از شیخ فریدالدین عطار عوارف المعارف از شیخ سہروردی، فوائد الفواد ملفوظات شیخ نظام الدین اولیا، خیر المجالس ملفوظات شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی، انسان کامل از شیخ عبدالکریم جیلی وغیرہ کے صفحے کے صفحے الٹ جائیے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملاً بھی کتاب و سنت کی تلقین ملے گی، اور باوثوق ذرائع سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اکابر صوفیاء کے مجاہدات، ریاضات اور مراقبات کی اساس و بنیاد قرآن و حدیث کی تعلیمات ہی ہیں، اور ان کی پاکیزہ زندگیاں اسلام کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔

اسلامی تعلیمات میں محبت الٰہی، مکارم اخلاق اور خدمت خلق کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، تصوف کی تعلیمات بھی انھیں ارکان ثلثہ پر مبنی ہیں، تاریخی شواہد کی بنیاد پر بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرات صوفیاء ہی نے اپنی عملی جد و جہد کے ذریعہ ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی و روحانی نظام کو زندہ رکھا، صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا، متکلمین، معتزلہ اور حکماء نے صرف دماغ کی آبیاری کی جبکہ صوفیاء نے دماغ کے ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کی اہم ترین خدمت بھی انجام دی اور یہ بات کسی بیان و تشریح کی محتاج نہیں ہے کہ اسلام میں اصلی چیز دل ہے نہ کہ دماغ اگر دل فاسد ہو جائے تو دماغ کا فاسد ہو جانا یقینی ہے، چنانچہ نبی صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله وهی القلب۔" انسان کے جسم ایک عضو ہے اگر وہ صالح ہو جائے تو سارا جسم صالح ہو جائے اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جائے۔ آگاہ ہو جاؤ وہ قلب ہے۔

حضرات علماء کرام نے علمی و نظری دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جبکہ حضرات صوفیاء نے اپنے اعمال و اخلاق اور سیرت و کردار سے اسلام کی صداقت کو مبرہن اور آشکارا کیا، اسلئے

تصوف یا طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں تصوف اسلام کا عطر اور اس کی روح ہے، لیکن کوئی انسانی تحریک خواہ وہ کتنی اچھی کیوں نہ ہو جب افراط وتفریط عمل ورد عمل کا بازیچہ بنتی ہے تو اس کی شکل مسخ ہوئے بغیر نہیں رہتی، چنانچہ متکلمین نے اسلام کو یونانی فلسفہ کی زد سے بچانے میں بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ہیں، لیکن آگے چل کر جب علم کلام کو شکوک وشبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا تو یہی علم کلام مسلمانوں میں ذہنی انتشار برپا کرنے کا سبب بن گیا، یہی حال تصوف کا بھی ہوا کہ تصوف کی ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی دیکھ کر جاہل یا نقلی ارباب غرض صوفیوں کے بھیس میں اس جماعت صوفیہ صافیہ میں در آئے اور اپنی مقصد براری کے لئے شریعت وطریقت میں تفریق کا نظریہ شائع کر دیا، مجاز پرستی قبر پرستی، نغمہ وسرود کو روحانی ترقی کا لازمی جزو بنا دیا اور دنیا پرستی سے گریز کو رہبانیت کی شکل دیدی مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ محققین صوفیاء نے ہمیشہ ان گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے، اور ان فاسد عناصر کو تصوف سے خارج کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

اس جعلی اور غیر اسلامی تصوف کی بنا پر سرے ہی سے تصوف کا انکار کر دیا جائے اور اسے نوع انسانی کیلئے بمنزلہ افیون بتایا جائے اور الزام عائد کیا جائے کہ تصوف زندگی کے حقائق سے گریز کی تعلیم دیتا ہے اور اس نے مسلمانوں کے قوائے عمل کو مضمحل یا مردہ بنا دیا تو یہ سراسر ناانصافی اور اسلامی تصوف پر ظلم ہوگا۔

بد قسمتی سے خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو براہ راست اسلام اور اسلامی مآثر کا مطالعہ کرنے کی بجائے مستشرقین اور عیسائی مصنفین کے واسطہ اور انھیں کی مستعار عینک سے اسلامی علوم ومعارف کو دیکھنے کا عادی ہے۔ اسلامی تصوف پر اسی قسم کے بیجا اور غلط اعتراضات کرتا رہتا ہے، یہ بات حق وصداقت اور انصاف وعدالت سے کس قدر بعید ہے کہ ہدف ملامت تو بنایا جائے اسلامی تصوف کو اور قبائح مدنظر رکھی جائیں غیر اسلامی تصوف کی۔ اسلام کے ان نادان دوستوں نے اپنے اس رویہ سے نہ صرف علم وتحقیق کا خون کیا بلکہ انھوں بندگان خدا کو تصوف کی حسنات وبرکات سے محروم کر دیا۔

امید ہے کہ ماہنامہ دار العلوم کا یہ خصوصی شمارہ مخالفین تصوف کے اڑائے ہوئے گرد کو تصوف کے چہرے سے صاف کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا، ہم نے حتی الوسع اس بات کی کوشش کی ہے کہ مضامین مفید اور معیاری ہوں، ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ تو ناظرین ہی کریں گے، ہمارا ارادہ یہ بھی تھا کہ اس نمبر میں اکابر دیوبند رحمہم اللہ کے احسان وسلوک پر خصوصیت کے ساتھ بحث وتحقیق پیش کی جائے، مگر اپنے ارادہ میں ہمیں کامیابی نہ مل سکی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے علاوہ اکابر کے تصوف پر مقالات فراہم نہ ہو سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ انشاء اللہ کسی اور موقع پر یہ کمی پوری کردی جائے گی۔

ظلمت کدۂ ہند میں اسلام کی ضیاپاشیاں

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرنے والوں میں صوفیا اپنی مرتاضانہ تربیت کے باعث علماء کے مقابلہ میں عوام الناس سے زیادہ قریب تھے، صوفیا اپنے گرد مریدوں کا ایک حلقہ قائم کر لیتے تھے جس میں غیر مسلم بھی شامل ہوتے تھے جنھیں وہ اپنی روحانیت اور انسانیت سے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے رفتہ رفتہ یہ گرویدگی اسلام قبول کرنے کا سبب بن جاتی تھی، چنانچہ جنوبی ساحل کے موپلوں کو مالک بن دینار کے متوسلین نے اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، گجرات کے بنجاروں کو الحلاج نے، ترچناپلی کے لبیوں کو نثار شاہ نے، کچھ کے میمنوں کو یوسف سندھی نے گجرات کے بوہروں کو عبداللہ حرازی نے، آفریدی پٹھانوں کو ناصر خسرو نے مشرف بہ اسلام کیا، نیز پورے کشمیر کو شرف بہ اسلام کرنے کا سہرا شیخ سید علی ہمدانی کے سر ہے جنھوں نے اپنے ساتھ سات سو مشائخ کو لے کر یہ کارنامہ انجام دیا۔

(ہند و پاک میں اسلامی کلچر ۱۴۲)



ایک تعارف

(مولانا اعجاز احمد اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ)

تمہید شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی نے اپنی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے باب اشراط الساعۃ میں سنن ترمذی کے حوالہ سے ایک طویل حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند خاص خاص برائیاں ذکر کی ہیں، جن کے عموم وشیوع کے نتیجے میں دنیا کو سرخ آندھیوں، زلزلوں زمین میں دھنسا دیئے جانے، آسمان سے سنگباری، اور مسلسل حوادث ومصائب کا انتظار کرنا چاہئے یہ کل چودہ امور ہیں، جن میں سے آخری بات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے، ولعن آخر ھذہ الامۃ اولھا امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو مورد لعن قرار دیں۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک امت کے سابقین اولین کو لعنت وملامت کرنا جب کہ بعد والوں کو دین کا علم اور دین کا عمل بھی انھی اگلوں سے ملا ہے۔ ایسا ہولناک گناہ ہے جس پر سرخ آندھیاں آسکتی ہیں، زلزلہ آسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور لوگ اس میں دھنسا دیئے جائیں، یہ بھی اندیشہ ہے کہ صورتیں بگاڑ دی جائیں، حد یہ ہے کہ آسمان سے پتھر بھی برس سکتے ہیں۔

آج قلم وکاغذ اور طباعت واشاعت کے بحرانی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر روز بازار میں نئی نئی کتابیں اور نئے نئے مضامین، نئے نئے افکار سے مالامال گوناگوں مؤلفین واہل قلم کے قلم سے نکل نکل کر بازار میں آرہے ہیں، غیر مسلموں کی بات نہیں، خود مسلمانوں میں زبان وقلم کی جو بہتات ہے کسی پڑھے لکھے پر مخفی نہیں ہے، یہ کتابیں اور یہ مضامین اگر حقائق پر

مشتمل کتاب وسنت کے ترجمان ہوتے، اسلامی مسائل واحکام کی تشریح وتوضیح کرتے، تب تو کچھ شکایت نہ ہوتی مگر مصیبت یہ ہے کہ جس نے چند حروف پڑھ لیئے، اور اس کے دماغ میں کچھ سوچنے کی صلاحیت ہے وہ بیتاب ہے کہ کسی طرح اپنے نتائج افکار کو، خواہ وہ بالکل بودے اور عقل وفہم سے بعید ہوں منظر عام پر پیش کرے، ان افکار میں اگر کوئی خوبی ہوتی ہے تو بس یہ کہ وہ نئی تحقیقات سامنے لاتے ہیں جن کا سلف میں ذکر بھی نہ ہو۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ قرآن شریف لوگوں میں عام ہوجائیگا اسے عورتیں بھی پڑھیں گی، مرد اور بچے بھی پڑھیں گے، اس وقت کوئی آدمی سوچے گا کہ میں نے قرآن پڑھ لیا لیکن میری پیروی نہیں کی جاتی، پھر اس پر عمل کا اہتمام کرے گا، تب بھی اس کی پیروی نہیں کی جائے گی، پھر وہ اپنے گھر میں مسجد بناکر عبادت میں لگ جائے گا، پھر بھی اس کی پیروی نہ کی جائے گی، اب وہ اپنے دل میں کہے گا کہ میں نے قرآن پڑھا اور کسی نے مجھے اہمیت نہ دی کہ میرا اتباع کرتا، میں نے اس پر عمل کیا، پھر بھی میں مقتدیٰ نہ بنا، پھر میں نے اپنے گھر کو مسجد بناڈالا تب بھی کوئی میرے پیچھے چلنے والا نہ نکلا، اچھا اب میں نئی تحقیقات اور نئی باتیں پیش کردوں گا، ایسی تحقیقات اور ایسی باتیں جو نہ اللہ کی کتاب میں ہوں گی اور نہ انھوں نے اللہ کے رسول سے سنا ہوگا، شاید اس سے میری اہمیت ہو، اور میری پیروی کی جائے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار اس کی باتوں پر دھیان نہ دینا گمراہی ہے۔ (جمع الفوائد ج۱ ص۶۲ بحوالہ دارمی)

ہم دیکھتے ہیں کہ آج یہی جذبۂ تجدد اور ہوس مقتدائیت ہے، جو لوگوں کی زبان وقلم سے نئی نئی تحقیقات اور نئی نئی باتیں نکلواتی رہتی ہے۔

پھر یہ بھی بکثرت ہوتا ہے کہ لوگ سرسری طور پر کتب احادیث وتفسیر کی ورق گردانی کرکے ہمہ دانی کے زعم میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ان سے جو کچھ اپنی استعداد کے مطابق الٹے سیدھے مطالب اخذ کرلیتے ہیں ان کو اسلاف کی کتابوں اور ان کی زندگیوں میں تلاش کرنے لگتے ہیں اور جب وہ اپنی فہم کے لحاظ سے ان کے مطابق نہیں پاتے یا کچھ کم وبیش دیکھتے ہیں تو ان پر زبان طعن دراز کرنے لگتے ہیں۔

یہ بات ہم علم و عمل کے ہر شعبے میں بہت عرصے سے دیکھ رہے ہیں لیکن اس باب میں مطعون تر اور مظلوم تر جو شعبہ ہے وہ احسان و سلوک کا شعبہ ہے جس کا اصطلاحی نام "تصوف" ہے، اور جس گروہ پر سب سے زیادہ مشق ستم کی جاتی ہے وہ صوفیہ کا گروہ ہے، تصوف سے بڑھ کر کوئی بدعت نہیں اور صوفیہ سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں، یہ لے ادھر چند برسوں سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ جن حلقوں میں تصوف کل تک سرمایۂ افتخار اور وجہ سعادت تھا، جس کے حصول کے بغیر آدمی کی دینی شخصیت ناتمام اور ادھوری سمجھی جاتی تھی، آج انھیں حلقوں کے افراد اس کے نام اور نسبت سے شرمانے لگے ہیں، کل تک جن بڑوں نے تصوف کے ذریعہ اپنی شناخت پیدا کی تھی آج انھیں کے چھوٹے اسے باعث ننگ سمجھنے لگے ہیں، اولین سابقین کو تو چھوڑیے قرون متاخرہ میں کون نہیں جانتا کہ کم از کم اسی برصغیر ہند و پاک میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اور ان کی اولاد و احفاد حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد، نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے نامور صاحبزادگان اور روحانی و معنوی اخلاف یہ سب حضرات نہ صرف یہ کہ تصوف اور صوفیہ کے علم و عمل کے ذوق آشنا تھے بلکہ اس کے زبردست داعی اور وکیل بھی تھے، ان کی زندگیوں سے تصوف کو نکال لیجئے تو ان کے کمالات کی روح فنا ہو جاتی ہے، پھر ان کے بعد علماء دیوبند کے اساطین مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کی ساری زندگی تصوف ہی کے محور پر گردش کرتی رہی، ان کے کمالات کا ہر معقول شخص کو اعتراف ہے، لیکن ستم ظریفی کی حد ہے کہ جن ذرائع سے ان کو کمالات تک رسائی ہوئی تھی اور جس کو انھوں نے ہمیشہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھا اور جس [illegible] کے لئے حد درجہ ناپسند نہیں کیا اسی کو ان کے بہت سے اخلاف مٹانے پر تلے ہوئے ہیں

غلط فہمیاں

تصوف کے سلسلے میں غلط فہمیوں کی لمبی زنجیر ہے جس میں وہ لوگ بھی گرفتار ہیں جو اس کے منکر ہیں، اور وہ لوگ بھی جو اس کے قائل و معترف [illegible] ہیں ان کی غلطی یہ ہے کہ بہت سے وہ امور جو اس فن میں مطلوب [illegible] مقصود سمجھ رکھا ہے، اور ان میں ایسا غلو کئے ہوئے ہیں [illegible] دینی مصلحت کی خاطر ان میں تغیر و تبدیل کر دیا جائے تو تصوف [illegible] نے تو حد ہی کر رکھی ہے کہ اس کو شریعت سے الگ کوئی چیز

سمجھتے ہیں، اور منکرین کی غلط فہمی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی نے خواہ وہ کتنا ہی ناتمام شخص ہو تصوف کے نام سے پیش کر دی اسے تصوف سمجھ کر قرآن وسنت کے معیار پر پرکھنے لگے اور انھیں مطابق نہ پاکر پورے تصوف ہی کا انکار کر دیا، حالانکہ جس طرح ہر جماعت میں معتبر اور غیر معتبر افراد ہوتے ہیں اسی طرح صوفیہ میں بھی دونوں طرح کے افراد ہیں، پس اس باب میں ہمیشہ انھیں کا ارشاد معتبر ہوگا جو تصوف کے محققین ہوئے ہیں، ہر وہ شخص جو اپنا شمار صوفیہ میں کرتا ہو اس کی بات معتبر نہ ہوگی، خود محققین صوفیہ نے ان کا رد کیا ہے اسلئے یہ کسی طرح مناسب نہیں غیر محققین افراد کے اقوال کو تصوف اور صوفیہ کے سر تھوپ کر تصوف کا انکار کیا جائے۔ اور بعض لوگوں نے ـــــ اور ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے) ـــــ تصوف کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا، حقائق کو پہچانا نہیں، رسوم کو تصوف سمجھ لیا اور غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔

اس مقالہ میں قصد یہ ہے کہ تصوف کی حقیقت، اس کے مقاصد، اس کے مبادی و ثمرات، نیز احوال صوفیہ پر اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ اصل حقیقت واضح ہو جائے غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور کام کرنے والوں کی ہمتیں تازہ ہو جائیں، دلوں سے افسردگی دور ہو جائے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کے آغاز میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ایک عبارت نقل کر دی جائے، جس میں انھوں نے نہایت ایجاز و بلاغت کے ساتھ شریعت اسلامی کا مکمل تعارف پیش کر دیا ہے، شاہ صاحب کی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ ہے اس کے پہلے حصہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ومعظم مادعت الی اقامته الرسل امور ثلٰثة تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازاة وغیرها وقد تکفل بهذا الفن اهل الاصول من علماء الامة شکر الله مساعیهم وتصحیح العمل فی الطاعات المقربة والارتفاقات الضروریة علی وفق السنة وقد تکفل بهذا الفن فقهاء الامة فهدی الله بهم کثیرین واقام بهم فرقة عوجاء۔

وتصحیح الاخلاص والاحسان الذین هما اصلا الدین الحنیفی الذی ارتضاه

الله لعباده. قال تبارك وتعالى وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة وذلك دين القيمة، وقال، ان المتقين في جنّت وعيون اٰخذين ما آتاهم ربهم انهم كانوا قبل ذلك محسنين كانوا قليلا من الليل ما يهجعون وبالاسحار هم يستغفرون وفي اموالهم حق للسائل والمحروم وفي الارض آيات للموقنين وفي انفسكم افلا تبصرون

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما الاعمال بالنيات وقال في جواب جبرئيل الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك.

والذي نفسي بيده هذا الثالث ادق المقاصد الشرعية ماخذا واعمقها محتدا وهو بالنسبة الى سائر الشرائع بمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنى من اللفظ وقد تكفل به الصوفية رضوان الله عليهم فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوى وحازوا السهم الاعلى فلله درهم ما اعم نفعهم واتم نورهم (تفهيمات الهيه ص ۱۷)

ترجمہ: اور حضرات انبیاء نے جن امور کی اقامت کی جانب دعوت دی ہے ان میں اہم اور بنیادی تین باتیں ہیں۔

(۱) مبدأ اور معاد نیز جزا و سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا اس فن کی ذمہ داری علماء امت میں سے اہل حق متکلمین پر ہے اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی مشکور فرمائے۔

(۲) حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرانے والی طاعات اور ضروری معاملات و ارتفاقات کے سلسلے میں شریعت کے طریق عمل کی تصحیح اس فن کی ذمہ داری فقہاء امت نے لی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور ان کے واسطے سے بہت سے کج رو فرقوں کو درست کیا۔

(۳) اخلاص اور احسان کی تصحیح کرنا یہ دونوں اس دین حنیف کی بنیاد ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں، اور نہیں حکم دیا ان لوگوں کو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اس طرح کہ عبادت کو خاص اسی کے لئے کرنے والے ہوں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا۔

اور فرمایا: بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے، ان کے رب نے ان کو جو کچھ ثواب دیا ہوگا اس کو لے رہے ہوں گے، وہ لوگ اس کے قبل نیکوکار تھے، وہ لوگ رات کو بہت

کم سوتے تھے، اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سائل اور غیر سائل کا حق تھا۔ اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، اور خود تمہاری ذات میں بھی تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اعمال کا دارو مدار نیت پر ہے، اور حضرت جبرئیل کے سوال کے جواب میں کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان اس کو کہتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اور قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ تیسری قسم از روئے ماخذ کے تمام مقاصد شرعیہ میں دقیق اور باعتبار اصل کے سب سے زیادہ گہری ہے، اور شریعت کے تمام احکام کے مقابلہ میں ایسی ہے، جیسی روح جسم کے مقابلہ میں اور اس فن کی کفالت حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ نے فرمائی، چنانچہ یہ حضرات پہلے خود ہدایت یاب ہوئے، پھر ہادی بنے، خود ہدایت حاصل کی اور دوسروں کو ہدایت دی، خود پیا اور دوسروں کو پلایا، اور سعادت بلند پر فائز ہوئے اور بڑا نصیبہ پایا۔ اللہ ہی کے لئے ان کی خوبیاں ہیں۔ اللہ اکبر ان کی افادیت کتنی عام ہے اور ان کا نور کتنا تام ہے۔

تصوف ایک اصطلاحی لفظ

تصوف کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ تصوف، ایک شرعی مقصد جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے دینی احکام کے لئے بمنزلہ روح کے قرار دیا ہے، اصطلاحی عنوان ہے، عنوان سے بدکنا، اس کو ہدف اعتراض بنانا معقولیت سے بعید ہے۔

بات یہ ہے کہ دور رسالت میں تمام علوم وفنون دینیہ اور تمام اعمال شرعیہ کا سرچشمہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ تھی۔ آپ سے حضرات صحابہ نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق کمالات علمیہ وعملیہ کی تحصیل کی، اور مختلف علوم میں امتیاز پیدا کیا، لیکن اس وقت تک علوم کے لئے الگ الگ عنوانات اور ان کے حاملین کے لئے الگ الگ نام متعین نہ ہوئے تھے۔ آپ کے تمام شاگردوں اور متوسلین کا ایک لقب تھا یعنی صحابہ، ان کے بعد جو لوگ آئے وہ تابعین ہوئے۔ پھر علوم میں امتیاز اور اس کے واسطے سے ان کے متخصصین میں امتیاز پیدا ہونے لگا، چنانچہ علم حدیث، علم تفسیر، علم فقہ، علم الانساب، پھر علم اسماء الرجال، علم اصول، علم کلام اور مختلف علوم الگ الگ عنوانات سے

ظاہر ہونے لگے، ظاہر ہے کہ یہ تمام علوم سادہ اور ابتدائی شکل میں عہد نبوت میں موجود تھے مگر جوں جوں ان کی تفصیلات مرتب ہوتی گئیں، ان کی تدوین ہوتی گئی۔ ان کے الگ الگ نام متعین ہوتے گئے۔ اور ان کے لحاظ سے ان کے ماہرین کے نام معروف ہوتے گئے. تو کیا چونکہ عہد نبوت میں یا عہد صحابہ میں یہ نام اور یہ القاب نہ تھے، اس لئے ان کو بدعت اور محدث قرار دے دیا جائے گا۔ اگر نہیں تو پھر اسم تصوف ہی سے وحشت کیوں ہے؟ ہاں یہ دیکھ لینا چاہئے، اور بغور سمجھ لینا چاہئے کہ جس علم یا جس عمل کا یہ عنوان مقرر ہوا ہے اس کی اصل قرآن و سنت، عہد نبوی اور صحابہ میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر دین کے اس معیار پر تصوف کا مصداق کھرا نہیں ثابت ہوتا تو بے شک یہ لائق رد اور قابل انکار ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس کے مقاصد و اغراض کتاب و سنت سے ماخوذ اور اس کے وسائل و ذرائع حد جواز کے اندر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اس بنا پر انکار کر دیا جائے کہ کتاب و سنت میں اس نام کا پتہ نہیں، اگر ایسا وطیرہ عام کر دیا جائے تو بہت سے علوم کو شریعت کے دائرے سے خارج کرنا پڑے گا۔

اس حقیقت کے مان لینے کے بعد اس بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ تصوف کی وجہ تسمیہ کیا ہے، اور اس کا ماخذ اشتقاق کیا ہے؟ خواہ یہ صوف سے مشتق ہو کہ بیشتر اہل تصوف اپنے زہد و قناعت کی وجہ سے موٹے جھوٹے اور سادہ لباس پر اکتفا کرتے تھے، یا صفو سے اسے مشتق مانا جائے کہ تصوف میں صفائے قلب کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ بس اس کے مفہوم اور معنوں پر نگاہ کرنی چاہئے، پھر یہ بھی نہیں ہے کہ اس فن کا بس یہی ایک نام ہو اہل تصوف نے اسے احسان سے بھی تعبیر کیا ہے، جو خالص حدیث کا لفظ ہے، اسے طریقت بھی کہا ہے، جو شریعت کی پیروی کا راستہ ہے۔ اسے سلوک بھی کہتے ہیں کہ یہ درحقیقت مرضیات الٰہی اور احکام شرع کی رہ نوردی ہے۔

تصوف کی حقیقت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل ان صلاتی و نسکی ومحیای ومماتی للہ رب — تم کہدو کہ بالیقین میری نماز، اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، یہ سب خالص

العالمین لاشریک لہ وبذلک امرت و انا اول المسلمین۔

(سورہ انعام)

اللہ ہی کے لئے ہے، جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے، اور میں سب ماننے والوں میں پہلا ہوں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

و ما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و یقیموا الصلوٰۃ و یؤتوا الزکوٰۃ و ذلک دین القیمہ۔

(سورہ بینہ)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ اسی کے لئے خالص رکھیں دین کو یکسو ہو کر، اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں، اور یہی طریقہ ہے درست مضامین کا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون۔ (سورہ ذاریات)

میں نے جن و انس کو محض اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

یاایہا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا و سبحوہ بکرۃ و اصیلا۔ (سورہ احزاب)

اے ایمان والو! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو۔

اس نوع کے مضامین قرآن پاک میں جابجا بیان ہوئے ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) انسان اور جنات کی تخلیق کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت ہے۔

(۲) عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہئے، اس میں کسی غیر کی شرکت نہیں ہونی چاہئے۔ حتیٰ کہ حظ نفس کے بھی شائبہ سے پاک ہونی چاہئے۔

(۳) عبادت اور بندگی کا یہ خلوص ساری زندگی میں جاری و ساری رہنا چاہئے، عبادت کے جو متعینہ طریقے اور اوقات ہیں، وہ تو ہیں ہی، ان کے علاوہ زندگی کا ہر ہر لمحہ ہر

حرکت وسکون، اور ہر قول وفعل للّٰہیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہونا چاہئے۔ زندگی بھی اسی ذاتِ برحق کے لئے، اور موت بھی اسی محبوب حقیقی کے لئے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم و از برائے تو زیم (۱)

میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی محبت میں زندہ رہوں، مٹی ہو جاؤں، اور آپ کے پاؤں کے نیچے زندگی بسر کروں، مجھ خستہ کا مقصود ساری کائنات میں بس آپ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے لئے مروں اور آپ کے لئے جیوں۔

آپ تصوف کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں جو معتبر ائمۂ صوفیہ نے لکھی ہیں، پڑھ جائیے۔ ان کے اقوال و فرمودات پر نظر ڈال لیجئے، ان کی زندگیوں کا مطالعہ کر لیجئے، سب کا حاصل اور خلاصہ یہی نکلے گا کہ اللہ کی عبادت ہو، خلوص اور یکسوئی کے ساتھ ہو، اور پوری زندگی اس کی بندگی و طاعت کے سانچے میں ڈھل جائے، بس بندہ کی تمام تر کوشش یہی ہو۔

اس جگہ حضرات صوفیہ کی تالیفات سے ایسے اقوال و عبارات نقل کئے جا سکتے ہیں، جو مذکورۂ بالا مضمون کی دلیل ہوں، مگر اس کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ بات ایسی عیاں اور معروف ہے کہ اس کے لئے کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔ تصوف کا ماحصل اور صوفیہ کی ساری تگ ودو کا حاصل بس یہی ہے کہ زندگی و موت کا محور رضار باری تعالیٰ ہو جائے۔

یہاں ایک لمحہ غور کیجئے، جو کچھ تصوف کا مقصود ذکر کیا گیا ہے، جس پر تمام صوفیہ کا اتفاق

---

(۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ راوی ہیں کہ ان کے شیخ، شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ، ایک رات خاص حال اور خاص کیفیت میں حجرۂ عبادت میں ٹہلتے تھے، اور یہ رباعی نہایت درد و سوز کے ساتھ پڑھتے اور سجدے کرتے تھے، کم و بیش ایک ہزار سجدے کئے تھے۔ ان اللہ والوں کے دلوں میں محبت کی وہ آگ لگی رہتی تھی کہ ان کے پورے وجود کو پھونک کر رکھ دیتی تھی ؎ میں رقص کرتا ہوں مست ہو کر، مجھے وہ اپنا بنا رہے ہیں ۔۔ جلے گی ان کے سوا ہر اک شے وہ آگ دل میں لگا رہے ہیں ۔ آج ستم ظریف، ان کی نیتوں پر شبہ کرتے ہیں۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۔ (مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی)

ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اصل ایمان سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ درحقیقت یہی ایمان ہے البتہ ایمان میں کبھی اضمحلال آجاتا ہے، اس پر نفسیات کی کدورتیں، اور غفلت کے گرد و غبار چھا جاتے ہیں، معصیت کے امراض اسے ضعیف اور بے جان بنا دیتے ہیں، تو کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کدورتیں، یہ گرد و غبار، اور یہ ضعف و اضمحلال دور کر کے اسے صاف ستھرا، قوی اور زندار بنا دیا جائے، اسی کوشش اور جد و جہد کو عام اصطلاح میں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اتباع سنت

یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ ایمان کی دولت ہمیں نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حاصل ہوئی ہے، ان پر ایمان لانا، ان کو واجب الطاعت ماننا، ان سے قلبی محبت و لگاؤ رکھنا، اور ان سے نقوش قدم پر چلنا، ایمان میں داخل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کے اتباع کے بغیر اگر کوئی شخص چاہے کہ رضا باری تعالیٰ کو اپنی زندگی کا محور بنائے تو یہ ناممکن ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔

(سورہ آل عمران)

تم کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا، اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کر دیگا، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں۔

ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا۔

(سورہ احزاب)

تمہارے واسطے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے اس شخص کے لئے جو اللہ کی اور یوم آخرت کی توقع رکھتا ہے، اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت ہے، لیکن اس کا طریقہ سرکار نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اطاعت ہے۔ پس انسان کی ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اپنے کو نبی کے نقش قدم پر ڈال دے، اقوال و اعمال، افکار و نظریات،

عتقادات وجذبات، سیرت وکردار، ہر اعتبار سے ٹھیک نبی کا پیرو ہو، اس کے ساتھ یگانگت
ور اتحاد پیدا کرے ورنہ کچھ نہ حاصل ہوگا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز بر پئے مصطفےٰ

سعدی! یہ بات محال ہے کہ حق کا راستہ بجز مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے اور کسی طرح
چلا جا سکتا ہو۔

سعدی علیہ الرحمہ صوفیہ کے مستند ترجمان ہیں، تمام صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیوی
واخروی تمام سعادات دامن مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہیں۔ اس کے بغیر سب
ہیچ ہے۔

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ جن کا مقام جماعت صوفیہ میں بہت
بلند ہے، وہ اپنے مکتوبات میں بار بار نہایت تاکید اور شد ومد کے ساتھ اتباع سنت کی ترغیب
دیتے ہیں، اپنے ایک مکتوب میں اپنے مرشد گرامی خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ کے فرزند خواجہ محمد
عبداللہ کو تحریر فرماتے ہیں کہ

نصیحتے کہ بہ فرزندی اعزی ولبائر احبہ نمودہ می آید اتباع سنت سنیہ است
علی صاحبہا الصلوۃ والسلام والتحیۃ واجتناب از بدعت نامرضیہ . . . سعادتمند
کسے است کہ دریں غربت احیائے سنتے از سنن متروکہ نماید وا ماتت بدعتے از بدع
مستعملہ فرماید۔ ایں آں وقت است کہ ہزار سال از بعثت خیر البشر علیہ وعلی آلہ
الصلوۃ والسلام گزشتہ است، علامات قیامت پرتو انداختہ است وسنت بواسطہ
بعد عہد نبوت مستور شدہ است و بدعت بعلت افشار کذب جلوہ گر گشتہ شاہبازے
باید کہ نصرت فرماید و ہزیمت بدعت نماید..... ہمگی ہمت وتمامی نہمت متوجہ آں باید
کہ ترویج سنتے از سنن نمودہ آید ورفع بدعتے از بدع کردہ شود۔ (مکتوب ۲۳ دفتر دوم ص۵۸)

ترجمہ: نصیحت جو فرزند عزیز اور تمام دوستوں کو بطور خاص کی جاتی ہے، وہ سنت سنیہ
علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی تابعداری، اور بدعات ناپسندیدہ سے کلی اجتناب کی ہے۔۔
وہی شخص سعادت مند ہے۔ جو اسلام کی غربت کے اس دور میں، متروکہ سنتوں میں سے کسی

سنت کو زندہ کرے، اور جاری بدعات میں سے کسی بدعت کو ختم کرے۔ یہ وہ وقت ہے کہ حضرت خیرالبشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر ایک ہزار برس گذر چکے ہیں، قیامت اپنا سایہ ڈال رہی ہے، عہد نبوت سے بعد کی وجہ سے سنتیں پوشیدہ ہو رہی ہیں، اور کذب کی شیوع کی وجہ سے بدعات جلوہ گر ہو رہی ہیں، کوئی شاہبازہ چاہیئے جو سنت کی نصرت کرے، اور بدعات کو شکست دے، پوری توجہ اور اہتمام سے اس پر متوجہ ہونا چاہیئے کہ کسی سنت کی ترویج ہو اور کسی بدعت کا خاتمہ ہو۔

خلاصہ

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صوفیۂ کاملین اور مشائخ محققین کے نزدیک تصوف کا حاصل یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل، اس کے واسطے سے حق تعالیٰ کی رضا رکا حصول ہو، یہی تصوف کی روح ہے، اور اس کی غایت ہے، اگر یہ بات کسی کو حاصل ہو تو اس نے تصوف کی روح پالی، خواہ وہ اس نام سے آشنا نہ ہو، اور جو اس سے محروم رہا اس کو تصوف سے کوئی تعلق نہیں، خواہ اس کو تصوف کی تمام اصطلاحیں ازبر ہوں، خواہ وہ تمام رسوم تصوف کو ادا کرتا ہو، اور خواہ وہ خود کو زمرۂ صوفیہ میں شمار کرتا ہو۔

یہاں تک تصوف کی حقیقت اور اس کے مقاصد کے سلسلے میں اجمالی گفتگو کی گئی ہے اب مناسب یہ ہے کہ اس سلسلے میں قدرے تفصیلی بات بھی ہو جائے، تاکہ تصوف کے متعلق لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے جو شکوک و شبہات عموماً دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا تصفیہ ہو جائے، نیز اس باب میں علماء دیوبند۔ جو سلسلۂ تصوف کے مجدد ہوئے ہیں۔ کا موقف بھی واضح ہو جائے۔

دین میں تصوف کا مقام

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے، ولادت سے لے کر موت تک، جتنے اور جن احوال سے آدمی گزرتا یا گزر سکتا ہے، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، خرید و فروخت، معاملات و اخلاق، دوستی و دشمنی، نکاح و طلاق، سیاست و حکومت، عبادت و اطاعت، غرض ہر شعبۂ حیات کو اپنی کامل گرفت میں رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ شریعت اپنے

آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔ اس طریقۂ حیات کے علاوہ اور کوئی دستورالعمل معتبر اور لائق قبول نہیں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔ (سورہ آل عمران)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا طالب ہوگا، تو وہ مقبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

پوری شریعت اور پورے دین پر غائرانہ نظر ڈالئے تو اصولی طور پر شریعت پانچ اجزا پر مشتمل نظر آتی ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ارشاد فرماتے ہیں کہ

"غور سے سن لیجئے، دین کے پانچ اجزا ہیں، ایک جزتو عقائد کا ہے کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے، وہی حق ہے۔

دوسرا جز عبادات ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔

تیسرا جز معاملات ہیں، یعنی احکام نکاح وطلاق، حدود وکفارات، بیع و شرا، اجارہ وزراعت وغیرہ، اور ان کے جز و دین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت یہ سکھلاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں فلاں چیز کی کرو، بلکہ ان میں شریعت یہ بتاتی ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو، زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ ہو غرض جواز وعدم جواز کا بیان کیا جاتا ہے

چوتھا جز معاشرت ہے، یعنی اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیونکر چاہیئے اس کے کیا آداب ہیں، بیوی، بچوں، عزیزوں، اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیونکر برتاؤ چاہیئے۔

پانچواں جز تصوف ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں۔ آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لئے بیوی بچوں اور دوسرے دنیاوی اور معاشرتی امور کو چھوڑنا پڑتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے، جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔

غرض دین کے پانچ اجزا ہیں، ان پانچوں کے مجموعے کا نام دین ہے، اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو، تو وہ ناقص دین ہے" (۱)

جس طرح جسم انسانی میں اگر کوئی ایک عضو نہ ہو، یا ناقص ہو تو ایسا شخص حسن وجمال کے معیار پہ پورا نہ اترے گا، اسی طرح اگر کسی شخص کی دین داری مذکورہ پانچ اجزا میں سے کسی ایک سے خالی ہو، تو اس میں نقص کا رہ جانا ناگزیر ہے۔

اصلاح نفس کی اہمیت

پھر غور کیجیے، اصلاح نفس یا تصوف، جسے دین کا ایک جز بتایا گیا ہے، بلاشبہ یہ پانچ اجزا میں سے ایک جز ہی ہے، مکمل دین نہیں ہے، لیکن اس میں بھی ذرا تردد نہیں کہ یہ ایسا جز ہے، جو باقی اور اجزا کے لئے تکمیل و تزیین کا سامان ہے، اگر نفس کی اصلاح نہ ہو، اور وہ اپنی بہیمیت پر قائم رہے، اور شہوات و خواہشات میں ملوث رہے، تو ہو سکتا ہے کہ دین کے باقی اجزا وجود میں آتے رہیں، مگر نفس کی سے تلوثیات کی وجہ سے وہ مکدر ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا۔

جس نے نفس کو پاک کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو خراب کر رکھا وہ ناکام ہوا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الہوٰی فان الجنۃ ھی الماوٰی

جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس کی خواہش سے روکا۔ اس کا مستقر جنت ہے

حقیقت یہ ہے کہ نفس، انسانی وجود کا وہ جز ہے جس میں بگڑنے اور فاسد ہونے کی استعداد اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا اسے مطلقاً "امارۃ بالسوء" برائی کا حکم دینے والا قرار دیا ہے، لیکن یہی نفس تزکیہ اور طہارت کے قبول کر لینے کے بعد نفس مطمئنہ بن جاتا ہے جس میں دخول جنت کی ندا سننے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں

---

(۱) بصائر حکیم الامت ص۸۴ بحوالہ وعظ تفصیل الدین۔

نفس آدمی بمنزلہ درختیست کہ بمدد ہوائے شیطانی در ذات ایں کس بیخ می گیرد و محکم می شود، اگر آدمی بندریج وسکونت بزور عبادت وتقوی وبقوت محبت و عشق ہر روز آں درخت را بجنباند ہر آئینہ بیخ او سست شود وقابل قلع گردد۔(۱)

آدمی کا نفس ایک درخت کی طرح ہے، شیطانی وساوس کی مدد سے اس میں بیج پڑتا ہے پھر وہ درخت بن کر مضبوط ہو جاتا ہے، اگر انسان آہستہ آہستہ سنجیدگی سے عبادت وتقویٰ کے زور، اور محبت وعشق الٰہی کی قوت سے روزانہ اس درخت کو ہلاتا رہے گا، تو یقیناً وہ سست پڑ جائے گا، اور اکھاڑنے کے قابل ہو جائے گا۔

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے، تو آدمی کو احکام الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی، بلکہ اس میں شوق وذوق کا اضافہ ہو کر حلاوت ولذت کی ایک جدید کیفیت شامل ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے پوری زندگی پر لطف اور کیف آفریں ہو جاتی ہے۔

گویا دین کی تکمیل کا مدار اصلاح نفس پر دو طریقوں سے ہے، ایک تو اس طرح کہ وہ خود شریعت کا ایک جز ہے، وہ نہ ہو تو اس میں ایک جز کی کمی رہ جاتی ہے۔ دوسرے اس طرح کہ باقی اجزا کی کما حقہ تکمیل بھی اسی جز کے واسطے سے ہے، اس کے نہ ہونے سے ہر جز میں کمی واضمحلال کو راہ مل جاتی ہے۔

تصوف کے اجزا

تصوف کوئی علمی اور تحقیقاتی فن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عملی اور تمرینی شعبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ مشائخ صوفیہ، مریدین کے قیل وقال کو پسند نہیں کرتے، فرماتے ہیں کہ کام کرتے رہو، مقصود کام کرنا ہے، کلام کرنا نہیں ہے۔ صوفیہ کے مشہور شارح اور ترجمان خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے فرمایا ہے کہ

کامیابی تو کام سے ہوگی ۔۔۔ نہ کہ حسن کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی ۔۔۔ فکر کے اہتمام سے ہوگی

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ عمل سے پہلے، اس کا بقدر ضرورت علم ہو، تاکہ اعمال میں غلطی نہ ہو، اس لحاظ سے، اور دوسرے فنون کی طرح تصوف کے بھی کچھ مبادی ومقدمات، کچھ مقاصد

---

(۱) نظام تعلیم وتربیت ص ۱۱۵ ج ۲، بحوالہ سیر الاولیاء ص ۲۴۲۔

اور کچھ ثمرات وفوائد ہیں۔ ان میں عمل کے لحاظ سے اصل چیز تو مقاصد ہیں، لیکن ان کے حصول کے لئے کچھ ابتدائی تمہیدات اور بنیادی مقدمات ہوتے ہیں۔ جن کو بروئے کار لائے بغیر مقصد کا حصول نہیں ہوتا، پھر مقاصد کو عمل میں لانے کے بعد ان کے کچھ ثمرات وفوائد حاصل ہوتے ہیں، ان ثمرات میں سے بعض تو مطلوب بھی ہوتے ہیں۔ اور محمود بھی، اور بعض صرف محمود ہوتے ہیں۔ ان کا حصول مطلوب نہیں ہوتا۔ اس کی قدرے تفصیل حکیم الامت حضرت تھانوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

"ہر مطلوب میں کچھ مبادی ہوتے ہیں، کچھ مقاصد، کچھ زوائد و توابع، اصل مقاصد ہوتے ہیں۔ اور مبادی ان سے مقدم ہوتے ہیں، مگر مقصود بالعرض"(۱)

اور زوائد ان سے موخر مگر غیر مقصود ہوتے، اسی طرح اس طریق میں بعض مبادی ہیں، وہ چند علوم ومسائل ہیں، جو موقوف علیہ ہیں بصیرت فی المقصود کے لئے، اور بعض مقاصد ہیں کہ وہی مقصود بالتحصیل ہیں، اور انہیں پر مدار ہے کامیابی و ناکامی کا، اور بعض زوائد ہیں کہ ان کا وجود نہ معیار کامیابی ہے، اور نہ فقدان معیار ناکامی۔

منجملہ مبادی کے امر اول مذکورہ بالا ہے (یعنی چند علوم ومسائل) جو غالباً اعظم المبادی اور ابجع المبادی ہیں اور مقاصد اعمال خاصہ ہیں جو کہ افعال اختیاریہ ہیں، جن میں ایک حصہ اعمال صالحہ متعلق بجوارح ہے (یعنی ایسے اعمال جن کا تعلق اعضاء ظاہرہ سے ہے) جن کو سب جانتے ہیں، نماز روزہ حج و زکوٰۃ و دیگر طاعات واجبہ ومندوبہ اور دوسرا حصہ اعمال صالحہ متعلق بقلب ونفس ہے، مثل اخلاص وتواضع وحب حق وشکر وصبر ورضا وتفویض وتوکل وخوف ورجا وامثالہا اور ان کے اضداد کا ازالہ، اور ان اعمال اختیاریہ کو مقامات کہتے ہیں، اور یہی نصوص میں مامور بالتحصیل ہیں (یعنی قرآن حدیث میں ان کے حاصل کرنے کا حکم ہے) اور ان کے اضداد مامور بالازالہ بمعنی الکف والردع ہیں (یعنی افعال مذکورہ کی ضد جو اعمال وافعال ہیں۔ انہیں ترک کرنے کا حکم ہے) اور

---

(۱) مقصود بالعرض کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ چیز مطلوب نہیں ہے، لیکن چونکہ حصول مقصود کے لئے ضروری ہے، اس لئے اس کا برتنا ضروری ہے، مثلاً کھانے کے لئے برتن چولھا بذات خود مطلوب نہیں ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لئے وہ مقصود بالعرض ہے۔

ان اعمال کی غایت تعلق بحق و رضائے حق ہے کہ روح اعظم سلوک و تصوف کی یہی ہے اور زوائد احوال خاصہ ہیں مثل ذوق و شوق، قبض و بسط، صحو و سکر، غیبت و وجد اور استغراق واشباہہما اور یہ امور غیر اختیار یہ ہیں، اعمال مذکورہ پر اکثر ان کا ترتب ہوتا ہے اور گاہ نہیں ہوتا، یہ احوال نہ مامور بہا ہیں اور نہ ان کے اضداد مامور بالازالہ، اگر ترتب ہو جائے تو محمود ہے اور اگر نہ ہو تو مقصود میں کچھ خلل نہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ المقامات مکاسب والاحوال مواہب (مقامات کو حاصل کیا جاتا ہے، اور احوال عطیۂ خداوندی ہیں)۔

پس خلاصہ یہ ہوا کہ طریق میں تین امر مبحوث عنہ ہیں (۱) علوم جن سے مقصود میں بصیرت حاصل ہوتی ہے (۲) اور اعمال جو کہ مقصود ہیں، اور انہیں کا اہتمام ضروری ہے (۳) اور احوال جو کہ مقصود نہیں ہیں، گو محمود ہیں، ان کے درپے ہرگز نہیں ہونا چاہئے عہ

مقاصد تصوف

تصوف کے مقاصد جن کا اوپر ذکر ہوا، اور جنہیں اصطلاح میں مقامات کہا جاتا ہے، ان کے مطلوب و مامور ہونے میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا حضرت تھانوی نے اس کے دو شعبے بیان فرمائے۔ ایک شعبہ وہ ہے، جو اعضائے ظاہرہ سے متعلق ہے، مثلاً نماز روزہ حج وزکوٰۃ اور دوسری طاعات، ان میں جو کچھ فرض ہے، وہ تو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ البتہ ان میں جو کچھ نوافل ہیں ان کی تکثیر اور ان کا اہتمام مقربین اور اصحاب سلوک کا وظیفہ ہے، لیکن تصوف میں زیادہ اہتمام ان اعمال کا ہوتا ہے، جن کا تعلق قلب سے ہے جن کے حاصل ہونے کے بعد اول الذکر اعمال میں جان پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ

الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔	سنو! بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے، تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے سنو! وہ دل ہے۔

نماز ہر شخص پڑھتا ہے، لیکن اگر اس میں قلب کا عمل یعنی خشوع شامل نہیں ہے، تو نماز عبادت کا ظاہری ڈھانچہ بن کر رہ جائے گی، اس نماز سے فریضۂ الٰہی از روئے فقہ ظاہری تو اتر جائے گا۔ مگر اس

عہ بصائر حکیم الامت بحوالہ تربیت السالک ص ۷۰۳۔

پر اس فلاح کی ضمانت نہیں ہے، جس کی طرف اذان میں حی علی الفلاح کہہ کر دعوت دی جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فقد افلح المومنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون۔ کامیاب ہوئے وہ مومن جو اپنی نماز میں صاحب خشوع ہیں۔

ہم اس جگہ چاہتے ہیں کہ مقاصد تصوف کی تفصیل بقدر ضرورت کر دیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس تصوف کی مخالفت آج کل ایک فیشن بن گئی ہے وہ انسان کو کن بلندیوں تک پہونچانا چاہتا ہے، اور اس سے محروم ہو کر لوگ کن پستیوں میں جا پڑے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی جماعت علماء و مشائخ دیوبند کے سرخیل ہیں، جو ایک طرف باکمال محدث اور زبردست فقیہ ہیں، تو دوسری طرف اعلیٰ درجہ کے صوفی اور شیخ طریقت بھی ہیں، جن کے فیض صحبت سے علماء ربانیین کی ایک بڑی تعداد وجود میں آئی، اور جن کے انفاس قدسیہ کی برکت سے برسوں کی نہیں بلکہ صدیوں کی جمی جمائی بدعات کا خیمہ اکھڑ گیا، ان کی ایک مختصر تحریر اس موضوع پر عربی زبان میں تذکرۃ الرشید میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم نے نقل کی ہے، اصل عبارت نقل کرنے میں ذرا طوالت ہے، تذکرۃ الرشید میں ملاحظہ فرمالیں، یہاں ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) علم صوفیہ: نام ہے علم دین کا خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی اور قوۃ یقین کا، اور یہی علم اعلیٰ ہے۔

(۲) حال صوفیہ: اخلاق کا سنوارنا، اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگائے رکھنا۔

(۳) حقیقت تصوف: اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ مزین ہونا، اپنے ارادہ کو ترک کرنا اور بندے کا اللہ تعالیٰ کی رضا میں بالکلیہ محو ہو جانا۔

(۴) اخلاق صوفیہ: وہی ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وانك لعلی خلق عظیم۔ بیشک تم بڑے خلق پر فائز ہو نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے اس پر عمل کرنا۔

صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) اپنے آپ کو کمتر سمجھنا، اس کی ضد تکبر ہے۔ (۲) مخلوق کے ساتھ لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آنا

اور خلقت کی ایذاؤں کا برداشت کرنا (۳) نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرنا، غیظ و غضب سے بچنا (۴) ہمدردی اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا، مخلوق پر فرط شفقت کی وجہ سے جس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے نفسانی حظوظ پر مقدم رکھا جائے (۵) سخاوت کرنا (۶) درگزر اور خطا کا معاف کرنا (۷) خندہ روئی اور بشاشت سے پیش آنا (۸) سہولت اور نرم پہلو رکھنا (۹) تصنع اور تکلف سے پرہیز کرنا (۱۰) خرچ بلاتنگی اور اسراف کے کرنا (۱۱) خدا پر بھروسہ رکھنا (۱۲) تھوڑی دنیا پر قناعت کرنا (۱۳) پرہیزگاری اپنانا (۱۴) جنگ و جدل اور عتاب نہ کرنا، مگر کسی حق کی بنیاد پر (۱۵) بغض و کینہ و حسد نہ رکھنا (۱۶) مال و جاہ کا خواہش مند نہ ہونا (۱۷) وعدہ کی پابندی کرنا (۱۸) بردباری (۱۹) دوراندیشی (۲۰) بھائیوں کے ساتھ موافقت و محبت رکھنا، اور اغیار سے علیحدہ رہنا (۲۱) محسن کی شکرگزاری اور جاہ کا مسلمانوں کے فائدے کے لئے استعمال کرنا۔

صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر و باطن مہذب بناتا ہے، اور تصوف سارا ادب ہی کا نام ہے (کس ادب کا؟) بارگاہ احدیت کا ادب، اور حق تعالیٰ کے جلال و ہیبت کی وجہ سے ازروئے حیا، ماسوی اللہ سے اعراض کرنا۔ حدیث نفس (یعنی ہمہ وقت نفس کی گفتگو میں مشغول رہنا) بدترین معصیت اور ظلمت کا سبب ہے۔ (۱)

غور کر لیجئے۔ ان مقاصد میں کوئی بات اہل ایمان کے لئے نہ مبہم ہے اور نہ اجنبی کہ اسکی تشریح و تعریف ضروری ہو، البتہ قوۃ یقین جس کو مولانا نے علم اعلیٰ سے تعبیر کیا ہے، اس کی قدرے وضاحت کر دینی مناسب ہے۔

قوت یقین | اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات از قبیل امور غیب ہیں۔ اور انسان کے ادراک و حواس کی قوت عالم شہود سے متعلق ہے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے اوپر ایسا یقین حاصل ہو، اور اس کے ساتھ ایسا قوی تعلق و ارتباط پیدا ہو کہ اس کی وجہ سے مشاہدات کا یقین اور دنیا کی چیزوں کا تعلق مضمحل اور ماند پڑ جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس مادی جسم کے ساتھ جو عناصر اربعہ سے مرکب ہے۔ ایک غیر مادی چیز بھی جوڑ رکھی ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر جسم کے ساتھ

(۱) تذکرۃ الرشید، ص ۱۱/۲ ۔

کم اور عالم غیب کے ساتھ زیادہ ہے، وہ روح ہے، اور جس طرح محسوس چیزوں کے ادراک و علم کے لئے اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی میں مختلف اعضا بنا کر ان میں احساس کی طاقت رکھ دی ہے مثلاً آنکھ میں دیکھنے، کان میں سننے، زبان میں ذائقہ، ناک میں سونگھنے اور کھال میں چھونے کی طاقت رکھ دی ہے، اسی طرح عالم غیب کی چیزوں کے ادراک کے لئے اللہ تعالیٰ نے روح کو بھی ایک عضو عطا فرمایا ہے، اور اس میں امور غیبیہ کے ادراک کی قوت ودیعت فرما دی ہے، اس کا نام "قلب" ہے۔

پھر ہر شخص یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ جس حاسہ سے کام لیا جاتا رہے گا، وہ اپنا فریضہ باقاعدہ انجام دیتا رہے گا، اور جس حاسہ کو معطل کر دیا جائے، رفتہ رفتہ اس کی طاقت ضعیف ہو جاتی ہے، مثلاً اگر نگاہ کو معطل کر دیا جائے، ہمیشہ آنکھ پر پٹی بندھی رہے، اور اس سے کام نہ لیا جائے تو زیادہ مدت نہیں گزرے گی کہ بصارت ضعیف ہو جائے گی، اور ایک عرصہ میں بالکل ہی زائل ہو جائے گی۔

بعینہ یہی حال قلب کا بھی ہے، اگر اس کو امور غیبیہ کے ساتھ جوڑے رکھا گیا، اور اس کے موانع کے دور کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس کو غیبی امور کے ساتھ مناسبت قوی ہوتی جائے گی یہاں تک کہ یہ اپنی قوت کی وجہ سے تمام حواس ظاہرہ پر غالب آجائے گا۔

اور غیبی امور کے ساتھ اس کے تعلق کی ترتیب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر بکثرت کیا جائے، ذکر کا اصل محل قلب ہے، مگر اس میں ذکر جاگزیں کرنے کے لئے زبان سے کام لینا پڑتا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ذکر کے دل میں راسخ ہونے سے جو چیزیں مانع ہیں، ان سے علی حسب مراتب اور بقدر ضرورت اجتناب کیا جائے، تاکہ اللہ کی یاد دل میں بیٹھ کر حضوری کی کیفیت پیدا کر دے اس مرتبہ میں پہونچ کر آدمی کو یقین کی قوت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایک بار ارشاد فرمایا کہ

"تمام اذکار و اشغال و مراقبات وغیرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی حضوری ہر وقت میسر رہے، بعض نے اس حضوری کے دو درجے کر دئے ہیں جن

میں ایک یہ ہے کہ اسم ذات مخیلہ (قوت خیال) میں قائم ہو جائے، پھر اسم سے مسمیٰ (یعنی ذات حق) کی طرف بآسانی راستہ مل جاتا ہے (اور یہی دوسرا درجہ ہے) یہ جو بزرگوں نے چلہ وغیرہ کا طریقہ ایجاد کیا ہے، اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی دوسرا نقش و خیال مخیلہ پر نہ پڑے، مثلاً باہر نکلو تو گھونگھٹ کر کے نکلو کہ کسی کو دیکھو گے تو اس کی صورت کا نقش مخیلہ کو مکدر کر دے گا، جس طرح انسان کو اپنی ہستی کا ہمہ وقت علم ہے کہ "میں ہوں" بس ایسا ملکہ بلکہ یہی علم حق تعالیٰ کے ساتھ رہنا چاہئے، فرق اتنا ہے کہ اپنے تئیں جسم، صورت شکل، آنکھ ناک، کان کے ساتھ مشاہدہ کرتا ہے، حق تعالیٰ کو بدوں اس کے مشاہدہ کرے کہ وہ ہے۔ ؎

دور بینا بارگاہ الست   غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست (۱)

کے یہی معنی ہیں، اور النہایۃ راجعۃ الی البدایۃ کا یہی مطلب ہے کہ جس طرح نوزائیدہ بچہ جانتا ہے کہ "اللہ ہے"، بس یہی قائم ہو جاتا سب کچھ ہے۔ انسان کسی وقت اپنی ہستی کو بھی بعض مصروفیت میں فراموش کر دیتا ہے، لیکن یہ فراموشی نہایت خفیف اور کالعدم ہوتی ہے۔

پہلے بزرگ اخلاق سیئہ کو چھڑانے کی محنتیں کرایا کرتے تھے تاکہ یہ کام آسان ہو جائے۔ مگر متاخرین نے خصوصاً ہمارے سلسلے کے بزرگوں نے یہ طریق [illegible] کیا ہے کہ ذکر اس قدر کثرت سے کرے کہ یہ اخلاق ذکر کے نیچے دب جائیں اور ذکر تمام باتوں پر غالب آجائے۔ (۲)

ذکر و اشغال پر مفصل گفتگو تو آگے آرہی ہے، لیکن اس تحریر سے معلوم ہوا کہ مقاصد سلوک میں [illegible] مقصد جو عمل اعلیٰ ہے، وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی حضوری حاصل ہو جائے، حقیقت [illegible] خدا تعالیٰ بندے کے ساتھ ہیں۔

---

(۱) [illegible] بارگاہ کے جو دوربین حضرات ہیں، ان کی رسائی بس اسی قدر ہے کہ "وہ ہے" اس سے زیادہ ان کی بھی رسائی نہیں ہے)۔ (۲) تذکرۃ الرشید ص ۱۲ ج ۲

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وھو معکم اینما کنتم — تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔

بلکہ وہ تو شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید — ہم آدمی کے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔

یہ حقیقت باوجودیکہ ایک امر محکم ہے، مگر انسان اس سے عموماً غافل رہتا ہے، اس غفلت کا علاج "ذکر کثیر" ہے، اور اس کے اثر کرنے کی شرط، موانع کا انسداد ہے، ذکر کثیر کے بعد اس حضوری اور معیت کا راسخ علم بندے کو حاصل ہوتا ہے، اس حضوری کے دو درجے ہیں، اور یہ دونوں درجے الگ الگ استعدادوں کے لئے ہیں، کبھی تو اللہ تعالیٰ کے نام کو ذکر کثیر کے ذریعے انسان کے دل میں، دماغ میں، خیال میں منقش کردیا جاتا ہے، چنانچہ ذاکر کو باری تعالیٰ کے نام کا استحضار کامل حاصل ہو جاتا ہے، یہ پہلا درجہ ہے، پھر اس خیال کو اسم سے مسمی اور ذات کی طرف منتقل کردیا جاتا ہے، یہ دوسرا درجہ ہے، اور یہی اصل مقصود ہے، اور جن کی استعداد اعلیٰ ہوتی ہے، ان کو پہلے درجہ کی حاجت نہیں ان کو براہ راست ذات حق کی حضوری حاصل ہو جاتی ہے۔

مقاصد تصوف پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجئے، ان میں سے کون سی بات قابل اعتراض ہے، جس سے ہمارے بہت سے بھائی بدک رہے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو حلاوت ایمان[1] جس کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے، اور جو منجملہ انعامات الٰہیہ کے ہے، اس کا حصول انہیں مقاصد کے حصول پر موقوف ہے۔ واللہ الموفق۔

---

(۱) عن انس رضی اللہ عنہ: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان، من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما ومن احب عبدًا لا یحبہ الا اللہ ومن یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یلقی فی النار (بخاری ومسلم) تین باتیں جس میں ہونگی اسے ایمان کی حلاوت نصیب ہو گی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول، دنیا کی ہر شئے سے زیادہ اسے محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ اگر کسی سے محبت

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

مبادی تصوف

ترتیب کے لحاظ سے مبادی اور تمہیدات کا ذکر پہلے آنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ مبادی کی اہمیت، مقاصد کی اہمیت پر موقوف ہے، کیونکہ مبادی مقصود نہیں ہوتے حصول مقصود کے ذرائع ہوتے ہیں، مقصد جتنا رفیع اور وقیع ہوگا، اس کے مبادی ومقدمات اسی کے بقدر مہتم بالشان ہوں گے۔ اس لئے پہلے مقاصد پر گفتگو کی گئی مقصد کی عظمت وجلالت کا جب انکشاف ہوگیا، تو ظاہر ہے کہ جن ذرائع سے اس کا حصول ہوگا۔ ان کا بجالانا کس قدر ضروری ہوگا، مقصد تصوف کی تحصیل کے لئے جو ضروری مقدمات درکار ہیں، ان کو ہم تین بنیادی عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) بیعت وصحبت (۲) ریاضت ومجاہدہ (۳) اذکار واشغال ومراقبات۔

بیعت وصحبت

جہاں تک انسانی طبیعت کا معاملہ ہے، ہر زمانے کے عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسانی طبیعت کے بناؤ اور بگاڑ میں جس قدر صحبت ومعیت کا دخل ہے، اتنا کسی اور چیز کو دخل نہیں ہے، یہ ایک ایسا بدیہی اور فطری مسئلہ ہے جس پر کسی دو شخص کی رائے مختلف نہ ہوگی، قرآن سے، حدیث سے، اقوال علماء سے، حتیٰ کہ عام انسانی افراد سے یہ بات اس قدر محقق ہے کہ اس کے لئے کسی طرح کا ثبوت پیش کرنا تحصیل حاصل

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رکھے تو محض اللہ کے واسطے محبت کرے، تیسرے یہ کہ کفر میں لوٹنا اس کے نزدیک آگ میں گرنے کی طرح ہولناک بن جائے۔ حلاوت ایمان کیا ہے؟ امام نووی اس کا جواب دیتے ہیں۔ استلذاذ الطاعات، طاعات سے لذت یاب ہونا۔ وتحمل المشاق فی رضی اللہ عزوجل ورسولہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضامندی کے لئے دشواریوں کو جھیلنا، وایثار ذلک علی عرض الدنیا۔ اور متاع دنیا پر اسے ترجیح دینا۔ ومحبۃ العبد ربہ سبحانہ وتعالیٰ بفعل طاعتہ وترک مخالفتہ وکذلک محبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بندے کا اپنے رب سے محبت کرنا اس طرح کہ اس کی اطاعت میں سرگرم رہے اور اس کی خلاف ورزی سے بچتا رہے، اور اسی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی محبت رکھے، ہم نے جن مشائخ صوفیہ، جو واقعی تصوف کے صحیح نمائندے تھے کی سیرتوں کا مطالعہ کیا ہے، یا ہمیں ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے پاس اس حلاوت ایمانی کے جتنے نمونے ہم نے دیکھے، کہیں اور دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کثر اللہ امثالہم۔

اور طول لاطائل ہے ،حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ساری فضیلت وکمال کا راز اسی ایک بات میں ہے کہ ان کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ومعیت ایمان وعقیدت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی ، اگر کسی کو یہ صحبت حاصل نہیں ہے ، تو وہ ایمان وعمل کے خواہ کتنے اونچے درجے پر فائز ہو ، باتفاق امت اسے کسی صحابی کے مقابل میں نہیں رکھا جا سکتا ۔

اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہے کہ جس کسی کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے ، وہ کسی صاحب کمال ہی کی صحبت میں حاصل ہوتا ہے ،حضرات صوفیہ نے اس اصول کے پیش نظر طریق کا مدار صحبت پر رکھا ہے ، لیکن یہ بھی معلوم ومسلم ہے کہ نری صحبت بلا تعلق ومحبت اور بغیر اعتقاد وانقیاد کے مفید وموثر نہیں ہوتی ، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی دینی کمال اور تقوی کا حسن وجمال حاصل کرنا ہو ، وہ کسی صاحب کمال اور متقی وخوش وخصال کو تلاش کرے ، اس سے عقیدت ومناسبت ہو ، تو اس کی صحبت میں رہے ، اس سے علم وعمل سیکھے ، اس طریقے سے اسے کمال حاصل ہوتا چلا جائیگا ۔

تجربہ یہی ہے کہ جو کچھ کسی کو حاصل ہوا ہے ، اسی طریقہ سے حاصل ہوا ہے ، دنیاوی علوم وفنون اور اعمال واشغال میں بھی یہی دستور کارفرما ہے ، اگر کسی کو تجارت کرنی ہے تو تاجروں کی صحبت میں رہ کر سیکھے ۔

صحبت کی تاثیر

مشہور ہے کہ کسی جوہری کا انتقال ہونے لگا ، اس کا بچہ ابھی چھوٹا تھا ۔ اس نے ایک صندوق میں جواہرات اور انہیں کے ہم شکل اور ہم رنگ پتھر کے ٹکڑے رکھدیئے ۔ اور ایک رقعہ پر وصیت تحریر کی کہ اس صندوق میں جواہرات ہیں اور انہیں کے ہم رنگ پارہائے سنگ رکھے ہوئے ہیں ۔ بڑے ہونے کے بعد تم اسے فلاں شخص کے پاس جو میرا دوست اور جوہری ہے ، لے جاکر اسے دکھانا ، وہ شناخت کرکے تمہیں اصل جواہرات حوالے کردے گا ۔ شعور کی عمر کو پہونچنے کے بعد یہ لڑکا صندوق لے کر اپنے باپ کے دوست کے پاس پہونچا ، اور اسے وصیت نامہ دکھایا ۔ اس جوہری نے وصیت نامہ اور جواہرات اور سنگ ریزوں کو دیکھ کر کہا کہ میں یونہی چھانٹ کر جواہرات تم کو نہیں دے سکتا ، اس کی ایک شرط ہے ، وہ یہ کہ میری دکان پر تم پانچ سال تک کام کرو ۔ اس نے پانچ سال تک کام

کیا، ان پانچ برسوں میں اسے جواہرات کی مکمل شناخت حاصل ہو گئی، اب اس نے صندوق منگوایا، اور قفل کھول کر کہا کہ اب تم خود پہچان لو، میرا مقصد یہی تھا کہ تم کو یہ معرفت وشناخت حاصل ہو جائے، اگر میں اسی وقت تمہیں دے دیتا تو جواہرات تو تمہیں مل جاتے، لیکن نہ تم کو جواہرات کا علم حاصل ہوتا اور نہ ان کی قیمت معلوم ہوتی، اس حکایت سے صحبت کی اہمیت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

صحبت کی برکت

حکیم الامت حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے، موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا حتیٰ کہ بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدے سے نہ اٹھایا جائے گا بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا، بلا خوش نویس کے پاس بیٹھے، اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز کوئی خوش نویس نہیں ہو سکتا غرض بدوں کامل کی صحبت کے کوئی نہیں بن سکتا"۔ (۱)

صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند
ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا گو نشیند در حضور اولیا
یک زمانہ صحبتِ با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
صحبت نیکاں اگر یک ساعت است بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است

نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک بنا دے گی، اسی طرح بدبخت کی صحبت تم کو بدبخت بنا دے گی، جو شخص خدا کی ہم نشینی کا طالب ہو، تو اس کو اولیاء کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہئے، اللہ والوں کی تھوڑی دیر صحبت سو سالہ طاعت بے ریا سے بہتر ہے، نیکوں کی صحبت اگر گھڑی بھر نصیب ہو جائے تو وہ سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے۔

ساعت کا مطلب

کامل کی صحبت میں بعض اوقات کوئی گر ہاتھ آجاتا ہے، یا کوئی حالت ایسی قلب میں پیدا ہو جاتی ہے، جو ساری عمر

(۱) شریعت وطریقت ص۶۹ بحوالہ تصوف وسلوک ص۱۱۱۔

کے لئے مفتاح سعادت بن جاتی ہے، ہر وقت ہر ساعت مراد نہیں ہے بلکہ وہی وقت اور وہی ساعت مراد ہے، جس میں یہ حالت میسر ہو، تاہم ہر صحبت میں اس خاص بات کا احتمال ہے، اس لئے ہر صحبت کا اہتمام کرنا چاہئے، اس سے ہر صحبت کا مفید اور نافع ہونا ظاہر ہے، اور اس حالت کو صد سالہ طاعت کے قائم مقام بتلانے کی ایسی مثال ہے کہ اگر کسی کے پاس سو اشرفیاں ہوں، تو بظاہر اس کے پاس اسباب اور سامان کچھ نہیں ہے، لیکن اگر ذرا تعمق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر چیز اس کے قبضے میں ہے، کیوں کہ اشرفیوں سے اسباب خریدا جا سکتا ہے، اسی طرح اگر اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو تو بظاہر خاص طاعات میں سے اس کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر حکماً ہر چیز ہے۔ (۱)

شیخ کی صحبت میں طالب پوشیدہ طور پہ آہستہ آہستہ اپنے اندر اخلاق حمیدہ کو جذب کرتا رہتا ہے، بالآخر وہ اعلیٰ درجہ کا صاحب اخلاق بن جاتا ہے، صحبت نیکاں کے متعلق شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا یہ قطعہ بہت عجیب اور مناسب ہے۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم (۲)

ترجمہ: ایک روز حمام میں ایک محبوب کے ہاتھوں سے ایک خوشبودار مٹی مجھ کو ملی میں نے اس سے پوچھا کہ تو مشک ہے یا عنبر کہ تیری دل آویز بو سے میری طبیعت مست ہو گئی، وہ بولی کہ میں ایک ناچیز اور معمولی مٹی تھی، مگر ایک مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں اسی ہم نشین کے جمال نے مجھ میں اثر کیا ہے، ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں، جو پہلے تھی۔

بیعت حضرات مشائخ اور صوفیہ جب کسی سالک اور مرید کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے ہیں تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت کرتے ہیں۔ یعنی پچھلے گناہوں سے توبہ کراتے ہیں، اور آئندہ معصیت نہ کرنے کا عہد لیتے ہیں، اور معصیت ہو جانے کی

---

(۱) شریعت و طریقت ص۴۹ (۲) گلستاں۔

صورت میں توبہ کر لینے کا وعدہ کراتے ہیں، نیز اعمال صالحہ پر استقامت اور سنت و شریعت کے اتباع کامل کا معاہدہ کراتے ہیں۔ یہ سارے کام تو خود مرید اور سالک کے کرنے کے ہیں، لیکن انسانی فطرت ہے کہ اپنے کسی عمل پر دوسرے کو گواہ بنالیا جاتا ہے۔ تو اس میں پختگی آجاتی ہے، اور اس کا اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ ایک شخص جب اپنے شیخ و مرشد کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے، اور شریعت پر استقامت کا عہد کرتا ہے، تو اس میں بڑی قوت آجاتی ہے۔ بیعت کا یہ طریقہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے یہاں اپنے امتیوں سے بیعت لینے کا عام دستور تھا۔ امام نسائی نے اپنی کتاب میں مختلف امور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیعت لینے کا ذکر فرمایا ہے۔ خود قرآن کریم میں ایمان و عمل صالح پر بیعت لینے کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

یٰایہا النبی اذا جاءك المومنات یبایعنك علی ان لا یشرکن باللہ شیئا و لا یسرقن و لا یزنین و لا یقتلن اولادھن و لا یاتین ببہتان یفترینہ بین ایدیہن و ارجلہن و لا یعصینك فی معروف فبایعہن واستغفر لہن اللہ ان اللہ غفور رحیم۔

اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس غرض سے آئیں کہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر کوئی بہتان نہ باندھیں گی، او معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، توا کو بیعت کرلو، اور ان کے لئے اللہ سے استغ کرو، بیشک اللہ غفور رحیم ہیں۔

یہ تو گناہوں سے اجتناب کے سلسلے میں بیعت ہے، بعض مواقع پر جہاد پر بیعت لے کا ذکر ہے۔

ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم۔

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ درحق اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ا ہاتھ کے اوپر ہے۔

بیعت کی شکل کیا ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔

عن عوف بن مالك الاشجعي قال كنا عند النبي صلى الله عليه وسلم تسعة أثمانية او سبعة فقال الا تبايعون رسول الله صلى الله عليه وسلم فبسطنا ايدينا وقلنا على ما نبايعك يا رسول الله قال على ان تعبد والله ولا تشركوا به وتصلو الصلوات الخمس وتسمعوا وتطيعوا۔

(مسلم، ابو داؤد و نسائی)

عوف بن مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، نو آدمی تھے، یا آٹھ، یا سات آدمی آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے، ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا کہ کس امر پر بیعت کریں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، اور پانچوں نمازیں پڑھو اور احکام سنو اور مانو

حکیم الامت تھانویؒ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

"حضرات صوفیا رکرام میں بیعت کا معمول ہے، جس کا حاصل التزام احکام (یعنی احکام ظاہری و باطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے، جس کو ان کے عرف میں بیعتِ طریقت کہتے ہیں، بعض اہل ظاہر اس کو اس بنا پر بدعت کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعتِ جہاد کرنا معمول ہے، مگر اس حدیث میں صریح اثبات موجود ہے، کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہ ہیں، اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے، کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے، بلکہ بدلالت الفاظ معلوم ہوتا ہے کہ التزام و اہتمام اعمال کے لئے ہے، پس اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، بعدہ بوجہ اشتباہ بیعت خلافت کے سلف نے صحبت پر اکتفا کیا، پھر خرقہ کی رسم بجائے بیعت کے جاری ہوئی، جب وہ رسم (بیعت) خلفاء میں نہ رہی تو صوفیہ نے اس مردہ سنت کو پھر جاری کیا۔" (۱)

ابتدا میں خلفاء روحانی عامۃ الناس سے بیعت لیا کرتے تھے، یہ بیعت حکومت

---

(۱) شریعت و طریقت ص۵۸۔

وفاداری اور تسلیم وانقیاد کی تھی۔ اس دور میں اگر صوفیہ دست بدست بیعت طریقت لیتے تو صورۃً مشابہت کی وجہ سے خلفاء وحکام کو بدگمانی ہوتی، اور خطرات کا اندیشہ ہوتا، اس لئے حضرات مشائخ نے یہ طریقہ موقوف کردیا، کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے، صرف صحبت پر اکتفا کیا، پھر بعض حضرات نے بطور علامت کے بجائے بیعت کے خرقہ دینا تجویز کیا، جو اس بات کی نشانی ہوتی کہ اس شخص کو فلاں بزرگ کی خدمت وصحبت حاصل ہے، بعد میں بیعت کا دستور خلفاء نے ختم کردیا۔ تو مشائخ نے پھر وہی قدیم سنت تازہ کردی۔ (۱)

بیعت کی ضرورت

یہ بات یقینی ہے کہ بیعت کی ضرورت اس درجہ عام نہیں ہے کہ ہر شخص کو اس کا پابند قرار دیا جائے، بہت سی سلیم طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور مختلف اسباب وعوامل سے ان کے اندر تقویٰ ودیانت کا رجحان متعین ہو جاتا ہے، ایسے لوگ اگر بیعت نہ ہوں تو مضائقہ نہیں، لیکن عام انسانی طبائع کو دیکھتے ہوئے، اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے، امت کے حکیم حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ:

"نفس میں بعض خفیہ امراض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے، اور اگر سمجھ میں آبھی جاتے ہیں، تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا، اور جو معلوم ہوتا ہے تو نفس کی کشاکشی سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے، ان ضرورتوں سے پیر کامل تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے، ان کا علاج وتدبیر بتاتا ہے، کیونکہ خود اپنی حالت کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا، اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے۔" (۲)

عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کمال بدوں استاذ کے حاصل نہیں ہوتا، تو جب اس راہ طریقت میں آنے کی توفیق ہو، تو استاذ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہئے جس کے فیض تعلیم وبرکت صحبت سے مقصود حقیقی تک پہونچے۔

---

(۱) یہ مضمون القول الجمیل مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں بھی مفصل بیان کیا گیا۔

(۲) شریعت وطریقت صفحہ ۶ بحوالہ انفاس عیسیٰ وقصد السبیل وعظ الباطن۔

گرہوائے ایں سفرداری دلا — دامن رہبر بگیر و پس بیا
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگزشت و نشد آگاہ عشق

اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ کر پیچھے پیچھے آؤ اس لئے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چلا، اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہو سکا۔(۱)

شیخ کامل

بیعت وصحبت کی اہمیت وضرورت ثابت ہو جانے کے بعد ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سالک مطمئن ہو جائے اور اس کی صحبت وتعلیم سے تقویٰ کی راہ طے کرے۔ ضرورت ہے کہ اس کے واسطے اعلیٰ درجہ کا دین دار ومتقی اور صالح ومصلح تلاش کیا جائے کیونکہ صحبت و بیعت کی تاثیر بیان کی جاچکی ہے، حدیث شریف میں ہے۔

عن ابی هریرة قال، قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: المرء علی دین خلیله فلینظر احدکم من یخالل۔(۲)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہئے کہ کس کے ساتھ دوستی کرے۔

جب معمولی دوستی کے اندر یہ اثر ہوتا ہے، تو شیخ اور استاذ سے تو اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے، اس کا کیا کچھ اثر ہوگا، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جس کے ساتھ جس قدر محبت وعقیدت ہوتی ہے، اسی اعتبار سے اس کے اعمال واخلاق کا اثر جلد اور محکم طور پر سرایت کرتا ہے، اگر خدانخواستہ پیر کا حال بہتر نہیں ہوا تو اس کے حال کی خرابی مرید میں بھی آئے گی، اس لئے تلاش مرشد میں بہت احتیاط کرنی چاہئے۔ ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے۔

شیخ کامل کی علامات

مشائخ محققین نے شیخ کامل کی کچھ علامات ذکر کی ہیں جن کو دیکھ کر شیخ کامل کو پہچانا جاسکتا ہے، حضرت تھانویؒ نے ان علامات کو اس طرح تحریر کیا ہے۔

---

(۱) شریعت وطریقت ص۶۲ بحوالہ تعلیم الدین۔ (۲) ابوداؤد و ترمذی۔

(۱) علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو، خواہ تحصیل سے، خواہ صحبت علماء سے، تاکہ فساد عقائد و اعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے ورنہ مصداق ؎

اوخویشتن گم است کرا رہبری کند کا ہوگا۔

(۲) عقائد، اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

(۳) تارک دنیا، راغب آخرت ہو، ظاہری و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔

(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔

(۵) بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو اور ان سے فیوض و برکات حاصل کیے ہوں۔

(۶) تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو، اور ان کی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۷) جو لوگ اس سے بیعت ہوں، ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔

(۸) اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

(۹) بہ نسبت عوام کے، خواص یعنی فہیم و دین دار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

(۱۰) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

(۱۱) خود بھی ذاکر و شاغل ہو، کیونکہ عمل یا عزم عمل کے بغیر تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

(۱۲) مصلح ہو نرا صالح ہونا کافی نہیں ہے، شیخ ہونے کے لئے دونوں کے جمع کی ضرورت ہے کہ صالح بھی ہو اور مصلح بھی ہو، تاکہ جو مرض باطنی بیان کرے اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے، اور جو علاج تجویز کرے اس سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جائے۔

جس شخص میں یہ علامات ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں، یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے یا نہیں، کیونکہ یہ امور لوازم مشیخت یا ولایت سے نہیں ہے، اسی

طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں، کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی میں سے نہیں ہے، اصل میں یہ ایک نفسانی تصرف ہے، جو مشق سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ کام غیر متقی بلکہ غیر مسلم بھی کرسکتا ہے، اور اس سے چنداں نفع بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے اثر کو بقا نہیں ہوتا، صرف مرید غبی کے لئے جو ذکر سے اصلا متاثر نہ ہوتا ہو چند روز تک شیخ کے اس عمل سے اس میں ایک گونہ تاثر و انفعال و قبول آثار ذکر کا پیدا ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لوٹ پوٹ ہی ہو جائے (۱)

کچھ ضروری اور مفید ہدایات

اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے، کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ، لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل و مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا، اسی طرح اگر شیخ کا انتقال قبل حصول مقصود کے ہو جائے یا ملاقات کی امید نہ ہو، جب بھی دوسری جگہ تلاش کرے، البتہ بلا ضرورت محض ہوسناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے، اور نسبت قطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے۔

شیخ کو سب سے افضل سمجھنا

مشہور ہے کہ اپنے پیر کو سب سے افضل سمجھے ظاہرًا اس میں اشکال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وفوق کل ذی علم علیم۔ ہر صاحب علم سے بڑھ کر دوسرا عالم ہے۔

اتنا سمجھے کہ میری تلاش سے زندہ لوگوں میں اس سے زیادہ نفع پہونچانے والا شخص مجھ کو نہیں مل سکتا۔ (۲)

ریاضات و مجاہدات

اہل تصوف کے یہاں تلاش مرشد کے بعد دوسرا اہم اور ضروری کام ریاضت و مجاہدۂ نفس ہے، اور یہ بات صرف اسی فن کے ساتھ خاص نہیں ہے، آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرنا چاہے بہرحال محنت وکوشش

(۱) شریعت و طریقت ص۶۴ بحوالہ تعلیم الدین۔ (۲) ایضًا۔

کلفت و مشقت اور جگر کاوی اور پتہ ماری سے چارہ نہیں، ایک کاشت کار سے لے کر ایک صاحب قرطاس و قلم تک جسے چاہیں دیکھ لیں، اگر کسی نے کوئی کمال حاصل کیا ہے تو استاذ کی رہنمائی کے بعد وہ مجاہدۂ و محنت ہی کا ثمرہ ہوگا، راتوں کو جاگنا، دن کو تھکنا، جسم کو مشقتوں کا عادی بنانا، سردی گرمی کی تکالیف کا سہنا، کھانے پینے کے معمولات کا گڑبڑ ہونا، کبھی فاقہ کی نوبت آجانا، کون سی ایسی مشقت ہے جو کسی اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انسان نہیں برداشت کرتا، تحصیل علم کے لئے علم کے شیدائیوں نے جو مجاہدے کئے ہیں، تاریخ کی داستانیں ان سے جگمگا رہی ہیں، یہ مجاہدہ کسی ایک علم کی خصوصیت نہیں ہے، تمام علوم کا یہی حال ہے، دنیاوی علوم میں اگر کوئی کسی کمال کا طالب ہے، تو اسے بھی محنت و مشقت کا وہی وطیرہ اختیار کرنا ہوگا، جو دینی علوم کے لئے اختیار کیا جاتا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کام کیلئے مجاہدہ مسلم، ہر کمال کے لئے تحمل کلفت عین کمال، لیکن اگر صوفیہ قرب خداوندی کیلئے مجاہدہ کا نام لیں تو مورد طعن! یہ کہاں کا انصاف ہے، دوسرے علوم و فنون کے لئے اگر کوئی استاذ اپنے شاگردوں سے محنت و مشقت لیتا ہے، اس کے لئے اپنے تجربے سے کچھ اصول و قواعد اور طریقے متعین کرتا ہے، تو کسی صاحب کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ اصول و قواعد کتاب و سنت اور سلف صالح سے منقول ہیں یا نہیں؟ اس میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ حصول علم کے لئے یہ بات متعین ہے یا نہیں، اگر معین ہے تو مضائقہ نہیں کہ وہ طریقہ مسلمانوں سے لیا گیا ہے، یا دوسری اقوام سے۔ لیکن مقاصد تصوف کو حاصل کرنے کے لئے اگر ضرورت کی بنا پر یا سہولت کے واسطے کچھ تجربہ کاروں نے کچھ مجاہدے یا ریاضتیں تجویز کیں تو فوراً سوال قائم کر دیا جاتا ہے کہ یہ طریقہ کتاب و سنت میں کہاں ہے، سلف صالح نے اس طریقہ پر کب عمل کیا ہے؟ یہ طریقہ تو جوگیوں سے لیا گیا ہے، یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے؟ وغیرہ ذٰلک من الخرافات۔[1]

---

(۱) بہت عرصہ سے شور مچایا جاتا ہے کہ تصوف، ہندوؤں کے جوگ کا مثنیٰ ہے، اور صوفیوں نے جوگیوں سے اعمال و اشغال حاصل کئے ہیں، پروپیگنڈہ خواہ کتنا ہی جھوٹا ہو، اس میں بڑی طاقت ہے، اچھے اچھے ذہن و دماغ اس شور و غوغا سے ماؤف اور بہتیرے کان اس چیخ و پکار سے بہرے ہو گئے ہیں، لیکن اس میں حقیقت کتنی ہے اس کا اندازہ کسی قدر خود اسی مضمون سے اور تفصیل سے دوسرے مضمون کے ذریعے ہو جائے گا۔ اللہ ہمارے ناقدین کو فہم سلیم دے۔

کتاب وسنت کی ساری مشق کے لئے بس تصوف غریب ہی رہ گیا ہے۔ باقی کہیں کتاب وسنت کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ وہ لوگ کرتے ہیں، جن کو کتاب وسنت کے حروف ونقوش کے علاوہ کسی اور چیز سے مس نہیں، جو حدیث لم یبق من القرآن الا رسمہ (قرآن کی صرف تحریر باقی رہے گی) اور لم یبق من الدین الا رسمہ (دین کا صرف نام باقی رہ جائے گا) کے مصداق ہیں، جن کی زندگیوں میں، ان کے مکان میں، ان کے لباس میں، ان کی اولاد میں، حتی کہ ان کے قلوب میں یہودیت اور نصرانیت بھری پڑی ہے، اور کتاب وسنت کا دور تک پتہ نہیں چلتا۔

وسائل ومقاصد کا فرق

یہ لوگ تصوف کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھتے وقت بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر یہ بات انہیں خوب یاد ہوتی ہے — کہ شریعت نے ان چیزوں کو بطور خود جو مقصود اور مطلوب ہیں متعین اور متشکل کر دیا ہے، لیکن ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کے ذرائع ووسائل میں وسعت کا راستہ اختیار کیا ہے، بعض مواقع پر تو شریعت نے مقصد کے ساتھ حصول مقصد کا بھی طریقہ متعین کر دیا ہے، اس میں تو تغیر وتبدیل ممکن نہیں، جیسے طہارت کے لئے پانی یا بوقت ضرورت مٹی کا استعمال، یا نماز کے اعلان کے لئے اذان پکارنا، کہ یہ ذرائع ہیں لیکن چونکہ حصول مقصود کے لئے شریعت نے انہیں ذرائع کو متعین کر دیا ہے اس لئے وضو کے لئے آدمی بجائے پانی کے کوئی اور سیال چیز استعمال کرے تو اس سے طہارت حاصل نہ ہوگی، اسی طرح نماز کی اطلاع عام کے لئے بجائے اذان کے اور کسی ذریعے سے کام لیا جائے، تو وہ درست نہ ہوگا۔

لیکن زیادہ تر مواقع میں شریعت نے حصول مقصود کا کوئی خاص طریقہ کار مقرر نہیں کیا ہے، زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے طریقۂ کار کے اخذ واختیار کا معاملہ اصحاب معاملہ کے سپرد کر دیا ہے، البتہ جواز وعدم جواز کی حدود متعین کر دی ہیں کہ ان سے خروج نہ ہو، جواز کے دائرہ میں رہتے ہوئے، مقاصد کے حصول کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ خاص طریقہ عہد نبوت میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس طریقے کو

کتاب و سنت سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا، جس طریقے کی اباحت کتاب و سنت سے ثابت ہو گئی، اس کو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے، مثلاً تحصیلِ علم، مقاصد شرعیہ میں سے ایک عظیم مقصد ہے لیکن اس کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ منضبط نہیں کیا ہے، آدمی کوئی بھی جائز طریقہ اختیار کرے، جس سے علم حاصل ہو جائے بس کافی ہے، اس میں اس اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کہ تم نے فلاں خاص طریق سے علم حاصل نہیں کیا ہے، اس لئے تمہارا علم معتبر نہیں، بس شرط یہ ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہو۔

البتہ اس مسئلہ میں حدود کی رعایت ضروری ہے، یعنی اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اسے ذریعے اور سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے۔ اس کو مقصود اور بالذات عبادت نہ بنا لیا جائے، ورنہ وہ بدعت قرار پائے گا، ذرائع میں بطورِ خود کوئی تقدس اور عبادت کا پہلو نہیں ہے، اگر ذرائع میں تقدس کا تصور ہے تو مقاصد کے اعتبار سے ہے۔ اگر کسی وقت ان سے مقصود کا حصول نہ ہو، یا کسی وجہ سے ان میں ضرر کا پہلو غالب ہو جائے، یا ان سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ تحصیل مقصود کے لئے از روئے تجربہ حاصل ہو جائے، تو بے تامل اول کو چھوڑ کر دوسرے ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ تصوف کا مقصود رضا رِ خداوندی اور اخلاقِ عالیہ کا حصول، رذائل سے اجتناب، دل میں یادِ الٰہی کا رسوخ اور عبادات میں ان کی روح یعنی خشوع و خضوع کا حصول ہے، ان مقاصد کے حصول کے لئے شریعت نے کچھ قواعد اور کچھ دستور اور طریقے متعین کئے ہیں ان کو نہ تو کبھی بدلا جا سکتا، اور نہ انہیں ترک کیا جا سکتا، یہ ذرائع قربِ رضار خدا سے تو ذرائع ہیں، ورنہ وہ بذاتِ خود مقصود اور عبادت ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، تلاوت و ذکر وغیرہ۔

لیکن ان مقاصد کے حصول اور ان کے مذکورہ بالا وسائل کو عمل میں لانے کی راہ میں بہت سے موانع پیش آتے ہیں، بہت سی رکاوٹیں اور اڑچنیں پڑتی ہیں ان موانع کو ہٹانے اور ان دقتوں کو دور کرنے کے لئے، کچھ تدبیروں اور کچھ معالجات کی ضرورت پڑتی ہے، شریعت

نے ان معالجات اور ان تدبیروں کو کسی خاص شکل میں متعین نہیں کیا ہے، انہیں تدبیروں اور انہیں معالجات کو اصطلاح صوفیہ میں "مجاہدات و ریاضات" سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ مجاہدات نہ عبادت ہوتے اور نہ مقصود، اگر کسی شخص کو بغیر مجاہدہ و ریاضت کے مقصود حاصل ہو جائے، تو اسے ان کی کچھ ضرورت نہیں، حضرات صحابہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ان اصطلاحی مجاہدات کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ان کے لئے نماز، روزہ، تلاوت قرآن، اور ذکر الٰہی ہی کافی تھے، ان کے بعد بھی خود صحابہ کی برکت، دنیا دارانہ ماحول کے مغلوب ہونے کی وجہ سے ان مجاہدات کی زیادہ ضرورت نہ تھی، مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نفوس پر دنیاداری اور غفلت کا غلبہ ہوتا گیا، اب نماز، روزہ، تلاوت وغیرہ سب باقی ہیں، مگر تزکیہ نفس اور خشوع و ادب کا پتہ نہیں ہے، اس غفلت کو دور کرنے کے لئے ماہرین مناسب مجاہدے تجویز کرتے گئے، آج بھی اگر کسی کی استعداد عالی ہو یا مرشد قوی تاثیر رکھتا ہو، تو زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

نفس و شیطان کی رخنہ اندازی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا تو فرشتوں کی طرح معصوم و بے خطا، اور خواہشات و شہوات سے مبرا نہیں پیدا فرمایا، اور نہ شیاطین کی طرح سراپا طغیان و بغاوت بنا کر رکھا، بلکہ آگ پانی مٹی ہوا کے امتزاج سے اس کا پتلہ اور ڈھانچہ بنایا، اور پھر اپنے امر خاص سے اس میں لطیف اور پاکیزہ روح ڈال دی، اس میں مذکورہ بالا چاروں عناصر کی خصوصیات بھی ہیں اور روحانیت و ملکوتیت کی بھی استعداد ہے، پھر دونوں استعدادوں کی امداد کے لئے اللہ نے دو مخلوق برپا کیں، آگ پانی، مٹی اور ہوا کے آمیزہ سے شہوات و خواہشات بھرا، نفس تیار ہوا، جو ہر وقت لذت کوشی و عیش پرستی کی جانب دوڑتا رہتا ہے، اس کی امداد کے لئے ابلیس اور اس کی ذریت ہے، اور روح لطیف کی امداد کے لئے ملائکہ کا لشکر ہے، ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک اور قوت ودیعت فرمائی جس کا نام "عقل" ہے، اور عقل کی رہنمائی وحی کے ذریعے کی، عقل ان دونوں جذبات میں اعتدال و توازن برقرار رکھتی ہے۔

غور کیجئے، اگر نفس کا میلان شہوات و معاصی کی جانب ہے، تو اس کو ہوا دینے والا ہے، اور اگر روح کا انجذاب حق تعالیٰ کی بارگاہ قدس کی جانب ہے، تو اس کی

مدد کے لئے جنود ملائکہ حاضر ہیں، انسان اس کشمکش میں گرفتار ہوتا ہے تو عقل، دونوں کے درمیان شریعت کی رہنمائی میں محاکمہ کرتی ہے، پھر نہ تو وہ اسے بالکل شیطان بن جانے دیتی، اور نہ انسانوں کی صف سے نکل کر فرشتہ بننے کی اجازت دیتی، پھر وہ انسان ہی رہ کر بارگاہِ قدس میں ترقی کرتا رہتا ہے، تاہم عام انسانوں کے حق میں نفس و شیطان کا پلہ بھاری رہتا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں، اول یہ کہ انسان بچپن سے بلوغ تک ایک ایسے عبوری دور میں ہوتا ہے جبکہ عقل نا پختہ اور شعور نابالغ ہوتا ہے اس دور میں روح بھی خوابیدہ اور نفس کے تابع ہوتی ہے، اس عبوری عہد میں نفس اپنی لذات و ضروریات پر لوٹتا رہتا ہے، اس عہد میں نفس کافی طاقتور ہوچکا ہوتا ہے، بلوغ کے وقت تک جبکہ اس کی عقل کامل ہوتی ہے، نفس کا غلبہ ہوچکا ہوتا ہے، اس عبوری مرحلہ کے گزرنے کے بعد وہ خدا کے احکام کا مخاطب ہوتا ہے، یہ احکام نفس کی عین ضد ہوتے ہیں کیونکہ نفس تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہے، اور احکام اسے پابند بناتے ہیں، پس وہ بغاوت کرتا ہے، اور شیطان اس کی مدد کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمانیات کا تعلق غیبی حقائق سے ہے، اور اعمال صالحہ کی بنیادیں بھی غیبی امور پر ہیں، اس کے برخلاف نفس اور طبیعت کے تقاضے اور خواہشات کا تعلق اس دنیائے حاضر کے ساتھ ہے، اور آدمی کی نہاد عاجلانہ ہے، پس عالم غیب سے اس کا تعلق ذرا مشکل سے قائم ہوتا ہے اور اس دنیا کے ساتھ جلد رشتہ جڑ جاتا ہے۔ اسی لئے بیشتر نفوس اپنی لذات و خواہشات میں منہمک ہوتے ہیں۔

اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ بجر اسے شریعت کی لگام پہنائی جائے، اگر وہ گناہ ہہ دوڑے تو اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں اس کے ملکات رذیلہ کو دور کیا جائے۔ خصائل حمیدہ کا اسے خوگر بنایا جائے۔ اور عبادت و طاعت کا ذوق اس کے اندر بیدار کیا جائے، یہی بنیاد ہے ریاضات و مجاہدات کی۔

مجاہدے کی اقسام

مجاہدات کی حقیقت اجمالاً واضح کر دینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے نزدیک جو ضروری مجاہدات ہیں، جن کے اختیار کئے بغیر حصول مقصود ممکن نہیں، ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کر دیا جائے۔ اس سے اندازہ

ہوجائے گا کہ صوفیہ کس قدر فطرت شناس اور روح ایمان کے کس درجہ عارف اور واقف کار ہیں ۔
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ:

" مجاہدے کی دو قسمیں ہیں، ایک مجاہدۂ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے، مثلاً تکثیر نوافل سے نماز کا عادی کرنا، اور روزے کی کثرت سے کھانے کی حرص وغیرہ کو کم کرنا۔

اور ایک مجاہدہ مخالفت نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضا کرے اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا۔

اصل مقصود دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے، اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کے لئے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو جائے گا، تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی، لیکن اگر کسی کو بغیر مجاہدۂ جسمانی کے نفس پر قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو مجاہدۂ جسمانیہ کی ضرورت نہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں، اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدۂ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ (۱)

مجاہدۂ جسمانی کے ارکان

حضرات صوفیہ کے نزدیک جسمانی مجاہدہ کے چار بنیادی ارکان ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی فن میں اعلیٰ کمال حاصل کرنے کے لئے ان چاروں مشقتوں سے گزرنا ناگزیر ہے اول قلت طعام، یعنی کم کھانا، کم کھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کھانا اتنا کم کھائے کہ اس کی طبعی قوت گھٹ جائے، کم کھانے کا وہی مطلب ہے، جسے اطبا صحت جسمانی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں، یعنی یہ کہ جب تک خوب بھوک نہ لگے، کھانا نہ کھایا جائے، اور جب تھوڑی بھوک باقی رہے، جبھی ہاتھ کھینچ لیا جائے، یہ تدبیر جہاں صحت جسمانی کے لئے اکسیر ہے صحت روحانی کے لئے بھی ناگزیر ہے، آدمی ہر وقت اناپ شناپ کھاتا رہے، یا ضرورت سے زائد پیٹ کو بھرتا رہے تو اخلاط میں اعتدال باقی نہیں رہتا، جس سے اگر اس کی جسمانی صحت متاثر ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ رطوبات فاسدہ کی کثرت کی وجہ سے قلب و دماغ تشویش

(۱) شریعت وطریقت صفحہ ۸ بحوالہ وعظ المجاہدہ۔

کی آماجگاہ بن جاتا ہے، جس سے دل کی یکسوئی باقی نہیں رہتی، جوکہ ایک ضروری چیز ہے۔

دوسرے قلت منام: کم سونا۔ اس سے بھی مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت سے زیادہ نہ سوئے، ضروری نیند جو چند گھنٹوں میں پوری ہو جاتی ہے، اس سے زیادہ سونے سے بلغم بڑھتا ہے، سستی پیدا ہوتی ہے، اور آدمی کاہل ہو کر رہ جاتا ہے۔

تیسرے قلت کلام: یعنی کم بولنا، اس مسئلہ میں تو شاید دنیا کے کسی عقل مند کو اختلاف نہ ہوگا کہ ضرورت سے زائد کلام کرنا ہر عملی مقصد کے لئے سخت مضر ہے، خاموشی سے بہتر وقت کو اور قوت کو بچانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

چوتھے قلت اختلاط مع الانام: یعنی لوگوں کے ساتھ کم سے کم تعلق رکھنا مطلب یہ ہے کہ آدمی زیادہ خلوت اختیار کرے، کسی کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے خلوت جس قدر ضروری ہے، اس سے کام کرنے والا ہر شخص واقف ہے۔

آدمی کا نفس ان چار چیزوں یعنی طعام، منام، کلام، اور اختلاط مع الانام کا حد درجہ حریص ہے، جب اس میں تقلیل کا ارادہ کیا جائے گا، تو شدید مشقت برداشت کرنی ہوگی، مگر یہ چاروں مجاہدے ایسے ہی ضروری ہیں، جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز ضروری ہے۔

حضرت حکیم الامت لکھتے ہیں کہ:

"جو شخص ان چاروں کا عادی ہو جائے گا، واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا" (۱)

مجاہدۂ نفس

مجاہدۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے تو اس کی مخالفت کی جائے، اسے زبردستی معصیت سے روکا جائے، اس میں نفس کو شدید کلفت ہوتی ہے، یہ مجاہدہ فرض ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے، اور نفس کو ڈھیل دے دی جائے تو وہ معاصی کا ارتکاب کر کے ہر وقت غضب الٰہی کو دعوت دیتا رہے گا، لیکن عین گناہ کی خواہش کے وقت نفس کو قابو میں کرنا ایسا مشکل امر ہے کہ اس میں کامیابی کی امید بہت کم ہوتی ہے۔ البتہ اگر پہلے سے اس کی تدبیر کی جائے تو اول تو تقاضائے معصیت

(۱) تعلیم الدین۔

کم ہوگا، اور اگر ہوگا تو اس کا مقابلہ آسان ہوگا، اس کی تدبیر کیا ہے۔ حضرت حکیم الامت کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:

"یہ بات اس وقت حاصل ہوگی جبکہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی کسی حد تک مخالفت کی جائے، مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش نہ پوری کی جائے، بلکہ اس کے تقاضے کو روک دیا جائے اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد اس کی جائز خواہش پوری کردی جائے، تاکہ نفس پریشان نہ ہوجائے، بلکہ اس کو کسی قدر خوش رکھا جائے، اور اس سے کام لیا جائے اس لئے کہ مزدور خوش دل کند کار بیش، تو جب مباحات میں مخالفت نفس کے عادی ہوگئے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہوگے، اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے، وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اس کو دبا نہیں سکتا۔" (۱)

مجاہدہ میں اعتدال

اعتدال اور توسط تمام دینی اعمال میں ضروری ہے، یہ بات مجاہدے میں بھی قابل لحاظ ہے، مجاہدے سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو مشقت کا عادی بنانا ہے، اور راحت و تنعم کی عادت سے باہر نکالنا ہے۔ اسی لئے حضرات مشائخ نے ازخود کوئی مجاہدہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:

"پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہئے، مگر اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کریں، بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کریں۔" (۲)

مجاہدہ درحقیقت معالجہ ہوتا ہے، اور علاج ہمیشہ مریض کی طبیعت، اس کی قوت اور اس کے مرض کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اس میں اس کی بھی رعایت ملحوظ ہوتی ہے کہ اس کو کس درجہ کی صحت و قوت مطلوب ہے، اس لئے جیسے ایک مریض کے علاج کو دوسرے مریض کے علاج پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ایک شخص کے مجاہدے کو دوسرے کے مجاہدے پر

(۱) تعلیم الدین۔ (۲) وعظ المجاہدہ۔ ایضاً

قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا، مثلاً ایک شخص کو نزکام ہے، اور دوسرے کو کینسر، نزکام کے مریض کا علاج سستا اور اس کا پرہیز معمولی ہوگا، اس کو شفا بھی جلد کے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کینسر کے مریض کا علاج گراں اور مشکل اور پرہیز سخت ہے اور صحت بھی بہت دیر میں حاصل ہوتی ہے دونوں ایک ہی طبیب کا علاج کرتے ہیں، لیکن دونوں کے علاج میں بہت فرق ہے۔

اسی طرح ایک عام آدمی ہے، اور ایک سپہ سالار افواج ہے، دونوں ایک مرض میں مبتلا ہیں۔ عام آدمی کو ہلکی دوا دی جاتی ہے، اور عام غذا تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو شفا حاصل ہو اور بقدر ضرورت طاقت حاصل ہو جائے۔ لیکن سپہ سالار کو اعلیٰ قسم کی دوا تجویز کی جاتی ہے تاکہ جلد صحت حاصل ہو۔ اور عمدہ قسم کی مقوی غذائیں اور طاقت کی دوائیں بتائی جاتی ہیں، تاکہ پوری قوت عود کر آئے، کیونکہ اس کا کام بڑا اور طالب مشقت ہے۔ پس اول کو معمولی شفا مطلوب ہے، اور دوسرے کو اعلیٰ درجہ کی شفا درکار ہے۔

ٹھیک یہی حال مجاہدات کا ہے۔ از خود اگر کوئی مجاہدہ اختیار کیا جائے گا تو نقصان کا اندیشہ ہے۔ اس کیلئے شیخ و راہبر کی ضرورت ہے، وہ موقع اور ضرورت کے مناسب مجاہدات تجویز کرے گا

بعض لوگ بزرگوں کے حالات کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان میں ان کے بعض مشکل اور سخت مجاہدات منقول ہیں۔ ان سے انہیں وحشت ہوتی ہے، انہیں خیال کرنا چاہئے کہ ان حضرات سے بہت بڑے بڑے کام لینے تھے، اس لئے ان سے مجاہدات بھی سخت کرائے گئے، ورنہ عام اور معمولی آدمیوں کے سلسلے میں ایسے مجاہدے منقول نہیں ہیں، یہ طبیب کی تجویز ہے، اس پر غیر طبیب کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

اور یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جن بزرگوں نے یہ مجاہدات کئے ہیں انہوں نے ان کے ذریعے بڑے بڑے کمالات حاصل کئے۔ انہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوا، لیکن آج کے باشندے، جن کو نہ ان مجاہدات کی ہوا لگی، اور نہ انہیں اپنے منہ زور نفس کو ہاتھ لگانے کا کبھی حوصلہ ہوا، انہیں ان مجاہدات پر اعتراض سوجھ رہا ہے۔ دوستو! اگر تم سے نہیں ہوتا، نہ کرو، مگر اعتراض تو نہ کرو۔

یہی حال امراض کے اعتبار سے علاج کا معاملہ ہے، کبھی مرض شدید ہوتا ہے تو علاج میں

بظاہر سختی ہوتی ہے، ناواقف اسے سختی کہتا ہے، مگر واقف کار اسے عین شفقت تصور کرتا ہے آخر ڈاکٹروں کے آپریشن اور چیر پھاڑ کو کون سختی کہتا ہے۔

مرض کی شدت اور علاج کی سختی

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سوانح حیات "تذکرۃ الرشید" میں حضرت کا ایک ملفوظ منقول ہے، فرماتے ہیں:

"اخلاق سیئہ بہت سے ہیں، مگر اکثر نے دس میں محصور کر دیا ہے، پھر ان دسوں کا خلاصہ تکبر کو بتایا ہے، اگر یہ دور ہو جائے تو باقی خود دور ہو جاتے ہیں، حضرت جنید بغدادی کے پاس کوئی آدمی بیس سال رہا اور ایک روز عرض کیا کہ حضرت اتنی مدت میں مجھے آپ سے کچھ حاصل نہیں ہوا، وہ شخص اپنی قوم کا سردار اور برادری میں ممتاز تھا، آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے، فرمایا اچھا ایک بات کرو، اخروٹوں کا ایک ٹوکرہ بھر کر خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ جاؤ، اور پکارو کہ جو شخص میرے ایک جوتہ مارے گا اس کو ایک اخروٹ دوں گا، اور جو دو مارے گا تو دو دوں گا۔ اسی طرح زیادہ کرتے چلے جاؤ، جب یہ کام کر چکو اور اخروٹ کا ٹوکرہ خالی ہو جائے تب میرے پاس آؤ، اس شخص نے کہا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ حضرت یہ کام تو مجھ سے نہ ہو سکے گا، حضرت جنید نے فرمایا کہ یہ وہ مبارک کلمہ ہے کہ اس کو ستر برس کا کافر صدق دل سے ایک مرتبہ پڑھ لے تو واللہ مسلمان ہو جائے گا مگر تو اس وقت اس کے پڑھنے سے کافر طریقت ہو گیا۔" (۱)

بزرگوں سے جو مجاہدات منقول ہیں، اگر ان میں ہمارے ذکر کردہ اس نکتے سے صرف نظر کر لیا جائے تو آدمی اعتراضات کی وادی میں جا گرے گا، اور محروم ہو گا، نگاہوں کے اس قصور نے بڑی محرومیاں پیدا کی ہیں اور بڑے فتنے اٹھائے ہیں۔ اللھم انا نعوذ بك من الفتن ما ظھر منھا وما بطن۔

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۱۳ ج ۲۔

اذکار - اشغال - مراقبات

مبادی تصوف میں تیسری اہم چیز اذکار واشغال اور مراقبات ہیں۔

اذکار ذکر کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت سے تو یہ مقاصد میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یاایہاالذین اٰمنوا اذکرواللہ ذکراکثیرا۔ (سورہ احزاب) اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بکثرت کرو۔

دوسری جگہ فرمایا۔

واذکر ربك فی نفسك تضرعا وخیفة ودون الجہر من القول بالغدو والآصال ولا تكن من الغافلین۔ (سورہ اعراف)

اور اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح وشام اور غافلوں میں سے مت ہو (بیان القرآن)

غفلت ذکر کی ضد ہے، غفلت حرام ہے، اور ذکر فرض ہے، اور یہ خود مطلوب ہے۔

لیکن دوسری حیثیت سے مقصود ومطلوب کے لئے معاون اور ذریعہ بھی ہے، منجملہ مقاصد شرع کے محبت الٰہی کی تحصیل بھی ہے، جس قدر اللہ کا ذکر کیا جائے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی، اور محبت کے بعد خدا کی اطاعت وبندگی پر دوام حاصل ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں خدا کا قرب میسر ہوگا، بزرگوں نے ذکر کو دونوں حیثیتوں سے اختیار کیا ہے، مقصود ہونے کے اعتبار سے یہ حضرات پوری زندگی کو ذکر سے سرشار کردینا چاہتے ہیں، جو "ذکر کثیر" کا اعلیٰ مصداق ہے، یہاں تک کہ ذکر کا رنگ ان پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا ہے، جیساکہ ایک حدیث میں نیک لوگوں کی علامت بیان کی گئی ہے کہ

اذاراوا ذکر اللہ۔ ــــــــ جب ان پر نظر پڑے تو اللہ یاد آئے۔

لیکن ذکر کا یہ رنگ آدمی پر چڑھے کیونکر؟ اس کے لئے بطور وسیلہ کے ذکر کو ہی استعمال کیا گیا اور اس طرح کے ذکر کے مختلف طریقے تجربے کی رو سے تجویز کیے گئے۔ ان کی خاص خاص تعداد متعین کی گئی، ان کی وضع اور ہیئت مقرر کی گئی، جہر اور سر کی حدیں بنائی گئیں، اور ان سے

کا حاصل یہ ہے کہ ذکر بعجلت اور بسہولت دل میں راسخ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث میں ذکر کا حکم مطلق ہے، اس مطلق حکم کی تعمیل کے لئے اگر کوئی خاص طریقہ بشرطیکہ وہ جائز ہو، وضع کیا جائے، اور اسے بطور وسیلہ کے عمل میں لایا جائے، اس طریقۂ خاص کو مقصود اور عبادت نہ قرار دیا جائے، تو اس میں اسی کو کلام ہو سکتا ہے، جو اصول شرع بلکہ اصول عقل سے بھی نابلد ہو۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضرات صوفیہ کبھی ذکر کا جہرًا حکم دیتے ہیں، کبھی اس کے لئے بیٹھنے کی کوئی خاص ہیئت بتاتے ہیں، اور حکم دیتے ہیں کہ مثلاً لاالٰہ پر سر اور گردن کو پیچھے لیجاؤ اور یہ خیال کرو کہ غیر اللہ کی محبت اور اس کا اثر دل سے خارج ہو رہا ہے، اور پھر الا اللہ کی ضرب دل پر لگاؤ کہ اللہ کا نور یا اللہ کی محبت دل میں پیوست ہو رہی ہے، یہ ضربیں متواتر اور مسلسل لگائی جاتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی مقصودیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت مستحکم ہو جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ طریق زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔ کبھی مشائخ ذکر قلبی تلقین کرتے ہیں، اور اس کے بھی مختلف طریقے ہیں، مثلاً یہ کہ خیال کرو کہ دل کی دھڑکنیں ناطق ہیں، اور اللہ اللہ کر رہی ہیں، یہ طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ ذکر کا رسوخ ہو جائے، کبھی پورے کلمہ لاالٰہ الا اللہ کی مشق کراتے ہیں، کبھی الا اللہ کی ضرب لگاتے ہیں، کبھی صرف اللہ اللہ رٹاتے ہیں، یہ سب تمرینات ہیں، اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ ان کے مختلف اثرات قلب پر مرتب ہوتے ہیں، یہ سب قلب میں ذکر کے رسوخ کے اسباب وذرائع ہیں، انہیں بدعت قرار دینا دینی اعتبار سے اپنے ذہنی افلاس کی خبر دینا ہے، ایک بچہ قرآن حفظ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جب تک وہ قرآن کے الفاظ اپنی زبان سے نہیں رٹے گا، کلمات قرآنی اس کی لوح دل پر نقش نہ ہوں گے۔ وہ کبھی پوری آیت دہراتا ہے کبھی ایک ہی لفظ کا تکرار کرتا چلا جاتا ہے، کیا اس کو بدعت کہا جائے گا۔

حضرات صوفیہ اللہ کے نام کو مختلف طریقے سے رٹاتے ہیں، یہ طریقے مقصود نہیں ہیں، مقصود یہ ہے کہ وہ نام دل میں راسخ ہو جائے، اسی کے لئے ضربیں لگواتے ہیں۔ اسی کے لئے خلوت میں بیٹھاتے ہیں، اسی کے لئے چلوں کا حکم دیتے ہیں، خدا کے نام میں جو برکت اور حلاوت

ہے، اس کے اثر سے رذائل فنا ہوتے ہیں، ایمان میں ترقی ہوتی ہے، دل نرم ہوتا ہے، ماسوی اللہ کی محبت دل سے زائل ہو جاتی ہے، غرض اس ایک نام کے رٹنے سے روح اسلام اور روح ایمان حاصل ہوتی ہے، اور یہی روح نہ حاصل ہو تو آدمی روح حیوانی رکھتے ہوئے مردہ ہے۔ حدیث میں ہے:

عن ابی موسیٰ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الذی یذکر اللّٰہ والذی لایذکر مثل الحی و المیت۔ (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو اللہ کو یاد کرتا ہے اور جو نہیں یاد کرتا، زندہ اور مردہ کی ہے

غرض یہ ہے کہ یہ تمرینات ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ آدمی کے رگ و ریشہ میں ذکر سرایت کر جائے، اور کوئی لمحہ اس کا غفلت میں نہ گزرے، چنانچہ صدیوں کا تجربہ یہی ہے کہ جس نے ان طریقوں کے مطابق کسی مرشد کامل کی رہنمائی میں ذکر اللہ کی مشق کی، اس کا پورا وجود ذکر الٰہی بن گیا، اس کا مشاہدہ اس کثرت سے ہے کہ اس کی تکذیب، تواتر کی تکذیب ہے اگر کسی کو تجربہ نہ ہوا ہو تو تجربہ کاروں کی بات کی تصدیق تو کرنی چاہئے، ہاں اگر کوئی، اس سے بہتر طریقہ ذکر الٰہی کے رسوخ کا لائے تو کیا مضائقہ ہے ؎ چشم ما روشن و دل ماشاد۔

لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ دوستوں نے تصوف پر تو تیشہ چلا دیا، مگر اس کا کوئی بدل نہ پیش کر سکے، جو دولت ہاتھ میں تھی اسے ضائع کر دیا، اور دوسری کوئی دولت عطا نہیں کی پس محروم تو کر دیا، اور محرومی کا کوئی علاج نہیں کیا۔

کہتے ہیں کہ اعمال مسنونہ کافی ہیں۔ اس میں کیا شبہ کہ وہ کافی ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اعمال مسنونہ کے جتنے مدعیان خام ہیں، ذرا سی ٹھیس میں ان کے تمام دعووں کی ہوا نکل جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت اور نظر کیمیا اثر حاصل تھی اس لئے ان کے لئے کسی مشق و مجاہدہ کی ضرورت نہ تھی آپ کی نظر کی تاثیر ہی سے قلوب کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی، لیکن اب جب کہ وہ دولت حاصل نہیں ہے، ذکر کے رسوخ اور دلوں کو نرمانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرورت پڑتی ہے، آج بھی مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی مرشد قوی النسبت اور زیادہ

موثر ہوا، تو اس کے مریدین و متوسلین کو زیادہ محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے کوئی بہت کامل اور اعلیٰ درجہ کا استاذ ہو تو طلبہ کم محنت کر کے بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ طریقے کہاں تھے؟ ہم عرض کریں گے کہ طرق اور ذرائع کے بارے میں یہ سوال بیجا ہے کہ حضور کے زمانے میں کہاں تھے؟ ذرائع ضرورت کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں آپ کی صحبت بابرکت کے ہوتے ہوئے ان طرق کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کے بعد ضرورت ہوئی ہے، جواز کی حدود میں رہ کر کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جہاد ایک شرعی فریضہ ہے، اس کی اقامت کے لئے ضرورت کے لحاظ سے جو چیز بھی جائز حدود میں ہو گی اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ذکر کے رسوخ کے لئے کوئی مناسب اور موثر طریقہ اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اشغال

"شغل" بھی صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دل کی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لئے کوئی عمل کیا جائے، تاکہ اس سے یکسوئی پیدا ہو، مثلاً لفظ اللہ موٹے حرفوں میں لکھ کر اس پر نگاہ جمائی جائے کہ پلک تک نہ جھپکے، اس سے قلب کو یکسوئی بھی حاصل ہوتی ہے اور اس پر کچھ ایسے اثرات بھی طاری ہوتے ہیں، جن سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے پھر قلب تشویشات سے خالی ہو کر ہمہ وقت متوجہ بحق رہتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اشغال کا مقصود اصلی یہ ہے کہ قلب کا انتشار جو بوجہ تشویش افکار کے ہے دفع ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو، تاکہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام الی اللہ جو کہ مبتدی کو بوجہ غیب ہونے مدرک کے، اور مزاحم ہونے افکار مختلفہ اور حیات حاضرہ کے متعذر ہے[1] سہل ہو جائے، اشغال مختلفہ اسی کے حیل (تدبیریں) اور طرق ہیں، نماز میں سترہ کا حکم اس عمل کا ماخذ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بتصریح علماء اسرار، مقصود سترہ سے بھی جمع خاطر اور ربط خیال و نفی انتشار ہے، جیسا کہ ابن ہمام

(۱) مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات چونکہ غیب ہے، اور انسان مشاہدات کا خوگر ہے پھر (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے، اور سترہ اس کی تدبیر ہے۔" (۱)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"غرض جتنے اشغال ہیں، وہ جمع خاطر ہی کے لئے ہیں، مقصود بالذات نہیں ہیں، اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے کہ جوگیوں تک سے بعض اشغال لئے ہیں، مثلاً حبس دم، جو جوگیوں کا شغل ہے مگر چونکہ ان کا مذہبی شعار نہیں ہے اور خطرات دفع کرنے کے لئے نافع ہے، اس لئے اس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے، اور اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور اس میں تشبہ ممنوع نہیں ہے، کیونکہ جو چیز کسی فرقہ کا نہ مذہبی شعار ہو اور نہ قومی، محض تدبیر کے درجے میں ہو، اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لئے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے، چونکہ حبس دم بھی دفع خواطر کے لئے محض ایک طبعی تدبیر ہے، اس لئے اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ یہ اخذ تدبیر میں ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں، اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے، یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا، محض ایک تدبیر تھی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔" (۲)

خوب یاد رکھیئے کہ شاذو نادر جو اشغال جوگیوں سے لئے گئے ہیں وہ نہ تو بعینہ ان کے طریق پر لئے گئے ہیں اور نہ ان پر مطلقاً عمل ہوتا، ان میں مشائخ نے تصرف کرکے انکی ہیئت تبدیل کردی ہے، مثلاً حبس دم کے جو طریقے جوگیوں میں مروج ہیں، ان میں سے کوئی ایک طریقہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یہ کہ قلب انسانی پر ہر وقت مختلف قسم کے افکار کی یورش رہتی ہے، اسلئے سالک مبتدی کو اللہ کی طرف توجہ تام نہیں ہوتی، اس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے، اور بہت سے لوگ اس کے دفعیہ کی تدابیر پوچھتے بھی رہتے ہیں لیکن جب اس کی تدبیر بتائی جاتی ہے تو سطحی علم رکھنے والے اسے بدعت کہہ کر بدکتے ہیں، اور محروم رہتے ہیں۔ فو یل لہم۔

(۱) شریعت وطریقت صـ۲۷۳، بحوالہ التکشف۔

(۲) شریعت وطریقت صـ۲۷۳۔

ہمارے یہاں معمول نہیں ہے، صرف معمولی درجے میں سانس روکنے کا عمل کیا جاتا ہے، تاکہ کسی قدر گرمی پیدا ہو کر فاسد رطوبات جل جائیں، اور اس سے یکسوئی پیدا ہو، پھر یہ کہ وہ بہت ناگزیر ضرورت کے وقت اختیار کئے جاتے ہیں، اور ہمارے مشائخ دیوبند نے تقریباً اسے بالکل ہی حذف کر دیا ہے۔

اشغال کی ضرورت

اشغال کی ضرورت کب ہوتی ہے، یہ بھی حضرت تھانویؒ کی زبانی سن لیجئے:

"ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت و خشوع معلوم ہوا اور وہ روزانہ بڑھتی جائے اور وساوس و خطرات میں کمی ہونے لگے، اور دل لگا کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں، اور ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی و خشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل کر لیا کرے۔" (۱)

مراقبات

مراقبہ بھی حضرات صوفیہ کی اصطلاحات میں سے ہے، اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا یا اس سے متعلق کسی اور مضمون کا اکثر احوال میں، یا کسی خاص محدود وقت میں دل سے پورے تدبر اور کامل غور و فکر کے ساتھ خیال جمانا، اور اس کا تصور بطور مواظبت کے رکھنا، تاکہ اس تصور کے غلبہ سے اس کے مقتضا پر عمل ہونا آسان ہو جائے۔ یہی عمل مراقبہ کہلاتا ہے مراقبہ کا فائدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ناقص اور ناتمام تصور، جو کبھی ذہن میں حاضر ہوتا ہے، اور بیشتر اوقات غائب رہتا ہے، یہ تصور راسخ ہو جائے، اسی رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

الاحسان ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك۔	احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے

اور فرمایا

احفظ اللہ تجدہ تجاھك۔	اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھو، اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔

(۱) شریعت و طریقت ص۲۴۲۔

دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بندے کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار رکھے، گویا اسے اپنے سامنے پا رہا ہے، اسے دیکھ رہا ہے، اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب اس کا گہرا تصور آدمی کو حاصل ہو، اس کے بغیر استحضار ناممکن ہے، اسی گہرے تصور اور کامل توجہ کو حاصل کرنے کیلئے مشائخ مختلف مراقبات تجویز کرتے ہیں۔ کبھی کسی خاص صفت کا مراقبہ تلقین کرتے ہیں، کبھی محض ذات کا مراقبہ، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار تام حاصل ہو جائے۔ (۱)

مشارطہ اور محاسبہ مراقبہ سے تعلق رکھنے والی دو چیزیں اور ہیں۔ ایک مراقبہ سے پہلے اور ایک مراقبہ کے بعد۔ مراقبہ سے پہلے مشارطہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ صبح اٹھ کر تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کو خوب فہمائش کرے کہ دیکھو فلاں فلاں کام کرنا، اور فلاں فلاں نہ کرنا، اس کے بعد دن بھر صبح کو دی ہوئی ہدایات کی نگرانی کرتے رہنا، اور جب دن ختم ہو، پھر سوتے وقت صبح سے شام تک جو اعمال کئے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لے جو کام نیک ہوئے ہوں، ان پر شکر الٰہی بجالائے، اور جو برے کام صادر ہوتے ہوں، ان پر نفس کو ملامت اور زجر و توبیخ کرے، اگر صرف زجر و توبیخ کافی نہ ہو تو کچھ سزا تجویز کر کے اس کو عمل میں لائے۔ اسی طریقۂ کار کو محاسبہ کہتے ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

ولتنظر نفس ماقدمت لغد۔ چاہئے کہ ہر شخص غور کرلے کہ کل کے لئے کیا کیا ہے؟ (۲)

مراقبات بہت سے ہیں، ان سب کا مقصود ایک ہے کہ حق تعالیٰ کی حضوری، ان کی محبت، ان کی یاد اور ان پر اعتماد کلی حاصل ہو جائے۔ اس استحضار سے بندے کو حق تعالیٰ سے حیا کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، جس کی برکت سے معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اور طاعات کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

یہ مبادی تصوف پر مجمل گفتگو کی گئی ہے۔ تفصیل کے لئے تو دفتر درکار ہے۔ لیکن اس سے اندازہ تو ہو ہی گیا کہ مقاصد تصوف کے حصول کے لئے جو تمہیدات و مقدمات تجویز کئے گئے ہیں اور ان کی افادیت و نافعیت پر صدیوں کا تجربہ شاہد ہے ان کو بدعات کے ذیل میں شمار کرنا، حقیقت ناشناسی کی دلیل ہے، البتہ ناقص متصوفین جب ان مبادی کو مقصود کے درجے پر

---

(۱) ماخوذ از شریعت و طریقت۔ (۲) ماخوذ از تعلیم الدین۔

رکھنا شروع کر دیں، تو یقیناً ان پر نکیر کی جائے گی۔ یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ان مبادی میں کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔ اگر ان کے علاوہ کسی اور چیز سے مقصود حاصل ہو جائے تو ان مبادی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مبادی کو عمل میں لائے بغیر مقصود کا حصول معتبر نہیں ہوگا یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے یہاں ایک مقولہ بہت رائج ہے۔

طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق۔ خدا تک پہونچنے کی راہیں مخلوقات کی سانس کے بقدر ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے، ایمان حاصل ہونے کے بعد خدا کے قرب و رضا کو حاصل کرنے کا کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں ہے، بے شمار ذرائع و وسائل کو کام میں لاکر خدا کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ صوفیہ کا متعارف طریقہ ہو یا کوئی دوسرا طریقہ!

تاہم یہ بھی مسلم ہے کہ حضرات صوفیہ کے متعارف طریقوں سے جس درجہ جذب وحضوری، اور یقین و توکل کا حصول ہوتا ہے، تجربہ سے ثابت ہے کہ دوسرے ذرائع اتنے مفید اور تام نہیں ہیں۔

توابع وثمرات

آدمی کسی فن میں کوشش اور محنت کرتا ہے، اس کے اندر کمال پیدا کرنے کی لگن میں رہتا ہے، اور اسے ہمہ وقت برتتا رہتا ہے، تو تجربہ ہے کہ اس کے اسرار و رموز اس پر کھلنے لگتے ہیں، وہ بڑے عجیب عجیب تجربات سے گزرتا ہے، جو باتیں پہلے اس کے وہم وگمان میں نہیں آتی تھیں، وہ اس کے تجربات و مشاہدات کے ذیل میں آکر بدیہیات وضروریات میں شامل ہو جاتی ہیں، یہ تجربہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، معمولی کاشت کاری و دست کاری سے لے کر اعلیٰ درجے کے علمی مشاغل تک کے ماہرین ان تجربات سے گزرتے ہیں۔

اسی طرح انسان جب اپنے باطن کی اصلاح اور نفس کے تزکیہ کی راہ پر قدم رکھتا ہے، وہ اپنی پوری ہمت اور طاقت کے ساتھ اپنے قلب کو ذکر کے نور سے روشن کرنا چاہتا ہے،

اور شب و روز اسی دھن میں لگا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو، اس کے وجود کو کچھ مخصوص نوازشوں کے ساتھ سرفراز کرتے ہیں، اس پر غیبی حقائق کا انکشاف ہونے لگتا ہے اگر اس کی دماغی استعداد عالی ہوتی ہے، تو قرآن و سنت کے اسرار و غوامض اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ اس کی طبیعت کا رنگ بدل جاتا ہے، ایک عام آدمی بھی وہی قرآن و حدیث پڑھتا ہے۔ اور یہ شخص بھی وہی قرآن و حدیث پڑھتا ہے، لیکن اول کے قلب پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اور اس کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے، دل شوق یا خوف سے معمور ہو جاتا ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑتی ہیں، ہر ہر آیت پر خدا سے نیا عہد و پیمان باندھتا ہے، غرضیکہ اسے کچھ ایسی خاص باتیں حاصل ہوتی ہیں جن کی دوسروں کو خبر نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک عالم تشریف لے گئے، رات کے سناٹے میں دیکھا کہ ذاکرین کی جماعت بیدار ہوئی، اور تہجد کی رکعتیں پڑھ کر لوگ اپنے اپنے اذکار میں لگ گئے پھر ان عالم کی آنکھوں نے دیکھا کہ کوئی رو رہا ہے، کسی کی چیخ نکلی جا رہی ہے، کوئی چپکے چپکے آنسو بہا رہا ہے، کوئی ساکت و صامت گردن جھکائے بیٹھا ہے، کوئی مناجات کرکے سو سو طرح اپنے رب کی خوشامد کر رہا ہے۔ انہوں نے صبح کو شیخ خانقاہ سے عرض کیا کہ یہی کلمہ میں بھی پڑھتا تھا۔ اور مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور یہی کلمہ دوسرے لوگ پڑھ پڑھ کر بے حال ہوئے جا رہے تھے، اس میں کیا راز ہے، شیخ نے اول تو ٹالا کہ یہ لوگ دل کے ضعیف ہیں۔ زود حس ہیں، وغیرہ، لیکن پھر ان کی درخواست پر انہیں بھی ذکر تلقین کیا، اس تلقین کے بعد جب وہ ذکر کے لئے بیٹھے تو مارے گریہ کے منھ سے کلمہ ادا نہیں ہوتا تھا، بعد میں آکر عرض کیا کہ میں سمجھ تو نہیں سکا کہ کیا بات ہے، مگر دل ہے کہ امنڈا چلا آتا تھا۔

ان کیفیات کو حضرات صوفیہ اپنی خاص اصطلاح میں "احوال" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ احوال محض فضل خداوندی سے نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے ملنے نہ ملنے میں بندے کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا، تاہم عموماً تجربہ یہی ہے کہ بندہ جب اپنے کو یاد الٰہی میں کھپاتا ہے تو اس کی استعداد و قوت کے بقدر ان مواہب سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

احوال رفیعہ

ہندوستان کے مایۂ ناز اور مشہور عالم و محدث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"جن لوگوں کو سکینہ پر دوام و استقامت نصیب ہوتی ہے انہیں یکے بعد دیگرے بلند احوال نصیب ہوتے رہتے ہیں، سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت سمجھے، اور یہ جان لے کہ یہ حالات اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی طاعت حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے، اور یہ کہ اس کا باطن نفس اور دل کی گہرائی طاعت الٰہی سے متاثر ہے" (۱)

شاہ ولی اللہ ایک ایسے عالم و محدث ہیں جن پر ہندوستان کے بیشتر علمی حلقوں کا اعتماد ہے، ان کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ صاحب سکینہ کو بہت سے بلند احوال حاصل ہوتے ہیں ان احوال کی قدرے تفصیل آگے آرہی ہے، لیکن ہمارے زمانے میں دینی اصطلاحات، اور دینی علوم سے اس قدر بعد ہوگیا ہے کہ اکثر اصحاب کے لئے لفظ "سکینہ" نامانوس ہوگا، اور بعض سطح بینوں، اور سرسری مطالعہ والوں نے اس باب میں بڑا مغالطہ پیدا کر رکھا ہے، کہ جہاں کوئی لفظ ان کی عقل و فہم سے بالاتر اہل علم کی کتابوں میں آیا، تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے قصور علم اور کوتاہیٔ نظر کا اعتراف کریں، ان الفاظ کو ہی بے معنی اور بے اثر بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، اس طرح آہستہ آہستہ وہ تمام الفاظ و اصطلاحات جو آج سے ایک صدی پیشتر نہ صرف یہ کہ مانوس تھے، بلکہ ناخواندہ حتی کہ غیر مسلموں تک میں متعارف تھے، آج پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ احوال کی قدرے تفصیل بیان کرنے سے پہلے لفظ سکینہ کی تشریح کردیں۔ اور یہ تشریح بھی ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ہی سے مستعار لیں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"تمام مشائخ کے طریقوں کا مقصد و منتہی ایک خاص نفسی کیفیت کا حاصل کرنا ہے جس کا نام ان کی اصطلاح میں "نسبت" ہے، کیونکہ یہ ہیئت نفسی درحقیقت

---

(۱) حضرت شاہ صاحب کا یہ مضمون، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی کتاب تصوف اور نسبت صوفیہ سے ماخوذ ہے، اصل کتاب القول الجمیل سے بھی اس کی مراجعت کرلی گئی ہے۔

انسان کا حق تعالیٰ کے ساتھ ربط وارتباط ہے، اسی کا نام سکینہ بھی ہے، اور اس کو نور بھی کہتے ہیں، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی میں یعنی اس کے نفس ناطقہ میں ایک ایسی کیفیت سرایت کر جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے ملائکہ کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، اور عالم بالا کے مشاہدہ کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس عبارت کی تشریح میں مشہور بزرگ عالم اور محقق شیخ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں:

"تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارات اور اذکار وغیرہ پہ مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے، اسی ملکہ کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے، اور حصول نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو اُدھر توجہ تام ہو گئی، اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا، ورنہ حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس ؛ ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال یعنی نسبت حاصل ہے جس کی نہ تو کیفیت کا بیان ہو سکتا، اور نہ کسی چیز پر اس کو قیاس کیا جا سکتا ہے" (۱)

چند احوال رفیعہ

مشائخ کو حصول نسبت کے بعد جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بہت سے بلند احوال حاصل ہوتے ہیں، جن کی عوام الناس کو تو ہوا بھی نہیں لگتی اور وہ علماء جو صرف علم کے ظاہر پر اکتفا کئے رہتے ہیں اور قلب و باطن کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ بھی ان میں سے اکثر محروم رہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان احوال رفیعہ میں سے چند ایک کو شمار کرایا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض احوال اپنے تعارف کے لئے مبسوط مقالہ چاہتے ہیں، کیونکہ ہمارے دور میں یہ چیزیں نامانوس اور اجنبی بن چکی ہیں، نہ صرف اجنبی بلکہ ستم ظریفوں نے اپنی کوتاہی عقل کی وجہ سے انہیں اعتراضات کا ہدف بھی بنا رکھا ہے، اسلئے

(۱) تصوف اور نسبت صوفیہ (مجموعۂ تالیفات ص ۱۴۳ ج ۴)

ضرورت ہے کہ ان کی حقیقت واضح کر دی جائے، لیہلك من هلك عن بينة و يحيى من حي عن بينة۔ لیکن اس مقالہ میں زیادہ بسط کی گنجائش نہیں، یونہی یہ مقالہ طویل ہوگیا ہے تاہم اختصار کے ساتھ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سالک کو حصول نسبت کے بعد ایک عظیم القدر حال یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ نفس کی شدید کشاکش سے نجات پاکر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دیتا ہے، اس کا ایک ہی مطمح نظر رہتا ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوجائیں اس کے لئے وہ سو طرح کے جتن کرتا ہے۔

(۲) اسی طرح اس کو ایک بڑی دولت یہ حاصل ہوتی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کے آثار قلب سے چھلک کر بدن اور دوسرے اعضا پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

(۳) صاحب نسبت کو حق تعالیٰ کی جانب سے رویا صالحہ (اچھے خواب) کی نعمت میسر آتی ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ نیک آدمی کا رویا صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد نبوت کے حصوں میں سے صرف مبشرات رہ جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب جسے کوئی نیک آدمی دیکھے، یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جاوے، چنانچہ حق تعالیٰ کے قول لہم البشری فی الحیوۃ الدنیا۔ میں بشریٰ کی تفسیر رویا صالحہ سے کی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح صاحب سکینہ کو اس دنیا میں فراست صحیحہ کی دولت حاصل ہوتی ہے یعنی دل میں ایسی بات کا آجانا جو حقیقت کے مطابق ہو، اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله۔ یعنی مومن کی فراست سے بچو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

(۵) صاحب نسبت کو ایک بڑا انعام حق تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ ملتا ہے کہ اس کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کو ایسی نسبت اور ایسا تعلق قائم ہوجاتا

ہے کہ وہ اپنی جس ضرورت کے لئے جہد ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتے ہیں۔

(۶) اسی طرح صاحب سکینہ کو ایک بلند حال یہ ملتا ہے کہ اگر اللہ پر توکل کر کے کسی بات پر قسم کھائے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری کر دیتے ہیں، جیساکہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

رب اغبر اشعث ذی طمرین لا یعبوبہ احد لواقسم علی اللہ لا برہ۔

یعنی بہت سے غبار آلود، پراگندہ بال پھٹے پرانے کپڑے والے، جن کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا لیکن اللہ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں۔

مطلب یہ ہے کہ ظاہر حال تو ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھانا گوارا نہ کریں، مگر خدا کے نزدیک ایسا درجہ کہ اگر کچھ زبان سے نکال دیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھنے کے لئے وہی کر دیتے ہیں۔

صاحب سکینہ کے ان احوال کا ذکر کر کے شاہ صاحب پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایسے احوال رفیعہ جو مذکور ہوئے، اور انہیں کے مانند دوسرے حالات عالیہ، یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے، اور اس کی طاعات عند اللہ مقبول ہیں، نور ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے، لہٰذا سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت سمجھے، کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل ہے" (۱)

یہ چند خدائی انعامات ہیں، جو حق تعالیٰ کی جانب سے صاحب نسبت کو ملتے ہیں، اتنے ہی پر بس نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی گنجہائے گرانمایہ ہیں، جن سے سالکین نوازے جاتے ہیں۔

---

(۱) مجموعۂ تالیفات مصلح الامۃ ص ۴۳۔

الہام مثلاً ایک بڑی نعمت ـــ جو اصحابِ نسبت کو ملتی ہے، وہ الہام ہے، الہام کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر نظر و استدلال کے اللہ تعالیٰ کوئی حقیقت بندے کے قلب میں القاء فرما دیں، یا کسی غیبی مخلوق کے ذریعہ اطلاع بخش دیں جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے لئے ارشاد ہے کہ

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ (سورۂ قصص)	ہم نے موسیٰ کی ماں کی جانب وحی کی کہ دودھ پلاتی رہو۔

یہ وحی باتفاق مفسرین الہام ہے۔ اسی طرح حضرت مریم کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے

واذ قالت الملائکۃ یٰمریم	جب فرشتوں نے کہا اے مریم

فرشتے کا حضرت مریم سے خطاب فرمانا الہام کی قبیل سے ہے، یہ دولت اللہ تعالیٰ صاحب نسبت بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

موطا امام مالک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے

انا عمر ولم احرص علی امرکم لکن المتوفی اوصیٰ الی بذلک واللہ الہمہ ذلک۔	میں عمر ہوں اور تم پر حاکم بننے کی مجھے خواہش نہ تھی، لیکن متوفی (یعنی ابوبکر) نے مجھے اس کی وصیت کی اور اللہ نے ان کے قلب میں اس کا الہام فرمایا۔

کشف الہام اور فراست سے مشابہ ایک اور بڑی نعمت اہل نسبت کو میسر آتی ہے وہ کشف ہے، کشف کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے قلب میں عالم غیب کی اشیاء منکشف ہو جائیں اور وہ انھیں اس طرح دیکھے جس طرح ظاہری آنکھوں سے دنیا کی چیزیں دیکھتا ہے، بخاری و مسلم میں حضرت انس بن نضر کا قول مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ انی لاجد ریحھا من دون احد میں جبل احد کے پیچھے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔ اس روایت کی شرح میں امام نووی فرماتے ہیں

محمول علی ظاہرہ وان اللہ اوجد ریحھا من موضع المعرکۃ۔	یہ روایت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی خوشبو میدان جنگ میں محسوس کرا دی۔

غزوۂ احد ہی کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ احد میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں دو شخص سفید لباس پہنے ہوئے بہت سخت لڑائی لڑ رہے تھے میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا یعنی جبرئیل ومیکائیل علیہما السلام ۔ (بخاری ومسلم)

دنیا میں جنت کی خوشبو پالینا اور فرشتوں کو جو غیبی مخلوق ہیں دیکھ لینا ان کا تعلق کشف سے ہے

کشف کی قسمیں کشف کی دو قسمیں ہیں. کشفِ کونی وکشفِ الٰہی، کشف کونی کا مطلب یہ ہے کہ زمان ومکان کی دوری صاحب کشف کے لئے حجاب نہ رہے کسی چیز کا حال معلوم ہوجائے، اور کشف الٰہی یہ ہے کہ علوم واسرار اور حقائق ومعارف خواہ سلوک کے متعلق ہوں یا حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق اسکے قلب پر وارد ہوں، یا عالم مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر مکشوف ہوں، اور واردات غریبہ ومواجید مثل ذوق وشوق، محبت وانس وہیبت وانکشاف اسرار احکام وحسن معاملہ فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ وغیرہ فائز ہوں، جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہے

علوم کشفیہ کا درجہ کشف والہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے. اگر شرعی قواعد کے مطابق ہے تو قابل عمل ہے ورنہ واجب الترک ہوگا. حقائق ومعارف بھی وہی قبول ہیں جن کو شریعت رد نہ کرے، رسالہ قشیریہ میں ابو سلیمان دارانی کا قول منقول ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نکتہ اسرار صوفیہ میں سے آتا ہے مگر میں اس کو بلا دو عادل گواہوں کے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے قبول نہیں کرتا، اور ابو حمزہ کا قول ہے ۔

کل باطن یخالفہ الظاھر فہو باطل جو باطن کہ ظاہر کے خلاف ہو وہ باطل اور مردود ہے ۔[۱]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرات صوفیہ کے بیان کردہ حقائق ومعارف جہاں بظاہر کسی ظاہر نص سے ہٹے ہوئے نظر آئیں، تو فوراً ان کا انکار کردیا جائے، اس میں بہت تامل اور احتیاط سے کام لینا چاہئے. بعض اوقات آدمی کسی آیت یا حدیث کا صحیح مطلب نہیں سمجھ پاتا، اور اپنے ذہن ودماغ سے اس کا کوئی مطلب اخذ کرلیتا ہے. اور پھر اسی کو معیار بنا کر علماء وفقہاء کے اقوال

---

[۱] عنوان "الہام" سے ہے تک شریعت وطریقت سے ماخوذ ہے جو حضرت تھانوی کے افادات وتالیفات سے مرتب کی گئی ہے

کو رد کرتا ہے، اور بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ میرا استدلال قرآن وسنت سے ہے حالانکہ اس کا حاصل مستدل اس کی اپنی فہم ہے، یہ مصیبت ہمارے اس زمانہ میں بہت عام ہے عموماً لوگ سنجیدگی اور عقلی توازن کے ساتھ قرآن وحدیث پر غور نہیں کرتے، یہ لوگ دوڑتے بھاگتے مختلف مشاغل اور گوناگوں افکار وخیالات میں گرفتار سرسری نظر سے کسی آیت یا حدیث کا کوئی مفہوم اخذ کرلیتے ہیں بس اسی کو حرف آخر سمجھ کر قرآن وحدیث کا درجہ دیدیتے ہیں، حالانکہ یہ ان کا قصور فہم تھا اس ذہنی طغیانی نے نہ جانے کتنے حقائق وعلوم کو فنا کرکے رکھ دیا ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی مشائخ اور صوفیہ کی زبان نہیں سمجھتا یہ حضرات کوئی لفظ بولتے ہیں اور اس کا کوئی مخصوص معنی ان کے نزدیک متعین ہوتا ہے، لیکن پڑھنے اور سننے والا اس کا اصطلاحی معنی نہیں جانتا وہ اس لفظ کو اسکے لغوی یا عرفی معنی میں مراد لے لیتا ہے اور غلط فہمی کا شکار ہوجاتا ہے ایسی غلطیاں ہر فن میں غیر اہل فن سے ہوتی رہتی ہیں اور اہل علم ان کی تصحیح کردیا کرتے ہیں مگر اہل تصوف پر اس باب میں بہت ظلم ہوا ہے لوگ تصوف کے حقائق ومسائل سے عموماً آگاہ نہیں ہیں یہ لوگ تصوف کی اصطلاحات کو کسی اور معنی میں لے کر اس کی تردید کرنے لگ جاتے ہیں۔

اسلئے خوب غور کرلینا چاہئے کہ محققین صوفیا ومشائخ جنھوں نے اپنی تمام تر زندگی اپنے سارے اوقات اور اپنا دل ودماغ، جسم واعضاء اور ذہانت وذکاوت بلکہ تمام راحت وآرام رضاء الٰہی کیلئے قربان کردیا ہے، ان کی زبان وقلم سے نکلا ہوا کوئی علم آسان نہیں ہے کہ اسے رد کیا جائے اگر کہیں اشکال ہو تو رد کرنے سے پہلے غور وتامل سے اس کا مطلب سمجھ لینا چاہیئے، اہل فن سے پوچھ لینا چاہئے تاکہ اس کے سمجھنے میں کوئی تصور واقع نہ ہو، پھر بھی دیکھ لینا چاہئے کہ قرآن وحدیث کی جس نص سے یا قاعدے سے ہم اسے رد کر رہے ہیں اس کا بھی وہی مفہوم ہے جو ہم نے سمجھا ہے جب اس کا خوب اطمینان ہوجائے اور علماء فن سے اس کی تصدیق ہوجائے تب رد کرنے میں کوئی حرج نہیں ورنہ ان حضرات کے مقابلے میں اپنے کو قصور فہم اور قلت تتبع کے ساتھ متہم کرنا زیادہ مناسب ہے، مخلص اہل علم کو اس کا خوب تجربہ ہے کہ بعض اوقات قرآن واحادیث کے ظاہر سے ایک مفہوم ذہن میں آتا ہے، مگر جب کوئی محقق اور دقیقہ رس صاحب علم اس کا صحیح مفہوم بیان کرتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سمجھا گیا تھا وہ کس قدر بے بنیاد تھا۔ واللہ الموفق۔

****



تصوف ایک تعارف SUFISM

مولانا اختر امام عادل، دارالعلوم حیدرآباد

یوں تو تصوف اپنی روح اور اصل کے اعتبار سے عہد نبوی ہی سے موجود ہے، تصوف ہی کی دوسری تعبیر حدیث میں احسان کے لفظ سے کی گئی ہے۔ مگر باقاعدہ تصوف اور صوفیاء کی اصطلاح اور مستقل ایک روحانی جماعت کی شکل اسے اس وقت حاصل ہوئی جبکہ عہد صحابہ کے بعد عالم اسلامی میں فتوحات کی کثرت اور دولت کی فراوانی کے نتیجے میں عام طور پر لوگ ذہنی تعیش، راحت پسندی، فکری اضمحلال اور تہذیبی نمائش کے شکار ہونے لگے اور مسلمانوں کے اندر سے وہ اسلامی روح رخصت ہونے لگی جو مومن کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ نجات ہے۔ ایسے وقت میں ایک ردعمل کے طور پر صوفیہ تحریک اٹھی اور بہت تیزی کے ساتھ عالم اسلام کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔

اس تحریک میں بنیادی اہمیت اس کو دی گئی کہ محنت و مشقت اور ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ تزکیۂ نفس اور اصلاح حال کیا جائے۔ اور پھر اسی زینے سے اللہ کی معرفت حاصل ہو، اور کشف و مشاہدات کے دروازے کھلیں اس میں علمی اور استدلالی بحث و نظر کی قطعاً گنجائش نہیں رکھی گئی، بلکہ علم کو اس راہ کے لئے حجاب اکبر قرار دیا گیا۔

تصوف کی اصطلاح، ماخذ اور حقیقت

تصوف کے بارے میں اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ اصطلاح کہاں سے لی گئی؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاریخ نگاروں اور اہل تحقیق کی رائیں علم و تاریخ کے مختلف زاویوں کو چھو رہی ہیں مثلاً۔

(۱) بغداد کے مشہور مورخ علامہ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کا خیال یہ ہے کہ صوفیہ کی نسبت زمانۂ جاہلیت کے ایک صوفہ نامی آدمی کی طرف ہے، اس کا اصلی نام غوث ابن المرتھا، مگر صوفہ کے نام سے وہ مشہور تھا، ابن جوزی کے اس قول کی وجہ نہ معلوم ہوسکی کہ دورِ جاہلیت کے ایک شخص کی طرف تصوف کی نسبت کس بنا پر کی گئی؟ کیا اس صوفہ نامی آدمی کا ریاضت و مجاہدات کے میدان میں کوئی کردار تھا؟ یا جو لوگ صوفیہ تحریک اٹھانے میں پیش پیش تھے ان کا اس شخص سے کوئی نسلی تعلق تھا؟

(۲) قدیم مورخین میں البیرونی اور جدید تاریخ نگاروں میں فون ھامرکی رائے یہ ہے کہ صوفیہ یونانی لفظ سوفیا سے بنا ہے، یونانی زبان میں سوفیا کے معنی عقل و حکمت کے ہیں اس توجیہ سے ان حضرات کے موقف کی تائید ہوتی ہے جو اس کے قائل ہیں کہ اسلامی تصوف دراصل افلاطونی فلسفے کی شاخ ہے۔

لیکن یہ فہم سے بالاتر چیز ہے کہ مسلمان صوفیار نے اپنی جماعتی اصطلاح کے لئے عربی لغات کے وسیع ذخیرے سے کیوں استفادہ نہیں کیا؟ اور اس غرض سے ان کو یونان کی خاک کیوں چھاننی پڑی؟ اسلامی فلسفہ میں انھوں نے کیا نقص محسوس کیا؟ کہ فلسفۂ افلاطون میں انھیں پناہ ڈھونڈنی پڑی، فیہ ما فیہ۔

(۳) ایک رائے یہ بھی ہے کہ صوفیہ صوف سے بنا ہے، چونکہ اس وقت کے فقرار عموماً صوف کے کپڑے پہنتے تھے، اس لئے وہ صوفیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

(۴) کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ صوفیہ صفۃ المسجد النبوی سے بنا ہے، عہد نبوی میں مسجد نبوی سے متصل صفہ ایک چبوترہ تھا، جہاں دنیا سے بے تعلق فقرار صحابہ عبادت میں مشغول رہتے تھے، صوفیار نے اپنی جماعت کو اسی صفہ کی طرف منسوب کیا۔

(۵) ایک خیال یہ ہے کہ صوفیہ صفا سے مشتق ہے چونکہ یہ مردان با صفا کی جماعت تھی اس لئے صوفیہ کہلانے لگے۔

(۶) بعض اس طرف گئے ہیں کہ صوفیہ صف اول سے بنا ہے، چونکہ ان کا خیال تھا کہ جو شخص تقرب الی اللہ کی غرض سے اس جماعت میں شامل ہوگا وہ انشاء اللہ جنت کے مستحقین

کی صف اول میں شمار کیا جائے گا۔

تصوف کی حقیقت

(۱) حضرت ابوسعید الخزاز فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کا دل آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو جس میں خدا کی معرفت کا نور جھلکے جسے ذکرِ الٰہی میں وہ لذت حاصل ہو جو دنیا کی کسی چیز میں نہ مل سکے۔

(۲) ابو محمد الجریری (م ۳۱۱ھ) کہتے ہیں کہ تصوف اخلاق حسنہ کے اپنانے اور عاداتِ بد کے ترک کرنے کا نام ہے۔

(۳) ابوبکر الکتانی (م ۳۲۲ھ) فرماتے ہیں کہ تصوف و فا، قلب اور انوار الٰہی کے مشاہدے کا نام ہے۔

(۴) جعفر الخلدی (م ۳۴۸ھ) فرماتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ انسان اپنے کو بندگی کے لئے وقف کردے اور بشری تقاضوں سے بے نیاز ہو کر حق عزّ اسمہ کی طرف نگاہ جمادے۔

(۵) شیخ شبلی کا فرمان ہے کہ تصوف کا آغاز اللہ کی معرفت سے ہوتا ہے اور اس کی انتہاء توحید کی منزل ہے۔

(۶) الرسالۃ القشیریۃ کے مصنف علامہ قشیری لکھتے ہیں کہ تصوف و تقویٰ مشتبہ چیزوں کے چھوڑ دینے کا نام ہے۔

مذکورہ بالا اقوال کی روشنی میں تصوف کی بنیادی تصویر سامنے آجاتی ہے، اور یہ بھی پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ صوفیہ اگر کوئی تحریک تھی جیسا کہ بعض تاریخ نگاروں کا کہنا ہے تو یہ کسی دنیوی مفاد پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کی منزل وہی تھی جس کو حدیث احسان میں بیان کیا گیا ہے۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (الحدیث)

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو پھر اگر تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے تو کم از کم یہ خیال تو ضرور قائم رہے کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے صوفیاء کرام کے مذکورہ بالا اقوال کو جو مناسبت ہے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے

تصوف کی اہم ترین شخصیات

تصوف کی اصطلاح اور اس کی حقیقت سے روشناس

ہونے کے بعد آئیے ایک نظر ان شخصیات پر ڈال لیں جو تصوف میں کردار کی حیثیت رکھتی ہے ان شخصیات کے مقام و مرتبہ کے تناسب سے تصوف کی اہمیت کا اندازہ کرنا بھی آسان ہوگا۔

① **رابعہ بصریہ رح** اسلامی تصوف کی یہ وہ مایۂ ناز خاتون ہیں، جن کی نظیر انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے ایک ایسی خاتون جس نے اپنی تمامتر خواہشات اور تقاضوں کو پامال کرکے زہد و تقویٰ کا وہ مقام حاصل کیا کہ بہت سے مردوں سے بھی آگے نکل گئیں، عشق الٰہی کا وہ چراغ ان کے سینے میں روشن تھا جو اندھیروں کے دبیز سے دبیز پردے کو بھی چاک کرنے کے لئے کافی تھا، انھوں نے محبت الٰہی کی شمع اس وقت جلائی تھی جب کہ اسلامی فتوحات، دولت کی بہتات اور فتنوں کی رہ رہ کر اٹھان نے لوگوں کے ذہنوں کو آلودہ کردیا تھا اور تاریکیاں دن بدن گہری ہوتی جارہی تھیں، ان باطنی کمالات کے ساتھ وہ صوفیانہ ادب میں بھی سند کا درجہ رکھتی ہیں، ان کا کلام کھوکھلی شاعری اور نرے ادب سے الگ ایک چیز تھی، ان کے کلام میں وہ تاثیر تھی جو نغمۂ داؤدی کی یاد تازہ کرتی تھی۔

ان کی وفات کے بارے میں مختلف تاریخیں ملتی ہیں، ۱۳۵ھ، یا ۱۸۰ھ یا ۱۸۵ھ، ان کی وفات سے نسوانی تاریخ میں جو خلا پیدا ہوا وہ آج تک پُر نہ ہوسکا ان کے بعد امت ایسی ماؤں کے لئے ترس گئی جن کے سینے میں لخت جگر کی محبت سے زیادہ محبتِ الٰہی کا طوفان اپنی تاثیر دکھاتا ہو۔

② **ابراہیم ابن ادہم رح** ابراہیم ابن ادہم صرف تاریخی شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل تاریخ کا نام ہے وہ صرف عہد ساز نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی تعبیر تھے، اقوام و ملل کی تاریخ میں ایسی مثالیں نایاب ہیں کہ یاد الٰہی کی طلب نے کسی کو تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کردیا ہو، مگر ہاں امت محمدیہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم ایک ایسی ہی مثالی شخصیت تھے جن پر صرف امت محمدیہ نہیں بلکہ پوری تاریخ بھی ناز کرے تو کم ہے جنھوں نے محض اللہ کی محبت کی خاطر تاج و تخت پر لات ماردی تھی، اور صحرا و بیابان کی راہ لی تھی، پھر زہد و تصوف کی راہ سے وہ روحانی اور ابدی حکومت حاصل کی تھی جس کا دائرہ محدود انسانیت تک نہیں بلکہ پوری کائنات پر محیط تھا مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ

جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔ جب خدا اس کا ہے تو خدا کی پوری کائنات اس کی ہے۔ آپ کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔

۳ سفیان ثوریؒ

حضرت سفیان ثوریؒ صف اول کے صوفیا میں ہیں جن کو علم کے ساتھ زہد کی دولت بھی حاصل تھی، لوگ عام طور پر سفیان ثوری کو ایک فقیہ اور مجتہد امام کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ علم کے ساتھ زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت کے بھی امام تھے۔ انھی کا یہ مشہور فرمان جگہ جگہ تصوف کی کتابوں میں ملتا ہے۔

"کہ زہد دنیا سے اپنی تمام امیدیں منقطع کر لینے کا نام ہے، کھردرا کپڑا پہننے یا جبہ و دستار کی بندش کا نام نہیں"

آپ کی زندگی ان تمام علماء کیلئے مینارۂ نور ہے، جو علم کے ساتھ احسان کی منزل کے بھی طلبگار ہیں، آپ کی ولادت ۹۷ھ اور وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔

۴ ذوالنون مصریؒ

حضرت ذوالنون مصریؒ صرف زاہد فقیر نہیں بلکہ مستقل مدرسۂ تصوف تھے، یہ وہ شخصیت تھی جس نے تصوف میں مستقل باب معرفت کی بنیاد ڈالی، ان کا کہنا تھا کہ مجھے رب کی معرفت اپنے رب ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی، اگر رب مددگار نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

معرفت کا یہ وہ راز تھا جس کا انکشاف سب سے پہلے ذوالنون مصری کی زبانی ہوا، رب کو رب ہی کے ذریعہ پہچاننا ایک ایسی منزل ہے جہاں برسوں کی ریاضت کے بعد بھی انسان مشکل ہی سے پہونچتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری قبطی النسل تھے، بعض روایات کے مطابق ان کا شجرہ نوبی خاندان سے ملتا تھا، آپ کی وفات ۲۴۵ھ میں ہوئی۔

۵ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ

حضرت جنید بغدادی نسبی اعتبار سے نہاوند سے تعلق رکھتے ہیں آپ کی ولادت عراق کے تاریخی شہر بغداد میں ہوئی اور وہیں آپ نے پرورش پائی، آپ حارث المحاسبی کے خصوصی شاگرد تھے آپ نے تصوف و معرفت کی دنیا میں ایسے پائیدار اور روشن نقوش چھوڑے ہیں جن سے

رہتی دنیا تک رہنمائی اور روشنی حاصل کی جاتی رہے گی، جنید بغدادی کا نام سنتے ہی تصور میں زہد وتقویٰ کی وہ مثالی منزل جھلکنے لگتی ہے، جہاں تک رسائی کے لئے تخیل کو بھی کافی گردش دینے کی ضرورت پڑتی ہے، حضرت جنید بغدادی کا یہ مشہور مقولہ صوفیا کی زبان زد ہے کہ

"تصوف یہ ہے کہ حق کے ساتھ انسان کو ایسی محویت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول جائے، اس کا وجود بھی حق کی راہ میں فنا ہوجائے، پھر اسے بقاء باللہ کی منزل نصیب ہوجائے۔"

جب آپ سے ان اہل معرفت کے بارے میں سوال کیا گیا جن پر استغراق کا ایسا غلبہ ہو کہ ظاہری اعمال خیر بھی ان سے متروک ہوجائیں تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

"کہ یہ لوگوں کی نگاہ میں خواہ کتنا ہی بعید ہو، مگر میرے نزدیک یہ بہت بڑا مقام ہے اور جو لوگ ان اہل معرفت پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ میرے نزدیک زناکاروں اور چوروں سے بھی بدتر ہیں"

آپ ۲۹۷ھ میں اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے۔

۶ بایزید بسطامی رح

حضرت بایزید بسطامی کے دادا مجوسی اور والد زردشت مذہب کے ماننے والے تھے مگر اللہ نے ان کو ایمان ومعرفت کے نور سے نوازا، پھر وہ اس میں اس قدر آگے گئے کہ روحانی دنیا کے تاجدار بن گئے تصوف کی کتابیں ان کے واقعات، کرامات اور اقوال سے بھری ہوئی ہیں، تصوف کی کتابوں میں جب سلطان الاولیاء کا لقب آتا ہے تو عام طور سے اس سے مراد حضرت بایزید بسطامیؒ ہی ہوتے ہیں۔

انہی کے بارے میں وہ مشہور واقعہ کتابوں میں موجود ہے کہ ایک بار وہ ایک بہت ہی مشہور بزرگ کے پاس بڑی عقیدت کے ساتھ ملنے گئے مگر جب وہ ان کے آستانے پر حاضر ہوئے تو بزرگ محترم کو قبلہ کی طرف تھوکتے دیکھا، اس منظر کو دیکھتے ہی وہ الٹے قدم لوٹ گئے، اور بزرگ کو سلام تک نہ کیا، ان سے جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو حسرت آمیز لہجے میں کہا:

• کہ جب یہ شخص دربار رسالت کا ادب شناس نہیں ہے تو اس کے بارے میں آخر کیسے باور کرلیا جائے کہ یہ اپنے دعویٰ ولایت میں صادق ہوگا۔

یہ عشق کا بڑا اعلیٰ مقام ہے جس کی خواجہ بایزید بسطامی بات کررہے ہیں، ورنہ عوام تو کیا خواص کو بھی ان چیزوں کی تمیز نہیں رہتی، تھوکتے وقت کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ میرا رخ قبلہ کی طرف تو نہیں ہے؟ اور اسی طرح روضۂ اقدس بھی ہے ؎

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے ایک تاریخ ۲۳۴ھ ہے اور دوسری ۲۶۱ھ ہے

۷۔ منصور الحلاج رح

آپ کا پورا نام ابومغیث الحسین ابن منصور الحلاج ہے، ولادت فارس میں ۲۴۴ھ میں ہوئی، آپ کے دادا زردشت مذہب کے ماننے والے تھے، آپ کی تربیت عراق کے مشہور شہر واسط میں ہوئی۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت ایسے تہ در تہ پردوں میں مستور ہے کہ ان کی حقیقت تک رسائی بہت مشکل ہے، خدا نے ان کو کس منزل کا مسافر بنایا تھا اس کو وہی لوگ جانیں جو ایسی منزلوں کا سفر کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اسی ابہام کا اثر ہے کہ آج بھی کچھ لوگ ان پر نکتہ چینی کررہے ہیں اور خود ان کی زندگی میں بھی لوگ ان کو نہ سمجھ سکے، ان کی اداؤں کے رموز و اسرار سے واقف نہ ہوسکے، ان پر کفر کا فتویٰ لگادیا گیا، ان پر چار ایسے زبردست الزامات تھے کہ جن کی صفائی منصور نہ کرسکے اور نہ کرنے پر وہ قادر تھے بالآخر وہی ہوا جو شریعت کا فیصلہ تھا، ان کو تختۂ دار پر لٹکادیا گیا، اور ایک نامعلوم منزل کا مسافر، عشق کی بے تاب کروٹیں بدلتا ہوا ۳۰۹ھ میں ابدی نیند سوگیا۔ ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

ان پر لگائے گئے چار الزامات یہ تھے۔

(۱) ان کا تعلق باطنیہ نواز ایک مشہور شیعہ فرقہ قرامطہ سے تھا۔

(۲) ان کی زبان سے اکثر انا الحق کا جملہ نکلتا تھا جسکے ظاہری معنی ہیں کہ میں خدا ہوں۔

(۳) ان کے معتقدین ان کو خدا تصور کرتے تھے اور اس پر وہ خاموش رہتے تھے۔
(۴) حج کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ ایسا فرض نہیں ہے جس کو ادا کرنا ضروری ہے۔

۸ حجۃ الاسلام ابو حامد الغزالیؒ

امام غزالی کا شمار کبار صوفیاء میں ہوتا ہے، بلکہ ان کو معرفت کا امام قرار دیا گیا ہے، ان کی ولادت ۴۵۰ھ کو خراسان کے مشہور شہر طوس میں ہوئی، آپ نے جرجان اور نیشاپور کا سفر کیا، نظام الملک سے گہرے روابط کی بنا پر بغداد کے سب سے بڑے جامعہ مدرسہ نظامیہ میں تدریس پھر صدارت کا منصب حاصل کیا، اس مدرسہ میں رہ کر آپ نے اسلام کی وہ مثالی خدمات انجام دی ہیں جسے تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی، مدرسہ میں قرآن وحدیث فقہ وکلام کا درس دینے کے علاوہ آپ نے فلسفۂ یونان اور فرقہ باطنیہ کا ایسا تاریخی تعاقب کیا ہے جس نے فلسفہ اور باطنیت کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا، آپ کی مایۂ ناز کتاب تہافت الفلاسفہ نے علمی دنیا سے وہ زبردست خراج تحسین وصول کیا ہے جو اس موضوع کی بہت کم کتابوں کو حاصل ہوا، مدرسہ نظامیہ کے پورے دورِ قیام میں امام غزالی کی شخصیت ایک متکلم اسلام، دین کے زبردست سپاہی اور ملت کے جانباز مجاہد کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی تھی، لیکن ایک عرصہ تک منطق وفلسفہ کی گتھیاں سلجھانے اور فقہ وکلام کی باریکیاں سمجھانے کے بعد ان کے اندر ایک عجیب وغریب ذہنی انقلاب پیدا ہوا، ان کے اندر خلق بیزاری اور خدا طلبی کی کیفیت پیدا ہوئی اور مرکز علم وفن بغداد جیسا ثقافتی وتاریخی شہر انھیں ایک ویران قبرستان محسوس ہونے لگا، بغداد کی پر رونق آبادی اور فلک بوس عمارتیں انھیں بیابان کے کھنڈرات سے زیادہ وحشتناک معلوم ہونے لگیں، ان کو خلوت ویکسوئی کی ضرورت تھی جو اس گنجان شہر میں انھیں میسر نہ ہو سکتی تھی، آخر ایک دن وہ کسی طرح شہر سے نکلے اور صحرا وبیابان کی راہ لی، اسی کے بعد ان کا وہ یادگار سفر شروع ہوا جس میں وہ دمشق پہنچے دمشق کی جامع مسجد کے ایک منارے میں اعتکاف کیا، پھر وہاں سے مجنونانہ انداز میں بیت المقدس پہونچے، انبیاء کے اس مقدس شہر اور مسلمانوں کے قبلۂ اول میں نہ معلوم انھوں نے کیا کیا حاصل کیا، کافی دنوں ٹھہرنے کے بعد جب عشق نے اجازت دی تو وہ وہاں سے گرتے پڑتے حجاز پہونچے اور خانۂ کعبہ کی زیارت کے بعد آستانۂ رسالت پر حاضر ہوئے

پھر وہ کن کیفیات اور حالات سے دوچار ہوئے وہ جانیں اور ان کا خدا جانے، مدینہ طیبہ کی نہر سلسبیل سے جب عشق کی آگ میں کچھ ٹھنڈک آئی، تو وہ اپنے وطن واپس ہوئے وطن کے علم دوستوں سے ملاقات ہوئی تو اپنے دس سالہ سفر کے تجربات کا نچوڑ "احیاء علوم الدین" کتاب کی شکل میں پیش کیا، جب ان سے ان کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کا راز دریافت کیا گیا تو انھوں نے "المنقذ من الضلال" جیسی قیمتی کتاب لکھ کر اس راز کا انکشاف کیا۔

غرض امام غزالی صرف تصوف نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی ان عظیم ہستیوں میں تھے جن کی زندگی انقلابات سے بھرپور اور عبرتوں سے معمور تھی، وہ دین حق کے روشن چراغ تھے جس سے نہ معلوم کتنے چراغوں نے روشنی حاصل کی یہ چراغ مسلسل پچپن سال تک جلتا رہا اور صفحہ گیتی پر اپنی روشنی بکھیرتا رہا، مگر دیکھتے ہی دیکھتے ۵۰۵ھ میں یہ چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا مگر اس کا نور آج بھی اہل معرفت کے دلوں کا طواف کررہا ہے، وہ اب پھر کسی بیت المقدس کے راہی اور دمشق کے مسافر کا طلب گار ہے جس کے سینے میں وہ ایک ایسی امانت بن کر رہ سکے

۹ ابوالفتوح شہاب الدین السہروردی

ان کی پیدائش ۵۴۹ھ میں ایران کے ایک مقام سہرورد میں ہوئی، یہ مستقل ایک سلسلۂ تصوف کے امام اور بانی ہیں جو سلسلۂ سہروردیہ کے نام سے مشہور ہے، ان کا رجحان اشراقی فلسفہ کی طرف تھا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اشراقی فلسفہ کے ایک مدرسہ کی حیثیت ان کو حاصل تھی۔

ان کی زندگی کے حالات ایسے پیچ در پیچ اور واقعات کے نشیب وفراز اتنے عجیب تھے کہ اصل حقیقت تک پہونچنا عام نگاہوں کے لئے مشکل ہوگیا، چنانچہ ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو راہ حق کے دیوانوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے، حق کے فرزانوں کی تاریخ نے اپنا سبق دہرایا اور دار ورسن کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، حضرت شہاب الدین سہروردی پر علماء حلب کی جانب سے قتل کا فتویٰ صادر کیا گیا اور اس فتوی کے مطابق سوریا کے مقام پر ۵۸۷ھ میں اس شہید ناز نے اپنی جان پائے نازنیں پر نچھاور کردی، ابھی وہ عمر کی

رف ۳۸ بہاریں دیکھ پائے تھے کہ ان کو خزاں کی گود میں ہمیشہ کے لئے سلادیا گیا۔

حضرت سہروردی نے فلسفہ اشراق اور تصوف کے موضوع پر چند کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں حکمۃ الاشراق، ہیاکل النور، التلویحات العرشیہ اور المقامات خاص شہرت کی مالک ہیں۔

۱۰: شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ ان کی ولادت ۵۶۰ھ میں اندلس کے اندر ہوئی، بعد میں اندلس سے رخصت ہو کر مصر چلے گئے تھے، مصر کے قیام کے زمانے میں حج کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ حج کے لئے روانہ ہوئے، حجاز پہونچکر حج کیا، حج سے واپسی میں بغداد تشریف لائے، بغداد میں کچھ دنوں ٹھہر کر دمشق کو آخری مستقر کی حیثیت دی، اخیر عمر تک وہیں رہے، وہیں وصال ہوا اور خاک دمشق کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئے، شیخ اکبر ایک مستقل فلسفہ تصوف کے امام کی حیثیت رکھتے ہیں، وحدۃ الوجود کا نظریہ تو انہی کی جانب منسوب ہی ہے گروہ اولیاء سے ان کو خاتم الاولیاء کا خطاب دیا گیا، یہ بھی راہ حق کے ان دیوانوں میں سے تھے جن کے عشق کی داستان دلدوز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معمہ بن گئی تھی معرفت کی منزل کا یہ منتہی مسافر کس کس مقام کی بات کرتا تھا وہ عام فہم سے بالاتر بات تھی، ان کے "انسان کامل" کے نظریے نے تو علم و آگہی کی دنیا میں ہلچل ہی مچادی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس نظریے کی بنیاد اس پر تھی کہ ایک انسان پر جب وحدانیت کی منزل میں استغراقی کیفیت غالب ہو جاتی ہے تو اس بات کے روشن امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس انسان کے اندر خدائی صفات کا ظہور ہونے لگے۔

یہ معرفت کا غالباً وہی مقام ہے جس کی نشاندہی ایک حدیث قدسی میں کی گئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ میری طرف ایک ہاتھ آتا ہے، تو میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں، اور بندہ جب چل کر آتا ہے تو میں دوڑ کر آتا ہوں، پھر وہ میری عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اسکا ہاتھ میرا ہاتھ، اسکا پاؤں میرا پاؤں اسکی آنکھ میری آنکھ اس کی زبان میری زبان ہو جاتی ہے پھر اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ درحقیقت خدا کی زبان سے صادر ہوتا ہے

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ومارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمیٰ الآیۃ۔ اور آپ نے نہیں پھینکا جس وقت آپ نے پھینکا تھا، بلکہ اللہ نے پھینکا تھا۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ شیخ اکبر کے اس نظریہ پر وہ شور وغوغا مچا، اور ایسی ہنگامہ آرائی ہوئی کہ چشم فلک نے کسی عارف اور عاشق حق کے خلاف کم اس قسم کی معرکہ آرائی دیکھی ہوگی، ان پر کفر وشرک کے فتوے لگائے گئے، ان کو آزمائشوں میں ڈالا گیا انھی آزمائشوں سے دوچار ہوتے ہوئے آخر کار ۶۳۸ھ میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے حریفوں کی بزم سے رخصت ہوگئے اور اپنے پیچھے اس حسرت آمیز صدا کی ابدی گونج چھوڑ گئے ؎

مجھ سا مشتاق نہ پاؤگے زمانے میں کہیں
گرچہ ڈھونڈوگے چراغ رخ زیبا لیکر

شیخ اکبر ایک عارف وزاہد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ مصنف بھی تھے، مختلف موضوعات پر آپ کی کتابوں کی تعداد چار سَو تک پہونچتی ہے، جن میں روح القدس، ترجمان الاشواق، الفتوحات المکیہ اور فصوص الحکم شہرۂ آفاق کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۱ ابوالحسن الشاذلیؒ

حضرت ابوالحسن شاذلیؒ ۵۹۳ھ میں مرسیہ کے قریب ایک گاؤں کے اندر پیدا ہوئے، بعد میں وہ تونس منتقل ہوگئے تھے وہیں سے ان کو کئی بار حج کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، پھر عراق چلے گئے اور اخیر تک وہیں رہے عراق ہی سے ایک بار حج کا سفر کر رہے تھے کہ عیذاب کے جنگل میں ۶۵۶ھ کو وہ آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

آپ ایک مستقل سلسلہ تصوف شاذلیہ کے امام اور بانی ہیں، آپ کی طرف بے شمار کشف وکرامات منسوب ہیں، آپ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ۔

"ہم اللہ کو ایمان ویقین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے ہمیں دلیل وبرہان کی روشنی میں خدا کو پہچاننے کی ضرورت نہیں"

۱۲۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، آپ پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ صوفیاء میں کم ہی کسی پر اتنا لکھا گیا ہوگا، آپ کی ولادت جیلان میں ۴۷۰ھ میں ہوئی اور ۵۶۱ھ میں وفات ہوئی آپ کا مزار مبارک بغداد میں مرجع خلائق بنا ہوا ہے، آپ مستقل سلسلۂ تصوف قادریہ کے امام اور بانی ہیں آپ بلندپایہ ولی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے زبردست عالم دین بھی تھے، آپ کو علوم عصریہ پر بھی مکمل دستگاہ حاصل تھی، تقریر و خطابت میں آپ کی کوئی مثال نہ تھی بلکہ تاریخ نے آپ کے جلسۂ خطابت کی جو رپورٹ محفوظ کی ہے اس کی روشنی میں تو آج تک آپ جیسا سحر البیان خطیب پیدا نہ ہوا، آپ کی کرامات بے شمار ہیں، صوفیاء نے آپ کو چار اساسی اقطاب میں سے پہلے درجے کا قطب تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو انچاس اولادیں عطا فرمائی تھیں، جن میں سے گیارہ لڑکوں نے اپنی زندگیاں قادری سلسلے کے فروغ و اشاعت ہی کے لئے وقف کر دیں، اور کہنا چاہیئے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات اور اصول کی غیر معمولی وسعت و پھیلاؤ میں جہاں شیخ کے کبار خلفاء کا زبردست ہاتھ ہے وہیں آپ کی صلبی اولاد کا بھی شالی کردار رہا ہے، اللہ حضرت شیخ، ان کی ذرّیات اور ان کے تمام متعلقین و متوسلین پر اپنے بے پناہ رحمتوں کی بارش فرماتے آمین۔

ع :- خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را ۔

۱۳ احمد الرّفاعیؒ

آپ کا نسبی تعلق عرب کے قبیلہ بنی رفاعہ سے تھا اور اسی لئے رفاعی آپ کی شہرت کا جزو بن گیا ہے، تصوف میں آپ کی جلالت شان اور علو مرتبت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ صوفیاء کے نزدیک چار اساسی اقطاب میں آپ دوسرے درجہ کے قطب مانے گئے ہیں، آپ نے ریاضت و مجاہدہ اور زہد و تقویٰ میں اتنے مبالغہ سے کام لیا کہ آپ کا زہد ضرب المثل بن گیا، آپ کی کرامات بہت ہیں آپ مستقل ایک سلسلۂ تصوف رفاعیہ کے امام اور بانی کی حیثیت سے معروف ہیں۔

ایک طویل عرصہ تک لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا، یہاں تک کہ وقت موعود آپہونچا ۵۸۰ھ میں پورے عالم اسلامی کو عموماً اور تصوف کو خصوصاً آپ سوگوار چھوڑ گئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

۱۴۔ شیخ احمد البدوی

آپ مصر کے سب سے بڑے ولی کی حیثیت سے خاص امتیاز رکھتے ہیں، آپ کی ولادت ۵۹۶ھ میں مصر کے مقام فاس میں ہوئی، خدا نے آپ کو حج کی سعادت سے نوازا، حج سے فارغ ہوکر عراق تشریف لائے اور عراق کے مشہور مقام طنطا پر مستقل مقیم ہو گئے یہاں تک کہ ۶۳۴ھ میں طنطا ہی کی خاک کی امانت بن گئے آپ کا مزار مقصود خلائق بنا ہوا ہے۔

دنیائے تصوف میں آپ کو چار اساسی اقطاب میں تیسرے درجے کا قطب قرار دیا گیا ہے زہد وتقویٰ اور دنیا بیزاری میں آپ تاریخی حیثیت کے حامل ہیں، آپ نے اپنے کو عبادات الٰہی کے لئے وقف کر دیا تھا، زندگی کی سب سے بڑی نعمت نکاح سے بھی اپنے کو محروم رکھا تھا آپ احمدیہ سلسلۂ تصوف کے امام و پیشوا ہیں، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ فقر و غنا، زہد وتوکل اور تصوف وتقویٰ کے ساتھ آپ اپنے وقت کے ایک ممتاز شہسوار بھی تھے، تاریخ کے مطابق مصر و عراق میں آپ کی شہ سواری کا جواب نہ تھا، موجودہ زمانے میں عالم اور مجاہد، صوفی اور بہادر، شیخ اور سپاہی، اور بزرگ اور راہ جنگ متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی عالم بھی مسند تدریس پر فائز رہتے ہوئے ایک بہترین شہسوار ہوسکتا ہے اور کوئی شیخ وقت بھی، وقت آنے پر خانقاہ کی مسند بیعت وارشاد چھوڑ کر میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھا سکتا ہے؟ مگر امام الطریقت شیخ احمد بدوی کو اللہ نے انھی متضاد کمالات کا حامل بنایا تھا، جن کی مثال تاریخ بار بار پیش نہیں کر سکتی ہے

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

۱۵۔ ابراہیم الدسوقیؒ

آپ کی ولادت ۶۳۳ھ میں ہوئی آپ دسوقیہ سلسلے کے امام اور بانی ہونے کے ساتھ ساتھ چار اساسی اقطاب میں چوتھے درجے کے قطب بھی ہیں، آپ جس طرزِ اصلاح اور طریقِ تعلیم کے حامل اور داعی تھے، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی، آپ زندگی کی تمام لذتوں سے دستبردار ہوجانے کی دعوت دیتے تھے، اور خود اس کی واضح مثال تھے۔ آپ کے فیض سے پورا عالم مستفید ہو رہا تھا، آپ کے وجود سے

پوری دنیا کے تصوف میں ایک خوشگوار حرکت تھی، ۱۳۷۶ھ میں یہ حرکت اچانک بند ہوگئی اور وہ زاہد اکبر جنھوں نے اپنے کو زندگی کی تمام لذات سے بے نیاز کرلیا تھا ایک وقت آیا کہ خود زندگی کی بھی انھیں ضرورت نہ رہی، اور یہ امانت، مالکِ امانت کے سپرد کرکے بقاء کی اس منزل کی طرف چل پڑے جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آسکتے ہیں، وہ ہمیشہ کے لئے اس ڈوبتی اور ابھرتی دنیا کو بے سہارا چھوڑ گئے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۱۶ - خواجہ بہار الدین نقشبندیؒ

آپ کا پورا نام شیخ بہار الدین محمد ابن محمد البخاری ہے، آپ کی ولادت بخارا میں ۶۱۸ھ میں ہوئی، آپ ایک مشہور سلسلۂ تصوف نقشبندیہ کے امام اور بانی ہیں اور اسی لئے نقشبند آپ کے نام کا جزو بن گیا ہے، آپ شاہ نقشبند کے لقب سے جتنی جلد پہچانے جاتے ہیں اتنی آسانی سے نام کے ذریعہ نہیں، آپ کی عظمت ومنزلت کا اندازہ آپ کے اس جملے سے ہوتا ہے جو ہر نقشبندی بزرگ کے لئے ایک وظیفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

"جہاں عارفین وکاملین پہونچ کر رک جاتے ہیں اور اس سے آگے بڑھنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی وہیں سے میرے سفرِ معرفت کا آغاز ہوتا ہے۔"

اس جملے میں وہ کس مقام کی بات کرگئے ہیں اس سے تو وہی لوگ واقف ہوں گے یا ہوسکتے ہیں جنھیں کبھی ایسے سفر کا اتفاق یا سعادت حاصل ہوئی ہو، حضور کی یہ حدیث ایسے ہی بزرگ علماء کی سوانح دیکھ کر یاد آتی ہے جس کے الفاظ میں اگرچہ کچھ کلام ہے مگر معنی بالکل صحیح ہیں کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل الحدیث: "میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کے مانند ہیں۔"

آپ ۷۹۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئے مگر آپ کا سلسلہ، آپ کی تعلیمات اور آپ کی یادیں آج تک زندہ ہیں، ایسا لگتا ہے کہ شاہ نقشبند کہیں نہ کہیں زندہ موجود ہیں۔

"لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء ولکن لا تشعرون ٥

" جو لوگ اللہ کی راہ میں مرتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم ان کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتے "

تصوف کی اہم شخصیات کی فہرست یہیں پر ختم نہیں ہوتی، صوفیاء اور بزرگانِ دین کے تذکروں سے درجنوں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ مجھے ان تمام فہرستوں کا احاطہ مقصود نہیں ہے اور نہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش ہے، میں تصوف کے تعارف کے ذیل میں کم از کم ان شخصیات کا ذکر ضروری سمجھتا تھا جن کے بغیر تصوف کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اور جن پر تصوف میں غلو کرنے کا الزام ہے، ورنہ تصوف کی روح کے اعتبار سے تو ہر مومنِ صالح اپنے وقت کا بہترین صوفی ہے۔

افکار و تعلیمات

کسی بھی جماعت کے مخصوص افکار و نظریات اس کے تعارف کی راہ میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے آئیے تصوف کے کچھ مخصوص افکار و خیالات، تعلیمات و اصلاحات پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لیں تا کہ صوفیہ تحریک کی تہ اور اس کے حقیقی خط و خال تک ہم پہونچ سکیں۔

(۱) ـــ صوفیاء کا خیال ہے کہ دین کے دو رخ ہیں، شریعت اور حقیقت

۱ :- شریعت دین کے ظاہری حصے کا نام ہے، اور یہ ایسا دروازہ ہے جس میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جس نے کلمۂ توحید کا دل سے اقرار کیا ہو۔

۲۔ مگر حقیقت، دین کی اس روح کا نام ہے جس تک رسائی ہر ایک کیلئے ممکن نہیں، یہ نہاں خانۂ فطرت کا وہ راز سربستہ ہے جسے سوائے اہلِ ریاضت و تقویٰ کے کوئی نہیں پا سکتا۔

(۲) ـــ صوفیاء کی نگاہ میں تصوف، طریقت اور حقیقت کے مجموعے کا نام ہے۔

(۳) ـــ تصوف کے لئے روحانی قوت اور باطنی تاثیر ضروری ہے جو شیخِ طریقت کے واسطے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴) ـــ اس راہ کے مسافروں کے لئے ذکر و فکر اور مراقبہ ضروری ہے، مراقبہ کا مطلب یہ ہے

کہ اپنی پوری ذہنی قوت ملاء اعلیٰ کی طرف مرکوز کردے اور اوپر سے انوار و تجلیات کے نزول کا انتظار کرے، صوفیاء کے نزدیک یہ وہ مقام ہے جو صرف اولیاء کو حاصل ہوتا ہے ۔

(۵) :۔ صوفیاء شرعی احکام کی پوری پابندی کو لازم قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک شریعت حقیقت سے مقدم ہے، شریعت میں جو ناقص ہوگا اسے طریقت میں بھی ناقص قرار دیا جائیگا وہ اس معاملے میں اسی طرح سخت ہیں جس طرح کہ اہل شریعت علماء ـــــ شریعت کے احکام اور امر و نواہی کی ان کے نزدیک کیا اہمیت ہے ؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے صوفیاء کرام کے چند اقوال نقل کر دینا مناسب ہوگا ۔

۱ :۔ حضرت سہل التستری رحمہ فرماتے ہیں: "طریقت کے لازمی اصول سات ہیں، قرآن پر مضبوطی سے قائم رہنا، سنت نبوی کی پیروی کرنا، حلال کھانا، ایذا رسانی سے بچنا، گناہوں سے پرہیز کرنا، توبہ کا التزام کرنا، حقوق کی ادائیگی میں سستی نہ کرنا۔"

۲ :۔ حضرت ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں: "جب تمھارا کشف کتاب وسنت کے کسی حکم سے ٹکرا جائے تو کتاب وسنت کو تھام لو اور اپنے کشف کو دیوار پر مار دو۔"

۳ :۔ حضرت شاذلی رحمہ ہی فرماتے ہیں: "جب کوئی صوفی پنج وقتہ با جماعت نماز کا پابند نہ ہو تو ہرگز قابل توجہ نہیں، وہ کسی لائق نہیں ہے۔"

۴ :۔ حضرت بایزید بسطامی رحمہ فرماتے ہیں: "کسی شخص کے کشف و کرامات کو دیکھ کر متاثر نہ ہوجانا اگر کوئی شخص ہوا میں بھی اڑتا ہوا دکھائی دے تو اس اڑان کو دیکھ کر فریب نہ کھانا تمھارے نزدیک معیار یہ ہونا چاہئے کہ قرآن و حدیث کے اوامر و نواہی اور شریعت کے احکام کا وہ پابند ہے یا نہیں؟ شریعت کے حدود سے اس کے قدم تجاوز تو نہیں کر گئے ہیں؟ اگر وہ شریعت کا پابند ہے تو ولی ہے ورنہ اس کی کرامات شیطانی خرافات اور کید و فریب کے سوا کچھ نہیں۔" ـــــ حضرت بایزید بسطامی رحمہ ہی کا قول ہے کہ۔

۵ :۔ اگر کوئی آدمی اپنی جائے نماز پانی پر بچھا دے اور فضا میں چار زانو بیٹھ جائے تو بھی اس وقت تک فریب میں نہ آنا جب تک کہ یہ جائزہ نہ لو کہ وہ شریعت کے معاملے میں کیسا ہے

۶ :۔ امام غزالی رح فرماتے ہیں :۔ اگر تم کسی ایسے انسان کو دیکھو جو ہوا میں اڑتا، اور پانی پر چلتا ہو، اور خلاف شرع کام بھی کرتا ہو، تو یقین کرلو کہ وہ شیطان ہے۔

(۹)ـــــ صوفیاء کی ترجمانی کرتے ہوئے امام غزالی نے لکھا ہے کہ تنہا عقل معرفت کے لئے کافی نہیں بلکہ عقل سے بالاتر کسی ایسے طریق کی ضرورت ہے، جس پر چلنے کے بعد انسان کو وہ چشم بینا حاصل ہو جائے جس کی روشنی میں اسے ایک طرف انوار الٰہی کی جھلکیاں نظر آئیں تو دوسری طرف ملاء اعلیٰ کی کچھ خاص باتوں اور مستقبل کے اہم واقعات پر بھی اس کی نظر جا سکے۔

امام غزالی رح فرماتے ہیں کہ یہ چشم بینا اور نور معرفت بغیر صوفیاء اور عارفین کی راہ پر چلے حاصل ہونا مشکل ہے اس پر انھوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویائے صادقہ اور سچی پیشین گوئیوں سے استدلال کیا ہے۔

(۷)ـــــ صوفیاء علم لدنی کے بھی قائل ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ صرف انبیاء و اولیاء کو حاصل ہوتا ہے جیسے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں خود قرآن نے علم لدنی کی خبر دی ہے۔ وعلمنا ہ من لدنا علماً۔ اور ہم نے ان کو اپنی جانب سے ایک خاص علم سکھایا

(۸)ـــــ ان کے نزدیک فنا ایک بہت بڑا مقام ہے، صوفیاء میں فنا کی اصطلاح سب سے پہلے حضرت بایزید بسطامی رح نے قائم کی، اور آپ ہی نے سب سے اول اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی، مگر خود حضرت بسطامی رح اس فنا کو اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنے شیخ حضرت ابو علی سندھی رح کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ

"فنا کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی ذات و صفات میں اتنا محو ہو جائے کہ اسے اللہ کے سوا کچھ یاد نہ رہے، یہاں تک کہ وہ اپنے وجود کو بھی فراموش کر دے، اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ جس کے بعد فنا کا کوئی درجہ نہیں ہے، وہ فناء الفناء کا ہے جس کو صوفیاء کی اصطلاح میں مقام جمع الجمع کہتے ہیں، یعنی ایسا مقام کہ اپنے فنا ہونے کا احساس بھی فنا ہو جائے، اس پر استغراق کا ایسا غلبہ ہو کہ اسے یہ بھی شعور و احساس نہ رہے کہ میں فنا ہو چکا ہوں"

علامہ قشیری رح فرماتے ہیں۔

جس شخص پر سلطان الحقیقۃ کا ایسا غلبہ ہوکر اللہ کے کما سوا تمام چیزیں اس کی نگاہ سے بالکل اوجھل ہوجائیں بلکہ صفحۂ ادراک سے ان کی یاد اور کسک تک رخصت ہوجائے تو ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خلق سے فنا ہوکر حق کے ساتھ بقا کی منزل کا مسافر بن چکا ہے۔

غالبًا یہ وہ مقام ہے جس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے، موتوا قبل ان تموتوا ، الحدیث ، کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ۔

(۹) ـــــ مقام فنا کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں پہونچنے کے بعد سالک کے تصورات دو متضاد قطبوں کے درمیان سیر کرتے ہیں، کبھی وہ اتحاد کے مقام سے گذرتا ہے اور کبھی تنزیہ و تجرید کی سیر کرتا ہے۔

درجاتِ سلوک

تصوف کے ان نظریات کا تعلق اصول وضابطے سے ہے، اسی جگہ تصوف کے فکری خانے میں سفر معرفت کی بھی کچھ اصطلاحی منزلیں ہیں جن کو صوفیاء کے عرف میں درجاتِ سلوک کہا جاتا ہے، مناسب ہوگا کہ سلوک کے اصطلاحی درجات سے بھی ہمارا تعارف ہوجائے۔

① تصوف میں صوفی، عابد، زاہد، مختلف درجات کا نام ہے۔

② مقامات ایک اصطلاحی نام ہے، ان سے مراد وہ روحانی منزلیں ہیں جن پہ راہِ خدا کا مسافر گذرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرتا ہے، اور اپنی اگلی منزل کی طرف پرواز بھرنے کے لئے ہمت و محنت کا ایندھن جمع کرنے کا بندوبست کرتا ہے، یہ مقامات رک کر ٹھہر جانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک طرح کی سانس لینے کی منزل ہے، اگر کوئی سالک ان ہی مقامات کو اپنی آخری منزل بنالے تو وہ ناقص قرار دیا جاتا ہے۔

③ احوال :- یہ ان کیفیات کا نام ہے جن کے جھونکے سالک پر اس لئے چلتے ہیں تاکہ راستے کا تعب اور طبیعت کا اضمحلال ختم ہوکر اسے ایک ایسا روحانی نشاط و سرور حاصل ہو

کہ وہ اپنے سفر کی رفتار تیز سے تیز تر کردے، اور اس کی روح کو ان لمحات کا شوق بے چین کردے جن میں اسی طرح کے نرم، خرام روحانی جھونکے اس کے قلب و روح کو کیف و سرور سے بھر دیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ احوال قلب پر چند لمحوں کے لئے طاری ہوتے ہیں جو دائمی نہیں ہوتے"

④ تصوف کی روشنی میں احوال اور مقامات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ احوال عنایات الٰہی سے حاصل ہوتے ہیں، اس میں محنت وکسب کا دخل نہیں ہوتا۔ جبکہ مقامات سراسر کسبی ہیں، محنت کے مطابق مقامات طے ہوتے ہیں، اسی بات کو صوفیاء اپنے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

"احوال براہ راست چشمۂ جود وکرم (اللہ) سے نازل ہوتے ہیں، اور مقامات سالک کی ہمت ومحنت اور جہد مسلسل سے حاصل ہوتے ہیں"

⑤ تصوف میں سلوک کا پہلا درجہ، محبتِ الٰہی اور عشق رسول ہے، جس میں اتباع سنت مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے

⑥ اسکے بعد کی منزل "اسوۂ حسنہ" ہے، جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ الآیۃ، یقیناً تمھارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے۔

⑦ اس کے بعد توبہ کا مقام آتا ہے، جو بنیادی طور پر تین چیزوں سے عبارت ہے ۱۔ گناہ سے مکمل پرہیز، اپنے کئے پر ندامت وپشیمانی اور ہمیشہ کے لئے اس گناہ کو چھوڑ دینے کا عزم مصمم

⑧ ورع بھی ایک مقام کا نام ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ طالب شبہ کی ہر چیز سے پرہیز کرے خواہ اس کا تعلق زبان، دل، یا عمل کسی سے ہو۔

⑨ زہد اس مقام کا نام ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ انسان بظاہر دنیا میں ہو، مگر اس کا دل خالق کائنات کے ساتھ وابستہ ہو، اسی لئے صوفیا کہتے ہیں کہ زاہد وہ ہے جس کے دل کو اللہ نے دنیا کی آلائشوں سے دھو دیا ہو چاہے بظاہر دنیا کے وہ سارے کام کررہا ہو۔

اور اسی لئے ایک انسان دولت مند اور خوش حال ہوتے ہوئے بھی زاہد ہوسکتا ہے، بشرطیکہ مال و دولت سے اسے کوئی رغبت نہ ہو، بلکہ اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ لگا ہوا ہو کیونکہ

زہد فقر کا نام نہیں ہے، اور اسی لئے ہر فقیر کا زاہد ہونا اور نہ ہر زاہد کے لئے فقیر ہونا لازم ہے۔

(۱۰) توکل ابتدائی درجہ ہے، سر تسلیم خم کرنا اور راضی برضا رہنا درمیانی درجہ ہے اور خود سپردگی سب سے اعلیٰ اور آخری مقام ہے۔

(۱۱) محبت تصوف کے اعلیٰ منازل میں سے ایک منزل ہے، محبت کیا شئی ہے؟ اس کی علامت اور حدود اربعہ کیا ہیں ان کو سمجھنے کے لئے حضرت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کا قول ملاحظہ کیجئے

"محبت کی علامت یہ ہے کہ ہر معاملے میں محبوب کی موافقت اور ہر پہلو سے اسے خوش رکھنے کی کوشش کی جائے، محبوب سے قریب ہونے کے لئے ہزار حیلے بہانے تلاش کئے جائیں، جب بھی فرصت ملے تو لایعنی کاموں میں پڑنے کے بجائے محبوب کے در کا رخ کیا جائے"

(۱۲) سلوک کا سب سے آخری مقام رضا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں۔

"خدا کے ہر فیصلے پر راضی رہنا، سب سے بڑا مقام ہے اور جس کو یہ مقام مل گیا تو درحقیقت اسے دنیا ہی میں جنت کی بہاریں مل گئیں۔

بعض صوفیاء یہ بھی کہتے ہیں کہ

"مقام رضا تک پہونچ جانے کے بعد خصوصی احوال وکیفیات طاری ہوتے ہیں، پھر اس کے سامنے ایک ایسا نور پھرنے لگتا ہے جس میں وہ غیب کی کتاب کا مطالعہ اور کائنات اور نظام فطرت کے اسرار و رموز کا انکشاف کرسکتا ہے"

یہ تعلیمات و افکار تصوف کے مجموعی ڈھانچے میں مشترک ہیں، مگر اہل تصوف کے درمیان بھی مختلف مکاتب فکر موجود ہیں جن میں مناسب طور پر افکار و تعلیمات کی تقسیم ہو جاتی ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تصوف کے وہ تمام نظریات جو اوپر ذکر کئے گئے ہیں وہ سب کے سب کسی ایک مکتب فکر میں موجود ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان مختلف مکاتب تصوف پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے مگر اس سے پہلے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ تصوف کے مکاتب دو نوعیت کے ہیں ایک فکری ونظری مکاتب، دوسرے عملی و اصلاحی مکاتب، پورے تصوف کے مجموعی مطالعہ سے انھی دو طرح کے مکاتب کا سراغ ملتا ہے یہ بھی

یادرہے کہ ان دونوں مکاتب کے درمیان تداخل کا سلسلہ بھی جاری ہے، ایک فکری مکتب تصوف کسی علمی مکتب تصوف کے ساتھ جمع بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد سب سے پہلے فکری مکاتب تصوف کی طرف ہم چلیں اور ان کے اساتذہ سے ایک ملاقات کریں

تصوّف کے مکاتب فکر

تصوّف میں اساسی اہمیت کے حامل چار مکاتب فکر ہیں

(۱) مکتب زہد اس مکتب سے شب بیدار، عبادت گذار اور آنسو بہانے والے حضرات تیار ہوتے ہیں، اس کے مرکزی اساتذہ میں حضرت ابراہیم ابن ادہم، حضرت سفیان ثوری، اور حضرت رابعہ بصریہ خاص مقام کے حامل ہیں۔

(۲) مکتب کشف و کرامات اس مکتب کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ نری عقل معرفتِ الٰہی کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے زبردست محنت و ریاضت اور روحانی مجاہدوں کی ضرورت ہے، تاکہ دل پر پڑے ہوئے جہالت وغفلت کے دبیز پردے چاک ہوجائیں، اور دل کی آلودگیاں ختم ہوکر اس میں جلا پیدا ہوجائے، اس کے بعد ہی انسان حقائق کا ادراک کرسکتا ہے اور اس میں انوارالٰہی کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہے ــ اس مکتب کے صدر اعلیٰ حضرت امام غزالیؒ ہیں۔

(۳) مکتب وحدۃ الوجود اس مدرسہ کی بنیاد اس فکر پر قائم ہے کہ اللہ ہر شئی میں موجود ہے، اور ہر شئی اللہ سے قائم ہے، اس لئے دنیا کی تمام چیزیں قابل احترام ہیں، اس لئے کہ ہر چیز میں اللہ کا جلوہ موجود ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا یہ فرمان تو تقریبًا ہر روز اس مکتب میں دہرایا جاتا ہے کہ۔

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ چکی ہے کہ ہر وجود میں اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے، ہمارا وجود اگرچہ جداگانہ نظر آرہا ہے مگر درحقیقت اسی کے وجود کی یہ سرسری جھلکیاں ہیں۔ وجودِ ذاتی سے وجود حق کے سوا کچھ صادر نہیں ہوسکتا، اور یہ طے ہے کہ

وجود حق ایک ہی ہے، اس وقت اگر ہم مخلوقات کا کوئی ممتاز اور مستقل وجود مان لیں تو وجود حق میں دو مختلف وجودوں کا اقرار کرنا پڑے گا، اور یہ ناممکن ہے:

اس مدرسہ کے مرکزی استاذ شیخ محی الدین ابن عربی ہیں، اور ماضی قریب کے لوگوں میں شیخ جمال الدین افغانی خصوصی شہرت رکھتے ہیں، ان کی کتاب "الواردات" نے ان کو اس مدرسہ کے اساتذہ میں شامل کردیا ہے

(۴) مکتب اتحاد وحلول | اس مکتب کی تعلیم بھی اسلامی طرز کی ہے مگر اس کے نصاب تعلیم و تربیت پر ہندی اور عیسائی تصوف کی بھی ہلکی چھاپ محسوس ہوتی ہے، حقیقت حال خدا جانتا ہے مگر شرعی اعتبار سے بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے، مثلاً اس مدرسہ کے بنیادی افکار میں سے یہ فکر کس قدر وحشت خیز ہے جو صوفی کے بارے میں ان کے یہاں ملتی ہے کہ جب ایک صوفی انتھک محنتیں کرتا ہے، اور اپنے پیمانۂ دل کو بالکل مجلّیٰ کرلیتا ہے تو خدائی صفات اس میں اتر آتی ہیں، اور اسکے افعال اور خدائی افعال کے درمیان ایک اٹوٹ اتحاد پیدا ہوجاتا ہے، یہ مقصود اگرچہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے درست ہے جیساکہ پچھلے صفحات میں میں نے اس کی طرف اشارہ کیاہے، مگر جب اس تصور کی تعلیم کے لئے مستقل نصاب تیار ہوتا ہے تو اس نصاب کا نقشہ کچھ اتنا بھیانک ہوجاتا ہے کہ اہل شریعت کو مجبوراً تلوار اٹھانی پڑتی ہے، پھر وہی الزام دہرایا جاتا ہے جو منصور کے بارے میں دہرایا گیا تھا کہ صوفی اور شیخ کو وہ ایک نوع کا خدا سمجھ بیٹھتے ہیں، اور شیخ اس بناء پر اس تصور کی تردید نہیں کرسکتے کہ اس تصور کی بنیاد ایک مسلمہ صداقت پر ہے، اس لئے اس تصور کی نفی سے اس کھلی سچائی پر حرف آئے گا، مگر ان کی خاموشی ان کے معتقدین کے لئے دینی وفکری تباہی کا سامان فراہم کردیتی ہے، اور رفتہ رفتہ ان کے معتقدین اور اس مکتب اتحاد کے طلبہ صوفی اور شیخ کو واقعۃً خدا ہی سمجھ لیتے ہیں، پھر تعدد الٰہ کا وہی تصور جنم لیتا ہے جو عیسائی اور ہندی تصوف میں موجود ہے، اور اسی بناء پر میں نے یہ کہا کہ اس مکتب پر ہندی اور عیسائی تصوف کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ اس مکتب کے استاذ الاساتذہ حضرت منصور حلاج ہیں۔

سلاسل تصوف | طریق کار اور اصولِ تربیت کے اعتبار سے بھی تصوف میں مختلف

مکاتب پائے جاتے ہیں، جس کو میں نے عملی مکاتب تصوف کا نام دیا ہے، مگر صوفیاء کی اصطلاح میں ان مکاتب کو سلاسل کا نام دیا گیا ہے، تصوف کے سلاسل بے شمار ہیں مگر میرا مقصد تصوف کا پورا ڈھانچہ تیار کرنا نہیں ہے بلکہ اصولی حیثیت سے اس کا تعارف کرانا ہے اس لئے صرف چند مشہور سلاسلِ تصوف کا ذکر میں کافی سمجھتا ہوں۔

(۱) سلسلۂ قادریہ:- یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی طرف منسوب ہے اس سلسلے کی شاخیں پورے عالم میں پائی جاتی ہیں۔

(۲) سلسلۂ رفاعیہ:- اس کی نسبت حضرت شیخ احمد رفاعی رح کی طرف ہے اس کو عموماً مغربی ایشیا کے علاقوں میں زیادہ فروغ حاصل ہوا، باقی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں اس کا وجود برائے نام ہے۔

(۳) سلسلۂ احمدیہ:- یہ حضرت شیخ احمد بدوی رح کی طرف منسوب ہے، اس سلسلے کی اشاعت مصر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں خوب ہوئی اس سلسلے کی بھی کئی شاخیں پیدا ہوچکی ہیں، مثلاً بیومیہ، شناویہ، شعبیہ وغیرہ، اس سلسلے کی خاص پہچان سرخ عمامہ ہے۔

(۴) سلسلۂ دسوقیہ:- اس سلسلے کے بانی حضرت ابراہیم دسوقی رح ہیں، اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام انسانوں سے بلاامتیاز مذہب و ملت بلکہ تمام مخلوقات سے محبت و پیار کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سلسلے میں خلوت پسندیدہ نہیں ہے، البتہ شیخ کی اجازت سے کوئی چاہے تو کرسکتا ہے۔

(۵) سلسلہ اکبریہ:- اس کے بانی شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ہیں، اس میں خصوصیت کے ساتھ خاموشی تنہائی، فاقہ کشی اور شب بیداری کی تعلیم دی جاتی ہے مصائب پر صبر، نعمتوں پر شکر اور قضا و قدر پر اطمینان یہ تین چیزیں اس سلسلے کے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہیں

(۶) سلسلۂ شاذلیہ:- یہ سلسلہ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ کی جانب منسوب ہے، اس سلسلے کی بنیادی تربیت ذکر و فکر کی کثرت کے بارے میں ہوتی ہے اس

میں زیادہ مجاہدات پر زور نہیں دیا جاتا ہے اسی لئے صوفیاء نے اس سلسلے کو بہت آسان سلسلہ قرار دیا ہے، یہ سلسلہ مصر، یمن عرب، ممالک، مراکش، مغربی الجزائر اور مغربی و شمالی افریقہ تمام میں پھیلا ہوا ہے، ان تمام علاقوں میں اس سلسلے کے کافی افراد پائے جاتے ہیں۔

(۷) **سلسلہ مولویہ:-** اسکے بانی شیخ جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) ہیں، جن کا مزار مبارک قونیہ میں ہے، کہتے ہیں کہ اس سلسلے کے حلقۂ ذکر میں رقص و سرود، سماع و قوالی، اور حال و قال مستقل دینی اور روحانی اہمیت رکھتے ہیں، شروع میں اس کو ترکی اور مغربی ایشیا میں زبردست فروغ حاصل ہوا مگر آج ترکی کے بعض علاقے حلب اور بعض مشرقی ممالک کے سوا کہیں اس کا وجود نہیں ہے۔

(۸) **سلسلۂ نقشبندیہ:-**

یہ حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندؒ کی طرف منسوب ہے، صوفیاء کے نزدیک شاذلیہ کی طرح یہ بھی بہت سہل سلسلہ ہے، اس میں بھی مجاہدات کی شدت کے بغیر بڑے قریب اور آسان راستوں سے انسان خدا تک پہونچ جاتا ہے، اس سلسلے کو فارس، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور مغربی ایشیا میں خاص شہرت حاصل ہوئی

(۹) **سلسلۂ چشتیہ:-**

اس کی نسبت حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی طرف ہے، اس سلسلے میں بھی بڑے بڑے اکابر گذرے ہیں، اس کو زیادہ تر شہرت ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہوئی

(۱۰) **سلسلۂ ملامتیہ:-**

اسکے بانی ابوصالح حمدون ابن احمد ابن عمار (م ۲۷۱ھ) ہیں، جو قصار کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، اس سلسلے کے افراد عموماً غالی قسم کے ہوتے ہیں، ماضی قریب میں ترکی کے اندر ان کے غلو کے مختلف نمونے سامنے آئے، اس سلسلے کو ترکی ہی کے اطراف و جوانب میں زیادہ تر شہرت حاصل ہوئی،

یہ دس سلسلے تصوف کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، تصوف کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص ان سلاسل کو نظر انداز کر کے تصوف کے حقیقی خد و خال کو نہیں سمجھ سکتا، اور نہ اس

کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تصوف کی تہ تک پہونچ گیا ہے۔

تصوف کا مثبت رخ

تصوف کے مجموعی تعارف کے بعد میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں بطور خلاصہ تصوف کے کچھ مثبت اور کچھ منفی پہلو پر بھی روشنی ڈالوں، اس سے تصوف کی افادیت کے ساتھ اس کے دوسرے رخ کو بھی سمجھنے میں بہت حد تک مدد ملے گی

① ___ تصوف نے بہت سے ایسے مقامات پر وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور جن کو تلوار و زبان کی ہزار طاقتیں بھی جمع ہو کر انجام نہیں دے سکتی تھیں مثلاً انڈونیشیا، افریقہ اور دوسرے بہت سے دور دراز ممالک جن کو زبردست سے زبردست اسلامی لشکر بھی فتح نہ کر سکتا تھا مگر تصوف کی جذبی قوت اور روحانی تاثیر نے بغیر کسی کشت و خون کے ان تمام ممالک پر اسلامی پرچم لہرا دیا، صوفیاء نے ان علاقوں میں غیر مسلموں اور متعصب دشمنوں پر اپنی قلبی اور روحانی توجہات کے ہتھیار استعمال کئے، نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں کی اکثریت ان صوفیاء سے قریب ہوئی، اور حلقہ بگوش اسلام ہو کر اسلام کی علمبردار بن گئی۔

خود ہمارا ہندوستان سلطان الہند حضرت خواجہ اجمیری رہ کا کتنا ممنونِ کرم ہے، مسلمانوں کی پوری فوجی طاقت بھی اگر یہاں کے تفلسف پرست غیر مسلموں پر صرف کر دی جاتی تو بھی مسلمان چہروں کا جنم لینا یہاں مشکل ہوتا، اسلامی حکومت کا تصور تو دور کی بات تھی، مگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اپنی روحانی طاقت اور خداداد کرامتوں کا مظاہرہ کیا، لاکھوں لاکھ انسان آن کی آن میں مسلمان ہو گئے، اور حضرت موسیٰؑ اور جادوگروں کے مقابلے کی تاریخ ہندوستان کی سرزمین پر ایک بار پھر دہرا گئی، یہ تصوف کا وہ مثبت رخ ہے جو اس کی تمام مضرتوں اور منفی پہلوؤں پر حاوی ہو گیا ہے۔

② اسلامی دور کے حکمرانوں نے ہر جہاد کے موقعہ پر صوفیاء اور خصوصاً اقطاب صوفیہ سے مدد اور توجہ کی درخواست کی، بڑے سے بڑے تاجور ان بزرگوں کی کٹیوں پر نیازمندانہ حاضر ہوتے اور نہایت عاجزی کے ساتھ دشمنوں کے مقابلے میں فتحیابی کی دعا کی درخواست

کرتے، اور بڑے سے بڑے نذرانہ کی پیش کرنے کی خواہش رکھتے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ ان بزرگوں نے کبھی ان تھیلیوں پر نگاہ تک نہ کی، بلکہ ان کی ایسی بے جا جرأتوں پر سخت نفرت اور غصّے کا اظہار کیا

لیکن اصل مقصد میں ان کو کبھی مایوس نہ کیا، بلکہ ان کو تسلّی دیتے اور حوصلے دلاتے، پھر دشمنوں کے خلاف ایسے روحانی ہتھیاروں کا استعمال کرتے کہ معمولی سے معمولی اسلامی لشکر، بڑی سے بڑی جنگجو، تجربہ کار اور جدید ہتھیاروں سے مسلّح افواج کو شکست دے دیتا، جس کی توجیہ خدائی نصرت کے سوا کسی چیز سے نہیں کی جاتی تھی، اور یہ خدائی نصرت لشکر کے مسلمان ہونے کے علاوہ بزرگوں کی دعاؤں کا ثمرہ ہوتی تھی —— حضرت احمد بدوی رح، ابراہیم دسوقیؒ اور ابوالحسن شاذلی رح اس باب کی جلی سرخیاں ہیں۔

(۳) —— اور غالبًا انھی چیزوں کا اثر تھا کہ صوفیہ تحریک محدود بن کر نہیں رہی، بلکہ پورے عالم میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں، ان تمام علاقوں پر چھا گئی، مصر، عراق، افریقہ مغربی، مشرقی اور وسطی ایشیا وغیرہ تمام ممالک اس کی روحانی سلطنت میں شامل ہوگئے

(۴) شعر، نثر، موسیقی اور فنون لطیفہ پر بھی تصوف کی گہری چھاپ پڑی، جو آج تک محسوس کی جارہی ہے۔

(۵) مغربی مادہ پرستوں کو اسلام کی طرف کھینچنے میں تصوف نے زبردست رول ادا کیا، جو مادہ پرست اسلام کی طرف آنے میں تصوف کے ممنون کرم ہیں، ان میں مارٹن لنجز ایک واضح مثال ہے، جو کہتا ہے کہ۔

> "میں یوروپی ہوں، میری روح بے قرار تھی، میری روح کو چین وسکون اور قرار وخلاص اسلامی تصوف کے زیر سایہ نصیب ہوئی، میں تصوف کا جتنا بھی دلدادہ ہوں کم ہے"

یہ مثال کے طور پر چند مثبت پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ تصوف کے مثبت اثرات کل یہی ہیں، بلکہ اس کی اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ تعارف کے لئے اس قدر کافی ہیں۔

⁂　⁂　⁂

تصوّف کا منفی رُخ

اب ایک نظر تصوف کے منفی رخ پر بھی ڈالنا ضروری ہے، اس سے میرا مقصد تصوف پر نکتہ چینی یا تنقید کے بجائے اس کے صحیح خطوط واضح کرنے ہیں، اور یہ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ اسکے مفید اور مضر دونوں پہلوؤں کو روشن کیا جائے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کے ایک منفی رخ کو دیکھ کر پورے تصوف ہی کو زہر ہلاہل کا نام دے دیا جائے بلکہ ایک انصاف پسند اور بصیرت مند تاریخ نگار کو دیکھنا چاہیے کہ اس کا کون سا پہلو غالب ہے تصوف کے بارے میں یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے منفی اثرات مثبت کے مقابلے میں نہایت کم اور جو بھی ہیں شکستہ حالت میں ہیں، اس لئے تصوف کی افادیت اور اثباتیت کا فیصلہ کرنا ہر انصاف پسند محقق کی تاریخی مجبوری ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد تصوف کے منفی یا مضر اثرات کی ایک مختصر فہرست ملاحظہ فرمایئے

(۱) بعض متصوفین اس گمان میں مبتلا ہیں کہ ولی سے تمام تکلیفات شرعیہ اٹھالی جاتی ہیں، اس سے شرعی احکام نماز، روزہ وغیرہ دوسرے تمام فرائض رخصت ہوجاتے ہیں اس لئے کہ وہ ایسے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں جہاں انھیں ان ظاہری چیزوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی، بلکہ بعض حالات میں یہ نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتی ہیں، اس لئے کہ اگر وہ ان ظاہری احکام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات کی طرف توجہ کریں تو ان پر جو باطنی واردات اور روحانی فیوض کا نزول ہو رہا ہے، ان کی طرف توجہ میں کمی واقع ہوگی جو ان کے منصب ولایت کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوگا۔

اولیا کے بارے میں یہ عقیدہ کتنا واضح طور پر خلاف شریعت ہے، جبکہ کسی نبی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ احکام شرعیہ کی پابندی ان سے اٹھالی گئی ہو ــــ جب کسی جماعت میں اس قسم کی فکر نشوونما پاتی ہے تو قدرتی طور پر اس جماعت کے ارکان اور متعلقین میں ذہنی و فکری اباحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ صوفیاء کی وہ جماعت جو اولیاء کو اس قدر ممتاز مقام پر دیکھنے کی عادی ہے، اس کے ساتھ بھی تاریخ کی وہی سنت دہرائی

گئی۔ امام غزالی رحمہ فرماتے ہیں کہ ابتداءً اس جماعت میں علمی وفکری آزادی کا رجحان بڑھا پھر آہستہ آہستہ اس آزادی نے ان کے اندر مختلف فرقے اور گروہ پیدا کر دیئے، جن میں سے ہر فرقہ آزادی میں دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ ان میں سے چند فرقوں کے خیالات آپ بھی ملاحظہ فرمائیے

الف :- ایک فرقہ نے اسلامی علوم چھوڑ کر منطق، فلسفہ اور علم ہیئت، ہی کو اپنا مشغلہ بنالیا اور اسی کو انھوں نے اپنے لئے معراجِ کمال تصور کیا۔

ب :- دوسرے فرقے نے معرفت الٰہی، دیدار باری اور سیر مقامات کے دعوے کئے

ج :- اس کے مقابلے میں تیسرے فرقے نے اباحیت و آزادی کا وہ راستہ اپنایا جس میں انھوں نے شریعت کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی اور حلال وحرام کی تمیز تک کھو دی، احوال و مقامات کا کیا ذکر، وہ تو ان کے لئے قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔

د :- ایک فرقہ نے اعلان کیا کہ ظاہری اعمال کا اللہ کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں ہے، خدا کے یہاں اصل اصیل چیز دل ہے اگر دل میں یادِ الٰہی اور عشق رسول موجزن ہو تو کسی عمل کی قطعا ضرورت نہیں، اور اگر انسان تمام اعمال صالحہ کر رہا ہو مگر اس کا دل عشق ومحبت کے سوز سے خالی ہو تو اس کے تمام اعمال غارت ہیں، اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے، بلکہ قیامت کے روز یہ اعمال اس کے لئے مصیبت بن سکتے ہیں کہ اس نے ان کو دل کے نہاں خانے سے خوراک مہیا کیوں نہ کی؟ ان کے نزدیک ایک انسان جورات دن فواحش وشہوات میں مشغول ہو، مگر اس کا دل یادِ الٰہی سے معمور ہو، تو یہ فواحش اس کے لئے قطعاً نقصان دہ ثابت نہیں ہونگے بلکہ ممکن ہے کہ یہ ان کے لئے نیکیوں میں تبدیل ہو کر مفید ثابت ہوں۔

۳ :- سلطان الاولیاء حضرت خواجہ بایزید بسطامی رحمہ کی طرف کچھ ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہیں جن کو دیکھ کر ایک صاحب شریعت انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ سبحانی ما اعظم شانی۔ یعنی میری ذات بے عیب ہے، میری شان کیا ہی بلند ہے۔

۲۔ انی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدونی۔ یعنی بلاشبہ میں خدا ہوں میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لئے میری عبادت کرو۔

۳۔ خضت بحرًا وقف الانبیاء عند سواحلہ۔ یعنی میں نے ایک ایسا سمندر

عبور کرلیا ہے کہ انبیاء بھی جس کے کنارے ہی پر رہ گئے تھے

۴۔ صعدت الی السماء وضربت قبتی بازاء العرش۔ یعنی میں نے آسمان پر چڑھ کر عرش کے بالمقابل اپنا ایک مستقل گنبد نما محل تیار کیا ہے۔

مگر یہاں پر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کے تمام اقوال کا راوی صرف ایک شخص ہے جس کا نام عبداللہ ہروی (م ۴۸۱ھ) ہے، اس کے سوا حضرت بایزید بسطامیؒ کے دوسرے ہزاروں مریدین میں سے کوئی اس قسم کے اقوال نقل نہیں کرتا، جس سے ان اقوال کے ضعف کی طرف اشارہ ملتا ہے، اور اسی بناپر ایک مستشرق تاریخ نگار آرنلڈ نیکلسن نے اپنی کتاب "تاریخ التصوف" میں حضرت بایزید کی جانب ان اقوال کی نسبت پر شک کا اظہار کیا ہے، اس نے روایتی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "یہ فہم سے بالاتر بات ہے کہ ایک ایسی ہستی جو سراپا تقدس نظر آتی ہے، جس کی کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے وہ اس قسم کی بے تکی کیوں کر ہانک سکتا ہے؟ وہ بھی اس وقت جب کہ ان اقوال کو نقل کرنے والا فرد واحد ہو[1]

بعض صوفیا نے ان اقوال کی نسبت صحیح مان کر کچھ تاویلات کی ہیں، مگر وہ تاویلات بحث ونظر کے نئے دروازے کھول دیتی ہیں، اس لئے آسان راستہ وہی ہے جو نیکلسن نے اختیار کیا ہے

۳: اسی طرح کچھ خوفناک اقوال منصور حلاج کی جانب بھی منسوب ہیں، مثلاً ان کا یہ شعر حلول واتحاد کی کس انتہا کی طرف اشارہ کررہا ہے۔

مزجت روحك في روحي كما تمزج الخمرة في الماء الزلال

فاذا مسك شيء مسني فاذا انت انا في كل حال

ترجمہ:۔ اے خدا تیری روح میری روح کے ساتھ اسی طرح ضم ہوگئی ہے جس طرح آب شیریں میں شراب گھل مل جاتی ہے، جب تجھ سے کوئی چیز مَس کرتی ہے تو اس کا احساس مجھے بھی ہوتا ہے، اسلئے کہ میں اور تو بہرحال ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔

ان کے اناالحق وغیرہ جملے بھی اسی قسم میں آتے ہیں، ان چیزوں کو صوفیاء کی شطحیات

---

[1] آرنلڈ کی اصل کتاب انگریزی میں ہے، مگر ڈاکٹر ابوالعلاء عفیفی نے اس کا عربی ترجمہ کردیا ہے، یہ عربی ترجمہ قاہرہ سے "فی التصوف الاسلامی وتاریخہ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ ۱۲

میں شمار کیا گیا ہے، جن کی بظاہر کوئی شرعی توجیہ نظر نہیں آتی۔

۴:۔ علامہ ابن تیمیہ نے کتاب السلوک کے ص ۳۳۷ پر مقام فنا پر بھی تبصرہ کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ: صوفیاء مقام فنا کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس مقام پر انسان کائنات کے ساتھ خود کو بھی فراموش کر جاتا ہے پھر وہ شعور کی منزل سے گذر کر لاشعور اور سکر کے اس مقام پر پہونچ جاتا ہے کہ اس کو ایمان کی حلاوت کے سوا کسی چیز کی تمیز نہیں رہ جاتی۔ اس وقت اس سے حرام وحلال ہر طرح کے افعال واقوال صادر ہو سکتے ہیں، مگر ان کو غلط کہنا صحیح نہیں ہوگا اسلئے کہ یہ ان کے مقام کا مقتضا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ اس پر ریمارک کرتے ہیں کہ "صحیح ہے کہ وہ اس مقام پر معذور ہیں، ان کو ان افعال واقوال کے صدور پر خطا دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ان امور میں پیروی جائز نہیں ہے اور نہ ان کے قول وفعل کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ اس خاص وقت میں اسی طرح تکلیف شرعی سے فروتر ہیں جس طرح کہ مجنوں اور غافل انسان"۔

۵:۔ علامہ ابن تیمیہ اتحاد وحلول کے قائلین پر بھی سخت برہم ہیں انھوں نے کتاب السلوک کے ص ۳۳۷ پر اتحاد وحلول کے نظریے کو کفر وضلال سے تعبیر کیا ہے۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ یہ نظریہ، برہمیہ جماعت سے جاہل صوفیوں میں داخل ہوا، برہمی حضرات بھی اتحاد کے قائل ہیں، جس کے بعد انسان کسی عمل یا فرض کا مکلف نہیں رہ جاتا۔

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ تصوف کا منفی رخ اولاً تمام سلاسل میں موجود نہیں ہے بلکہ کسی کسی سلسلے میں ہے، ثانیاً اس کا منفی رخ مثبت کے مقابلے میں انتہائی کمزور رہے محققین صوفیا ہر دور میں اس کی نفی کرتے رہے ہیں۔

میرے نزدیک وہ لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں جنھوں نے ان بعض منفی پہلوؤں کو دیکھ کر تصوف کو افیون یا سامان ہلاکت قرار دیا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کل قیامت میں جب ان کا سامنا ان اولیاء اللہ اور اکابر صوفیاء سے ہوگا اور وہ ان سے اس ظلم وزیادتی کی وجہ دریافت کریں گے تو ان کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ میں تو حضور کی اس حدیث پر اپنا پختہ ایمان رکھتا ہوں کہ من عادیٰ لی ولیًا فقد آذنتہ للحرب، اوکما قال جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی مول لی اس کیلئے میری طرف سے اعلان جنگ ہے۔

سلفی تصوف

کتاب و سنت کی روشنی میں

مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ خصوصی علامہ ابن قیمؒ تصوف کے مخالف ہیں، اور یہ چیز عام طور پر ان علماء کے دلوں اور دماغوں پر چھائی ہوئی ہے جن کو ان دونوں بزرگوں سے محبت اور عقیدت ہے اور اس وقت عرب دنیا میں کئی وجوہ کی بناء پر ان دونوں کا علمی سکہ چل رہا ہے علمائے عرب سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، ۱۹۵۵ء میں حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہوئی اور پھر ۱۹۷۳ء میں دوبارہ یہ شرف حاصل ہوا پھر ہم بغداد گئے، جہاں ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت ہوئی، ممالک عرب کے بہت سے اہل علم وفضل سے ملنا ہوا اسی طرح دوبارہ دوبئی جانا ہوا اور ایک بار بحرین کا سفر ہوا، ان سب مقامات پر ہم نے عرب علماء سے تصوف اور اہل تصوف پر گفتگو کی اور بہت سے مواقع ایسے حاصل ہوئے کہ مدارس عربیہ کے جلسوں میں عرب علماء سے ملنا ہوا، دیوبند، ندوہ، عمرآباد اور کیرلا کے علمی اجتماعات میں عرب علماء کے ساتھ مل بیٹھنے اور علمی مذاکرات کی نوبت آئی ہم نے تصوف پر خوب گفتگو کی وہ تصوف جو امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ اور شیخ الاسلام مدنیؒ اور ہمارے علمائے دیوبند کے درمیان دائر وسائر ہے اس کو ہم نے پیش کیا، البتہ اتنی احتیاط رکھی کہ تصوف کا لفظ نہیں استعمال کیا بلکہ احسان اور اس کے مشتقات پر گفتگو کی، اور جب حدیث جبریل کو ہم نے پیش کیا جس میں ایمان اسلام اور احسان کی

حقیقتیں بیان کی گئی ہیں اور پھر اپنے بزرگوں کے پیش کردہ سلوک کی نشاندہی کی تو ہمیں گفتگو میں بڑی کامیابی ہوئی اور علمائے عرب میں وہ طبقہ جو جدید مغربی فکر سے واقف ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ عرب نوجوانوں میں آزاد خیالی آوارہ مزاجی اور دین سے دوری اور بظاہر ایمان و اسلام کے باوجود احسانیات سے مہجوری بڑھتی جارہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ قلب سقیم کو قلب سلیم کیسے بنایا جائے، چنانچہ ایک مرتبہ جامعہ دارالسلام عمر آباد مدراس جنوبی ہند کے ایک جلسے میں علامہ شیخ علی بن صالح محوتی یمنی شارجہ کے چیف جسٹس سے ملاقات ہوئی اور تصوف پر کھل کر گفتگو کی تو انھوں نے صاف اعتراف کیا کہ اگر یہی تصوف ہے تو اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے، اور عجیب اتفاق ہے کہ اس شخص سے ہماری گیارہ ملاقاتیں ہوئیں، مگر یہ عجیب بات ہم نے دیکھی کہ یمنی ہونے کی وجہ سے علیؓ اور اہل بیت نبویؐ سے اور ذریت محمدیہ نبویہ سے ایک نفسیاتی تعلق ہے جب وہ ہم سے متاثر ہوئے تو ہم کو اپنے بزرگوں کے افادات پر یقین بڑھتا چلا گیا، ایک مرتبہ ہم نے اس شیخ سے پوچھا ہماری آپ کی یہ کون سی ملاقات ہے فرمایا یہ دسویں ملاقات ہے اور آیت کا ٹکڑا پڑھ دیا تلک عشرۃ کاملۃ ہم نے عرض کیا یہ آیت اس محل پر تو نازل نہیں ہوئی ہے، اس آیت کا اس موقع پر پڑھ دینا نہ تفسیر ہے نہ تاویل ہے بلکہ اس کو اعتبار کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون علیہ الملام کا قصہ پڑھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جس طرح اس عالم کبیر میں یہ دو شخصیتیں گذر گئی ہیں حضرت موسیٰ علیہ وعلی نبینا السلام کی شخصیت حق کا مرکز ہے دوسری شخصیت فرعون علیہ ما علیہ باطل کا مرکز ہے اب ذہن اس پر منتقل ہوا کہ انسان کا وجود ایک عالم صغیر ہے　اس کے باطن میں دو چیزیں ہیں روح ہے اور نفس ہے، روح کا غلبہ اور نفس کی مغلوبیت صلاح و کامیابی ہے، اور اسکے برعکس ناکامی و نامرادی ہے اور فساد اور شر کا غلبہ ہے یہی ہے جس کو صوفیہ صافیہ نے اعتبار کہا ہے۔

ایک مرتبہ جامعہ دارالسلام عمر آباد مدراس میں ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف جنرل سکریٹری رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے ملاقات ہوئی، دسترخوان پر ان کے ساتھ مجھے بٹھایا گیا، جامعہ کے سکریٹری جناب کاکا محمد عمر ثانی مرحوم و مغفور نے میرا خصوصی تعارف کرایا، کہا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے

فارغ التحصیل ہیں ہمارے جامعہ میں تفسیر، عربی ادب اور تاریخ کے استاذ رہ چکے ہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رفیق ان کی تحریک اسلامی کے رکن اور کارکن رہ چکے ہیں برسوں دعوتی اور اصلاحی کام کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے ساتھ پاکستان نہیں گئے جنوبی ہند کی قدیم اور مشہور درسگاہ کلیہ عربیہ باقیات صالحات ویلور مدراس میں دوبارہ مدرس ہو گئے بیس سال کے بعد درس حدیث دیکر نکلے۔ اب ایک خاص کام میں لگے ہوئے ہیں یہ خود آپ کو اپنے کام کا تعارف کرائیں گے۔ ڈاکٹر نے پوچھا کیا کام جواب کر رہے ہیں تو میں نے عرض کیا تعلیم و تبلیغ کے بعد ہمیں تجربہ ہوا کہ کوئی خلا ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں دین کے شعبے کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں وہ خلاء تزکیہ کا فقدان ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا تزکیہ کیا ہے میں نے عرض کیا اس کی دو جہتیں ہیں ایک جہت سلبی اور منفی ہے وہ ہے تخلیہ عن الرزائل۔ اور دوسری جہت مثبت اور ایجابی ہے۔ تحلیہ بالفضائل مثلاً ایک شخص ہے اس میں رذیلہ بخل ہے اس کو اس کے قلب سے کیسے نکالا جائے اور اس کے بدلے فضیلت سخاوت کیسے دل میں داخل کیا جائے حسی اور عقلی دلائل سے اس پر ایک صفت کا مذموم ہونا اور دوسری کا محمود ہونا ہم نے ثابت کر دیا لیکن اس کے قلب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب کیا کیا جائے اس کے لئے ملکے وجدان قلبی کو بیدار کیا جائے اور قرآن و حدیث سے جو کچھ اور جیسا کچھ مستفاد ہوتا ہے اس کو ایسے اسلوب کے ساتھ جو سادہ اور فطری اسلوب بیان ہو بنایا جائے تو اس کے قلب پر اثر ہو جاتا ہے یہ وجدانیات کا فن ہے جس میں قلب کی صلاحیتوں کو ترتیب معنوی کے ساتھ ابھارا جاتا ہے اس کے مناہج ہیں مدارج ہیں معارج ہیں اس پر علامہ ابن قیم کی مدارج السالکین اور اغاثۃ اللہفان اور طریق الہجرتین سے ہم نے ایسے افادات مرتب کر لئے ہیں جن سے ہم کام کرتے ہیں اس پر ڈاکٹر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا ہم آپ کے ساتھ مل بیٹھنے کے آرزومند ہیں ہم نے عرض کیا اللہ ملائے اور اچھے حالات میں ملنا نصیب ہو۔ ایسے بیحد واقعات ہیں جو علمائے عرب کے ساتھ پیش آئے۔ علامہ عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کہا سے

دہلی میں ملاقات کی جب وہ اپنی طویل جلاوطنی کے بعد واپس ہوئے ہم نے ان کے تلامذہ سے استفادہ کرلیا تھا۔ مولانا خواجہ عبدالحیُ فاروقی فاضل دیوبند شیخ التفسیر جامعہ ملیہ دہلی سے ہم ملے اور انکا مطبوعہ لٹریچر قرآن سے متعلق ہم نے پڑھ لیا پھر حضرت مولانا شاہ احمد علی مفسر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف ہوا وہ دیوبند آتے جاتے تھے دارالعلوم کی مسجد میں بعد نماز عصر تقریر فرماتے اور قرآن پاک پر توجہ دلاتے رہتے تھے انہوں نے فارغ شدہ علماء کے لئے ایک چار مہینے کا درس قرآن کا کورس بنایا تھا بحمدللہ ہم نے اس میں شرکت کی مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ دونوں شخصیتیں فیض یافتہ تھیں پھر جب ہم وہاں سے فارغ ہوکر نکلے اسی سال دارالعلوم دیوبند میں دورۂ تفسیر کھولا گیا پھر ہم جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس، جنوب ہند میں قرآن کے اور تفسیر کے مدرس ہوگئے، برسوں پڑھانے کے بعد مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی، بیس دن ہم نے ان کی صحبت پائی، حجۃ اللہ البالغہ کا درس سنا، ہمارے یہ بزرگ حجاز مقدس مکہ مکرمہ میں بارہ برس رہے نجدی الفکر اونچے علماء سے روابط ہوگئے فرمایا کہ ایک بار بہت بڑے عالم نے کہا کہ ہم علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابیں پڑھتے ہیں وہ ہمیں بہت کم سمجھ میں آتی ہیں، مولانا سندھیؒ نے فرمایا ہم اس کا انتظام کریں گے اس کے بعد ایک ہفتے کی محنت میں ایک رسالہ لکھ دیا جس کا عنوان قرار دیا۔ وہ اصول ومبادی جن کے سمجھنے پر علامہ ابن تیمیہ اور ان کے معاصرین کے علوم کا سمجھنا موقوف ہے یہ رسالہ اس نجدی عالم کو مولانا نے بند کمرے میں پڑھایا، کہنے لگے مطمئن رہو کسی کو اس کی خبر نہیں ہوگی کہ میں پڑھا رہا ہوں اور آپ پڑھ رہے ہیں، جب مولانا اس رسالے کے درس سے فارغ ہوئے تو وہ عالم بہت مسرور ہوا، اپنے گھر پہونچ کر اس نے علامہ ابن تیمیہ کی کتاب منہاج السنہ کا مطالعہ کیا، پھر حاضر ہوکر مولانا سندھی سے کہا میں پہلے منہاج السنہ کی پانچ سطریں پڑھتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اب بے تکلف میں نے پانچ ورق پڑھ لی ہے، اور سب کچھ سمجھ میں آگیا ہے، مولانا سندھی نے فرمایا یہ میرے رسالے کا فیض ہے، یہ رسالہ منطق وفلسفے پر مشتمل ہے آپ لوگ اسکے پڑھنے کو ناجائز سمجھتے ہیں، اب ہم نے جو محنت کی تب آپ کی سمجھ میں بات آئی۔ بہرحال

مولانا سندھی نے ایسے قصے سنائے جس سے ہمیں یقین ہوگیا کہ علامہ ابن تیمیہ کی کتابوں سے ایسی چیزیں نکالی جاسکتی ہیں جو ہمارے لئے مفید مطلب ہیں، آج کل مدارس عربیہ میں بالعموم منطق و فلسفے سے دلچسپی کم ہوتی چلی جارہی ہے اس کا برا نتیجہ ہوگا، البتہ اس سے بچائے، معقولات قدیمہ کا جو حصہ دیوبند میں لازمی ہے اس کا پڑھ لینا تو ضروری ہے تاکہ کلام و تصوف سمجھنے میں آسانی ہو، منطق و فلسفہ جانے بغیر کلام اور لٹریچر کا سمجھنا مشکل ہے، تصوف کو قدیم زمانے میں مدون کیا گیا اور جب علم کلام سے آدمی حیران ہو کر تھک جائے تو اس کی تصوف سے حیرانی دور ہوتی ہے۔

ہندوستان میں حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی وہ بزرگ شخصیت گذری ہے جس نے قرآن و حدیث فقہ اور تصوف کی جامعیت پر ایک تحریک دینی اٹھائی جس کا علمی و عملی نمونہ دارالعلوم دیوبند ہے، ان کی چیزوں کو سمجھنے کے لئے معقولات قدیمہ کا لازمی حصہ سمجھنا ضروری ہے اسی کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوان علماء عربیت سے آشنا ہوں اور عربی میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کی کتابوں کو پیش کریں تو روحانی ربانی احسانی تحریک عربوں میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔

اسی طرح اہل حدیث کے وہ علماء جو شاہ صاحب سے خصوصی ربط رکھتے ہیں خصوصاً مولانا سید شاہ نذیر حسین محدث دہلوی اور مولانا سید عبدالجبار غزنوی اور دورۂ اخیر میں مولانا شیخ ابراہیم سیالکوٹی پنجاب میں اور مولانا سید شاہ اسمٰعیل مدراسی وغیرہم معترفین تصوف میں سے ہیں جن کا ہم تذکرہ تذکرۃ المحسنین میں کریں گے۔ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَة۔

اس دور میں علمائے دیوبند میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی شخصیت گذری ہے جس نے علوم اربعہ قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف میں ایک ذخیرہ چھوڑا ہے، یہاں ہم ایک واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مالٹا کی قید سے رہا ہو کر آئے تو ملنے کے لئے مولانا تھانوی رحمہ اللہ حاضر ہوئے، مولانا شیخ الہند کے شاگرد رہ چکے تھے، اور ان کی سیاسی تحریک میں شامل ہوئے پھر بعد میں الگ ہو کر بیٹھ گئے، وہ آئے اور مل کر واپس ہوگئے تو لوگوں نے شیخ الہند سے عرض کیا کہ اپنی سیا

تحریک ان کو دلائل سے سمجھا کر اپنے ساتھ ان کو لینا چاہتے، شیخ الہندؒ نے فرمایا ایک شخص اپنے کو صاحب رخصت سمجھتا ہے اور اس عزیمت کی راہ کا اپنے کو قابل نہیں سمجھتا ہے تو میں نے اس کو چھوڑ دیا، زبردستی اپنے ساتھ لینے کا ارادہ نہیں کیا، صاحب علم وفضل ہے، گوشۂ عافیت میں بیکار تو نہیں بیٹھے گا، کتابوں کے ڈھیر لکھ کے لگا دیگا، پس ہم مولانا تھانوی کی کتابوں کو حضرت شیخ الہند کی کرامت سمجھتے ہیں

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ آپ کتابیں تصنیف نہیں کرتے، فرمایا کہ مولانا تھانوی نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بہت کافی ہیں. قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف پر کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ وہ حضرت شیخ الہند کے تلمیذ اور حضرت گنگوہی کے فیض یافتہ تھے، حضرت مولانا شاہ امداد اللہ فاروقی تھانوی، مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، تصوف میں ان کی لکھی ہوئی چیزیں بہت کام کی ہیں۔

ہم مولانا تھانویؒ کی کتابوں کا ایک تعارف کراتے ہیں، سب سے پہلی کتاب تعلیم الدین ہے جس کا نصف حصہ تصوف وسلوک سے متعلق ہے، یہ ہمارے نزدیک تصوف کی پہلی کتاب ہے جس کو پڑھنا چاہئے، پھر ایک ضخیم وفخیم کتاب تکشف ہے جس میں پوری طرح فن تصوف پیش کیا گیا ہے، اصول وفروع مبادی ومقاصد اور تمام متعلقات کو جمع کر دیا ہے پانچسو صفحات سے زیادہ پر یہ کتاب مشتمل ہے، اب سوال پیدا ہوا کہ ایک فن ہے جو من جملہ فنون مدون ہو چکا ہے تو اس کے جواب میں مولانا تھانوی کی دوسری کتاب پیش کی جا سکتی ہے دفع شکوک جس میں مولانا نے صوفیہ کی چیزوں کو قرآن سے مضبوط ومربوط کر کے دکھلایا ہے، غالباً یہ بھی چارسو صفحات پر مشتمل ہے، پھر مولانا نے "تشرف" کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی جس میں ان احادیث کو حل کیا ہے جو صوفیہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، اور اکثر علماء اہل حدیث اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، مولانا نے ایسی حدیثوں کو ذکر کرنے کے بعد ایسی صحیح قوی حدیثوں کو ذکر کیا ہے جن سے صحاح ستہ بھری ہوئی ہیں اور صوفیہ کا مصداق قوت کے ساتھ ان صحیح روایتوں سے صحیح ثابت ہوگیا۔

تشرف آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ تو ان کا علمی تصوف تھا، اب ان کا عملی تصوف

جو آدھی صدی سے زائد ان کے نظام خانقاہی میں برپا رہا اور ان کے زیر تزکیہ شخصیتوں کی اصلاح ظاہر و باطن کی گئی اس کا مجموعہ وہ کتاب ہے جس کا نام تربیت السالکؒ ہے جو سترہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح حضرت اقدس شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے جس میں بہت سے جواہر پارے ہیں سلوک و تصوف اور عرفانیات پر یہ ذخیرہ حرز جان بنانے کے قابل ہے

تیسرے بزرگ مولانا شیخ زکریا محدث کاندھلوی ہیں جنھوں نے آخری عمر میں تصوف کے اشاعت کا فریضہ ادا کیا اور ایک چھوٹی سی "شریعت و طریقت" کتاب تصنیف فرمادی، ان کی ساری کتابوں پر اگر کوئی روشنی ڈالے تو قرآن و حدیث کے ساتھ تصوف کے معارف کا خاصہ ذخیرہ ان میں موجود ہے جہاں تک ہمارا تحقیقی خیال ہے کہ بزرگان دیوبند میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تصوف کے علمی اور عملی مسئلہ میں ناآشنا رہا ہو ہم نوجوان علماء سے اس کی امید رکھتے ہیں کہ وہ ان بزرگوں کے لٹریچر سے فیض یاب ہوں گے۔

ہمارے بزرگوں میں علامہ سید انورشاہ محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں، اپنی قوت حافظہ، فہم سلیم اور تبحر علمی کے اعتبار سے ممتاز شخصیت رکھتے تھے ان کے بارے میں ہم چند کلمات کہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے اپنے علم و فضل سے متأثر کیا اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ان کے افکار میں اصلاح اور تربیت سے نوازا، حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں مولانا سعید احمدؒ اکبرآبادی ہیں جو اس بات کے راوی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے توسط سے شاہ صاحب کی بارگاہ علمی میں رسائی پائی، ایک مرتبہ جب مولانا سعید ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملے تو انھوں نے کہا کہ میرے چند شکوک و شبہات ہیں کیا حضرت شاہ صاحب ان پر توجہ فرمائیں گے اور حل فرمادیں گے، چنانچہ اقبال نے چند چیزیں لکھ کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجیں تو اطمینان بخش جواب پاکر وہ مطمئن اور مسرور ہوئے، مولانا سید یوسف محدث بنوری جو شاہ صاحب سے خاص تلمیذ تھے انھوں نے ہم سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ دیوبند سے کشمیر جاتے ہوئے راستے میں لاہور میں شاہ صاحب نے قیام فرمایا، اطلاع ملنے پر ڈاکٹر اقبال حاضر خدمت عالی ہوئے حدوث عالم پر چند سوالات ڈاکٹر صاحب نے کئے تو حضرت شاہ صاحب نے مولانا بنوری سے کہا کہ

میرا قصیدہ عربی ضرب الخاتم علی حدوث العالم پڑھو ایک ایک شعر دہ پڑھتے رہے اور شاہ صاحب
اس کی تشریح کرتے رہے جب طویل صحبت ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نہایت شاداں وفرحاں
حضرت کی تعظیم وتکریم کرکے واپس ہوگئے، ہم یہاں ڈاکٹر صاحب پر تذکرہ نہیں کر رہے ہیں نہ ان
پر کوئی تبصرہ مقصود ہے بتانا یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے تصوف کے سلسلے میں کیا کیا کیا ہے
ہم نے محسوس کیا کہ اپنی معلومات کو جو اپنے بزرگوں کے بارے میں ہم کو حاصل ہیں پیش کر دیں،
تمام بزرگوں کا اس وقت تذکرہ نہیں ہو رہا ہے، اللہ نے چاہا تو ہم اپنی کتاب تذکرۃ المحسنین
میں ان بزرگوں کے بارے میں تفصیل سے واقعات پیش کریں گے ۔

ہمارا کوئی بزرگ جو سلسلہ ولی اللہی سے وابستہ ہے بے نسبت نہیں ہے مولانا مفتی
شیخ عزیز الرحمٰن بجنوری مدظلہ العالی جو حضرت شیخ الاسلام مدنی رہ کے خلیفہ ہیں انھوں نے
ایک کتاب لکھی ہے جس میں بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تفصیل بتائی ہے کہ کون بزرگ کس
سے بیعت وخلافت سے فیض یاب تھے ۔

ہمارے حلقہ دیوبند کے ایک ممتاز جلیل القدر فاضل جنھوں نے دارالعلوم دیوبند سے
فارغ ہونے کے بعد جدید علوم کی تعلیم پائی اور یورپ کے کسی یونیورسٹی میں دو سال پروفیسر
رہے جہاں انھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں اور دہریوں کو عربی زبان کے ساتھ قرآن وحدیث
فقہ اور کلام وتصوف کی تعلیم دی وہ سب مسلم نہ ہو سکے بلکہ مسالم بن گئے، ان بزرگ سے
ایک مرتبہ میں نے عرض کیا ۔ کیا آپ علامہ انور شاہ کشمیری کے تلمیذ تو ہیں مریبی ہوگئے ہیں؛ فرمایا
کیا وہ مرید بنایا کرتے تھے، میں نے عرض کیا وہ تو اپنے والد ماجد علیہ الرحمہ کے سلسلہ سہروردیہ
میں بیعت وخلافت سے فائز المرام تھے پھر دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد حضرت
مولانا شاہ رشید احمد ایوبی انصاری گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ الہند مولانا
محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء وارشاد پر گنگوہ جاکر مولانا گنگوہی سے وابستہ
دامن ہوئے ہم نے حیدرآباد میں ایک دیوبند کے فارغ کو دیکھا جو شاہ صاحبؒ کے مرید تھے،
ان کو بیعت کرکے ماثورہ درودوں کی تلقین فرمائی جو سلسلہ شاذلیہ کا سلوک باطنی ہے۔

بہرحال وہ بزرگ کہنے لگے، کیا مرید ہونا ضروری ہے؟ میں نے عرض کیا مرید دو قسم کے ہیں

۱:- منکم من یرید الدنیا - ۲ ومنکم من یرید الاخرۃ اور میں نے دوسری آیت پڑھی من اراد الاخرۃ وسعی لھا سعیھا تو خاموش ہوگئے، گویا ان آیتوں کو میں نے ان پر پڑھ کر دم کردیا میں نے پھر عرض کیا کہ آپ نے طویل صحبت پائی انقلابی صوفی علامہ سندھی رح کی، جب کردہ عمر کے آخری حصے میں تھے، کمالات روحانی میں شاہ ولی اللہ کے راستے سے خوب ـــــــ دل و دماغ کو آراستہ کرلیا تھا آپ نے ان کی صحبت پائی، فکر ولی اللہ کو ان سے اخذ کیا، جب ان پر مولوی مسعود عالم ندوی نے تنقید فرمائی تو آپ نے اس کا جواب دیا ہم نے دونوں کتابیں پڑھیں مسعود صاحب مرحوم سے کہا کہ آپ مسعود ہیں اور وہ سعید ہیں دونوں کا مادہ سعد ہے آپ نے دراصل منطق نہیں پڑھی فلسفہ نہیں پڑھا اور کلام سے ناآشنا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تصوف کی کتابوں کے مطالعے میں وحشت ہوتی ہے، لیکن ماشاء اللہ آپ کی زندگی میں ہم احسان کو پاتے ہیں پھر ہم نے ان سے طویل صحبت رکھی اور اپنا فکر احسانی ان پر پیش کیا بہرحال ہمارے فاضل جلیل مولانا سعید اکبرآبادی مرحوم کو ہم نے توجہ دلائی کہ اب دیوبند کے سارے مشائخ جاچکے ہیں اور ان کی آخری یادگار شیخ زکریا ابن یحیٰ محدث رہ گئے ہیں جائیے ان سے رجوع کیجئے ان کے بعد آپ کو کوئی ایسا پیر نہیں ملیگا جو ظاہر و باطن کا جامع ہے محدث بھی ہے اور صوفی بھی ہے، ایک عرصے کے بعد جب ہماری ملاقات اکبرآبادی سے ہوئی تو فرمایا آپ کے ارشاد کی میں نے تعمیل کرلی، شیخ کاندھلوی کے پاس میں پہونچا اور درخواست کی کہ مجھ کو بیعت فرمالیجئے، ارشاد فرمایا، سعید تمھیں بیعت کی ضرورت نہیں ہے تمھیں جن بزرگوں کی صحبت ملی ہے ان کے اثرات بحمداللہ آپ میں کافی ہیں کچھ تلقینات کرتا ہوں اس کی پابندی کرو چنانچہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشادات شیخ کاندھلوی کی پابندی کی۔

جوہانسبرگ ساؤتھ افریقہ میں دارالعلوم دیوبند اور بزرگوں کے خلاف پروپگنڈا کرنے ایک رضاخانی مولوی پہونچ گیا اور گجراتی تجار اس سے بہت متاثر ہوگئے، دیوبندی فکر کے احباب نے اکبرآبادی مرحوم کو بلایا یہ وہاں پہونچے جس جگہ مخالف کی تقریریں ہوتی تھیں، اسی سے متصل جگہ پر ان کی تقریریں ہونے لگیں جس میں سیدھے سادے طرز پر اللہ

اور رسول کی باتیں اور دین کی ضروری ہدایتیں پیش کی جاتی رہیں، حسن اتفاق کہ محدث کاندھلوی وہاں تشریف فرما تھے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر مولانا اکبرآبادی نے پھر درخواست کی کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں، تو محدث کاندھلوی نے فرمایا بھائی تمھارا قلب آئینہ ہوچکا ہے اور اب تم کو دین کے کاموں کے لئے یکسو ہوجانا چاہئے، چنانچہ وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے ڈائرکٹر بنادیئے گئے، ہم نے مولانا اکبرآبادی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملاقات کی یہ ہمارا ان کو آخری دیکھنا تھا وہ وہاں کی مجلس انتظامیہ کے رکن رکین تھے، وہاں اس کی میٹنگ میں آئے ہوئے تھے، جب وہ مجلس کے کام سے فارغ ہوئے تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے درخواست فرمائی کہ اساتذہ اور طلبہ کی مجلس میں تقریر فرمائیے چنانچہ مولانا اکبرآبادی نے اس فقیر کے اشارے پر حقیقت تزکیہ اور اصلاح باطنی پر پُرزور تقریر کی اور مدارس عربیہ کو اس پر توجہ دلائی کہ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب سلیم کو صاف وشفاف آئینہ بنادیا ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مولانا اکبرآبادی پر کوئی خدا کا بندہ محققانہ کتاب لکھے اور ان کی شخصیت کو اس طرح پیش کرے کہ اس سے فوائد مرتب ہوں

بہرحال ہم تصوف کے متعلق اپنی باتیں پیش کرتے رہے، اب علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ خصوصی ابن قیمؒ کی کتابوں سے ہم نے جو کچھ سمجھا ہے اس کو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، ان دونوں بزرگوں کا نام لے کر جو لوگ تصوف اور اہل تصوف پر دلآزار جارحانہ تنقیدیں کرتے ہیں غالبًا ان لوگوں نے پوری طرح ان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ ان کا نام لیکر بیباکی کے ساتھ صوفیہ کی مخالفت نہ کی جاتی، ہم نے ابن تیمیہ کا مطالعہ کیا اور اس کے متخصص علماء سے مذاکرہ کیا ہم ایسے ماحول میں رہے، ان حالات میں گھرے رہے کہ ان دونوں بزرگوں کی صرف مدح سنتے رہے، پھر ہم نے ایسے بزرگوں کی صحبتیں پائیں جو ان پر جرح وقدح کرتے رہے پھر ہم نے حسن ظن سے کام لے کر ان کی کتابیں پڑھیں ان دونوں بزرگوں پر تفصیل سے اب کچھ کہنا نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ متقدمین صوفیہ حضرت حسن بصری حضرت ابراہیم بن ادہم حضرت فضیل بن عیاض، حضرت معروف کرخی، حضرت بشرحافی

حضرت شقیق بلخی، حضرت جنید بغدادی، حضرت سہل تستری، حضرت ابوطالب مکی حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ کے متعلق ابن تیمیہ فرماتے ہیں: یہ اسلام کے مشائخ ہیں ائمہ ہدایت ہیں، اللہ نے ان کے حق میں امت کے اندر لسان صدق رکھ دیا ہے۔ (جلاء العینین ص۵۹)

پھر دوسری جگہ احمد بن جواری سری سقطی ابوسلیمان دارانی کے متعلق اپنے رسالے السماع والرقص میں فرماتے ہیں کہ وہ اکابر شیوخ صالحین میں سے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ نے الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطٰن کے ص۱۴۴ پر فرمایا ہے یہ سب کتاب وسنت کے مشائخ ہیں، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

علامہ ابن قیم رحمہ نرم مزاج رقیق القلب متین اور سنجیدہ آدمی تھے اور اپنے شیخ کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے قید وبند کی مصیبتوں میں ان کے رفیق رہے جب ان کا انتقال ہوگیا تو بیحد دل شکستہ ہوگئے ایسی حالت میں ان کو منازل سائرین علامہ ہروی کی کتاب ملی اس کا انھوں نے مطالعہ کیا اور اس کی شرح لکھ ڈالی اس کے تین حصے ہیں ایک حصہ وہ تصوف ہے جس میں تصوف کی تائید ونصرت اپنے علمی دلائل وبراہین سے کرڈالی اور دوسرے حصہ میں تصوف کی سادہ باتیں نقل کردی ہیں اور ایک حصہ وہ ہے جس میں اپنی دانست میں تصوف پر اور اہل تصوف پر سخت تنقید کردی ہے۔

ہمارا قصہ سنئے ہم جامعہ دارالسلام عمر آباد مدراس جنوبی ہند میں بارہ برس رہے اور درس وتحقیق میں لگے رہے یہ اہل حدیث کا تعلیمی مرکز ہے جس میں ہم نے صبر وضبط اور علم وحکمت سے زندگی گذاری جب ہمارا اس مدرسے میں تقرر ہوا تھا تو مزاج میں ایک جھجھک اور گھبراہٹ پیدا ہوئی ایسے میں ہم نے حضرت اقدس شیخ الاسلام مرشد الانام سید شاہ حسین احمد مدنی حسینی قدس سرہٗ کو خط لکھا، کہ میں ایسے ماحول میں ہوں کہ پریشانی ہوتی ہے۔ تو حضرت اقدس کا جواب آیا: میں دعا کرتا ہوں تم محنت سے پڑھاؤ اور ان لوگوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو وہ بھی تم سے تعرض نہ کریں گے، بحمداللہ ہم نے بارہ برس وہاں اطمینان سے گذار دیئے پھر ہم بارہ برس بعد پڑھاکر نکلے اور ایک علمی سیاحت کی، دوران سیاحت سورت پہونچے، وہاں علامہ مفتی سید مہدی حسن جیلانی قادری دیوبندی سے ملے۔ ان کے دارالفقہ میں ایک طویل صحبت

پائی گفتگو ان کی تصنیفات پر ہوتی رہی جب میں رخصت ہونے لگا تو انھوں نے مدارج السالکین شرح منازل السائرین مصنفہ علامہ ابن قیم مجھے عطا فرمائی اور کہا کہ اس کی تین جلدیں ہیں دو جلدیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ایک جلد میرے پاس نہیں ہے اس کا خوب مطالعہ کرو، میں حیران رہ گیا کہ انھوں نے یہ کیسا پالیا کہ میں منکرین صوفیہ کے حلقہ سے آیا ہوں اب میں سفر میں اس کتاب مستطاب کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہا، پھر اسی دوران سیاحت میں دارالاسلام جمال پور پٹھان کوٹ پنجاب پہونچا وہاں آٹھ مہینے رہا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی شیخ امین احسن اصلاحی، سید مسعود عالم ندوی اور ان لوگوں کے ساتھ رہ کر علمی مذاکرات ہوتے رہے، ایک مرتبہ دسترخوان پر میں نے مولانا اصلاحی سے عرض کیا کہ آپ کا ذہنی معدہ امام ابن عربی کے تصوف کو ہضم نہ کرسکے گا البتہ علامہ ابن قیم کی کتاب مدارج السالکین میں جو تصوف ہے وہ آپ کے لئے سریع الہضم ہے اس کا مطالعہ فرمایئے، سب نے تعجب سے کہا ابن قیم نے بھی تصوف پر کچھ لکھا ہے پھر میں نے مدارج السالکین جلد اول اصلاحی صاحب کے حوالے کردی کہنے لگے یہ عجیب و غریب کتاب ہے رات میں نے جو پڑھنا شروع کیا تو کافی حصہ پڑھ لیا اور یہ معلوم ہوا کہ اس فن کی صحیح تعبیر کتاب وسنت میں کی جاسکتی ہے آپ نے مجھ پر بڑا علمی احسان کیا ہے، میرا مملوکہ نسخہ ان لوگوں کے حوالے ہوا، برسوں کے بعد کتاب مجھے واپس ملی، بہرحال علامہ ابن قیم کی باتیں سنئے جس میں تصوف حقیقی کی مخالفت تو درکنار دلائل وشواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ طریق کتاب وسنت میں مفید ہے (مدارج السالکین ص۵۵ ج۲)

اور شیوخ عارفین کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ تصوف کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اور سند کے طور پر ان بزرگوں کے اقوال نقل فرمائے ہیں، سید الطائفہ جنید بغدادی، ابوحفص، ابوسلیمان دارانی، سہل بن عبداللہ تستری، حضرت ابویزید بسطامی، شیخ احمد بن ابی الحواری، ابوعثمان نیشاپوری، ابوالحسن نوری، محمد ابن فضل، عمر بن عثمان مکی، ابوسعید خراز، ابن عطار اسکندری، ابواسحاق رقی، اور یعقوب نہرجوری، ابوالقاسم نصرآبادی، ابوبکر طاہی، ابوعمر بن نجید، ابوحمزہ بغدادی۔ ان کو تو امام احمد بن حنبل صوفی کہہ کر پکارا کرتے تھے، پھر ابن قیم فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان صوفیاء سے الگ ہیں وہ رہزن ہیں اور ابلیس کے کارندے ہیں (مدارج السالکین ج۲ ص۲۳۷)

علامہ ابن تیمیہ نے اپنے رسالے فی السماع والرقص میں لکھا ہے کہ ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا جس کو اس نے پہلے کے یونانی فلاسفہ سے اور بدعتی متکلمین جہمیہ سے اخذ کیا تھا بہت سی علمی وعملی باتوں میں وہ ملاحدہ اسمٰعیلیہ کے راستے پر چلا اور کبھی اس نے صوفیاء کے طرز پر قرامطہ باطنیہ کے خیالات کو ظاہر کیا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ نے اپنی کتاب خیام میں لکھا ہے کہ فلسفیانہ تصوف جدید اور افلاطونی الٰہیات کا ایک ہی سرچشمہ ہے، علامہ ابن تیمیہ جلاء العینین میں فرماتے ہیں، ان لوگوں نے تصوف میں گفتگو کی لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں بلکہ فلاسفہ کے طریق پر اپنے رسالے علم الظاہر والباطن میں ملاحدہ باطنیہ کی تلبیسات کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ متکلمین صوفیاء کے کلام میں وہ باتیں راہ پاگئیں ہیں، صوفیہ میں بعض ایسے بدترین لوگ ہوئے ہیں جو ملاحدہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو ضروری نہیں جانتے ہیں یہ لوگ محققین صوفیہ اور ان کے ائمہ کے برعکس ہیں، بہرحال ابن تیمیہ کی اور ابن قیم کی کتابیں ایسی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔

مدارج السالکین میں باب الذوق میں ابن قیم فرماتے ہیں جن لوگوں نے ایمان کا دعویٰ کیا وہ صاحبان ذوق نہ تھے، اللہ نے ان سے فرمایا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا لما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ آیت۔ یعنی یہ لوگ کفر کے دائرے سے نکل کر اسلام کے دائرے میں آگئے، ابھی ایمان ان کے دل کے اندر رچا نہیں، صاحب ذوق نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کے دائرے سے خارج نہیں ہیں، البتہ صاحب ذوق کا معاملہ دوسرا ہے، ذوق اور باطنی حب ایمان اس کا نشان ہے، اعمال صالحہ عقائد صحیحہ کے ثمرات ہیں اور یقین ہے مجاہدے کے ذریعہ احسان کا مقام پیدا ہوتا ہے (مدارج السالکین ج ۳ ص۵۸)

بہرحال ہمارا حسن گمان یہ ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن قیم رہ کو متقدمین صوفیہ اور حقیقی دونوں سے اختلاف نہیں ہے، ہمارے بزرگوں میں حضرت حکیم الامت تھانوی رہ فرماتے ہیں نسبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عبد ومعبود دونوں ایک ہوگئے یہ تو کفر صریح ہے (تعلیم الدین ص۹۵) مثنوی میں اس شعر کی شرح میں۔

جملہ معشوق است وعاشق پردۂ ٭ زندہ معشوق است وعاشق مردۂ

صوفیہ کا مشہور مسئلہ وحدت الوجود ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا نے ارشاد فرمایا کہ گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ نے ان کو وجود دیا ہے مگر اللہ کے وجود کے روبرو ان کا وجود ضعیف حقیر اور ناقص ہے اسلئے وجود ممکن کو وجود واجب کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور ہے، جب یہ کالعدم ہوا تو متعدد وجود ایک ہی رہ گیا وحدت الوجود کے یہی معنی ہیں۔ کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ وجود کا ایک ہونا ہے سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے مگر ایسا ہے گویا کہ نہیں ہے اس کو ادعائے وحدت الوجود کہا جاتا ہے اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں ہے جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبے میں فنا کہلاتا ہے، یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدت الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے شہود کا ایک ہونا یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور بقیہ سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں، پس وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں اختلاف لفظی ہے ایسا ہی میرے مرشد نے کہا ہے (شیخ عرب و عجم شیخ مشائخ صالحین مصلحین شاہ امداد اللہ فاروقی تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) وحدت الوجود کے معنی چونکہ عوام میں غلط مشہور ہو گئے تو بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا (کلید مثنوی)

مسئلہ وحدت الوجود کی تفصیل جو مولانا تھانوی نے کی ہے اس کو ذہن میں رکھئے اور دیکھئے علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے کیا کہا ہے (مدارج السالکین ج ۳ ص ۸۶۔ (طریق الہجرتین ص ۳۳۴)

مدارج السالکین جلد اول ص ۸۳ پر علامہ ابن قیم کی ایک تقریر ہے، سنئے

جس طرح انوار مخلوقہ اللہ کے نور کے سامنے اور علم خلق علم حق کے سامنے مخلوق کی قدرت اللہ کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے اسی طرح زمان دہر اور وقت دوام الٰہی کے سامنے مضمحل ہے جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے تو تمیز کی قوت کمزور ہو جاتی ہے اور حال غالب ہو جاتا ہے تو اہل استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے مافی الوجود الا اللہ ماثم موجود الحقیقۃ الا اللہ ھناک یفنی من لم یکن ویبقی من لم یزل ۔ وجود حق اور اس

دوام جب ما سوا اللہ پر غالب آتا ہے تو ہر شئی ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے۔ یہیں سے وحدت الوجود کے ماننے والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے اسی قسم کے مشتبہ کلمات جو اہل استقامت کی زبان سے نکل گئے لوگوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد بنادیا چنانچہ ابن تیمیہ نے فنا کی تین قسمیں کی ہیں، پہلی قسم انبیاء اور اولیاء کاملین کا حصہ ہے دوسری قسم قاصدین اولیائے صالحین کو نصیب ہوتی ہے اس کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں دوسری قسم ماسوا کے شہود سے فنا ہے اور یہ اکثر سالکوں کو پیش آتی ہے، اللہ کی محبت اللہ کی عبادت اور اللہ کے ذکر کی طرف انجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے، محبوب کا استغراق غیر کا شعور باقی نہیں رہنے دیتا، پس موجود کا وجود شہود کا شہود اور مذکور کا ذکر اس سے غائب ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ مخلوق اس کی نگاہ میں فنا ہوجاتی ہے اور صرف اللہ باقی رہ جاتا ہے، چونکہ پہلی قسم کی فناء سے اس فناء کا درجہ کم ہے اس لئے انبیاء اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سابقین اولین کو یہ فنا پیش نہیں آئی ان امور کی ابتداء تابعین کے عہد سے ہوئی، مشائخ صوفیہ میں سے حضرت ابویزید بسطامی حضرت ابوالحسن نوری، حضرت ابوبکر شبلی وغیرہ کو یہ احوال پیش آئے اور ان کے سوا حضرت ابو سلیمان دارانی حضرت معروف کرخی اور حضرت فضیل بن عیاض بلکہ جنید بغدادی کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی (العبودیۃ ص۹۸)

غور کیجئے صوفیہ صافیہ کے وحدت الوجود یا وحدت الشہود میں اور ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بیان کردہ اس فنا میں کیا فرق ہے بلکہ یہ دونوں بزرگ کے وسعت خیال کا حال یہ ہے کہ اگر سالک غلبہ حال میں سبحانی ما اعظم شانی اور ما فی جبتی الا اللہ کہدے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق جانتے ہیں (مدارج السالکین ج ۱ ص۸۴)

ان تصریحات کے بعد ہم ایک کتاب کا تعارف کراتے ہیں۔ مدارج السالکین علامہ ابن قیم کی تصوف پر مفصل کتاب ہے، تین جلدوں میں ہے جس کو علامہ سید رشید رضا الحسینی مصری نے اپنے اہتمام سے مصر میں چھپوائی ہے اور اس کے ٹائٹل پر لکھا ہے، یہ وہ کتاب ہے جس میں تصوف اور معارف الہیہ کے حقائق کتاب وسنت اور سلف صالح کے مطابق بیان کئے

گئے ہیں مصر کے مشہور مصنف عالم ہے، شیخ حامد الفقی جو علامہ ابن تیمیہ رح علامہ ابن قیم رح کے محبین میں سے ہیں اور ان کے علوم ومعارف کے پھیلانے کا بہت شوق رکھتے ہیں ان کو رنج ہے کہ مشائخ صوفیہ سے بکثرت ان کے ارشادات کیوں نقل کئے ہیں، شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہ سے بھی ہے کہ انھوں نے صوفیہ کی تعریف کیوں کی ہے، اللہ اکبر، یہ تو وہی بات ہوئی الناس اعداء لما جھلوا، کیسی دردناک صورت حال ہے کہ ان دو بزرگوں کی ہر بات قابل قدر ہے جو آپ کے نفس کے مطابق ہو اور جب وہ ایسی کوئی بات بیان کریں جس کو آپ کا نفس قبول نہ کرے تو آپ اس کو دلیل کے بغیر رد کر دیں، علامہ سید رشید رضا مصری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے، انھوں نے تصوف کے متعلق کوئی بہتر خیال ظاہر نہیں کیا ہے مگر مجبوری میں یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ بے شبہ صوفیہ صافیہ اہل حقائق ہیں جن کے سامنے متکلمین وفقہاء کی زبانیں بند ہوجاتی ہیں، حقیقت میں یہ حکمت الٰہیہ کے حامل ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ صوفیہ صافیہ نے اسرار شریعت محمدیہ کے بیان اور اخلاق کی تربیت کے ذریعہ اسلام کی خدمت کی ہے، یہاں ہم ایک واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ مصری کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے ایک خصوصی جلسے میں بلایا اس زمانے میں پانی کے جہاز سے وہ زحمت اٹھاکر آئے اور ندوے سے بہت متأثر ہوئے پھر ان کو علی گڈھ کالج نے اپنے یہاں مدعو کیا جب یہ مصری بزرگ علی گڈھ پہونچے اور وہاں پورا کالج دیکھا پھر شعبہ عربی شعبۂ دینیات کو ملاحظہ فرمایا، صدر شعبۂ دینیات مولوی عبداللہ انصاری دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا شاہ محمد قاسم صدیقی نانوتوی بانئ دارالعلوم دیوبند کے داماد تھے، جب سرسید احمد مرحوم نے مولانا نانوتوی کو علی گڈھ آنے کی دعوت دی اور شعبۂ دینیات کی تشکیل کی فرمائش کی تو مولوی عبداللہ کو بھیج دیا گیا، جب علامہ مصری کالج دیکھتے ہوئے شعبۂ دینیات میں پہونچے اور مولوی عبداللہ صاحب سے عربی میں گفتگو کی، جب انھوں نے شستہ شگفتہ فصیح اور بلیغ عربی میں روانی سے گفتگو کی تو انھوں نے (مصری بزرگ) دریافت کیا، کیا آپ نے ندوے میں پڑھا ہے، انھوں نے کہا نہیں بلکہ میں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی ہے جہاں علوم عقلیہ ونقلیہ قرآن وحدیث

فقہ اور تصوف اور جمیع علوم متداولہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ تو مصری بزرگ نے دارالعلوم دیکھنے کی آرزو کی، مولوی عبداللہ انصاری ان کو دیوبند لے آئے۔ بعد ظہر جلدی میں ایک جلسے کا انتظام کیا گیا مولانا ابوالطیب علامہ مفتی محمد احمد قاسمی مہتمم اور مہتمم ثانی علامہ شیخ حبیب الرحمٰن عثمانی تھے جلسے میں علامہ سید انورشاہ کشمیری نے مہمان مصری کے خیر مقدم میں عربی قصیدہ پڑھا، قصیدہ سن کر سید رشید رضا کو وجد آگیا۔ شاہ صاحب کے قصیدے سے بہت متأثر ہوئے، پھر شاہ صاحب نے ایک مبسوط تقریر کی اپنا تعارف کرایا کہ دیوبند کا کیا مسلک ہے، بتایا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ نے تجدید دین کا کام کیا ہے، ان کے تحقیقی منہاج پر قرآن و حدیث فقہ اور تصوف کی ایک نئی تحقیقی شان ہوئی ہے اسی جامع اور محققانہ طرز پر ہمارا مسلک ہے، پھر شاہ صاحب کا اور رشید صاحب کا مذاکرہ چلا جس سے وہ اور محظوظ ہوئے، یہ واقعہ اپنی تفصیل کے ساتھ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں دیکھئے۔

اب ہم ان بزرگوں سے جو سلسلۂ ولی اللّٰہی کے ترجمان اور نمائندے ہیں امید کرتے ہیں کہ اس ذہنیت کلیہ کی حفاظت کریں گے، جو جامعیت علوم اربعہ پر مبنی ہے واللہ ولی التوفیق وھو خیر الرفیق۔

ہاں اور دو چار باتیں عرض کرنی ہیں، علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ جو شخص منازل السائرین کی شرح کو دیکھ لے گا اس پر واضح ہوجائے گا کہ دو حضرات ابن تیمیہ اور ابن قیم نہ صرف اہل سنت اور جماعت ہی میں ہیں بلکہ امت محمدیہ کے اولیاء میں سے ہیں (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۴۳)

علامہ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں کہ ابن قیم کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل ہے، ان کو اذواق و مواجید کا بڑا حصہ ملا ہے جس پر ان کی کتابیں شاہد ہیں (جلاء العینین ص ۱۰)

عام طور پر تصوف پر معترض یہ کہتے ہیں کہ تصوف جمود اور تعطل کا نام ہے، ہم چند بزرگوں کا حوالہ دیتے ہیں، ہندوستان میں عہد عالمگیری کے بعد جو تحریک دینی اور تجدید یقینی کی جدوجہد ہوئی، علمی اور عملی انقلاب آیا اس میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادے اور ان کے فیض یافتہ تلامذہ اور مسترشدین کی مجاہدانہ کوششیں اور مجتہدانہ کاوشیں یہ بتا رہی ہیں کہ

کس طرح ان بزرگوں نے جمود کو حرکت سے بدلا اور تعطل کو عملی مساعی سے بدل کر رکھ دیا، اور خصوصًا سید احمد شہیدؒ کی تحریک اسلامی اس کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ اسی طرح مسلم ملکوں پر نظر ڈالئے کہ مغربی استعمار کے مقابلے میں جن بزرگوں نے اپنی جان و مال کو لٹایا اور قربانیاں پیش کیں ان کی مبسوط تاریخ ہے، سید عبدالقادر امیر جزائری، سید محمد احمد سوڈانی سید احمد سنوسی اس میدان کارمیں مصروف جہاد نظر آئیں گے۔ سید احمد سنوسی ایک مرشد روحانی شیخ طریقت صوفی زاہد و مرتاض کے علاوہ ایک زبردست فوجی سپہ سالار بھی تھے، حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات سے اور اسکے نتیجے میں نفس کا تزکیہ اور قرب الٰہی کے ذریعہ جذب و شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے وہ سب کچھ تصوف ہی کا ثمرہ ہے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری درجہ شوق شہادت ہے نفسیاتی پہلو سے اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مرغوبات نفسانی عادات حیوانی عادی مالوفات دنیوی مصالح ومنافع اور اغراض وخواہشات کی پستیوں سے وہی شخص نکل سکتا ہے جو مجاہدہ کرکے میدان جہاد میں گامزن ہوتا ہے، اللہ کا عشق پارے کی طرح کیفیت سیمابی اور تجلی حق کی بیتابی پیدا کردیتا ہے، مسلمانوں کی ماضی قریب کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ حرکت میں ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے اپنے دل کی بیتابی اور ایمان ویقین کی قوتوں سے ہزاروں انسانوں میں ایک روح پھونک دی، معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کے لئے فتح ونصرت کے حالات میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوئے ہیں اسی لئے کسی غیر معمولی شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن جب مایوس کن حالات ہوں اور ماحول میں بے یقینی کی کیفیات ہوں تو صرف وہی مرد میدان کش مکش کی طاقت رکھتا ہے جو تعلق باللہ اور مالک حقیقی کے عشق میں سرشار ہو، انیسویں صدی میں جب مسلمان ملکوں پر فرنگیوں کا طوفان منڈلانے لگا تو جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر وبیشتر مشائخ صوفیہ اصحاب سلاسل تصوف تھے جن کا تزکیہ نفس، سلوک راہ نبوت اور صحابہ وتابعین کی دینی حمیت، کفر کی نفرت، دنیوی خرافات کی حقارت، اللہ کے راستے میں شہادت کی تمنا ان کے پاس سب سے بڑی قوت تھی، الجزائر میں سید عبدالقادر امیر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا ۱۸۳۲ء سے

۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا یورپ کے مؤرخوں نے امیر جزائری کی ہمت وشجاعت اور علمی وعملی خوبیوں کی تعریف کی ہے، علامہ امیر البیان محمد شکیب ارسلان نے (حاضر عالم اسلام جلد دوم ص۱۷۳) لکھا ہے امیر عبدالقادر جزائری پورے عالم دین، ادیب محرر مقرر، عالی دماغ، پاک دل اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً وذوقاً صوفی تھے، انکی مشہور کتاب المواقف ہے وہ ایسے یکتائے روزگار لوگوں میں سے تھے کہ متاخرین میں اس کی نظیر نہ مل سکے گی دمشق کے زمانہ قیام کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ روزانہ صبح کو اٹھتے فجر کی نماز اپنے گھر کے قریب مسجد میں پڑھتے سوائے بیماری کے کبھی اس معمول میں فرق نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان میں صوفیا صافیہ کے طرز پر ریاضت ومجاہدے میں مشغول رہتے، متقیانہ سیرت اور اخلاق حسنہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا (حاضر عالم اسلامی ج ۲ ص۱۷۳)

تاغستان بحر خزر کے مغربی ساحل پر مسلمانوں کا ایک ملک تھا اور شمالی خفقاز کو ملاکر تیس لاکھ کے درمیان وہاں مسلم آبادی تھی ہشام ابن عبدالملک اموی کے زمانے میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا اس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیر اثر تھا، جب روسیوں کا وہاں تسلط ہوگیا تو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مشائخ نقشبندیہ نے جہاد کا علم بلند کیا، اور ایسی جدوجہد کی کہ اسلامی شریعت کے مطابق سارے معاملات فیصل ہونے لگے، جاہلی مراسم وخرافات سب ترک کردیئے گئے۔

امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ اس جہاد کے علمبردار تاغستان کے علماء ومشائخ تھے جو نقشبندیہ سلسلے کے زاہد ومرتاض صوفی تھے اس حقیقت کو انھوں نے عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام سے پہونچتا ہے جو سرکاری خطابات عہدے اور اقتدار جھوٹی قیادت، عیش ولذت، تمغوں اور مرتبوں کے لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں یہ سمجھ کر مشائخ نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہو نہ کہ جاہلی عادات کے مطابق، اس تحریک کے قائد غازی محمد روسی تھے، وہ علوم دینی میں بلند مرتبہ رکھتے تھے ان کی رسوم جاہلیہ

کے خلاف ایک تصنیف بھی ہے جس میں انھوں نے اپنے علاقے کی غیر شرعی رسموں کی نشاندہی اور اصلاح کی ہے، کتاب میں بھی اس علاقے کے دنیا پسند سرداروں پر سخت تنقید ہے ۱۸۳۲ء میں غازی محمد روسی رہ شہید ہوگئے، ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدوں کی قیادت سنبھالی جو امیر جزائری کے طرز پر تھے، دینی مشیخت کے ساتھ سیاسی امارت ہاتھ میں لی تھی، شیخ شامل نے پچیس سال تک روس سے مقابلہ جاری رکھا مختلف معرکوں میں فتح حاصل کی، روسی ان کی شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے، ۱۸۴۷ء میں شیخ شامل نے سارے قلعے فتح کرلئے بڑا جنگی سامان مال غنیمت میں ہاتھ آیا، اخیر میں ۱۸۵۹ء میں اس مجاہد نے ہتھیار رکھے تصوف اور جہاد کی جامعیت کی ایک مثال سید احمد سنوسی کی ذات ہے، جن کا اطالویوں سے مقابلہ ہوا طرابلس کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا گیا تھا، نوآبادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز سرداروں نے تنقید کی اور کہا یہ اطالویوں کی ناتجربہ کاری ہے اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے پھر بھی اٹلی والے اس علاقے کو فتح نہ کرسکے۔

یہ سنوسی درویشوں اور ان کے مجاہدانہ مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ اٹلی کو پندرہ برس تک قدم جمانے نہیں دیا، امیر شکیب نے لکھا ہے کہ طریقہ سنوسیہ کا نظام ایک حکومت کا نظام ہے، سید سنوسی کے متعلق امیر شکیب فرماتے ہیں مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی ثابت قدمی اور استقامت نظر آئی جو کم لوگوں میں دیکھی گئی، اولوالعزمی کے ساتھ اپنے تقوے اور عبادت کے لحاظ سے وہ اپنے زمانے کے اولیاء میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

بہرحال ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس کے تزکیئے باطن کی پاکیزگی کے بعد ایسا عزم و حوصلہ پیدا ہوجاتا ہے کہ جس کے ذریعہ اسلام کے دشمنوں سے مقابلے کی غیر معمولی قوت آتی ہے، ہم کہاں تک بتائیں کہ اہل تصوف میں جمود و تعطل نہیں ہے بلکہ للہیت کی تحریک ہے جس کو قرآن تبتل کہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ صوفیاء میں بعض اہل رخصت کسی عذر شرعی سے گوشہ گیر ہوگئے ہوں لیکن عزیمت کار سے الگ رہ کر اپنی ہمت باطنی اور دعاؤں سے کام کر رہے ہوں۔

اب ہم آپ کے سامنے ہندوستان کی تحریک انقلاب کا مختصر تذکرہ کریں گے، سرزمین ہند میں عہد عالمگیری کے دور میں چند ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے دہلی میں جب کہ مسلمانوں کی حکومت میں زوال کے آثار نمودار ہو رہے تھے تو ان بزرگوں نے دین کی تجدید اور انقلاب کی تحریک شروع کی حضرت امام ہمام حکیم الاسلام ابو الفیاض قطب الدین احمد ابن عبدالرحیم المعروف بشاہ ولی اللہ دہلوی کا ظہور ہوا، انھوں نے اپنے دور کے علماء و مشائخ علوم وفنون کے ماہرین اساتذہ سے تحصیل وتکمیل علمی وعملی کرلی، پھر ایک مدت دراز تک ان علوم وفنون کی تدریس واشاعت میں عمر گذاری اور حجاز مقدس کا سفر کیا اور حرمین شریفین کے اہل علم وفضل سے استفادہ کیا خصوصاً مدینہ منورہ میں امام شیخ ابو طاہر کردی مدنیؒ سے علم حدیث کی تکمیل کی، اس سے پہلے وہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم فاروقی سے اور اپنے شیخ ابوالرضا محمد سے علوم عقلیہ کی تکمیل کر چکے تھے علوم عقلیہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ میں کمال پیدا کیا اور تعلیم کے دونوں درجے تحصیلی وتکمیلی میں پورے فائز المرام ہوئے اور تزکیئے میں پورا درک حاصل کیا، حرمین سے ایسی حالت میں واپس ہوئے کہ امت مسلمہ میں دینی تجدید کیلئے سرو سامان سے آراستہ وپیراستہ ہو چکے تھے، ہندوستان آنے کے بعد دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور قرآن وحدیث فقہ اور تصوف چاروں میں ایسا تجدیدی کارنامہ انجام دیا کہ ان کی جامعیت سے ایک ذہنیت پیدا ہوگئی، قرآن و حدیث کی روشنی میں فقہ اور تصوف کا جائزہ لیا اور ایسا فکر صحیح مہیا فرمایا کہ جس کی بنیاد پر علمی جدوجہد کے ذریعے ایک عملی سوسائٹی بنائی، اس سوسائٹی نے عوام وخواص میں ایک ذہنی اور خارجی انقلاب پیدا کیا آج ہمارے لئے وہ مشعل راہ ہے مسلمانوں کی ذہنی زندگی کی اصلاح کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی چاہئے۔ تفسیروں میں حدیث کے مجموعوں میں فقہ کے ذخیروں میں اور تصوف کے لٹریچر میں شاہ ولی اللہ کے فکر کی بنیاد پر تدبر کرنا چاہئے اور ان کے متعلقہ علوم میں تحقیق کرنی چاہئے اور ایسی تنقیح کی جائے کہ جس کے ذریعہ صالح عنصر بیکار حصے سے الگ ہو جائے بے شک تحقیق وتنقیح کے اسی گراں قدر خدمت سے موجودہ اہل تجدد کے پھیلائے ہوئے فتنے کو ختم کیا جا سکتا ہے

شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی پسر شاہ ولی اللہ کے

پوتے شاہ اسمٰعیل اور شاہ اسحاق ان بزرگوں نے جو معتدل اور متوازن علمی و عملی پروگرام بنایا ہے گو اس میں خلل پیدا کیا گیا پھر بھی سوسائٹی اپنے عملی پیکر کے ساتھ موجود رہی اور اس تحریک دینی کے آخری بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید شاہ حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ذات ہے ہم ان کے ارشادات پر اپنی اس تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

بیعت اور اس کا ثبوت

بیعت نام ہے اس کا کہ شریعت کی کسی بات کے لئے عہد لیا جائے کہ وہ اس امر کو اللہ کے حکم سے انجام دینگے یا کسی خاص دینی مسئلہ کا کہ وہ اس پر عمل کریں گے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع میں ایسا کیا ہے چنانچہ حدیبیہ کی لڑائی کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ اگر دشمنوں سے مقابلہ کی نوبت آئی تو وہ بھاگیں گے نہیں بلکہ جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں کا مقابلہ کرینگے اور موت آجائے تو اس کو اختیار کریں گے اور اسلام کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیں گے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح میں فرمایا ہے لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونك تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم و اثابھم فتحا قریبا۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہوگیا۔ جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے پس اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اطمینان پیدا کر دیا اور ان کو فتح قریب عطا فرمائی۔

اسی طرح سورۂ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے بیعت لینے کے متعلق ذکر کیا ہے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ یا یھا النبی اذا جاءك المؤمنات یبایعنك علی ان لا یشرکن باللہ شیئا و لا یسرقن و لا یزنین و لا یقتلن اولادھن الآیۃ۔ ترجمہ:۔ اے نبی جب مومن عورتیں تمھارے پاس آئیں اور عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی ——— ——— ورنہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی۔

زمانہ جاہلیت میں عادت تھی کہ اپنے بچوں کو مرد عورت (ماں باپ) فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل کر ڈالتے تھے، فرمایا گیا ہے لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق فاقہ کے خوف سے

اپنے بچوں کو مت مارڈالو ـــــ اسی طرح اور برائیوں میں لوگ مبتلا تھے، عہد لیا گیا کہ ان سب سے علیحدہ ہو کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کریں گے، ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عورتوں سے بیعت لیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے، پس معلوم ہوا کہ بیعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ان بارہ صحابہ کرام میں ہیں جو بیعت عقبہ میں شریک تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو داعی اسلام اور مبلغ (نقیب) بنا کر بھیجا تھا۔ اسکے علاوہ آپ کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ آپ جنگ بدر میں شریک تھے جن کی مغفرت کا دنیا ہی میں اعلان ہو چکا تھا، یہی حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ صحابہ کی ایک جماعت آپ کے گرد حلقہ بنائے تھی آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

بایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئًا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادکم ولا تاتوا ببھتان تفترونہ بین ایدکم وارجلکم ولا تعصوانی معروف فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ ومن اصاب من ذالک شیئًا فعوقب فی دنیا فھو کفارۃ لہ ومن اصاب من ذٰلک شیئًا ثم سترہ اللہ فھو الی اللہ ان شآء عفا عنہ وان شاء عاقبہ فبایعناہ علی ذالک (بخاری شریف کتاب الایمان)

ترجمہ:۔ مجھ سے بیعت کرو اس پر کہ اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانو گے، سرقہ اور زنا کا ارتکاب نہیں کروگے اور اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہ کروگے، اور بہتان نہ باندھوگے اور کسی بھی اچھے کام میں نافرمانی اور حکم عدولی نہ کروگے، پس جو شخص اس عہد کو پورا کرے اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے اور جو شخص ان میں سے کسی جرم کا مرتکب ہو جائے پس اگر دنیا میں اس کو اس کی سزامل گئی تو وہ کفارہ ہو سکتی ہے اور اگر دنیا میں اللہ نے اس کی پردہ پوشی کرلی تو پھر اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے معاف کرے اور اگر چاہے تو سزا دے، (راوی کہتے ہیں کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد ختم کرچکے تو ہم نے آپ سے ان باتوں پر بیعت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں سے مختلف چیزوں پر بیعت لی ہے حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی اس بات پر کہ ہم ہر مسلمان کی خیرخواہی کریں گے اور حفاظت کریں گے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے اس سے بچیں گے۔

حضرت سلمہ بن اکوع سے پوچھا گیا کہ حدیبیہ میں کس چیز پر بیعت کی تھی تو کہا موت پر، یعنی اس پر کہ مر جائیں گے لیکن بھاگیں گے نہیں، کبھی بعض خاص باتوں پر بیعت کی، کبھی پوری شریعت پر کسی سے اس پر بیعت کی کہ کسی سے کوئی چیز مانگیں گے نہیں، اس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرام میں کسی کا کوڑا اگر جاتا تھا یا وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو خود ہی اتر کر اٹھاتے تھے یعنی کسی کو اٹھانے کے لئے نہیں کہتے تھے کہ کہیں یہ بھی سوال نہ ہو، مختلف جگہوں میں مختلف طریقہ سے قرآن اور حدیث میں ذکر آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی کبھی کچھ چیزوں کے لئے کبھی پوری شریعت کے لئے۔

بیعت کوئی نئی چیز نہیں ہے، قرآن وحدیث میں بہت سے واقعات ذکر کئے گئے ہیں جن سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے، بیعت اس بات پر ہوتی ہے کہ شریعت کے حکموں کی تعمیل کرینگے اللہ کا ذکر کریں گے اور شریعت پر چلیں گے، اسی کو بیعت طریقت کہا جاتا ہے، بیعت کے طریقے ہر زمانے میں جاری رہے ہیں اور اللہ کے خاص خاص بندوں نے مسلمانوں سے اس سلسلہ میں عہد لیا ہے۔

بیعت کون لے سکتا ہے

بیعت کا ہر شخص کو حق نہیں، بیعت لینے کا اسی کو حق ہے جو فسق وفجور سے بچتا رہا ہو اور کسی پیر کے پاس رہ کر کتاب وسنت کی روشنی میں تزکیۂ قلب حاصل کر چکا ہو اور اپنے مرشد سے نسبت باطنی حاصل کی ہو، ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ پر زمانۂ سابق میں بیعت کی جاتی تھی تمام صحابۂ کرام میں یہ اوصاف پائے جاتے تھے، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خصوصاً یہ سلسلہ زیادہ چلا ہے حضرت علی کے بعد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ۔

شیخ یا مرشد

حضرت علی رض کے بعد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء رحمہم اللہ میں سے جو بیعت لیتے ہیں ان کو پیر کہتے ہیں، پیر کے معنی بڈھے کے ہیں اور عربی میں اسے شیخ کہتے ہیں۔

چونکہ عموماً وہ شخص جو زیادہ دنوں تک اللہ اور رسول کی اطاعت میں وقت گذارتا ہے اور تجربہ حاصل کرتا ہے اور پھر اشاعت و تبلیغ کا کام کرتا ہے بوڑھا ہوتا ہے اسی لئے اسکو پیر کہا جاتا ہے، پیر کسی شخص کا نام نہیں ہے کسی مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ جو شریعت کا پابند اور عرصہ دراز تک ریاضت کئے ہوئے ہو وہ اللہ کی کثرت سے اطاعت کرتا ہو، اور دنیا کا حریص نہ ہو اس قدر عبادت کی ہو کہ اسے نسبت پیدا ہو گئی ہو وہی پیر ہوتا ہے مگر عرصہ دراز گذرنے کے بعد جس طرح ہر جماعت میں کھرے کھوٹے ہوتے ہیں، اسی طرح طریقت کے اندر بھی کھرے کھوٹے پیدا ہو گئے

جو شخص شریعت پر نہ چلتا ہو، اور سنت کا تابعدار نہ ہو وہ شخص بیعت لینے کا مستحق نہیں ہے۔ حکم ہوا ہے۔ یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین، اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اللہ سے اور سچوں کے ساتھ رہو، پیر وہ ہوتا ہے جو ہر طرح سچا ہو جس کے اندر فریب نہ ہو، پیر اس شخص کو بنایا جاتا ہے جو سچا ہو اللہ کے ساتھ اور رسول اللہ کے ساتھ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔ اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ سے یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ایمان کا درجہ اول ہے اور ثانوی درجہ تقویٰ کا ہے اور تیسرا درجہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ کا ہے، محققین کی رائے ہے کہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ سے مراد مرشد تلاش کرنا ہے چوتھا حکم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو۔ سب سے پہلا جہاد یہ ہے کہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کرو

طریقت وتصوف سنت قدیمہ ہے

طریقت وتصوف نئی چیز نہیں ہے بلکہ پرانی ہے، عرصہ سے چلی آرہی ہے، صحابۂ کرام فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا، ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہیں تھا اس کے کپڑے نہایت سفید تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب گھٹنے سے گھٹنے ملاکر بیٹھ گئے، ہم نے تعجب کیا وہ باہر سے آئے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے کیونکہ ایسے آدمی کے جو سفر کرکے آیا ہو کپڑے بہت میلے اور گندے ہوتے ہیں، اس نے سوال کیا ما الایمان؟ ایمان کیا ہے، آپ نے فرمایا ان تومن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ وتومن بالبعث بعد الموت والقدر خیرہ وشرہ اوکما قال ایمان یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اسکے رسولوں پر اور فرشتوں پر اور قیامت پر اور اچھی بری تقدیر پر۔ اس کے بعد سوال کیا اسلام کیا چیز ہے۔ فرمایا ان تشہدان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ولاتشرک بہ شیئا وتقیم الصلوٰۃ وتعطی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا۔ یعنی تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ ایک ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور روزہ رکھو اور استطاعت ہو تو حج کرو۔

اس کے بعد سوال کیا کہ احسان کیا چیز ہے فرمایا تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھتے ہو، اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو وہ تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے، احسان کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ کیا گیا ہے ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین دوسری آیت ھل جزاء الاحسان الا الاحسان، اس کی اور بھی آیتیں ہیں، آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک کہ احسان نام ہے اس چیز کا کہ خدا کی عبادت مکمل خضوع اور خشوع کے ساتھ انجام دو اور اس طرح عبادت کرو جس سے ظاہر ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو جیسے غلام آقا کو دیکھتا ہے تو نہایت توجہ سے کام کرتا ہے کوتاہی نہیں کرتا، ہر عبادت کی تکمیل اس طرح کرو جیسے تم اپنے آقا اور مالک کے دیکھنے کے وقت کرتے ہو اگر تم کہو کہ ہم اللہ کو نہیں دیکھ سکتے تو یہ خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

غلام کام کی تکمیل اس واسطے کرتا ہے کہ آقا اس کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔

اسی احسان کے حاصل کرنے پر تمام تر تصوف کا مدار ہے آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضور کی مجلس میں ایمان کے ساتھ حاضر ہوتے ہی احسان حاصل ہوجاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت اتنی قوی تھی کہ جو حاضر ہوتا تھا اس کے قلب پر ایسا اثر پڑتا تھا کہ تمام چیزوں کو بھول جاتا تھا اور اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی روز حاضر نہ ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ اپنے آدمیوں کو یاد کرتے تھے جب وہ ایک دو وقت نہیں آئے تو فرمایا حنظلہ کیوں نہیں آتے۔ لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا حضرت ابوبکر رض نے عرض کیا میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں اور خبر لاتا ہوں، چنانچہ وہ ان کے گھر گئے گھر والوں سے پوچھا کہ حنظلہ کہاں گئے، ان کی بیوی نے کہا کہ گھر میں سر جھکائے گوشے میں بیٹھے ہیں حضرت ابوبکر رض نے کہا کہ میں اندر جاکر دیکھوں؟ اندر گئے تو دیکھا بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں، پوچھا آنحضرت ؐ کی خدمت میں کیوں نہیں آتے، حضرت حنظلہ رض نے کہا: میں منافق ہوگیا ہوں، حضرت ابوبکر نے پوچھا کیسے؟ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ؐ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو دنیا کی ساری باتیں فراموش ہوجاتی ہیں اور خدا سے تعلق رہتا ہے اور جب گھر آتا ہوں، بال بچوں میں لگ جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں رہتی، حضرت ابوبکر رض نے فرمایا کہ میری بھی یہی حالت ہے، پھر یہ بھی بیٹھ کر رونے لگے اور پھر فرمایا کہ ہماری تمام مشکلات کو حل کرنے والے وہی آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کے پاس چلو رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ بات ان کے سمجھ میں آگئی چنانچہ دونوں حضور ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہماری ایسی ایسی حالت ہوتی ہے آپ نے فرمایا اگر تم ہر وقت ایسے ہی رہو جیسے میرے سامنے رہتے ہو تو فرشتے تم سے مصافحہ کرنے لگیں مگر یہ حالت وقتا فوقتا ہی ہوسکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی ہے جیسی آفتاب اور صحابہ کے پاک وصاف دل گویا آئینہ تھے جب بھی آفتاب نبوت کے سامنے پہونچتے تھے اور حالت ہوجاتی تھی اور جب الگ ہوتے اس میں فرق آجاتا تھا

مشاغل صوفیہ اور تزکیۂ نفس

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چار کام سپرد کئے گئے تھے، جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے یتلوا علیہم ایاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ

۱:- قرآن حکیم کی آیتیں سناتے تھے، اس کا ذکر قرآن میں چار پانچ جگہ ہے۔
۲:- اللہ تعالیٰ کا کلام سکھاتے تھے۔
۳:- حکمت کی باتیں تبلاتے تھے۔
۴:- اور چوتھا کام یہ کہ دلوں کے میل کچیل دور کرتے تھے اور ان کو پاک وصاف کرتے تھے،

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی طاقت سے اہل ایمان کے دلوں کے میل کچیل دور ہوجاتے تھے، غیر اللہ کی محبت اور ہر قسم کی برائی دور ہوجاتی تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ صلعم مدینہ منورہ میں داخل ہوتے تھے تو ہر چیز روشن معلوم ہوتی تھی، جب تک آپ رہے سب چیزیں روشن معلوم ہوتی رہیں وفات کے بعد جب ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر مٹی ڈالی تو وہ روشنی جاتی رہی، اور کہتے ہیں کہ ابھی ہم نے ہاتھوں سے مٹی نہیں جھاڑی تھی کہ خود ہمیں اپنے دل اوپرے معلوم ہونے لگے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت کے آفتاب تھے صحابۂ کرام نے ان سے روشنی حاصل کی، اسی بنا پر اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو شخص اسلام کے ساتھ چند منٹ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں رہا ہو وہ بعد کے آنے والے بڑے سے بڑے متقی اور ولی سے بھی افضل واعلیٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی طاقت بجلی سے بھی زیادہ طاقتور تھی، دل ودماغ روشن کرنے والی، اس لئے ریاضت کی زیادہ ضرورت نہ ہوتی تھی، ضرورت اس بات کی تھی کہ اخلاص کے ساتھ مجلس میں حاضری ہوجائے مگر جیسا کہ حضرت انس رض نے فرمایا آپ کی جدائی کے بعد وہ روشنی نہیں رہی، اسی طرح صحابۂ کرام کے زمانہ سے جتنا زمانہ دور ہوتا گیا روحانی اور قلبی صفائی میں کمی ہوتی گئی، جس طرح صاف برتن کے صاف کرنے کے لئے کسی

زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہوتی میل کچیل جلد دور ہوجاتا ہے اسطرح صحابہ کے صاف قلوب کو صاف کرنے کیلئے کسی خاص ریاضت کی ضرورت نہیں تھی مگر جیسے جیسے میل بڑھتا اور جمتا گیا ریاضت کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔

احسان صفائی قلب اور تصوف

بس اسی دل کی ہی صفائی حاصل کرنے کا نام احسان ہے اور یہی تصوف کا مقصد ہے، تصوف کا مقصد کوئی نئی چیز نہیں ہے، حدیث جبریل میں جو چیز مذکور ہے وہی سچ ہے مگر بُعد کی وجہ زمانے کی طبیعتوں میں میل زیادہ ہوگیا جس کی وجہ سے مانجھنے کی ضرورت زیادہ ہوگئی۔

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو اصول تصوف میں ذکر کئے گئے ہیں یعنی بارہ تسبیحیں ذکر جہری پاانفاس مراقبہ وغیرہ اس کا بھی کسی حدیث میں ذکر نہیں ہے، انکا یہ اعتراض غلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد کے لئے تلوار تیر وکمان نیزہ وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے اور بندوق مشین گن گولہ بارود اور ہوائی جہاز کا کوئی تذکرہ نہیں آتا، آج اگر مسلمانوں کو شرعی جہاد کی ضرورت پڑے تو آپ یہ کہیں گے کہ جنگ تلوار سے کرنی چاہیئے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جنگ فقط تلوار، نیزہ، تیر وکمان سے کرتے تھے، ہرگز آپ ایسا نہیں کرسکتے اور اگر آج ایسا کریں گے تو دشمن آپ کو دور ہی سے فنا کردیگا مشین گن اور توپوں وغیرہ سے اگر دشمن حملہ کرے تو ہم کو بھی وہی چیز اختیار کرنی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم فرمایا ہے اعدوالھم مااستطعتم من قوۃ الخ جو تم سے قوت ہوسکے دشمنوں سے مقابلہ کے واسطے تیار کرو

مقصود جہاد سے اعلائے کلمۃ اللہ ہے جس چیز سے بھی ہو اور جس چیز کی ضرورت پڑے اس کو استعمال کرو جس سے دشمن کو شکست دے سکو اس کو مہیا کرو اور مقابلہ کرو

اسی طرح جس زمانے میں آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو اس زمانے میں تھوڑی ریاضت کی ضرورت پڑتی تھی اور اسی سے کام ہوجاتا تھا اور جتنے دن زیادہ گذرتے گئے ریاضتوں کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی، اسی وجہ سے چلّہ بارہ تسبیح، ذکر جہری اور پاس انفاس وغیرہ قلب کی صفائی کے لئے متعین کئے گئے۔

آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن شریف میں زیر و زبر نہیں تھے، حضرت ابوبکر رضؓ نے اپنے دور خلافت میں کتابی شکل میں کرایا، حضرت عثمان نے ترتیب دیا مگر زیر و زبر تب بھی نہیں لگائے گئے، صحابہ کرام کی زبان عربی تھی وہ بغیر زیر و زبر کے پڑھتے تھے جیسے ہم اردو زبان والے اردو کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاتے ہیں، آج کوئی بنگالی برمی یا انڈونیشیا والے سے کہا جائے کہ اردو کی صحیح عبارت پڑھو تو وہ نہیں پڑھ سکتا ہے، جس طرح ہم زیر و زبر کے نہ ہوتے ہوئے صحیح پڑھتے ہیں اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن جس میں نہ زیر نہ زبر نہ نقطہ کچھ بھی نہیں تھا صحابہ کرام صحیح پڑھتے تھے مگر تھوڑے ہی زمانہ بعد اس کی ضرورت محسوس ہوئی، عجمیوں کی غلط ملط کی وجہ سے لوگ زیر و زبر کے محتاج ہو گئے، بس یہ اعتراض کہ قرآن میں زیر و زبر نہیں لگانا چاہئے کیونکہ یہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں پائے گئے تو کیا یہ اعتراض کوئی وزن رکھتا ہے، بیشک اس زمانے میں لوگ بغیر زیر و زبر کے تلاوت کر لیتے تھے مگر آج مکہ اور مدینہ والے جن کی زبان عربی ہے وہ بھی بغیر زیر و زبر اور نقطہ کے نہیں پڑھ سکتے، جس طرح ہم محتاج ہیں صرف و نحو کے اسی طرح عرب والے بھی محتاج ہیں اور وہ بھی بغیر زیر و زبر و نقطہ کے نہیں پڑھ سکتے ہیں۔

تو زمانہ کے بدلنے کی وجہ سے احوال بدلتے رہتے ہیں، لیکن وہ احوال جو مقصود کو بدلنے والے نہ ہوں ان کو سنت ہی کہا جائے گا، مثلاً کسی شخص نے روٹی پکانے والے کو متعین کیا تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ لکڑی چولہا توا سب چیزیں مہیا کریں، لکڑی نہ ملے کوئلہ نہ ملے تو اوپلہ کو بھی استعمال کیا جائے، غرض جس چیز پر روٹی پکانا موقوف ہوا اسی کو طلب کیا جائے۔

مختصر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احسان حاصل کرنے کیلئے ریاضت کی ضرورت نہیں تھی مگر آج ہمارے مرشدوں نے بتلایا کہ اس طرح سے ذکر کرو اگر کوئی کہے کہ یہ بدعت ہے تو سراسر غلطی ہے۔

ذکر کی تاکید

خدا نے کئی جگہ ذکر کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد ہے واذکروا اللہ قیاماً وقعوداً، کھڑے اور بیٹھے کی کوئی قید نہیں ہے، اسی طرح لفظ کی کوئی قید نہیں ہے، اسی طرح لفظ اللہ، سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ ضرب کے ساتھ ہو یا بلا ضرب

کے ارشاد خداوندی کے تحت سب داخل ہے، دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا۔ تیسرا ارشاد فاذکرونی اذکرکم، تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا کوئی قید نہیں ہے کہ کس طرح سے ذکر کیا جائے، مطلقاً ذکر کا حکم ہے، ہمارے بڑے بڑے تجربہ کار لوگوں نے کہا ہے کہ ذکر سری سانس کے ساتھ اور ذکر خفی روح کے ساتھ کرو۔ بہرحال ذکر کوئی بدعت نہیں ہے۔ جیسے حکم دیا تھا جہاد کرنے کا، یہ دشمن کی طاقت کو کمزور کرنے کیلئے جہاد کرو چاہے تلوار سے چاہے تیر سے چاہے توپ یا مشین گنوں سے جس طرح تم انجام دے سکو اور دشمن کو شکست دے سکو۔

جیسے قرآن کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے تو زبر زیر لگانا اور عکسی قرآن چھپانا اسی کے حکم میں ہے، تم کو حج کا حکم دیا گیا ہے تو پہلے اونٹوں سے سفر کرتے تھے تو اس کی ضرورت ہوتی تھی اور آج جہازوں اور لاریوں سے سفر کرنا پڑتا ہے، اگر کوئی بیوقوف کہے کہ یہ بدعت ہے میں تو ہندوستان سے اونٹ پر سفر کروں گا تو کیا آپ سفر کر سکتے ہیں، اسی طرح سے جدّہ پہونچنے کے لاریوں سے سفر ہوتا ہے۔ تو مقصود بیت اللہ کی حاضری ہے جس طرح سے ہو اس کو انجام دیا جائے مقصد میں کوئی فرق نہیں آیا، زمانے کی ضرورت کی حیثیت سے فرق پڑ گیا ہے۔

تو میرے بزرگو آج یہ کہنا کہ تصوف اور سلوک میں جو باتیں ہیں بدعت ہیں یہ غلط ہے اور وہ مامور بہ ہیں ان پر عمل کرنا ہوگا۔ کیونکہ اصل مقصد تصوف میں احسان ہے اس کے حاصل کرنے کے جو طریقے خلاف شریعت نہیں ہیں، وہ سب ضروری ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص کہے کہ مجھکو خدا تک پہونچنے کے لئے قوال ڈھول اور گانے والے کی ضرورت ہے؟ یہ خلاف شریعت ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ان چیزوں کی ممانعت کی ہے، تو جن چیزوں سے ممانعت کی گئی وہ سنت میں داخل نہیں ہیں۔

بیعت کے فوائد

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیعت کی ضرورت باقی نہیں، یہ شبہ غلط ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی اور قرآن وحدیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا وہ بہ

کتاب صراط مستقیم میں بیعت کے فائدے بتلاتے ہیں کہ جب کوئی شخص برگزیدہ بندے کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو اس کی قبولیت کی وجہ سے خدا کی رحمت اس کی عنایت کرتی ہے اور اس کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ سے اس کی معصیت سے حفاظت کی جاتی ہے اگر اس کا مرشد بڑی عزت والا ہے تو اس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تیرا فلاں مرید فلاں خرابی میں مبتلا ہو رہا ہے اس کو نکالا جائے تو مرشد اس کو مناسب تدبیر سے اس خرابی سے نکالتا ہے، کبھی خود خداوند کریم ہی اس مرید کو خرابی سے بچاتا ہے، کبھی فرشتے کو حکم دیا جاتا ہے یا اور کسی ذریعہ سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے مثلاً مرشد کی صورت میں آکر فرشتہ اسے بچاتا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ زلیخا کے ساتھ مشہور ہے کہ اس نے سات کوٹھریوں میں بند کرکے وصال چاہا اور ان پر جبر کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا، معاذ اللہ میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں اس کی بیوی پر ہاتھ ڈالوں اس نے مجھ پر بڑے بڑے احسانات کیئے ہیں میں ظالم نہیں ہوسکتا ہوں، اس نے بہت مجبور کیا پھسلایا اور بہکایا اور قریب تھا کہ برائی میں مبتلا ہو جائیں، چنانچہ فرمایا گیا ہے ولقد ھمت بہ وھم بھا لولا ان رای برھان ربہ الخ تو اللہ تعالیٰ نے حفاظت کے واسطے حضرت جبرئیلؑ کو مقرر کیا وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت میں آئے، وہ سامنے کھڑے ہوکر انگلی منہ میں دبائے ہوئے تھے اور اشارے سے کہہ رہے تھے کہ خبردار اس میں مبتلا نہ ہونا، حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسکی خبر بھی نہ ہوئی اور اللہ نے ان کو بچالیا

حضرت سید شہیدؒ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کامل کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا کسی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے کسی روحانی ذریعہ سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، بیعت کے بہت زیادہ فوائد ہیں، قرآن شریف میں ہے ۔ کونوا مع الصٰدقین آپ دیکھتے ہیں کوئی کسی پارٹی میں داخل ہوتا ہے تو اس پارٹی کے تمام بڑوں سے اسکے تعلقات ہو جاتے ہیں، اور وہ بڑے لوگ اس کا خیال رکھتے ہیں تو آخرت والے جو خدا کے سچے بندے ہیں تو ان میں یہ بات کیوں کر نہ ہوگی ان میں تعلقات کی بات بہت اونچی ہوتی ہے، اگر تم اللہ کے کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تو جماعت

کے تمام بڑوں سے خواہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں سب سے تعلق ہوجاتا ہے اور وہ لوگ دعا کرتے ہیں اپنی ہمت سے خبر گیری کرتے ہیں۔

شریعت وطریقت

میرے بھائیو! نہ بیعت بدعت ہے اور نہ طریقت بدعت ہے اور نہ طریقت شریعت سے جدا ہے، طریقت شریعت کی خادم اور اس کی تکمیل کرنے والی ہے، یہ بڑے بڑے لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ بہاءالدین، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان بزرگوں نے طریقے جاری کئے ان طریقوں میں کوئی ذرہ برابر شریعت کے خلاف نہیں ہے ان طریقوں سے مقصود قربت اور آخرت کا حاصل کرنا ہے۔

نام کے پیر

مگر جیسے ہر جماعت میں کھرے کھوٹے ہوتے ہیں، اس جماعت میں بھی کچھ ایسے لوگ داخل ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے خرابی پیدا ہو رہی ہے، دین کو جال بنا کر دنیا حاصل کرنے والے ہر جماعت میں اور ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں اس لئے بیعت ہونے کے وقت مرشد کا انتخاب سوچ سمجھ کر کھرا کھوٹا دیکھ کر کرنا چاہئے، حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہ دستے نہ باید داد دست

بہت سے شیطان آدم کے بھیس میں آتے ہیں اس لئے ہر ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہئے۔

تم کو سوچنا اور سمجھنا چاہئے کہ جب تمہارا کچہری میں مقدمہ ہوتا ہے تو ہر وکیل کو وکیل نہیں بناتے، اور جب کبھی تم بیمار ہوتے ہو تو ہر ڈاکٹر کو معالج نہیں بناتے اور نہ ہر حکیم کے پاس جاتے ہو بلکہ سوچتے ہو کہ اچھے سے اچھا ڈاکٹر اور اچھے سے اچھا وکیل حاصل کریں، جب دنیا میں یہ معاملہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کے واسطے ہر کس وناکس کے ہاتھ پر کیسے بیعت کرنا صحیح ہوگا۔

عورتوں سے بیعت لینے کی صورت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کی بیعت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کرتے تھے، اور اگر مجمع بڑا ہوتا تو کپڑا پکڑا کر بیعت لیتے تھے، مگر عورتوں کی بیعت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں لی، حضرت

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، بخاری میں یہ روایت کئی جگہ ہے کہ وَاللہِ مَا مَسَّتْ یدُ رسولِ اللہِ یدَ النساءِ اِذا بایعہن خدا کی قسم حضورؐ کے ہاتھ نے کسی عورت کا ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔ بیعت کے وقت پردہ کرکے باہر سے بیعت کرتے تھے زبان سے یا کپڑے سے حضورؐ سے بڑھ کر متقی، پرہیزگار کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے، لیکن حضورؐ تو کسی اجنبی عورت کو سامنے نہ کرتے تھے اور نہ ہاتھ سے ہاتھ ملا کر بیعت کرتے تھے مگر آج یہ گمراہ اور شیطان کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے آؤ، تم پردہ اٹھاؤ، ہم تم کو محشر میں کیسے پہچانیں گے جب تک تمہارا چہرہ نہ دیکھیں گے تم تو ہماری بیٹیاں ہو، تم تو پوتیاں، نواسیاں ہو یہ تمام شیطانی کارروائیاں ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے آقا تھے، سب عورتیں آپ کی بیٹیاں تھیں اور ازواج مطہرات کے بارے میں فرمایا گیا ہے ازواجہ امہاتہم جس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی تمام بیویاں کل مؤمنین کی مائیں تھیں تو ہم آپ کی اولاد کے درجے میں ہوئے، مگر اس کے باوجود حضورؐ تو بے پردہ سامنے نہیں آتے، ہاتھ سے ہاتھ نہیں ملاتے لیکن آج ایسے غلط کار لوگ (پیدا ہوگئے) ہیں جو پردہ مٹواتے ہیں، بدن دبواتے ہیں اور تنہائی میں جمع ہوتے ہیں، یہ سب غلط ناجائز اور حرام ہے، جو یہ کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے پیر نہیں ہے بلکہ گمراہ شیطان ہے اس سے بچنا چاہیئے، ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیئے، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق اوکما قال اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کسی مخلوق کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک سریہ کا سردار بنایا اور حکم دیا کہ اس کی تابعداری کرو، سب راستے میں جارہے تھے کہ ایک جگہ پہونچ کر ایک شخص نے سردار سے کچھ مذاق سے کہا۔ اس پر ان کو غصہ آگیا انھوں نے حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو، پھر حکم دیا کہ ان میں آگ لگاؤ، پھر کہا اس میں کود و کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ تم میری تابعداری کرنا، بعض لوگوں نے کہا کہ ہاں حضورؐ نے حکم دیا ہے اور انھوں نے کودنے کا ارادہ کیا، اور بعض لوگوں نے کہا کہ ہم نے آگ سے ہی بچنے کے لئے حضورؐ کی تابعداری

کی ہے، ہم اپنے آپ کو آگ کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ کودنے سے جھجکے۔ اور دوسروں کو بھی منع کیا، اس سلسلہ میں اختلاف ہوتا رہا تا آنکہ آگ بجھ گئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، اور سردار کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوگیا، جب واپس ہوئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں اس معاملہ کا ذکر کیا تو آپ بہت خفا ہوئے، آپ نے دونوں کو ڈانٹا، سردار کو بھی، اور ان لوگوں کو بھی جنھوں نے کودنے کا ارادہ کیا تھا، پس معلوم ہوا کہ خلاف شریعت کسی کی تابعداری جائز نہیں، اگر کوئی مرشد کہے کہ بت کو سجدہ کرو تو ہرگز اس کی تابعداری نہیں کرنی چاہئے اور نہ مرشد کو ایسی بات کہنی چاہئے اگر وہ کرتا ہے تو پیر نہیں شیطان ہے۔ بعض بے وقوف کہتے ہیں ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

اور اس کے غلط معنی بیان کرتے ہیں، اگر مرشد شریعت کے خلاف کرتا ہے تو اس کی تابعداری ہرگز نہیں کرنی چاہئے،

بہرحال بیعت کرنا امر شرعی ہے اور سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری اور خدا کی خوشنودی ہی کا نام ہے، جو کچھ کمال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں ہے، آپ سے محبت کرنا آپ کی حکم کی ہوئی باتوں پر چلنا اسی میں نجات ہے، اسی میں کمالِ اطاعت ہے۔

بقیہ ص ۱۶۱ = احسان وسلوک میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کا مقام رفیع

دوستاں تضیع عمرت می کنند　　؛　　نخل عمرت را بافسوں می کنند

یہ جلسے بازیاں اور اٹکھیلیاں آج اچھی معلوم ہو رہی ہیں مگر موت کے قریب اور بعد ان پر لعنت ہزار لعنت بھیجنی ہوگی، ان میں جہاں تک ہو سکے کمی کیجئے لا تلهكم اموالكم ولا اولادكم عن ذكر الله پر غور کیجئے المال والبنون زينة الحيوة الدنيا والباقيات الصالحات کو پس پشت نہ ڈالئے یہ جوانی کی عمر اور صحت عظیم الشان نعمت ہے اس کو ضائع ہونے سے بچائیے۔　　(مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۱۴۶)

"اللہ بس باقی ہوس"

احسان و سلوک

حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کا مقام رفیع

لکل فن رجال یہ ایک مقولہ یا محاورہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی فن کے کسی مسئلہ پر غور و فکر، بحث و تبصرہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس فن سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہو پھر وہ فن جو کہ اصطلاحی فنون کی طرح کسبی نہیں بلکہ ایک اعتبار سے وہبی ہو اور فن کے ماہر و محقق کے بارہ میں خامہ فرسائی وہ کرے جو اس کی ابجد سے بھی ناواقف ہے اگر یہ المیہ نہیں تو اعجوبہ ضرور سمجھا جائے گا، لیکن بعض دفعہ عشق و محبت، عقیدت و ارادت کچھ ایسی باتیں بھی کہلوا دیتی ہے جو اگرچہ غیر مناسب ہوتی ہیں مگر محبوب کی نظر میں وہ دیوانہ فرزانہ سمجھا جاتا ہے جیسا کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے والے گناہ گار کی توبہ کی مثال میں اس صحرا نورد مسافر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم اسباب سے مایوس ہونے والے کو جب گمشدہ متاع عزیز مل جائے اور وہ اللھم انت ربی وانا عبدک کی بجائے انا ربک وانت عبدی کہہ ڈالے تو وہ مجرم نہیں بلکہ مقرب بارگاہ صمدی ہو جاتا ہے یہی کیفیت اس خاکروب دربار مدنی کی ہے کہ حضرت مدنی کے احسان و سلوک پر کچھ نہ لکھنے کی اہلیت کے باوجود الٹی سیدھی چند باتیں تحریر میں لانے کی سعادت اسی امید قبولیت پر پیش کر رہا ہے ۔ واللہ الموفق

زاہد الحسینی غفرلہ

از بستر علالت جمادی الاول ۱۴۱۳ھ

پاکستان

دنیا میں یہ عام طریقہ رائج ہے کہ کسی قابلِ قدر شخصیت کے تعارف میں اس کی ایک خاص معروف وصف کی بناپر اسے سمجھا جاتا ہے. خواہ اس ذات بابرکات میں کئی اوصاف حمیدہ موجود ہوں جیساکہ محدث کبیر عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو ایک محدث کی حیثیت سے دنیا جانتی ہے مگر ان کی مجاہدانہ حیثیت سے اکثر لوگ بےخبر اورناواقف ہیں، حالانکہ وہ اپنے دور کے مجاہد جلیل تھے. ان کی محدثانہ، متصوفانہ حیثیت مُسلّم، مگر ان کا ممتاز وصف جہاد فی سبیل اللہ تھا، جیساکہ وہ اپنے دور کے ممتاز سالک عاکف الحرمین فضیل بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرماتے ہیں

یَا عَابِدَ الْحَرَمَیْنِ لَوْ اَبْصَرْتَنَا   لَعَلِمْتَ اَنَّکَ فِی الْعِبَادَۃِ تَلْعَبُ

من کان یخضب خدّہٗ بِدُمُوْعِہٖ   فنحورنا بدمائنا تتخضب

یہ ایک طویل منظوم خط کے دو اشعار ہیں جن سے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی وہ حیثیت آشکارا ہوتی ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں۔

اسی طرح مشہور فلسفی ابن رشد اندلسی کو ایک فلسفی کی حیثیت سے دنیا جانتی ہے مگر ان کی فقیہانہ حیثیت سے دنیا ناواقف ہے. ان کی تالیف بدایۃ المجتہد دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح ائمہ اربعہ کے مدونہ فقہ کے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پر عمیق نظر رکھتے تھے، اور ابن رشد ہی علم حدیث میں اپنے دور میں ایسے فائق تھے کہ مؤطا امام مالک کے حافظ تھے۔

یہی حال قطب الارشاد والتکوین حضرت مدنی قدس سرہٗ کا ہے، دنیا میں آپ دارالعلوم جیسے عظیم علمی ادارہ کے شیخ الحدیث اور علماء ہند کی عظیم تنظیم جمعیۃ العلماء ہند کے صدر اور اپنے دور کے مجاہد جلیل کے طور پر ممتاز بلکہ منفرد حیثیت کے مالک تھے، لیکن ان تمام اوصافِ کمال سے رفیع آپ کا وہ مقام تھا جو آپ کو احسان وسلوک میں حاصل تھا جیساکہ دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری نوراللہ مرقدہٗ نے خلوت اور جلوت میں کئی بار فرمایا تھا۔

.. کہ میں نے اپنی سابقہ زندگی میں چودہ بار حرمین کی زیارت کی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ امت کے اولیاء کرام کو پہچان سکتا ہوں، میں نے

چودہ بار حرم کعبہ میں موجود اولیاء کرام کو دیکھا مگر میں نے حضرت مدنی کے ہم پلہ کسی کو نہ پایا، اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں : نہ شاگرد ہوں نہ مرید ہوں ۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رح نے حضرت حاجی امداد اللہ رح سے نقل فرمایا ہے کہ ،

حرم کعبہ شریفہ میں اکثر اوقات ۳۶۰ اولیاء کرام موجود رہتے ہیں ۔

حضرت لاہوری : اگرچہ حضرت مدنی کے نہ تو شاگرد تھے نہ مرید تھے مگر سیاسیات میں آپ کے پیرو کار تھے، لیکن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے برادر بزرگ اور مفتی عتیق الرحمٰن کے عم محترم مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہم جو سیاسی نظریات میں حضرت مدنی کے خلاف تھے مگر حضرت مدنی کے احترام میں ان کا یہ حال تھا کہ بجائے ولایتی کپڑے کے دیسی کھدر کا لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ ،

"میں محض مولانا کی تکلیف کے خیال سے کھدر پہنتا ہوں ورنہ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا، مولانا حسین احمد کا دل جتنا روشن ہے آج کسی کا نہیں، تم یا کوئی اور کیا جان سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد کیا ہیں اور ان کا کیا مقام ہے ۔

(ماہنامہ برہان دہلی بابت اگست ۱۹۶۰ء ص ۶۷)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا اصلی مقام تو سلوک و احسان میں ممتاز حیثیت کا مقام تھا دوسرے مشاغل ایسے مقام پر فائز ہونے والے عظیم المرتبہ انسان کے لائحہ عمل میں داخل ہوتے ہیں جیسا اسی برصغیر میں شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہ کا اصلی مقام وسلوک و احسان کی اشاعت او ترویج تھی، جس کا مرکز آپ کی خانقاہ مجددیہ نقشبندیہ تھی مگر اس وقت کے دین اکبری او دین الٰہی کا قلع قمع بھی آپ کے فرائض میں تھا، جس کے لئے گوالیار جیسے وحشتناک قلعے میں اسارت کو بطیب خاطر قبول فرمایا ۔ دور حاضر کے عظیم صاحب علم اور صاحب قلم حضرت مولا ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم نے قوم سے یہی شکوہ فرمایا ہے کہ ۔

ہماری آپ کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ (حضرت مدنی) کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہوں اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین واہل نظر کی زبان سے میں

نے ان کے لئے بڑے بلند کلمات سنے ہیں، اوران سب کو ان کی عظمت وبلندی کا معترف
اوران کی مدح وتوصیف میں رطب اللسان پایا ہے، مولانا اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبال
کے ان اشعار کا نمونہ ومصداق تھے

ستر دین ما را خبر او را نظر — او درون خانہ ما بیرون زدر
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش — او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او عبدہٗ — او نگنجد در جہان رنگ و بو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا سہ

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی
تکبیر مسلسل تھی (ایک سیاسی مطالعہ ص ۴۲)

حضرت مدنی رح کے اصلی مقام کو علامہ ابوالحسن علی ندوی نے بالفاظ دگر یوں ارقام فرمایا ہے:

"جو چیز خاص طور پر محسوس کی وہ دن میں ان کی شگفتگی مستعدی وبیداری ہر ایک کی
طرف توجہ والتفات، اور شب کو معمولات کی پابندی، ان آنکھوں نے متضاد
مناظر بھی دیکھے، بعض مقامی تحریکوں میں ارادت وعقیدت کا جوش بھی دیکھا
ان کی نیازمندی واظہار جاں نثاری بھی دیکھا، پھر انھیں آنکھوں نے زود رنج و
طوطا چشم عوام کو سخت برہم اور مغلوب الغضب بھی دیکھا اوران کے ذمہ داروں
کو تند وتلخ رُوْدر رُوْ کہتے بھی سنا۔

لیکن مولانا کی حالت یکساں پائی، بعض سیاسی تحریکوں کے زمانہ میں بھی
مشاہیر کو نیازمندانہ حاضر ہوتے اور سفارشی خطوط لکھواتے بھی دیکھا، پھران کی تلخ
نوائیاں اوراحسان فراموشیاں بھی دیکھیں، اس کو تنقیدی ذہن کہیے یا حقیقت بینی، کہ
طبیعت نے محسوس کیا کہ آنے والوں اور بیٹھنے والوں میں مولانا کے اصل ذوق اوراصل
فن سے استفادہ کرنے والے بہت کم نظر آئے۔

زیادہ وقت اشخاص یا جماعتوں کے تذکرے یا سطحی تبصرے یا تعویذ ودعا کی

فرائض میں گذرتا مولانا اپنی فطری عالی ظرفی سے کسی کو گرانی یا ناگواری کا احساس نہ ہونے دیتے مگر۔

جہاں کوئی تصوف وسلوک کا مسئلہ پوچھ لیتا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا یا اہل اللہ کا تذکرہ کرنے لگتا، فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا۔" (ماہنامہ الارشاد مدنی نمبر بحوالہ پرانے چراغ)

مرتب مکتوبات شیخ الاسلام مولانا نجم الدین اصلاحی نے ارشاد فرمایا کہ:

"حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کے بارے میں بہتوں کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل آئی کہ وہ کون سے مرکزی صفات تھے جو آپ کی زندگی میں سب سے نمایاں اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ کسی نے بہت بڑا مفسر اور محدث جانا، کسی نے ایک عالم اور شیخ طریقت سمجھا، کسی نے سیاسی راہ نما اور مجاہد قرار دیا، اس میں شبہ نہیں کہ مولانا میں وہ سارے کمالات تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لیکن مولانا مدنی میں ان تمام باتوں سے زیادہ آپ کا وہ روحانی مقام تھا جس سے عام طور پر دنیا ناواقف تھی اور ناواقف رہ گئی، اس کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ لوگوں نے تزکیہ نفس اور تطہیر قلوب کو ایک ثانوی چیز سمجھا اور صرف تعلیم کتاب وحکمت ہی کے اندر ساری تگ ودو محصور کر دی حالانکہ تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود محسوس ہوتی ہے اور دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ یہ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۴۴)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بارہ میں طالبین اور سالکین کی راہ نمائی کے لئے اکابر اولیاء اللہ نے راہ نمائی فرمائی جس میں بطور اختصار ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

ایک مولانا صاحب کو کچھ اشکال درپیش تھے تو انھوں نے خواب میں حضرت شاہ اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی اور اپنی حالت کا تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا، ہمارے حسین احمد کو لکھو۔ (مکتوبات ج ۳ ص ۱۵۱)

(ف) حضرت شاہ اہل اللہ شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے بھائی تھے، رحمۃ اللہ علیہم

نے ان کے لئے بڑے بلند کلمات سنے ہیں، اور ان سب کو ان کی عظمت وبلندی کا معترف اور ان کی مدح وتوصیف میں رطب اللسان پایا ہے، مولانا اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کے ان اشعار کا نمونہ ومصداق تھے

ستر دین ما را خبر او را نظر — او درون خانہ ما بیرون زدر
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش — او زدست مصطفی پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او عبدہٗ — او نگنجد در جہان رنگ وبو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا ہے

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی تکبیر مسلسل تھی (ایک سیاسی مطالعہ ص ۴۲)

حضرت مدنی رح کے اصلی مقام کو علامہ ابوالحسن علی ندوی نے بالفاظ دگر یوں ارقام فرمایا ہے:

" جو چیز خاص طور پر محسوس کی وہ دن میں ان کی شگفتگی مستعدی وبیداری ہر ایک کی طرف توجہ والتفات، اور شب کو معمولات کی پابندی، ان آنکھوں نے متضاد مناظر بھی دیکھے، بعض مقامی تحریکوں میں ارادت وعقیدت کا جوش بھی دیکھا ان کی نیازمندی واظہار جاں نثاری بھی دیکھا، پھر انھیں آنکھوں نے زود رنج وطوطا چشم عوام کو سخت برہم اور مغلوب الغضب بھی دیکھا اور ان کے ذمہ داروں کو تند وتلخ رُوْدر رُوْ کہتے بھی سنا۔

لیکن مولانا کی حالت یکساں پائی، بعض سیاسی تحریکوں کے زمانہ میں بھی مشاہیر کو نیازمندانہ حاضر ہوتے اور سفارشی خطوط لکھواتے بھی دیکھا، پھر ان کی تلخ نوائیاں اور احسان فراموشیاں بھی دیکھیں، اس کو تنقیدی ذہن کہیئے یا حقیقت بینی، کہ طبیعت نے محسوس کیا کہ آنے والوں اور بیٹھنے والوں میں مولانا کے اصل ذوق اور اصل فن سے استفادہ کرنے والے بہت کم نظر آئے۔

زیادہ وقت اشخاص یا جماعتوں کے تذکرے یا سطحی تبصرے یا تعویذ ودعا کی

فرماتے سن میں گذرتا مولانا اپنی فطری عالی ظرفی سے کسی کو گرانی یا ناگواری کا احساس نہ ہونے دیتے مگر۔

جہاں کوئی تصوف و سلوک کا مسئلہ پوچھ لیتا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا یا اہل اللہ کا تذکرہ کرنے لگتا، فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا۔" (ماہنامہ الارشاد مدنی نمبر بحوالہ پرانے چراغ)

مرتب مکتوبات شیخ الاسلام مولانا نجم الدین اصلاحی نے ارشاد فرمایا کہ:

"حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کے بارے میں بہتوں کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل آئی کہ وہ کون سے مرکزی صفات تھے جو آپ کی زندگی میں سب سے نمایاں اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ کسی نے بہت بڑا مفسر اور محدث جانا، کسی نے ایک عالم اور شیخ طریقت سمجھا، کسی نے سیاسی راہ نما اور مجاہد قرار دیا، اس میں شبہ نہیں کہ مولانا میں وہ سارے کمالات تھے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لیکن مولانا مدنی میں ان تمام باتوں سے زیادہ آپ کا وہ روحانی مقام تھا جس سے عام طور پر دنیا ناواقف تھی اور ناواقف رہ گئی، اس کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ لوگوں نے تزکیۂ نفس اور تطہیر قلوب کو ایک ثانوی چیز سمجھا اور صرف تعلیم کتاب و حکمت ہی کے اندر ساری تگ و دو محصور کر دی حالانکہ تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود محسوس ہوتی ہے اور دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ یہ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۴۴)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بارہ میں طالبین اور سالکین کی راہ نمائی کے لئے اکابر اولیاء اللہ نے راہ نمائی فرمائی جس میں بطور اختصار ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

ایک مولانا صاحب کو کچھ اشکال درپیش تھے تو انھوں نے خواب میں حضرت شاہ اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی اور اپنی حالت کا تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا، ہمارے حسین احمد کو لکھو۔" (مکتوبات ج ۳ ص ۱۵۱)

(ف) حضرت شاہ اہل اللہ شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے بھائی تھے، رحمۃ اللہ علیہم

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے سید عالی نسب ہونے کی نسبت سے سلوک اور احسان ان کا خاندانی ورثہ ہی کہا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصب رسالت میں سے تمام مناصب میں حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، تلاوت کتاب اللہ، تعلیم کتاب اللہ اور تزکیۂ باطن، ان تمام امور میں آپ بفضلہ تعالیٰ اپنے زمانہ کے فرد وحید تھے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ کے آبا و اجداد رحمۃ اللہ علیہم ان مناصب سے عموماً اور تزکیۂ باطن سے خصوصاً سرفراز تھے، درمیانی کچھ حصہ فترت کا چھوڑ کر نسلاً بعد نسلٍ سارا خاندان خانقاہی نظام میں نہ صرف منسلک تھا بلکہ اپنے علاقہ میں مسند نشینی سے مشرف تھا، جیسا کہ حضرتؒ نے فرمایا۔

"خاندان کے افراد اہل معرفت و طریقت تھے، صرف اخیر دو تین پشتیں دنیادار زمین داروں کی ہوگئی تھیں، نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ شاہان دہلی سے خاندان کو چوبیس گاؤں دیئے گئے تھے، شاہ مدن رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شاہ نور اشرف مرحوم نے سجادہ اور طریقت کو سنبھالا، اور دوسرے بیٹے تراب علی مرحوم نے جائیداد کا انتظام سنبھالا، اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہوگئیں"۔

(نقش حیات جلد ۱ ص ۸۵)

اگرچہ شاہ نور اشرف مرحوم نے خانقاہ کو قائم رکھا اور لوگ ادھر رجوع کرتے رہے مگر کچھ مدت بعد وہ خانقاہ صرف رسمی خانقاہ رہ گئی، بعد کے سجادہ نشین حضرات نے نہ تو خود مجاہدات و ریاضت کی طرف توجہ دی اور نہ ہی طالبان سلوک کی روحانی تربیت پر توجہ دی، بلکہ صرف پدری نسبت ہی کو کافی سمجھا، اگرچہ اس وقت تک خاندان کا کوئی فرد کسی دوسرے خاندان طریقت سلسلۂ بیعت میں منسلک نہ ہوا تھا مگر اب حالت ایسی ہوگئی کہ طالبان سلوک و احسان کسی دوسری خانقاہ کی طرف رجوع کریں، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت مدنی کے والد ماجد سید حبیب اللہ نور اللہ مرقدہا نے قدم اٹھایا اور اپنے زمانہ کے ولئ کامل حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل کیا، اس گناہ گار کے خیال میں مولانا حبیب اللہ صاحب کا یہ بیعت فرمانا بھی گنگوہ شریف کی نسبت کی ابتدا تھی جہاں سے آپ کے تینوں صاحبزادوں کو روحانی آب حیات سے سیراب ہونا تھا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا ہے کہ

• ہماری اس صدی کے آغاز میں اگرچہ انگریزوں کے دم قدم سے مادیت کے اس ملک میں قدم جم گئے ــــ اور اہل دل بڑے درد سے کہہ رہے تھے

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

پھر بھی عشق الٰہی کی کہیں کہیں دکانیں قائم تھیں جہاں سے جذبہ وشوق اور درد و محبت کا سودا ملتا تھا، ان دکانوں میں دو دکانیں خاص طور پر مرجع خاص و عام تھیں ایک گنگوہ میں اور ایک گنج مراد آباد میں، دونوں نے اپنی اپنی جگہ درد و محبت اور اتباع سنت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور اس جنس نایاب کو وقف عام کر دیا تھا،

(تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن از علامہ ندوی ص۱۰)

چنانچہ حضرت مدنیؒ کے والد ماجد نے حضرت گنج مراد آبادی سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت فرمائی اور حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق نے اپنے والد ماجد کی اجازت سے حضرت گنگوہی سے شرف بیعت حاصل کیا، اور جب حضرت کے والد ماجد نے ہجرت مدینہ منورہ کا ارادہ فرمایا تو حضرت شیخ الہندؒ کے مشورہ سے بلکہ حکم سے حضرت گنگوہی سے بیعت ہو گئے، جب کہ آپ کے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب اس سے پہلے بیعت ہو چکے تھے، اگرچہ حضرت مدنی کا قلبی میلان حضرت شیخ الہندؒ کی طرف تھا، مگر حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا محمد صدیق سے فرمایا:

• ان دونوں مولانا سید احمد (بانی مدرسہ علوم شرعیہ) اور (حضرت مولانا) حسین احمد کو حضرت گنگوہی سے بیعت کرا دو، خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلے پڑ جائیں کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں (نقش حیات ص ۸۷)

چنانچہ حضرت مدنی اور حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہما گنگوہ حاضر ہوئے اگرچہ حضرت گنگوہیؒ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ رد و قدح فرمایا کرتے تھے مگر ان دونوں کو بیعت فرما لیا اور پھر یہ فرمایا۔

"میں نے تو بیعت کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو وہاں حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ موجود ہیں ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرما دیں گے (نقش حیات ص۸۸)

(ف) حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا تعارف حضرت گنگوہی نے یوں فرمایا:

"اس عاجز کو جو معلوم کرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ کے قطب الارشاد تھے، آپ کا لقب عالم بالا میں مخدوم العالم ہے، آپ ولایت النبوۃ و مقام محمدی میں نہایت راسخ القدم ہیں (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۳)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب سے شرف ملاقات کا ذکر یوں فرمایا:۔

" اواخر ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ میں حاضری مکہ مکرمہ نصیب ہوئی، موصوف اس وقت بہت ضعیف ہوگئے تھے، حضرت گنگوہی رہ کا سلام و پیام سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر زندگی میں ملاقات ہو جاتی۔" (نقش حیات ص ۸۹)

حضرت گنگوہی کا ارشاد سنکر حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے:

" پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو یہاں آکر بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔" نقش حیات ص ۸۹)

اگرچہ حضرت مدنی رح کی اس بیعت اور روحانی تعلق میں روحانی سلسلہ کا ذکر نہیں مگر آپ نے ایک مکتوب گرامی میں فرمایا:۔

نیز میرے مرشد و آقا حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہیں انھوں نے اگرچہ مجھکو چاروں طریقوں میں بیعت فرمایا تھا، جن میں سے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ بھی ہے مگر اصلی طریقہ اور عام تعلیم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی چشتیہ صابریہ تھی۔"

(مکتوبات جلد ۱ ص ۳۹۶، و ج ۳ ص ۶۱، ۶۲)

اور یہی بات حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق ارباب طریقت میں مشہور ہے جیسا کہ انوار العاشقین میں درج ہے کہ۔

" متاخرین سلسلہ چشتیہ صابریہ میں باوجود قیام مکہ معظمہ کے وہاں حاضر ہو کر شہرت کا ہونا نادر ہے، مگر حضرت ممدوح کے برابر مشائخ میں کسی کو اس درجہ شہرت نہیں ہوئی۔" (ص ۸)

قطب الارشاد حضرت گنگوہی رحمہ کے منظومہ شجرۂ طریقت میں پہلا شعر یہ ہے۔

یاالٰہی کن مناجاتم بفضلِ خود قبول ؎ از طفیلِ اولیائے خاندان صابری

چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز کی برکت سے طریقہ صابری حجاز سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک میں پھیلا، پنجاب کے مشہور پیر طریقت حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہٗ العزیز کو آپ نے طریقہ صابریہ میں خلافت سے نوازا تھا۔

حضرت مدنی رحمہ کے اس روحانی سفر کی سرگذشت حضرت ہی کے قلم سے درج ذیل ہے

:۔ چنانچہ حرم محترم (مسجد نبوی) میں بیٹھ کر پاس انفاس کیا کرتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے محبت اور تعلق قلب میں بڑھنا شروع ہوا اور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں اسی طرح حضرت گنگوہی کی محبت بڑھ رہی ہے

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلسلۂ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی، اس اثنا میں رویائے صالحہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی، نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگی، مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ میں چونکہ مجمع لوگوں کا ہر وقت رہتا ہے اس لئے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے، وہ وقت آفتاب نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد کا تھا ـــ مگر جب آثار ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں سے شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا، مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے آبادی نہیں ہے ادھر نکل جاتا تھا (آج سے تقریباً سو سال پہلے) اور کبھی مسجد الاجابۃ میں، یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں، اور کبھی اس کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا

اسی حالت پر ایک مدت گذری جو حالتیں یا رویا صالحہ پیش آتیں تھیں ان کو قلم بند کرکے گنگوہ شریف بھیجا کرتا تھا۔

ایک روز مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بانتظار جماعت بوقت ظہر یا بوقت عصر بیٹھا ہوا تھا یکبارگی ایسا معلوم ہوا کہ میرا تمام جسم حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا جسم ہوگیا ہے، یہ حالت اس قدر قوی ہوگئی کہ میں اپنے جسم کو اپنا نہیں پاتا تھا، اور تعجب سے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتا تھا کہ دیکھوں یہ میرا جسم ہے یا نہیں اگر نہ ہوگا تو تکلیف محسوس نہ ہوگی، یہ حالت تھوڑی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ رہی پھر زائل ہوگئی میں نے اس حالت کو بھی لکھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ حالت فنا فی الشیخ ہونے کی ہے۔ (نقش حیات ص ۹۲)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۶ھ میں بیعت ہوئے اور ۱۳۱۸ھ یعنی تقریباً دو سال میں اسقدر ترقی فرمائی کہ کئی مقامات سلوک جن کی مختصر سی کیفیت درج کی جاتی ہے

۱۔ سلوک کا سب سے پہلا اثر مرشد اور ہادی کی محبت ہوتا ہے کیونکہ محبت روحانی ہی سے عمل اور اقتدار کا جذبہ متحرک ہوکر روحانی اور عملی انقلاب آتا ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں تعلیما للامۃ یہ بھی فرمایا کرتے تھے اللّٰهم ارزقني حبك وحب من ينفعني حبه عندك اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کان من دعاء داؤد علیہ السلام اللهم اني اسئلك حبك وحب من يحبك اور اس محبت کا اس قدر غلبہ ہو جائے کہ سالک یہ یقین کرے کہ اس وقت ساری زمین پر مجھے اپنے مقصد تک پہونچانے والا سوائے میرے مرشد کے کوئی نہیں. حضرت ______ حافظ ضامن حسن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"سالک کو چاہیئے کہ اس امر پر پورا یقین رکھے کہ اس وقت ساری دنیا میں مجھے میرے مقصد تک پہونچانے والا سوائے میرے مرشد کے اور کوئی نہیں اگرچہ دوسرے کامل اولیاء کرام اور مرشدان عظیم بھی موجود ہوں مگر اس کا یہ یقین اپنے شیخ کے ساتھ مستحکم ہو ورنہ ہلاکت کا خطرہ ہے۔" (امداد السلوک ص ۷)

۲۔ سالک جب ممکنات پر عبور کرتا ہے تو اس کی بصیرت روحانیہ میں جمادات نباتات وغیرہ کی مثالی شکل میں ترقی کی منازل محسوس ہوتی ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام

کو قرب خداوندی کی جو ندا دی گئی وہ پودے ہی سے تھی جیسا کہ فرمایا فلما اتٰھا نودی من شاطیٔ الواد الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من الشجرۃ ان یٰموسیٰ انی انا اللہ رب العٰلمین (القصص ۳۰) قرآن عزیز ہی میں کلمہ طیبہ کی مثال کشجرۃ طیبۃ (ابراہیم ۲۴) فرمائی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات روح الامین علیہ السلام کا محل رویت قرآن عزیز نے عند سدرۃ المنتہی (النجم ۱۴) فرمایا۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا سالک کو جب عبور عنصر بار پر ہوتا ہے تو یہ اس کے آثار ہیں۔ (مکاتیب ص ۴۴)

۳۔ آپ کا ارشاد کہ سلسلۂ چشتیہ کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں، ان آثار میں سے سوز و گداز ہے جس کا اثر گریہ و زاری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے سعادتمند کو مبارکباد دیا کرتے تھے، اور قرآن عظیم میں تو انبیاء علیہم السلام کے بکاء کا بھی ذکر ہے جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۵۸ میں ہے، اس گناہ گار کے نام ایک مکتوب گرامی میں فرمایا۔ رونا سلطان الاذکار کی شاخ ہے (مکتوبات ج ۳ ص ۱۱۷)

۴۔ چونکہ رویائے صالحہ علوم روحانی اور فیضان آسمانی کا وہ ابتدائی حصہ ہیں جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی تھیں اور اب تا قیامت امت کے سعادت مندوں کو ان کے مقام عروج میں یہ سعادت میسر ہوتی رہے گی، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالو وما المبشرات قال الرؤیا الصالحۃ رواہ البخاری وزاد مالک بروایۃ عطاء بن یسار یراھا الرجل المسلم او تری لہ (مشکوٰۃ)

۵۔ جب ذاکر ذکر زیادہ کرتا ہے تو ذکر اس کے بدن اور اس کے دل پر اثر انداز ہوجاتا ہے، قرآن عزیز میں ارشاد فرمایا اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم وقلوبھم الی ذکر اللہ۔ الزمر ۲۳ جب دل اور چمڑے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف جھکنے لگ جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ بدن میں غیر ارادی حرکت پیدا ہوجاتی ہے اور یہ کیفیت تقریباً ہر سچے ذاکر کو بفضلہ تعالیٰ حاصل ہوجاتی ہے۔

۶ و ۷۔ اگرچہ فنا فی الشیخ کی اصطلاح عمومی طور پر متعارف نہیں مگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث سے بطور اشارۃ النص کے اسے ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کی حقیقت

غایت تناسب مرید و شیخ میں ہے جو کہ غایت اطاعت و محبت سے پیدا ہوجاتا ہے (التکشف ص۲۹۲)

عارف باللہ سید اسماعیل شہید نے فرمایا ہے من التجلیات الصوریۃ الشہودیۃ

.... اوعن کونہ مطاعا طاعۃ ناشئۃ من صمیم قلب المطیع ومن

فنائہ فیہ بما ھو مطاع عندہ کذلک کالشیخ ۔ حضرت شہید نوراللہ مرقدہ کی اس عبارت

سے فنا فی الشیخ کا مستند واضح ہورہا ہے جس کی تشریح اہل دل ہی کرسکتے ہیں (واللہ اعلم)

درباره سفر گنگوہ شریف آپ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے شوال ۱۳۱۸ھ میں گنگوہ

شریف آنے کا حکم فرمایا، چنانچہ آپ کچھ مدت کے بعد حاضر ہوئے آپ کے برادر بزرگ بھی حاضر

خدمت ہوئے، حضرت نے خانقاہ قدوسیہ کے دو حجروں میں آپ کو قیام کی سعادت بخشی اور

مراقبہ پر دل جمعی سے عمل کرنے کی ہدایت فرمائی چنانچہ حضرت مدنیؒ نے فرمایا:

میں نے تعلیم شدہ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کردیا، عصر کے بعد جب کہ صحن میں
مجلس عمومی فرماتے تھے تو اسی مراقبہ میں حجرہ قدوسیہ کے برآمدہ میں ستون کے
پیچھے تقریباً دو تین گز فاصلہ سے میں مشغول ہوجاتا تھا، مغرب کے وقت تک
میں وہاں ہی مشغول رہتا تھا، اس مراقبہ سے مجھکو نہایت قوی اور بہت زیادہ
فائدہ ہوتا تھا۔ (نقش حیات ج ۱ ص ۱۴)

اعطاء خلافت:۔ اسی قیام کے دوران آپ نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص یہ کہہ رہا ہے کہ چالیس دن گزرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا۔ چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک اسی تاریخ کو خلافت سے نوازا، حضرت مدنیؒ نے عرض کیا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا سلوک بھی طے کرنے کی خواہش ہے مگر حضرت نے فرمایا:

"جو تعلیم میں نے دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے، یہاں پر تمام سلاسل
مل جاتے ہیں اسی کو مشق کرو۔"

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:۔

"اسی میں جد و جہد کرکے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے (ملخص)

فائدہ:۔ پیر سے مرید کا روحانی مدارج میں بڑھ جانا یہ فضل کہلاتا ہے جیسا کہ حضرت

گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ شیخ عبدالقدوس قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ شیخ مرید کو لے جاتا ہے اور فضل یہ ہے کہ مرید شیخ کو لے جاوے۔ پدر مفلس کو اگرچہ زکوٰۃ درست نہیں مگر صدقہ نافلہ جائز ہے (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۷)

حضرت مدنی کا قیام گنگوہ شریف میں تین ماہ سے کچھ دن کم رہا۔ مگر بہت بڑی روحانی دولت سے مالامال ہوکر منبع انوار روحانی اور مہبط انوار ربانی کو واپس تشریف لے گئے، اگرچہ آپ مدینہ منورہ ۱۳۲۰ھ کے اوائل میں پہنچے مگر زیادہ وقت دیوبند اور دوسرے مقامات پر رہا گنگوہ شریف سے واپسی پر دوسرے مقامات پر قیام کے دوران ایک مرتبہ سخت روحانی انقباض پیش آیا تو حضرت نے فرمایا کہ۔

"جاؤ کلیر شریف وغیرہ ہو آؤ حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب بھی قبض پیش آتا تو ایسے مقامات پر تشریف لے جاتے تھے۔" (نقش حیات ج ۱ ص ۱۰۸)

آپ نے مدینہ منورہ کی روحانی فضا اور ملکوتی سرزمین میں سلوک کی منازل طے کرنے اور ان پر مداومت کی جو سعادت حاصل کی ہے احقر کے خیال میں دوسرے کسی کو کم ہی نصیب ہوئی ہوگی، مدینہ منورہ میں قیام کے دوران حضرت گنگوہی سے خط وکتابت رہی جو اکثر مسائل سلوک پر مشتمل تھی مگر وہ سارے خطوط آپ کی اسارت مالٹا کے زمانہ میں ترکی حکومت نے ضائع کردیئے تھے (مکتوبات ج ۲، ص ۱۱۵)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلوک

اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ تمام طریقوں میں مقام رفیع کے مالک تھے مگر اپنے اکابر کی اتباع میں آپ کی حسب تحریر:

ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ اور اشرف طریقہ اختیار فرمایا۔ ان کا ظاہر نقشبندی ہے اور باطن چشتی ہے ؎

بلبل نیم کہ نعرہ زنم درد سر کنم	قمری نیم کہ طوق برگردن در آورم
پروانہ نیستم کہ سوزم بگرد شمع	شمعم کہ جاں گدازم ودم بر نیاورم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ: ان لصدرہ ازیزا کازیز المرجل من البکاء او کما قال، کیا اسی کی شہادت نہیں دیتی، میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ فرماتے تھے کہ ہمارے مشائخ چشتیہ کے تین دور ہیں اول طبقہ پر زہد غالب ہے، دوسرے طبقہ پر عشق غالب ہے اور تیسرے طبقہ پر اتباع سنت غالب ہے (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۳ ص ۶۶، ۶۷)

اس ظاہر و باطن کی تشریح حضرت نے دوسرے مکتوب میں یوں فرمائی:-

"اگرچہ سلوک چشتیہ میں چست و چالاک اور گامزن ہیں مگر عملی حیثیت سے حضرت مجدد کے قدم بقدم ہیں (ص مذکور)

اس کی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے کہ تزکیہ اور تربیت روحانی میں تو چشتیہ کی پیروی ہے مگر عملی حیثیت سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی ہے جو کہ نقشبندی تھے جس طرح آپ نے دین اکبری کا مقابلہ کیا اسی طرح ہمارے اکابر نے فرنگی حکومت سے برصغیر کو آزاد کرانے میں مجددی کردار ادا کیا۔

حضرت مجدد اور مزار مجدد سے اکابر کا تعلق یہ ہے کہ

۔ آپ کے مرید خاص حضرت مولانا محمد صدیق صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری اور پھر کچھ دن وہاں قیام کی اجازت طلب کی تو حضرت گنگوہی نے فرمایا

"مزار مجدد پر حاضر ہو تو کچھ اس ناکارہ کے واسطے بھی خیال کرنا اور زبانی مزار مبارک پر بےنشان نام سلام عرض کرنا" (مکاتیب رشیدیہ ص ۳۱)

اور دوسرے مکتوب میں وہاں قیام کی اجازت سے سرفراز فرماتے ہوئے فرمایا:

"قیام بر مزار حضرت مجدد علیہ الرحمۃ بہت عمدہ ہے حق تعالیٰ آپ کا مقصد حاصل فرمادے (ص ۹)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے سلوک و احسان کی اس سرگذشت سے ظاہر ہے کہ آپ کا سلسلہ سلسلہ چشتیہ صابریہ اور نقشبندیہ مجددیہ تھا۔

سنہ ۱۳۳۶ھ میں جبکہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ اسیر فرنگ تھے احقر نے دس ربیع الثانی بوقت اذان فجر مندرجہ ذیل خواب دیکھا۔

"احقر مزار مجدد رحمۃ اللہ پر حاضر ہے اور ایک بہت بڑا اجتماع ہے حضرت کے مزار کا رنگ

نسواری ہے جو کہ چمک دار پتھر معلوم ہوتے ہیں اور ان میں سوراخ ہیں جن میں
سبز رنگ کی شاخیں ہیں اور ان پر گل نرگس کھلا ہوا ہے، احقر نے مزار کو بوسہ دیا
اور ایک چھوٹے سے میز پر پسا ہوا نمک پڑا تھا وہ بہت سارے کر کاغذ میں
لپیٹ لیا۔

یہ خواب اپنے علاقہ کے ایک باخدا مرد درویش سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ
" حضرت مدنیؒ اس دور کے مجدد ہیں، قبر سے مراد ان کی نظر بندی ہے اور پھول
سے مراد ان کی وہ برکات ہیں جن سے عالم اسلامی معطر ہو رہا ہے"
اور اس گناہ گار کو شرمندہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مدنی کے روحانی برکات مجددیہ سے
تجھے بھی حظ وافر ملیگا۔

جیسا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:
" ان شاء اللہ تیری برکت سے حضرت مجدد کے فیوض وبرکات پھیلیں گے اھ
مکتوب شیخ الاسلام (از قلم حبیب اللہ مدینہ منورہ

چنانچہ مدینہ منورہ کے اٹھارہ سالہ قیام میں آپ پر جن انوار روحانیہ کی بارش ہوئی ہے اس کا خلاصہ
یہ ہے کہ کئی بار سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف خواب میں حاصل ہوا اور چند مرتبہ عالم
بیداری میں بے حجاب زیارت کا شرف حاصل ہوا جیسا کہ ایک واقعہ آپ نے ذکر فرمایا
" ایک روز ایک کتاب اشعار کی دیکھ رہا تھا اس میں ایک مصرعہ تھا۔ ہاں اے حبیب
رُخ سے اٹھا دو نقاب کو، یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا، میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور
مواجہہ شریف میں بعد ادائے آداب وکلمات مشروعہ انھیں الفاظ کو پڑھنا اور شوق دیدار میں رونا
شروع کر دیا، دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ کا حائل نہیں ہے، اور آپ کرسی پر
سامنے بیٹھے ہوتے ہیں، آپ کا چہرہ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے (نقش حیات ص ۱۰۱ ج ۱)
اعطائے خلافت کے بعد آپ نے بیعت طریقت کا سلسلہ کب سے شروع فرمایا، یہ
تاحال احقر کو معلوم نہ ہوسکا البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ قیام مدینہ منورہ کی کیفیت سے آپ کے چشتی

صابری ہونے کے آثار ہیں۔ اور اس گناہ گار کے خیال میں برصغیر کو عیسائی حکومت سے نجات دلانے کی تڑپ اور جد وجہد یہ آثار مجددیہ میں سے ہے جن کا ظہور آپ کے محبوب دینی، روحانی علمی راہ نما حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حجاز پہونچنے پر ہوا۔ دنیا کے لوگ اسے سیاست کہیں یا فراست ایمانی احقر کے نزدیک یہ تو مجددانہ نسبت کا عملی ظہور تھا جس کے لئے آپ اور آپ کے شیخ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہم مالٹا کے اسارت خانہ میں اسی طرح رہے جس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کیا گیا تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سالکانہ اور عارفانہ سرگذشت بیان کرنے کے لئے کئی دفاتر درکار ہیں جن کا خلاصہ یہ ہوسکتا ہے کہ آپ سفر وحضر، ریل اور جیل، لیل ونہار بلکہ کوئی لحظہ ایسا نہیں گذرا کہ یاد الٰہی اور قرب مطلب سے دوری تو درکنار غفلت میں بھی نہیں گذرا، آپ منازل سلوک طے کرتے کرتے اس مقام کو پہنچ چکے تھے جسے تصوف کی اصطلاح میں منتہی سلوک کہا جاتا ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ نے امداد السلوک میں فرمایا۔

> ومقام منتہی آنکہ بصحو وتمکین بود چنانکہ باید اجابت حق نماید ودر شدت وفراخی ومنع وعطاء ووفا وجفا بریک حال ماند خوردن وگرسنہ بودن او برابر وبیداری وخواب او یکساں باشد۔ واز حظوظ نفسانیہ فانی بود۔ فقط حقوق ماندہ باشند بظاہر باخلق وبباطن باحق گردد وایں جملہ از احوال فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین منقول است کہ آں جناب عالی صلی اللہ علیہ وسلم اول درغار حرا خلوت فرمود وآخر کار دعوت خلق کرد واگرچہ مشغول باخلق بودند مگر یک لمحہ از حق تعالیٰ جدا نبودند وجلوت وخلوت برابر داشتند واصحاب صفہ ہم در حال تمکین امراء و وزراء شدند کہ مخالطت در ایشاں اثر وضرر نمی کرد (امداد السلوک ص ۹۵)

یعنی سلوک واحسان کی انتہائی منزل جسے حصول مقصد کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے وہ مقام عبدیت کا حصول اور رضائے معبود حقیقی کا مطلوب ہونا۔ کسی کی مدح اور مذمت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اتباع سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم میں محو وسرگرم ہونا ہے جیسا کہ قطب الارشاد حضرت گنگوہی نے سالہا سال کی ریاضت کے بعد اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب نور اللہ قبورہما

کو اپنی حالت تحریر فرمائی۔

: حضور نے جو بندہ نالائق کے حالات سے استفسار فرمایا ہے، میرے ماوائے دارین اس ناکس کے کیا حالات ہیں اور کس درجہ کی کوئی خوبی ہے کہ جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں بخدا سخت شرمندہ ہوں کچھ نہیں ہوں مگر جو ارشاد حضرت ہے تو کیا کروں بناچاری کچھ لکھنا پڑتا ہے، حضرت مرشدمن، علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً سات سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے، اس سال تک دوسو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کرگئے ہیں اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انھوں نے درس جاری کیا، اور احیاء سنت میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہوجائے اور حضرت کے اقدام نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خلاصہ ہے کہ جذر قلب میں غیر حق تعالیٰ سے نفع وضرر کا التفات نہیں، واللہ بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی ہوجاتی ہے، لہٰذا کسی کے مدح و ذم کی پرواہ نہیں اور ذام ومادح کو دور جانتا ہوں اور معصیت کی طبعاً نفرت اور اطاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہوگئی ہے اور یہ اثر اسی نسبت یادداشت بے رنگ کا ہے جو مشکوٰۃ انوار حضرت سے پہنچا ہے۔ (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰)

حضرت مدنی رح کی ساری زندگی اسی لائحہ عمل کا عکس تھی، تدریس علوم نبوت، اشاعت دین اسلام، عسر اور یسر میں راضی بہ رضا خالق حقیقی ہجوم معتقدین، مسند حدیث، فرنگی کا جیل وغیرہا تمام حالات آپ کے قلب منور کو معبود برحق کی یاد سے غافل نہ کرسکتے تھے بقول مولانا ابوالکلام :

۔ حضرت مدنی کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا رہتا ہے "

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ مقام رضا پر فائز تھے یعنی ان کا مقصود حقیقی صرف اور صرف معبود حقیقی کی رضا تھا جس کا لازمی اثر یہ ہے کہ اس محنت اور تگ و دو کے بعد بھی اپنے آپ کی نفی کی جائے اور کمالات اگر ہوں تب بھی ان کی نسبت معبود حقیقی اور موجود حقیقی کی طرف کی جائے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں جو عریضہ اپنے حالات

اور واردات کے بارہ میں تحریر فرمایا اسکے آخر میں یہ ارقام فرمایا:

تیرا ہی ظل ہے تیرا ہی وجود ہے میں کیا ہوں کچھ نہیں ہوں اور وہ جو میں ہوں وہ
تو ہے اور میں اور تو خود شرک در شرک ہے (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰)

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے مکتوب گرامی میں فرمایا ہے۔

"میرے محترم یہ سب لطائف وسائل اور ذرائع ہیں، انوار وغیرہ بھی مقاصد اصلیہ نہیں ہیں
وصل اور فراق بھی مقصد اصلی نہیں ہے ؎

وصال وقرب چہ خواہی رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر از یں تمنائے

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے درجہ پر کوئی ولی نہیں پہونچ سکتا ان کی شان
میں فرمایا جاتا ہے یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا (الفتح) معیت اور دوام حضور بڑی چیز یں
اور انعام عظیم ہیں مگر مقصود اصلی رضائے خداوندی ہے، اگر شاہنشاہ کی دربار داری اور حاضر
باشی حاصل ہو جائے اور معاذاللہ رضائے شاہی نصیب نہ ہو تو خسارہ ابدی ہے اور اگر رضائے
شاہنشاہی حاصل ہو تو دوری مسافت اور غیر حاضری دربار کوئی چیز نہیں، بسا اوقات مجرمین بھی
دربار میں حاضر ہوتے ہیں مگر ان کی یہ حاضری خوش نصیبی نہیں سمجھی جاتی (مکتوبات ج ۴ ص ۱۱، ۱۲)

شاید اس لئے حضرت نے ارشاد وتلقین کی طرف زیادہ توجہ نہ دی حالانکہ آپ کی
ذات عالی قدر میں اس قدر جذب تھا کہ کوئی بھی اخلاص کے ساتھ دیکھ لیتا تو فریفتہ ہو جاتا تھا
بلکہ ایسے عشاق کی تعداد کثرت سے موجود ہے کہ جو بن دیکھے جاں نثاری کو فخر اور سعادت
سمجھتے ہیں، اگر حضرت مقام رضا اور مقام عبدیت پر فائز نہ ہوتے تو ان کے متوسلین کی تعداد
لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جاتی، مگر عجز وانکساری اور حقیقی تواضع نے اس طرف بہت کم توجہ
کرنے کی مہلت دی ہے، آپ نے ایک عقیدت مند کو جو ارقام فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے۔

بنے کیوں کر کہ ہے ہر بات الٹی ہم الٹے، یار الٹا، بات الٹی

مخدوما! مریدوں کا زیادہ ہونا، اپنے نام لیوا اور تابعدار زیادہ سے زیادہ بنانا، زیادہ سے
زیادہ لوگوں کو ہدایت کرنے کی جد وجہد عمل میں لانا، مرشدان طرق اور اہل بیعت کا عظیم الشان

مقصد ہے اور اس زمانہ میں تو اس مقصد کے لئے ایجنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں، پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں اور زیادہ تعداد مریدوں کی بنائی جاتی ہے، رجسٹروں میں ان کے نام درج کئے جاتے ہیں لہذا یہ تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہونی چاہئے کہ آپ اور آپ کے خاندان کے بہت سے عورت مرد میرے مرید ہوجائیں کم سے کم یہ فائدہ ضرور ہی ہوگا کہ ہرطرف آپ لوگ میری تعریفیں کریں گے میرا نام مشہور اور روشن ہوگا، مجھ کو آمدنی ہوگی، اچھا اچھا کھانا وغیرہ ملیگا، نذر نیاز آئے گی، پھر میں کیوں انکار کررہا ہوں، یہ آپ کی محبت ہی کی وجہ سے ہے، اسی وجہ سے اپنا نقصان کرتا ہوں، آپ اگر کسی کامل مرشد سے بیعت ہوں گے تو آپ کی وہ سچی رہنمائی کرے گا اور آپ کی دین اور دنیا کی بھلائی ہوگی، اس سے آپ کو وہ فوائد حاصل ہوں گے جو کہ مقصود اعظم ہیں، میرے جیسا ناکارہ و نالائق، نامراد سگِ دنیا، بندۂ شکم، بدنام کنندہ نکو نام سے اگر آپ بیعت ہوگئے تو اگرچہ میرا فائدہ ہی فائدہ ہے، مگر آپ کی راہ ماری گئی، آپ کے لئے ہر طرح نقصان ہی نقصان کا سامنا ہے، اسلئے میں آپ کے فائدے کیلئے کہتا ہوں کہ آپ کسی متدین، واقف شریعت وطریقت، کامل بزرگ کو تلاش کریں اور اس سے بیعت ہوں، آپ کہتے ہیں کہ میں نے سب کو دیکھ لیا ہے، کسی سے میری طبیعت بیعت ہونے کو نہیں چاہتی ہے، تو میرے محترم! آپ نے جن کو دیکھا، جن کی جانچ پڑتال کی، جن سے آپ کی خط وکتابت ہوئی، انھیں میں تو خداوند کریم کے مقرب بندے منحصر نہیں ہیں، آپ تلاش کرتے رہیں، ممکن ہے کہ کوئی مرد خدا مل جائے "اولیائی تحت قبائی لایعرفہم غیری" مشہور مقولہ ہے، ممکن ہے کہ آپ کی پرکھ غلط ہو پھر یہ عجیب بات آپ نے کہی کہ کسی سے بیعت ہونے کی طبیعت نہیں ہوئی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کی طبیعت پر مدار ہے جس کو آپ کی طبیعت بزرگ مانے وہ بزرگ ہے اور جس کو نہ مانے وہ بزرگ نہیں۔ (مکتوب ج ۴ ص ۴، ۵،)

اس لئے حضرت نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ ہرکسی کو حلقۂ ارادت میں لینے سے اجتناب فرمایا کرتے تھے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے جب اپنے ملحدانہ عقائد سے توبہ کی اور بیعت کیلئے مولانا عبدالباری کو سفارشی بناکر دیوبند حاضر ہوئے تو حضرت نے انکار فرماکر ان کو

بہ نفس نفیس تھانہ بھون حضرت تھانوی کے حضور پیش فرمایا، حضرت تھانوی نے کی سفارش پر ان کو بیعت تو فرمالیا مگر تربیت کے لئے حضرت تھانوی کی طرف رجوع کا حکم فرمایا (جس کی ساری سرگذشت مولانا دریا آبادی کی مرتبہ کتاب نقوش وتأثرات میں مذکور ہے) البتہ ایک طریقہ ایسا تھا جس کی روشنی میں حضرت انکار نہ فرماسکتے تھے اور وہ خود اس گناہ گار کا تجربہ شدہ ہے جس کی مختصر سی کیفیت یہ ہے۔

کہ مظاہر علوم سہارنپور کے زمانۂ تعلیم میں تقریباً ہر جمعرات کو بعد از عصر حضرت کی زیارت یوں ہوجایا کرتی تھی کہ کانگریس یا جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سہارنپور تشریف لاتے اور فرودگاہ میں تقریر فرماتے، اسی وقت سے آئینہ دل میں میں حضرت کا نقش اس طرح ثبت ہوگیا کہ آج تک باقی ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا۔ مگر زیادہ قرب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے داخلہ پر نصیب ہوا، ہر ہفتہ کئی بار گھنٹوں زیارت کا شرف مل جاتا، دارالحدیث سے لے کر خانقاہ مدنی تک اور پھر خصوصاً نماز مغرب میں جو حضرت خانقاہ سے متصل چھوٹی مسجد میں ادا فرماتے اور نماز مغرب کے بعد سوا پارہ نوافل میں دو حافظوں کو سناتے، اسی طرح نماز فجر اکثر اسی مسجد میں حضرت کی اقتدا میں پڑھنے کی سعادت ملتی، حضرت نماز فجر میں قنوت نازلہ باقاعدہ پڑھا کرتے تھے، غرضیکہ یہ سعادت کثرت سے حاصل رہی، اگرچہ بیعت کا مفہوم معلوم نہ تھا نہ یہ گناہ گار اس قابل تھا مگر تعلق کا ایک ذریعہ بنانے کے لئے کئی بار درخواست کی مگر یہی جواب ملا کہ استخارہ کرلیا جائے، اس کا جواب کبھی تو گستاخانہ طریقہ پر دیا جاتا کہ عبادت میں استخارہ کا حکم نہیں، اور کبھی کسی اور طریقہ سے مگر ادھر سے اسی پر اصرار رہا۔ آخر فراغت پر گھر آیا تو ایک رات خواب میں سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیعت کا حکم ملا، وہ پورا خواب لکھ کر ارسال کردیا، تو جواب ارشاد فرمایا کہ ملاقات پر انشاء اللہ بیعت کرلی جائے گی، آخر وہ سعادت آفریں گھڑی آگئی کہ مورخہ ۲۶ر شعبان ۱۳۵۵ھ/۱۲ر نومبر ۱۹۳۶ء بروز جمعرات نماز مغرب کے بعد اسی مسجد میں چند دیگر سعادت مندوں کے ساتھ بیعت

کا شرف حاصل ہو گیا۔

اس مختصر مگر جامع داستان کا مقصد یہ ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت ہونا بہت مشکل تھا۔ بیعت کے بعد رات کو خانقاہ کے بغل والے چھوٹے سے کمرے میں سونے کا حکم دیا کہ یہاں شیخ الہندؒ آرام فرمایا کرتے تھے۔ پھر تسبیح ۱۰۰ ربار، استغفار ۱۰۰ ربار، درود شریف ۱۰۰ بار صبح وشام پاس انفاس ایک گھنٹہ کرنے کا حکم فرمایا۔

۲۰ ررجب ۵۶ھ کو دوبارہ حاضری پر مندرجہ ذیل اسباق ارشاد فرمائے۔

نماز تہجد کے بعد فاتحہ ۳ ربار، درود شریف ۳ ربار، سورۂ اخلاص بارہ بار، درود شریف ۳ ربار پڑھ کر یہ دعا کی جائے، اللّٰہم بلغ ثواب ماتلوتہ لمشائخ ہذہ الطریقۃ وافض علیّ من فیوضاتہم و برکاتہم آمین، پھر ذکر یوں کیا جائے

لا الٰہ الا اللہ ۲۰۰ ربار۔ الا اللہ ۴۰۰ بار اَللّٰہُ اَللّٰہُ ۶۰۰ ربار، اَللّٰہُ ایکسو بار، ذکر قلبی ۲۰۰۰ ربار یہ ذکر کافی زمانہ ہوتا رہا اور پاس انفاس بھی ہوتا رہا، کیفیات وقتاً فوقتاً بذریعہ عریضہ اور کبھی زبانی عرض کرتا رہا، حتیٰ کہ الہ آباد جیل سے مورخہ ۹ ربیع الاول ۶۳ھ کو گرامی نامہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ اب اسم سے مسمّٰی کی طرف توجہ کرنی چاہئے اور وہ مراقبہ معیت ہے جس میں ھو معکم کا استحضار کیا جائے جس کی تشریح مکتوبات شریفہ ہے،

حضرت نے اس گناہ گار پر بہت زیادہ توجہ فرمائی، اور اس توجہ کے بہت زیادہ آثار محسوس ہوئے، ایک دفعہ سحری کے مراقبہ میں یوں القاء ہوا بلکہ ندا آئی کہ لو ابوالمعالی ہے۔ مگر افسوس کہ اپنی بداعمالی کی وجہ سے کچھ بھی باقی نہ رہا، جس طرح عمر عزیز کافی گذر گئی اسی کے ساتھ ساتھ وہ سب برکات بھی ختم ہو گئیں، صرف ایک برکت باقی ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہ کے ساتھ محبت میں ذرّہ بھی کمی نہیں ہوئی، الحمد للہ حسب ارشاد گرامی سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم المرء مع من احب، نجات کی امید ہے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ختم ہفت سلاطین اور حزب البحر کی اجازت سے نوازا ختم ہفت سلاطین تو آج تک جاری ہے جس کی برکات کا نزول ہو رہا ہے، حزب البحر چند سالوں کے بعد چھوڑ دی تھی اور حضرت نور اللہ مرقدہ کی یہی مرضی معلوم ہوتی تھی۔

بیعت کے دوسرے دن صبح ناشتہ کے بعد یہ "مستعمل عبا عنایت فرمایا جواب تک میرے لئے باعث سعادت و برکت ہے اور خواہش ہے کہ میرے کفن میں بھی اسی سے سعادت حاصل کی جائے، جیسا کہ :

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ نیا کرتہ طلب کرلیا تھا جو آپ کی خدمت میں ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا پیش کیا تھا، چند صحابہ کرام اس جرأت پر استفسار کے جواب میں اس صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ وجہ بیان فرمائی کہ میں نے اس مبارک کرتہ کو اپنا کفن بنانے کے لئے یہ جرأت کی ہے، چنانچہ وہ کرتہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کا کفن بنا (مشکوٰۃ)

اس گناہ گار نے بھی اسی سعادت کے حصول کے لئے یہ جرأت کی تھی، الحمدللہ ثم الحمدللہ

روحانی برکات کا ظہور

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے سلوک و معرفت کی تمام مروجہ منازل بے نظیر طریقہ پر طے فرمائیں، مدینہ منورہ، مالٹا اور پھر برصغیر میں آپ نے احسان و شہود کا قرب حاصل فرمایا، مگر ان برکات کا عملی ظہور آپ کے قیام بنگال سے زیادہ شروع ہوا، جہاں آپ بظاہر تو شیخ الحدیث صدر مدرس بن کے رہے، مگر درحقیقت آپ کی روحانی برکات کا انکشاف اور ظہور وہیں سے ہوا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی طرف سے مجاز طریقت و بیعت کے سعادت مندوں کی تعداد ۹۲ رہی ہے جبکہ کل مجازین کی تعداد ۱۶۷ رہی ہے، دارالعلوم دیوبند تشریف لانے کے بعد اگرچہ تدریس اور سیاسیات میں بے پناہ مصروفیت رہی مگر طالبان سلوک بھی کشاں کشاں حاضر خدمت ہوتے رہے، خانقاہ مدنی میں علمی اور سیاسی بحث کم ہوتی، مگر روحانی تجلیات زیادہ ہوتی تھیں، سفر میں آپ جہاں رونق افروز ہوتے خواہ وہ سفر سیاست کے نام سے ہوتا مگر وہاں بھی تشنگان آب حیات جوق درجوق پہونچ جاتے، چونکہ آپ مقام عبدیت پر فائز تھے اس لئے آپ نے :

"رو رو کر دعائیں کیں کہ ہجوم خلق کو ہٹادیا جائے" (مکتوبات ج ۲ ص ۱۶۰)

دراصل حضرت نوراللہ مرقدہ کی یہ کیفیت بھی سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اثر

تھی جو آپ نے تعلیماً للامت فرمایا۔ اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیرًا، اور یہ آپ کی صداقت للّٰہیت کی دلیل تھی کہ طالبان سلوک کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا جیساکہ،

ہرقل نے ابوسفیان سے سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو چند سوالات کئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کیا اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیروکار بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں، ابوسفیان نے بتایا کہ دن بدن بڑھ رہے ہیں، تو ہرقل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کیفیت کو آپ کی صداقت کی دلیل قرار دیا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

ظاہر ہے کہ غزوۂ بدر میں صحابۂ کرام کی تعداد ۳۱۳ اور بقول شاذ ۳۱۴ تھی اور پہلی مردم شماری حسب روایتِ بخاری چھ سو تھی، حدیبیہ کے وقت چودہ سو تھی، فتح مکہ کے دن دس ہزار اور غزوۂ حنین میں بارہ ہزار سعادت مند تھے جبکہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی، اور آج روئے زمین پر ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں جو کہ وللاٰخرۃ خیر لک من الاولیٰ کا مظہر ہیں، اور یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً کا لافانی ثبوت ہیں۔

حضرت کے پروانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی رہی حتی کہ بنگال کے سفر میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ ایک بڑے مجمع کو شرف بیعت بخشتے ہوئے کلمات بیعت کہلوائے گئے۔ بلاشبہ اس وقت عرب وعجم میں آپ کے غلاموں کی تعداد کئی لاکھ ہے، جہاں حضرت نوراللہ مرقدہٗ کے خلفاء اصطلاحی اور بصری زیارت سے محروم عشاق کو آپ کے فیوضات اور برکات سے مالامال فرما رہے ہیں، بارک اللہ فی مساعیہم وکثر اللہ امثالہم، آمین۔

تربیۃ السالکین

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی ریاضت اور محنت سے اس راہ سلوک کو طے فرمایا تھا، وہ پوری طرح اس کے نشیب وفراز سے واقف تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ نے سالکین کی تربیت ان کے مزاج کے مطابق فرمائی، اختصار کے طور پر ان کے ارشاد فرمودہ چند روحانی نسخے درج ذیل ہیں۔

(ا) امراض باطنیہ کے ازالہ کے لئے آپ نے فرمایا :۔

امراض باطنیہ کا علاج اجمالی تو کثرت ذکر اور تدبر فی القرآن اور کثرت تلاوت ہے اور تفصیلی (علاج) احادیث متعلقہ میں غور کرنا اور ان کی ہدایات کے مطابق ہر ایک خلق میں جد و جہد کرنی تصوف کی کتابیں ان امور میں ہدایات تامہ کرتی ہیں بالخصوص امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں جیسے کیمیائے سعادت، منہاج العابدین وغیرہ ہر دو کا ترجمہ اردو میں موجود ہے، منہاج العابدین امام غزالی کی آخری تصنیف ہے مختصر اور مفید ہے اس کا ترجمہ سراج السالکین اردو میں ہے اور بہت کارآمد ہے، رسالہ امداد السلوک فارسی میں بہت مفید ہے (مکتوبات شریف ج ۴ ص ۴۹)

(ف) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تصانیف کا خلاصہ خلاصۃ التصانیف فی التصوف کے نام سے عارف باللہ شیخ محمد امین کردی رہ نے فرمایا ہے، جس کا ترجمہ اردو میں اس گناہ گار نے روحانی تحفہ کے نام سے کیا ہے، الحمد للہ اس سے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو فائدہ پہونچا، چنانچہ اس کا ترجمہ پشتو زبان، سندھی زبان میں شائع ہو چکا ہے، اب انشاء اللہ انگریزی میں بھی شائع ہونے والا ہے۔

امداد السلوک :۔ یہ کتاب حضرت قطب الدین دمشقی م ۸۰۰ھ کی تالیف ہے جس کا نام رسالہ مکیہ ہے، یہ عربی زبان میں ہے جس کا ترجمہ فارسی زبان میں قطب الارشاد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حافظ محمد ضامن حسن شہید کے حسب ارشاد فرمایا اور اس ترجمہ کا نام اپنے مرشد کی نسبت سے امداد السلوک رکھا، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے اس گناہ گار کو مطالعہ کا حکم فرمایا تھا جس سے کافی روحانی فائدہ ہوا مگر افسوس گناہ گار سنبھال نہ سکا۔

اسی طرح آنکھ کے گناہ سے محفوظ رہنے کا عملی علاج تجویز کرتے ہوئے فرمایا :۔

جب کوئی حسین صورت نظر آجائے تو معاً یہ تصور کیجئے کہ ناپاک منی اور ناپاک خون سے بنائی ہوئی مورت ہے اور بدن میں سیروں نجاست اس میں بھری ہوئی ہے، صبح و شام پاخانہ اور پیشاب وغیرہ کی صورت میں نکلتی ہے اور مرنے کے بعد اس کی نہایت نفرت انگیز صورت ہونے والی ہے، اس واقعی بات میں ذرا غور اور دھیان برابر رکھئے، انشاء اللہ بے چینی

وغیرہ جاتی رہے گی۔ (ج ۴ ص ۲۹)

(۲) قبض و بسط کا علاج۔ اس گناہ گار کے نام مکتوب شریف میں یہ ارشاد فرمایا۔

قبض و بسط کی حالت کا پیش آنا خواص انسانی میں سے ہے، اس سے زیادہ متاثر نہ ہونا چاہئے، البتہ قبض کی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ استغفار کثرت سے کرتا رہے اور بسط کی حالت میں خدا کا شکر کثرت سے کرے کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اگر تم شکر کروگے اور احسان مانوگے تو اور زیادہ تم کو دوں گا۔ (مکتوبات ج ۳ ص ۱۲۰)

(۳) سالک کیلئے جسمانی اور مادی تکالیف کا علاج ہ۔ ایک مرید باصفا کو ارشاد فرمایا:

یہ جسمانی اور مادی تکالیف اندیشناک نہیں بلکہ ذکر کی تاثیرات ہیں جیسے اجزاء ناریہ دخان میں اجزاء ارضیہ کو اپنے مرکز کی طرف اٹھالے جاتے ہیں اور درمیان میں تصادم کی وجہ سے برق، رعد اور صاعقہ وغیرہ پیش آتے ہیں یہی حال سالک کو ذکر کے ساتھ پیش آتا ہے ھنیئاً لارباب النعیم نعیمھم الخ تاہم ذکر جہر بارہ تسبیح کو موقوف کر دیجئے اور علیٰ ہذا القیاس اسم ذات کو بھی بند کر دیجئے، یعنی پاس انفاس اور ذکر قلبی جو کہ جاری ہیں، جاری رکھئے اور مراقبہ میں ترقی کیجئے (مکتوبات ج ۳ ص ۹۳)

یہ گناہ گار عرض کرتا ہے کہ بیعت کا مقصد اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیعت کے بعد رزق کی فراوانی اور دنیاوی مقاصد پورے ہوں، آج کل بیعت کا تقریباً یہی معیار قرار دیا گیا ہے اسلئے بجائے اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کے اہل اللہ اور اولیاء کرام سے عملیات کی اجازت مانگتے ہیں اور اگر مالی حالت درست ہوگئی مادی اغراض پوری ہوگئیں تو پھر مرشد کو قاضی الحاجات کہنے اور سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگاتے، اور اگر میلے کچیلے گناہ سے آلودہ بدن کو شیخ کامل کی نظر سے صاف ہونے میں تکلیف پہونچے یا ناجائز رزق کی آمدنی بند ہوجائے یا کوئی مادی ابتلاء آجائے تو اس بیعت کو توڑ ڈالتے ہیں ایسے قسم کے لوگوں کا ذکر قرآن عزیز نے یوں فرمایا ہے

ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف	اور کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایک شرط پر
فان اصابہ خیر اطمان بہ وان اصابتہ	کرتے ہیں اگر ان کو دنیاوی بہتری مل جائے تو
فتنۃ انقلب علی وجھہ خسر الدنیا	اس سے خوش ہوجاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش

والآخرة ذلك هو الخسران المبين ○ آجائے تو چہرے کے بل پلٹ جاتے ہیں دنیا اور قیامت دونوں میں گھاٹا پاگئے اور یہ کھلا ہوا گھاٹا ہے۔
(الحج ۱۱)

حالانکہ سلوک و معرفت تو اصحاب صفہ کی وراثت ہے بلکہ اس گناہ کار کے نزدیک تو تمام دینی تعلیم اصحاب صفہ کی وراثت ہے ان مدارس اور خانقاہوں میں اگر اصحاب صفہ کی جھلک ہوگی تو دینی طور پر کامیاب ورنہ ناکام ہوں گے (اعاذنا اللہ منہ)

ایک صحابی نے رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپ سے بڑی محبت ہے آپ نے فرمایا دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے تین بار اللہ تعالیٰ کی قسم کھاکر کہا مجھے آپ سے بڑی محبت ہے تو آپ نے فرمایا۔ اگر تو سچا ہے تو پھر غربت کے لئے پالان تیار کرلے یاد رکھ جس کو میرے ساتھ محبت ہوگی فقر و فاقہ اس کی طرف پانی کے اس سیلاب سے بھی جلدی پہونچ جائے گا جو پستی کی طرف بہنے والا ہو (مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

چنانچہ سلوک و احسان کے طلبہ کو فقیر کہا جاتا ہے، اور فقر کے تین حرف تین صفات کی علامت ہیں، فؔ سے فاقہ، قؔ سے قناعت، رؔ سے ریاضت۔ رزقنا اللہ وایاکم (آمین)

اس دنیا کے عیش و عشرت سے دامن بچانا صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ سلوک کے لئے نہایت ہی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر اولیاء کرام ہمیشہ اس سے کنارہ کش رہے، شاہ غلام علی نقشبندی کو جب نواب ٹونک نے ضروریات کے پورا کرنے کے لئے مادی پیش کش کی تو آپ نے جواب میں فرمایا۔

نان جویں و خرقہ پشمین و آب شور — سیپارہ کلام و حدیث پیمبری
ہم نسخہ دو چار ز علمیکہ نافع است — نہ دیں نہ لغو بوعلی و آثار عنصری
تاریک کلبۂ کہ پئے روشنی آں — بیہودہ نبرد شمع خاوری
بہ یک دو آشنا کہ تیز رو بہ نیم جو — در پیش چشم او ملک سنجری
ایں آں سعادت است کہ حسرت برادبرد — جویائے ملک قیصر و تخت سکندری

(۴) حضرت مولانا عبدالحق مدنی صدر مدرس مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد کے نام گرامی نامہ میں ارشاد فرمایا:

" آپ کا یہ فرمانا کہ زن وشو کے تعلقات کے ساتھ اصلاح نفس محال ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ بیوی کے ساتھ خلوت بھی قلب کو صفا اور روح کو جلا دیتی ہے۔ شفاء قاضی عیاض کے شارح نے کہا ہے کہ ہر شہوت دل کو زنگ آلودہ کرتی ہے سوائے خلوت صحیحہ بیوی کے ساتھ، کیونکہ اس سے صفائی باطن ہوتی ہے (مکتوبات ج ۱ ص ۳۱)

تجرد اور ان دنیاوی علائق سے تبتل جو نہ صرف انسان کی فطرت سلیمہ میں داخل ہیں نہ صرف غیر پسندیدہ بلکہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی لا رھبانیۃ فی الاسلام سلوک و احسان، طریقت کا بنیادی اصول ہے، پھر نکاح جو کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، جس کو سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت سے تعبیر فرمایا سوائے یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے سب انبیاء علیہم السلام نے ازدواجی زندگی اختیار فرمائی، قرآن عزیز نے فرمایا وجعلنا لھم ازواجا وذریتہ (الرعد ۳۸) خود سید دو عالم امام المعصومین مرشد السالکین صلی اللہ علیہ وسلم کے نو حرم تھیں جو ان کی خصوصیت تھی، امت کی تعلیم کے لئے سفر میں مغازی میں بھی کسی نہ کسی ام المؤمنین کو ہمراہی کی سعادت بخشی، رفیق اعلیٰ کے سفر کے وقت بھی یہ تعلق جلوہ گر تھا،

نکاح اور تعلقات زن وشوئی معاشرتی یا جنسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ یہ تو مذہبی اور روحانی مسئلہ ہے، کئی اخلاق فاسدہ اور اعمال رذیلہ خبیثہ کا نکاح سے قلع قمع ہوجاتا ہے، قرآن عزیز نے جعل بینکم مودۃ ورحمۃ فرما کر اس کی حکمت بالغہ کو یوں ارشاد فرمایا کہ مودۃ فی زمان الشباب ورحمۃ فی زمان الشیخوخۃ یعنی جوانی میں میاں بیوی کے درمیان قلبی محبت ہوجاتی ہے اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کیلئے سراپا شفقت اور رحمت بن جاتے ہیں۔

(۵) ایک مسترشد کی بعض کمزوریوں پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

" طبیعت کا بدل جانا یا تو کسی گناہ کی شومی سے یا کسی حالت کے اظہار سے یا طبعی قبض سے جو کچھ بھی ہوا ہے استغفار کی کثرت لازم ہے افسوس تو اس امر کا ہے کہ چار وقت کی نماز کیوں چھوٹی ہمیشہ خیال رکھیئے کبھی ایسے وقت میں فرائض ترک نہ ہوں دل لگے یا نہ لگے، کتنا ہی انقباض ہو مگر نماز ہرگز ترک نہ ہونی چاہیئے، توبہ

نصوح کیجئے اور کثرت استغفار عمل میں لائیے انشاء اللہ حالت خوب ہو جائے گی (مکتوبات ج ۱ ص ۱۲۸)

ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال میں کمی یا کمزوری پر غور وفکر کرے، چونکہ اللہ تعالیٰ تو رحیم اور کریم ہے وہ کسی نعمت کو سلب نہیں فرماتا جب تک بندہ خود اپنی نا اہلی یا ناشکری کی وجہ سے محروم نہ ہو، ارشاد قرآنی ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (الرعد) خصوصاً سالک کے لئے تو بہت ہی محتاط رہنا ضروری ہے کہ اس کی محنت ضائع نہ ہو اس کیلئے توبہ اور استغفار ضروری ہے مگر توبہ وہی ہو جس کا ذکر قرآن عزیز نے یوں فرمایا ہے الا من من تاب و اٰمن وعمل عملاً صالحًا فاولئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنات وکان اللہ غفوراً رحیما (الفرقان)

(۶) ایک مسترشد صاحب کو جنھوں نے خلافت کی درخواست دی تھی، یہ ارشاد فرمایا:

محترم عزیز! نفس اور شیطان کے مکر ہزار ہزار ہیں دونوں انسان کو اگر وہ کھلی ہوئی انانیت اور جاہ پرستی اور خود غرضی سے بچتا بھی ہے تو ایسی ایسی خفیہ تدبیروں میں مبتلا کرتے ہیں کہ ان سے بچنا سخت مشکل ہوتا ہے، عموماً لوگوں میں پیری مریدی حب جاہ و مال اور خواہشات نفسانی کی بنا پر جاری ہو رہی ہے بہرحال ان دونوں کے مکر سے بچئے ممکن ہے کہ نسبت طریقت سے مالا مال ہو جائیں اور آپ کو باقاعدہ ارشاد و سلوک کی اجازت دی جاتے مگر ابھی بہت سی خامیاں ہیں۔ (ص ۳۲۷)

سالک کی نیت خالص اصلاح نفس ہو وہ نفی اثبات میں اگر اپنے وجود کی نفی نہیں کر سکتا تو وہ کیسا موحد ہے، لا الٰہ الا اللہ کے ذکر میں اگر وہ متعارف معبودات باطلہ کی نفی تو کرتا ہے مگر اپنے نفس کی نفی نہیں کرتا تو وہ کس طرح اصلاح پذیر ہو سکتا ہے، اس لئے وہ عملیات جن کا تعلق تسخیر خلق سے ہے تزکیہ نفس کیلئے مفید نہیں، اعداء کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے عملیات کا پڑھنا تو درست ہے کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر معوذتین نازل فرمائیں مگر تزکیہ نفس شئی دگر ہے۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ہی ایک مسترشد کو فرمایا:

"کوئی عمل تسخیر کا ایسا ہوتا تو میں یہاں جیل میں کیوں پڑا ہوتا، سب سے بڑا عمل تسخیر کا تقویٰ ہے ان الذین اٰمنوا وعملوا الصلحٰت سیجعل لھم الرحمٰن ودًا (مریم ۹۶)

(۷) اس گناہ گار کفش بوس کے نام ارشاد فرمایا :-

میرے محترم! لوازم عبودیت میں سے ہے کہ بندہ آقا کے حکم اور اس کی مرضی کا نہ صرف تابع بلکہ اس پر خوش بھی رہے اور منازل عشق میں تو اس کی رضوان اور خوشنودی نصب العین اور مقصود بالذات ہونی چاہئے پھر اس قلق اور اضطراب کے کیا معنی؟ عالم اسباب میں فرمایا گیا ہے اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل آپ پر لازم ہے کہ اگر مجھ پر کوئی آثار قلق و اضطراب کے ظاہر ہوتے تو مجھ کو نہ صرف صبر بلکہ شکر کی تلقین کرتے من یرد اللہ بہ خیرا یصب منہ یاد دلاتے، یہاں آپ خود الٹے مضطرب نظر آتے ہیں، ملاقات کا ہرگز قصد نہ فرمائیں (ڈسٹرکٹ جیل مراد آباد ۲۲ رجولائی ۱۹۴۲ء رجب ۱۳۶۱ھ) (ج ۴ ص ۳۶)

مرشد کے لئے مربی ہونا ضروری ہے، تربیت کا مفہوم یہ ہے کہ مرید اور مسترشد کی اصلاح کریں اس طریق علاج میں مرید کے مزاج اور کیفیت کا لحاظ نہ کرے۔ رب اور اب میں یہی فرق ہے کہ اب سراپا شفقت ہے اولاد کی فاش غلطی بھی دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے جبکہ تربیت کنندہ کے لئے تنبیہ اور بوقت ضرورت اس میں سختی بھی ضروری ہے، رب العلمین نے عفو وکرم مغفرت اور درگذر اس قدر فرمائی کہ اس سے زیادہ محال ہے مگر نافرمانی پر زجر و توبیخ اور بغاوت پر کسی بھی رعایت کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا عفو و کرم، درگذر، انکساری، محبت اور شفقت اس دور میں بے نظیر تھی مگر بغاوت اور عدم اعتماد پر سرزنش بھی تھی جس کی نظیر مولانا صبغۃ اللہ صاحب کا واقعہ ہے۔

(۸) مولوی صبغۃ اللہ صاحب سے میں تعلق ان کے مودودی ہونے کی وجہ سے منقطع کر چکا ہوں۔

(مکتوبات شیخ الاسلام (ج ۴ ص ۳۰۴)

چونکہ ابوالاعلی مودودی نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عنوان سے اپنا پورا زور قلم صرف کیا تھا جس کے دام تزویر میں بڑے بڑے علماء کرام اپنی سادگی اور اس سراب کو آب حیات سمجھ کر کشاں کشاں داخل ہوتے رہے مگر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے روز اول ہی سے اس جماعت کو گمراہ اور گمراہ کن قرار دیا تھا ہم جیسے نااہل مگر کفش بوس تو اسی وقت سے متنفر ہوگئے تھے خصوصاً مودودی کا شیخ العرب والعجم نور اللہ مرقدہٗ پر ذاتی اخلاقی حملہ ایسا انتہا

کر کوئی بھی انصاف پسند خصوصاً دارالعلوم دیوبند سے منسوب باوفا ایک لحظہ کیلئے بھی اس جماعت کے ساتھ تعلق رکھنا دینی اور روحانی بلکہ اخلاقی خودکشی سمجھتا تھا مگر بعض لوگ ادھر تو خانقاہ مدنی سے اپنے آپ کو منسلک بتاتے تھے اور ادھر مودودی کو بھی مصلح سمجھتے تھے، ان ہی میں سے مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری مدراسی بھی تھے، حضرت نے ان کو اپنی بیعت سے خارج فرمادیا، یہ گرامی نامہ اس انقطاع تعلق کے لئے تحریر فرمایا، مگر مولانا بختیاری سعادت مند تھے کہ جلد ہی توبہ کرلیا، اور حضرت کی خدمت میں توبہ نامہ ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ السر بالسر والعلانیۃ بالعلانیۃ پر عمل کرتے ہوئے اخبار مدینہ بجنور کی اشاعت مورخہ ۱/مارچ ۱۹۵۳ء میں توبہ نامہ بھی شائع کردیا جس کی نقل اور حضرت رح کا معاف فرمانا مکتوبات شریف ج ۲ ص ۳۰۱ میں مذکور ہے

ف :۔ اس گناہ گار نے ۱۹۴۳ء میں ایک خط بنام مکتوب مفتوح بہ نام مودودی صاحب لکھا جو صدق جدید لکھنؤ کی اشاعت مورخہ ۹ مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اور اس سے متأثر ہوکر مولانا ضیاء بلوی مرحوم نے ایک مضمون بہ نام کشف حقیقت بھی شائع فرمایا جو دارالارشاد اٹک نے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ بہ نام برأۃ المحدث از افتراء المحدث شائع کردیا ہے ۔

(۹) ایک مرید کو ارقام فرمایا :

آپ ذکر پر مداومت فرمائیں اور جہاں تک ممکن ہو اپنے نفس اور قلب پر قابو رکھیں، اگر بے قابو ہونے لگیں تو درود شریف پڑھتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور کریں

(مکتوب شریف ج ۱ ص ۳۹۲)

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں جلال ہے اور جلال کی قوت کو برداشت ہر ایک نہیں کرسکتا، نفس اور قلب کے بے قابو ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ وہ ناسوتی صفات کو چھوڑ کر ملکوتی صفات کی طرف پرواز کرنے لگے، اور دوسری حالت یہ ہے کہ بغاوت پر آمادہ ہوجائے، کیونکہ نفس کی تین حالتیں ہیں امارہ، لوامہ، مطمئنہ۔ اگر وہ امارہ ہوجائے تب بھی درود شریف کی کثرت سے بفضلہ تعالیٰ اس میں انکساری پیدا ہوجاتی ہے اور درود شریف حضور قلب اور شوق وعشق کے ساتھ اگر پڑھا جائے تو تصور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے، ذلک الفوز العظیم۔

(۱۰) چونکہ دل مرکز ہدایت ہے اور دل ہی سے کفر اور فسق اور نفاق کی امراض پیدا ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن عزیز نے صحابۂ کرام کے بارہ میں ارشاد فرمایا کتب فی قلوبہم الایمان (المجادلہ ۲۲) کافروں کے بارہ میں فرمایا قلوبہم منکرۃ (النحل ۲۲) اور ختم اللہ علی قلوبہم (بقرہ ۷) منافقوں کے بارے میں فرمایا فی قلوبہم مرض (بقرہ ۱۰) اسلئے اصلاح قلب ہی سے اعمال اور اقوال کی اصلاح ہوسکتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸) مگر دل تک رسائی زبانی ذکر اور دوسرے اوراد سے ہوگی اور جب دل ذاکر ہوجائے تو روح جو کہ حقیقت انسانیت کا نام ہے وہ ذکر کی دولت سے مشرف ہوجاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل و کرم والا ہے۔ یوتیہ من یشاء

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ان تمام مدارج کو یوں ارشاد فرمایا:

"لہٰذا برادر من تم پر لازم ہے کہ خاص ذات جل مجدہٗ کی جانب جہاں تک ہوسکے قلب کو متوجہ کرو، کیونکہ زبان سے ذکر کرنا گویا زبان کو ہلانا ہے اور قلب کا ذکر وسوسہ ہے اور حقیقی ذکر روح کا ذکر ہے" (مکتوب شریف ج ۱ ص ۴۹)

اسی کی مزید تشریح دوسرے مکتوب گرامی میں یوں فرمائی۔

"اگرچہ ذکر لسانی ذکر قلبی کے سامنے نہایت کمزور نسبت رکھتا ہو مگر جیسے کہ ذکر قلبی ذکر روحی کے سامنے نہایت کمزور ہے کہ ذکر اللسان تعلقہ و ذکر القلب وسوسہ قول سلف ہے مگر تاہم اس ذکر لسانی کو حقیر نہ سمجھا جائے (یہ بھی) بسا غنیمت ہے، اور بہت سے اشخاص اس سے بھی محروم ہیں، ثمرہ سے خالی نہیں اگرچہ ضروری ہے کہ حتی الوسع کوشش کی جائے کہ حضور قلب ہو، سیلاب میں دریا کا پانی بہتا ہے اور اس پر جھاگ اور کوڑا کرکٹ ہوتا ہے تاہم پانی اپنے فوائد زمینوں اور کاشت کے رقبوں، حیوانات وغیرہ کو پہنچاتا ہی ہے" (جلد اول ص ۱۷۳)

اس بابرکت راہنمائے ہدایت اور مینار نجات مضمون کو حضرت قدس سرہٗ العزیز کے اس مکتوب پر ختم کیا جاتا ہے جو آپ نے مولانا قاری محمد میاں صاحب مدرس فتحپوری دہلی کے نام ارقام فرمایا تھا۔

"میرے محترم! دوستوں اور احباب کی وجہ سے ان لمحات عزیزہ کو ضائع کرنا کس قدر بے وقوفی ہے سوچ کر اور غور کر کے اس کو سمجھئے۔

(باقی بر صفحہ ۱۳)

باطل … اور اس کے اثرات

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مبعوث ہوئے، جب انسانیت دم توڑ چکی تھی اور انسان جہنم کی آگ میں جلنے اور بھننے لگا تھا، یہ بڑا ہی صبر آزما اور نازک وقت تھا، دنیا بربادی اور تباہی سے دوچار تھی۔ انسان اپنے مالک حقیقی اور اس کی نعمتوں کو فراموش کر چکا تھا کہ دعائے خلیل کی مقبولیت اور نوید مسیحا کا وقت آیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے دعا کی تھی۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ)

اے ہمارے پروردگار اور بھیج ایک رسول انہی میں کا جو پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کتاب اور حکمت کی بات اور ان کو پاک کرے بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خوشخبری دی تھی۔

یابنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (الصف)

اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں اپنے سے پہلے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا ہوا اور ان رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے

رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول تھے اور سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے، آپ نے سارے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور وحدانیت کی دعوت دی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضابطۂ حیات نازل ہوا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرمائی۔

اوپر کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ آیات قرآنی کی تلاوت، کتاب و

حکمت کی تعلیم اور اسی کے ساتھ تزکیۂ قلب (باطن کی صفائی) سونپی گئی۔ اور آپ نے صحابۂ کرام کو ان تینوں پر عامل کرایا، تلاوت آیات اور کتاب وسنت کی تعلیم تو عام طور پر مدارس دینیہ میں دی جاتی ہے تیسرا کام تزکیۂ قلب کا — علماء ومشائخ خانقاہ نے اپنے ذمہ لیا، حدیث میں اسی احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حدیث جبریل میں ہے کہ سوال ہوا

فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ (مشکوٰۃ)	مجھے احسان کے متعلق بتایا جائے کہ کیا ہے آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت اسطرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا وہ رب العلمین کو دیکھ رہا ہے، وہ سامنے موجود ہے، اور رب ذوالجلال کے سلسلہ میں جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ بڑی لگن اور احتیاط کے ساتھ اپنے فرائض وواجبات ادا کرنے کی سعی کرتا ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ اگر رب العلمین کو حاضر وناظر محسوس نہ کر سکے تو اس کو یقین یہ ہو کہ رب العلمین اس کو دیکھ رہا ہے، اس ذات پاک سے بندہ کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں وہ جس طرح اور جیسے کر رہا ہے اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

یہ کیفیت مسلمانوں میں علم ویقین کے درجہ میں پہونچنے پر پیدا ہوتی ہے اور اس درجہ تک پہونچنے کے لئے تسبیح وتحلیل، پاس انفاس اور مراقبہ کرایا جاتا ہے اور بڑی مشق وتمرین کے بعد یہ کیفیت راسخ ہوتی ہے، یہ اللہ والوں کی صحبت وتوجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور مسلسل عمل کرنے اور توجہ دینے سے راسخ ہوتی ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تعلیم حاصل کی اور آپ کی توجہ خاص سے صحابہ کرام کا تزکیۂ قلب بآسانی حاصل ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ جو اعتماد علی اللہ، توکل اور خوف وخشیت ان میں تھی وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی اسلام وایمان پر وہ نثار تھے، آل اولاد، اقرباء واحباب کی اسلامی احکام کے مقابلہ میں ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی، غزوات وجہاد میں بخوشی شریک ہوتے تھے اور کامیاب

ہوکر داپس ہوتے تھے، اسلام وایمان کے نام پر سر کٹانا ان کے لئے بڑا سہل ہو گیا تھا، اور ایسی ان کے اندر قوت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ پہاڑ سے ٹکرا جاتے، سمندر اور دریاؤں میں چھلانگ لگا دیتے بڑی سے بڑی طاقت کو کچل ڈالنے کے لئے میدان میں نکل آتے تھے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا جوئی ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، قرآن پاک نے ان کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

والذین معہٗ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللّٰہ ورضوانا (الحجرات)

جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں نہایت سخت، اور آپس میں رحم دل ہیں، تم انھیں رکوع وسجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضامندی اور خوشی تلاش کرتے ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام جدھر نکل جاتے تھے فتح ونصرت اور کامیابی وکامرانی انکے قدم چومتی تھی، تائید خداوندی ان کے ساتھ ہوتی تھی اور کفار ومشرکین ان کو دیکھ کر رعوب ہوتے تھے

قاعدہ ہے کہ مربی ومعلم جس پایہ اور جس درجہ کے ہوتے ہیں، ان کے تلامذہ میں بھی وہی خوبو آتی ہے اور وہ بھی بلند پایہ ہوکر نکلتے ہیں، عہد نبوی میں ہزاروں حفاظ پیدا ہوئے اور عہد صحابہ میں حفاظ قرآن کی کمی نہیں تھی، اور اسی کے ساتھ ان میں محبت رسول اور خشیت الٰہی پائی جاتی تھی، جن کا غارتگری کا پیشہ تھا وہ معلم اخلاق بن گئے، بداخلاقیوں کا نام ونشان مٹ گیا، رہزن رہبر بن گئے، بت پرستوں کی اولاد ایثار وہمدردی کے پیکر نظر آنے لگے، اور یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔

یہ نگاہ نبوی کے اثرات تھے، عقائد واعمال میں پختگی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور خشیت الٰہی تزکیۂ قلب کے ذریعہ پیدا ہو گئی جس کو اب عوام وخواص بھولتے جارہے ہیں، پہلے انبیاء کرام اور رسل عظام آتے تھے اور یاددہانی کرتے تھے، اب تو ہمارے سامنے کتاب وسنت اور تعلیمات نبوی ہے، علماء جو روشن ضمیر ہوتے ہیں وہ اس راستہ کی رہبری کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر انسانوں کو عہد الست کی یاد دہانی فرمائی، اور اس طرح ان میں جذبہ اخلاص و للّٰہیت پیدا کرنے کی سعی فرمائی، ارشاد ربانی ہے

اذ اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ شھدنا ان تقولوا یوم القیٰمۃ انا کنا عن ھذا غافلین (الاعراف)	جب آپ کے رب نے عالم ارواح میں اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انھی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں. سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں آپ ہمارے رب ہیں ہم سب اس واقعہ کے گواہ بنتے ہیں تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے بے خبر تھے ۔

یہاں اس عالمگیر عہد کا ذکر ہے جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان ہوا تھا، اور یہ اس وقت ہوا تھا جب انسان اس دنیا میں آیا نہیں تھا اسی کو عہد الست کہا جاتا ہے، یہ روز ازل میں عہد و پیمان ہوا تھا ۔

اس عہد کی تفصیل یہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا ۔

" اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دست قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کیلئے پیدا کیا ہے، اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دست قدرت پھیرا تو جتنے گناہ گار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا، اور فرمایا ان کو میں نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے اور جہنم میں ہی جانے کے کام کریں گے، صحابہ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی متعین کر دیئے گئے تو پھر عمل کس مقصد کیلئے کرایا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو وہ اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جنت کا کام ہے

اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جہنم کا کام ہے"

آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلا واسطہ آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے، پھر ان کی نسل کی پشت سے دوسروں کو اور اسی طرح اس دنیا میں جو اولاد آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کی پشتوں سے نکالا گیا، یہ ارواح چھوٹی چیونٹی کے جثہ میں تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل وشعور سے نوازا تھا اور پھر سوال کیا، کہتے ہیں کہ یہ عہد اس وقت لیا گیا تھا جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اتارے جاچکے تھے، اور یہ مقام عرفات تھا جہاں یہ سوال وجواب ہوا اور جہاں پہلے حضرت آدم کو زمین پر اتارا گیا

اس سوال وجواب میں انسانی قلوب میں معرفت حق کی ایک چنگاری ڈالی تھی جو برابر سلگتی رہی اور اس کے ذہن سے کسی آن زائل نہیں ہوتی، جیسے ہم بچے کے پیدا ہونے کے وقت کرتے ہیں کہ اس کے کانوں میں اذان وتکبیر کی آواز پہونچانے کا اہتمام کرتے ہیں کہ دنیا میں آنے کے ساتھ اس عہد الست کی یاد تازہ ہوجائے اور جب عاقل وبالغ ہو تو اپنے فرائض ادا کرنیکا ان میں جذبہ کردیں لے، اور یاد حق اس کے رگ وریشہ میں رچ بس جائے

عہد الست کا بیج بھی اسی طرح عالم ارواح میں پرورش پارہا تھا اور دنیا میں آنے کے بعد اذان کی آواز پہونچا کر اسے تازہ کیا گیا، اور یہی وجہ ہے کہ ہر انسان میں خالق ومالک حقیقی کی عظمت وہیبت باقی رہتی ہے، کوئی دل اس سے خالی نہیں ہوتا، حدیث نبوی ہے

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چاہا کہ جب انسان دنیا میں آکر عقل وشعور کی دولت سے مالا مال ہوجائے تو اس عہد الست کی بیج کو گرمی پہونچا کر برگ وبار لانے کے لائق بنا دیا جائے اور انسان میں ایسی قلبی توانائی آجائے کہ دنیا کے کام وکاج میں ہوتے ہوئے بھی پروردگار عالم کے احسانات وانعامات کو ایک لمحہ کے لئے فراموش نہ کرے اور اسے رب العزت سے ایسی مناسبت تامہ پیدا ہوجائے کہ جو کام کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ اپنے رب قدیر کے سامنے حاضر ہے اور جو کچھ کررہا ہے اس کے حکم وایماء ہی سے کررہا ہے، انما الاعمال بالنیات کی

حدیث بتاتی ہے کہ دنیا میں انسان جو کام بھی کرتا ہے نیت سے وہ اس کیلئے باعث ثواب بن سکتا ہے، تجارت کررہا ہو یا کھیتی کررہا ہو، مزدوری میں مشغول ہو یا صنعت و حرفت میں، پڑھا رہا ہو یا پڑھ رہا ہو، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور چلنا پھرنا سب اطاعت خداوندی کا نمونہ بن جاتے اور اس کا کوئی لمحہ اطاعت الٰہی سے خالی نظر نہ آئے

سچ پوچھئے تو اسی نظام ربوبیت کا تقاضا تھا کہ انسانوں میں انبیاء کرام بھیجے گئے جنھوں نے انکو رب کائنات کی طرف بلایا اور کفر و شرک سے ڈرایا اور بچانے کی سعی کی، ختم نبوت کے بعد یہ فرائض علماء و مشائخ امت اور دوسرے دینداران امت انجام دے رہے ہیں اور تاقیامت دیتے رہیں گے، بیعت کا سلسلہ اسی کی یادگار ہے، مرشد یہی تو کرتا ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کراتا ہے اور آئندہ کیلئے وعدہ کراتا ہے کہ فلاں فلاں حرام اور ناجائز کام نہیں کرونگا اور نیک اعمال کی پابندی کروں گا اس وعدہ وعید کے بعد ذکر اللہ کی کثرت کراتے ہیں تاکہ ذہن و فکر میں یہ جم جاتے اور چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے اللہ کا دھیان برابر باقی رہے۔

قرآن نے مومن کی شان بیان کی ہے۔

انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم اٰیاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون (سورۃ الانفال)	ایمان والے تو وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں انکے ایمان کو زیادہ کردیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

اس آیت میں مؤمن کی صفتیں بیان کی گئی ہیں کہ اللہ کا جہاں ذکر آیا ان کا دل اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت سے جن کا دل لبریز ہوتا ہے وہ موجزن ہوجاتا ہے۔ ایک دوسری آیت میں ہے

وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم (الحج ۱۷)	ان متواضع لوگوں کو خوشخبری دیجئے جنکے دل ڈر جاتے ہیں جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے۔

ایک آیت میں ہے کہ رب العلمین کی یاد سے دل مطمئن ہو جاتا ہے اور یاد کرنے والوں کو سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب خبردار رہو کہ اللہ کی یاد سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

قلب انسانی میں جب ہیبت وخشیت الٰہی جاگزیں ہوگی تو لازماً دل ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا اور رجوع الی اللہ سے سکینت پیدا ہوتی ہے، ساری کائنات کا خوف دل سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے کو صرف رب العلمین کا سمجھنے لگتا ہے، سارے وسوسے جاتے رہتے ہیں۔

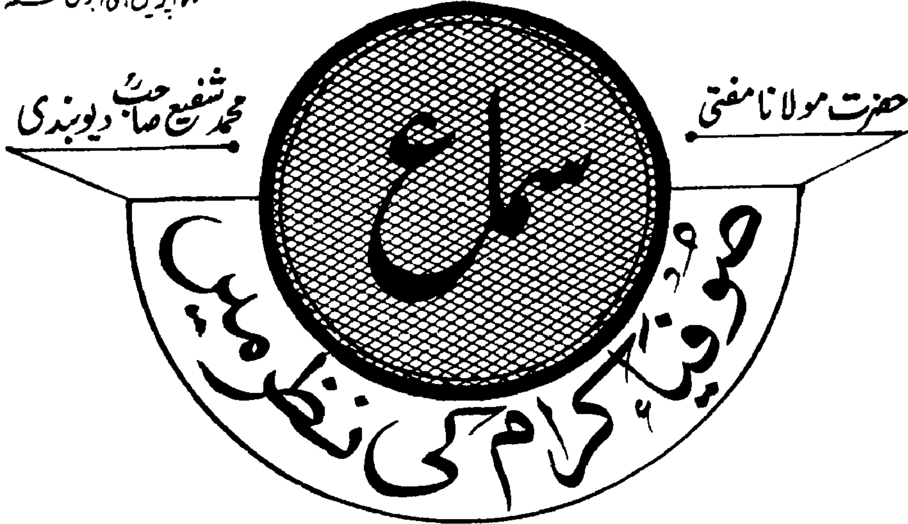
آدمی جب راہ راست اختیار کرتا ہے اور اپنے کو کچھ وقت کے لئے اللہ تعالیٰ کی یاد کیلئے مخصوص کر لیتا ہے تو اس کے نتیجہ میں صبر وتوکل کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے، اور تھوڑے دنوں کے بعد اس کا رشتہ خالق کائنات سے مضبوط ہوجاتا ہے، گناہوں سے طبیعت متنفر ہونے لگتی ہے۔

توکل کا حاصل یہ ہے کہ انسان پر جو سعی وکاوش ڈالی گئی اس کا بجا لانا تو اس کا فریضہ ہے، یہ صبر وتوکل کے خلاف نہیں ہے مگر اس کے بعد یقین رکھے کہ اس میں کامیابی عطا کرنا رب قدیر کی مرضی پر ہے اور جو ہوگا اس کی مرضی اور مشیت سے ہوگا۔

جب کسی مسلمان میں ہیبت وخشیت خداوندی، ایمان کی مضبوطی اور اللہ تعالیٰ پر بھرپور اعتماد ہوجاتا ہے تو پھر امید اسی کی ہوتی ہے کہ وہ کامیاب ہوکر رہیگا اور اللہ تعالیٰ اس کی دستگیری فرمائے گا۔

اولیاء کرام اور صوفیاء عظام اپنے متوسلین میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں باقی جو درحقیقت اولیاء اور صوفیاء میں نہیں ہوتے ہیں صرف ان کا بھیس اختیار کرتے ہیں، وہ چونکہ خود اخلاص وللٰہیت سے خالی ہوتے ہیں، ان کے تحت الشعور میں دنیا طلبی ہوتی ہے اس لئے ان کے ماننے والوں میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ پیر و مرید دونوں خلوص سے دور ہوتے ہیں، تصور خود ان کا ہوتا ہے عمل کا نہیں ہوتا ہے۔ (باقی آئندہ)





گانے بجانے کے سلسلے میں صوفیاء کرام کا صحیح مسلک عام طور پر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اس لئے ذیل میں اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے

امام سہروردی نے جو کبار شافعیہ میں سے ہیں اور صوفیاء کے ایک مکتب فکر کے بانی ہیں اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں دو باب مسئلہ غنا پر بھی باندھے ہیں، پہلے باب میں انھوں نے غنا کی گنجائش اور جواز سے بحث کی ہے، اور دوسرے باب میں حرمت و ممانعت بیان کی ہے، اس پوری بحث میں فقہاء کے اس مسلک سے سرمو تجاوز نہیں کیا ہے کہ غنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، جن میں سے اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو غنا حرام ہے چنانچہ وہ دوسرے باب میں لکھتے ہیں۔

> "ہم سماع کے صحیح ہونے کی صورت اور جس حد تک اہل صدق کے لئے سماع مناسب ہے، بتا چکے۔ اب چونکہ سماع کی راہ سے فتنہ عام ہے اور لوگوں میں صالحیت جاتی رہی ہے .... اور اس راہ میں وقت برباد ہوتا ہے، عبادات کی لذت کم ہوجاتی ہے، اجتماعات کی چاٹ لگ جاتی ہے، نفسانی خواہشات کی تسکین اور ناچنے گانے والوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے سماع کی محفلیں منعقد کرنے کا شوق بار بار پیدا ہوتا ہے، حالانکہ یہ بات مخفی نہیں کہ اس قسم کے اجتماعات صوفیاء کے ہاں ناجائز اور مردود ہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "عارف مکین کے

سوا کسی اور کیلئے سماع صحیح نہیں؛ اور مرید مبتدی کیلئے سماع جائز ہی نہیں۔[1]

غالباً اسی قول کے پیش نظر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی، جب ان سے سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو یہی جواب دیا کہ

۔ منتہی را باد حاجت نیست و مبتدی رامضر است۔

منتہی کو اس کی ضرورت نہیں، اور مبتدی کے لئے نقصان دہ ہے۔

امام سہروردی آگے لکھتے ہیں:

حضرت جنید بغدادی رح کا قول ہے کہ "جب تم کسی مرید کو سماع کی اجازت مانگتے دیکھو تو سمجھ لو کہ اس میں ابھی کچھ ناکارگی باقی ہے"

کہا جاتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رح نے سماع ترک کر دیا تھا (اور اپنے مریدوں کو بھی اس سے روک دیا تھا) ان سے کہا گیا کہ "آپ تو خود سماع سنا کرتے تھے؟ فرمایا- کن کے ساتھ؟" عرض کیا گیا کہ "خود اپنے لئے سنا کرتے تھے" فرمایا "کن لوگوں سے (سنا کرتا تھا)؟"

وجہ یہ تھی کہ وہ حضرات ایسے ہم نشینوں کے ساتھ سماع فرماتے جو سماع کے اہل ہوتے تھے، اور ایسے لوگوں سے سماع سنتے تھے جو گانے کے اہل ہوتے تھے، اسی لئے جب حضرت جنید بغدادی رح کو ہم مزاج ساتھی نہیں ملے تو انھوں نے سماع ترک کر دیا

حقیقت یہ ہے کہ بزرگان دین نے جب کبھی بھی سماع کو اختیار فرمایا، ہمیشہ کچھ حدود وقیود اور شرائط و آداب کا لحاظ رکھا اس کے ذریعہ وہ آخرت کی فکر، جنت کی رغبت اور دوزخ کا خوف پیدا کرتے (دین و شریعت پر عمل کرنے کا) جذبہ اور طلب بڑھاتے اور اپنی (دینی اور اخلاقی) حالت کو بہتر بناتے تھے۔

علاوہ ازیں سماع سے وہ حضرات بعض بعض اوقات ہی شغل فرماتے تھے، اُسے اپنا مشغلہ اور عادت نہیں بناتے تھے کہ عبادات اور اعمال میں حرج پڑنے لگے۔[2]

---

[1] عوارف المعارف الباب الثالث والعشرون فی القول فی السماع رداً وانکاراً ص ۱۸۰۔ [2] ایضاً ص ۱۸۹

آگے لکھتے ہیں :-

"علمائے شافعیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر محرم عورت سے خواہ وہ باندی ہو یا آزاد، پردے میں ہو یا سامنے سماع جائز نہیں "

امام مالکؒ کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے باندی خریدی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ مغنیہ ہے تو خریدار کو اختیار ہے کہ اس عیب کی بنا پر باندی واپس کر دے"

یہی رائے تمام اہل مدینہ کی ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا بھی مسلک ہے

گانا سننا گناہ ہے، اور سوائے چند فقہاء کے سب اسے ناجائز کہتے ہیں اور جو اسے جائز کہتے ہیں وہ بھی مسجد اور دوسرے مقدس مقامات پر اس کی اجازت نہیں دیتے: ؎

امام موصوف نے اس کے بعد غناء کی کراہت وتحریم پر قرآن وحدیث سے دلائل پیش کئے ہیں پھر لکھتے ہیں۔

"مشہور صوفی اور ولی اللہ، حضرت فضیل بن عیاض کا قول ہے" گانا زنا کا افسوں ہے"

اگر کوئی شخص انصاف سے کام لے، اور ہمارے زمانے میں سماع کی محفلوں پر غور کرے، اور مغنیؔ کا دف اور مطرب کا شبابہ لے کر بیٹھنے کو دیکھے، پھر سوچے کہ آیا اس قسم کا اجتماع کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی ہوا تھا؟ کبھی صحابہؓ نے بھی قوال اور مغنی کو بلوایا تھا؟ کبھی وہ حضرات بھی کسی مغنی کے گرد اس طرح پروانے بن کر بیٹھے تھے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ جواب انکار ہی میں ہوگا، تو پھر اگر سماع میں ذرا بھی نفع ہوتا اور اس سے کچھ بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا تو یہ حضرات اُسے اس طرح بغیر مس کئے مہمل نہ چھوڑ دیتے۔

جو شخص یہ کہے کہ سماع کوئی نیکی اور فضیلت کا کام ہے، جس کے لئے دوڑ دھوپ کی جائے اور محفلیں جمائی جائیں، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے حالات سمجھنے کا بالکل بھی ذوق نہیں۔

؎ عوارف المعارف ۱۸۹ -

بعض متأخرین نے استحسان کا سہارا لے کر سماع کی کچھ گنجائش نکالی ہے مگر افسوس!
اکثر لوگ اس میں غلطی کر جاتے ہیں۔[۱]

آگے لکھتے ہیں :

جس وقت محفل سماع میں مغنی بے ریش لڑکا ہو تو فتنہ متوجہ ہوتا ہے، تمام خداترس لوگوں کے نزدیک یہ سماع قطعاً حرام ہے، حضرت بقیہ بن ولید رح کہتے ہیں "اسلاف بے داڑھی کے حسین لڑکے پر نظر ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے" حضرت عطار رح کا قول ہے : "جس نظر میں بھی نفسانی خواہش ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں" بعض تابعین فرمایا کرتے تھے کہ : "میں کسی تائب نوجوان کے لئے خوفناک درندے کو اتنا خطرناک اور مہلک نہیں سمجھتا جتنا ایک بے ریش لڑکے سے اس کی مجالست کو"

خلاصہ یہ کہ جماعت صوفیہ کے لئے اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ اس قسم کی محفلوں سے پرہیز کریں اور مواضع تہمت سے بچیں کیونکہ تصوف تو سراپا صدق وحقیقت ہے، اسے ہرگز ہزل و استہزاء سے نہ ملائیں[۲]

علامہ ابن حجر رح "کف الرعاع" میں لکھتے ہیں :۔

قرطبی رح نے امام طرطوسی رح سے نقل کیا ہے کہ ان سے بعض لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو ایک جگہ بیٹھ کر پہلے قرآن کریم کی کچھ تلاوت کرتے ہیں، اس کے بعد ایک شخص اٹھ کر اشعار گاتا ہے پھر سب مست ہو کر رقص کرتے ہیں اور دف اور شبابہ بجاتے ہیں (اس طرح قرآن خوانی کی مجلس رقص وسرود کی محفل بن کر رہ جاتی ہے)
کیا ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہونا جائز ہے۔؟

آپ نے جواب دیا کہ : اکابرین صوفیاء کے نزدیک ایسا کرنا غلط کاری اور گمراہی ہے اسلام تو نام ہے صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔[۳]

---

[۱] عوارف المعارف، ص ۱۸۹ ۔ [۲] عوارف المعارف بہامش الاحیاء ج ۲ ص ۲۲۱ ۔
[۳] کف الرعاع بہامش الزواجر ج ۱ ص ۵۱ ۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد اور اصول دو چیزیں ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، اور یہ رقص وسرود کی محفلیں کتاب، وسنت سے کہیں ثابت نہیں۔

آگے یہ لکھنے کے بعد کہ رقص و سرود تو دراصل سامری کی ایجاد ہے، نیز صحابہ کرام کی محفلیں تو اس قدر پروقار ہوتی تھیں کہ جب وہ بیٹھتے تو اتنے سکون سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں جو ذرا حرکت سے اڑجائیں گے، لکھتے ہیں۔

جو شخص بھی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہو اور ان کی اس ناجائز کام میں معاونت کرے، یہی ائمہ اربعہ اور دوسرے مجتہدین کا مذہب ہے۔

بعض لوگ مشائخ کی حکایات اور ان کے افعال سے رقص و سرود کی اباحت پر استدلال کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی وجد میں آکر معمولی درجہ میں ہاتھ پیر ہلانے) کے جواز کے منکر نہیں، صرف ہیجڑے اور ہجنیے پن کو ناجائز کہتے ہیں، آخر یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ کرام رو (رقاصاؤں کی طرح) ناچتے، لہراتے اور بل کھاتے تھے! چلئے! اگر مان لیں کہ انھوں نے رقص کیا ہے، تو بتائیے آخر کہاں سے معلوم ہوا کہ (دل نرا دینے اور ایمان اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والے اشعار سن کر) وہ حضرات اس وقت اپنے آپے میں ہوتے تھے، اور وجد انھیں مجبور اور بے اختیار نہیں کردیتا تھا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم ان حکایتوں اور قصوں کو صحیح نہیں مانتے جن میں رقص و سرود کی نسبت ان بزرگوں کی طرف کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ جس طرح زندیقوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کو نہ چھوڑا اور لاتعداد من گھڑت باتیں اور احادیث ان کی طرف منسوب کردیں، اسی طرح انھوں نے یہ حکایات اور قصص بھی اپنی طرف سے گھڑکر ان بزرگوں کی طرف منسوب کردیئے ہوں۔

اور اگر بفرض محال ان حکایات کو صحیح مان لیں اور تسلیم کرلیں کہ ان حضرات نے یہ حرکات اپنے قصد و اختیار سے کی تھیں تو بھی ہمارے لئے سند صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے بعد صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین کا عمل ہے، اور ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ ان کا عمل ہرگز یہ نہ تھا۔[۱]

---

[۱] کف الرعاع ج ۱ ص ۵۱، ۶۲

آگے لکھتے ہیں :-

کتنی پیاری بات ہے جو امام العارفین قدوۃ العلماء ابو علی رودباری نے کہی ہے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص آلات موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے حلال ہے کیونکہ میں اتنا پہونچا ہوا ہوں کہ احوال کا اختلاف مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتا : آپ نے جواب دیا "ہاں، وہ پہنچا ہوا ہے لیکن کہاں ؟ جہنم میں"

کچھ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ :-

"یمن کے بعض ائمہ فرماتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے زمانے میں رائج سماع کا سوال ہے سو وہ بلاشبہ حرام ہے، کیونکہ اس میں منکرات ہوتے ہیں، عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط ہوتا ہے اور عوام اس کی وجہ سے ان گنت لغویات میں مبتلا ہوتے ہیں، لہذا حاکم (کے فرائض میں شامل ہے اور اس) پر واجب ہے کہ لوگوں کو سماع سے روکے" (کف الرعاع ملخصاً علی ہامش الزواجر ج ۱، ص ۲۰)

صاحب "اقتباس الانوار" نے حضرت بختیار کاکی رح کا تذکرہ کرتے ہوئے "سیر الاقطاب" سے ایک قول نقل کیا ہے، جس کی نسبت قاضی حمید الدین[1] ناگوری کی طرف کی گئی ہے، پھر اس قول کی نسبت پر جرح کی ہے، لیکن وہ قول دین و شریعت کے قوانین کے عین مطابق ہے اس لئے بجائے خود قابل قبول ہے۔ ہم ذیل میں "اقتباس الانوار" کی اصل عبارت مع اس قول کے نقل کرتے ہیں۔

"مجلس میں قاضی حمید الدین بھی موجود تھے، کہنے لگے میں حمید الدین، سماع سنتا ہوں، اور علماء کے قول کے بموجب اسے حلال کہتا ہوں، کیونکہ میں مریض ہوں اور درد دل میں مبتلا ہوں جس کا علاج صرف سماع ہی ہے، حضرت امام ابو حنیفہؒ نے ایسے مریض کا علاج شراب سے کرنا جائز قرار دیا ہے جس کے مرض کا علاج کسی دوسری دوا سے نہ ہو سکے، نیز اطباء کا بھی اتفاق ہو کہ مریض اس دوا سے صحت مند ہو جائے گا اسی بنیاد پر کہ میرے درد لا دوا کا علاج صرف سماع ہے سماع کا سننا بس میرے لئے جائز ہے جبکہ تمہارے لئے حرام ہے[1]"

---

[1] شیخ رکن بن حسام ناگوری نے اپنے فتاویٰ "حمادیہ" میں ان کا نام حماد الدین نقل کیا ہے، واللہ اعلم (مصنف) السنۃ الجلیہ ص ۹۲

علامہ سجزی نے اپنی کتاب "فوائد الفواد" میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ:۔

"۸ر شوال ۷۱۹ھ کی تاریخ تھی، حضرت (نظام الدین اولیاء) کی مجلس ہو رہی تھی اور سماع کا مسئلہ زیر گفتگو تھا، حاضرین میں سے ایک صاحب نے حضرت سے عرض کیا" آپ کے لئے تو جب چاہیں سماع مباح ہو جائے، اس لئے کہ یہ آپ کے لئے (بالکلیہ) حلال ہے:" حضرت رح نے فرمایا: نہیں، جو چیز حرام ہوتی ہے وہ کسی ایک کے لئے بھی حلال نہیں ہوتی، اور جو چیز حلال ہوتی ہے وہ کسی شخص کے کہنے سے حرام نہیں ہو جاتی بلکہ دراصل تحقیق یہ ہے کہ سماع ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے چنانچہ امام شافعی رح نے دف کے ساتھ سماع کو جائز قرار دیا ہے جبکہ ہمارے مشائخ حنفیہ رح نے اس کی بھی اجازت نہیں دی، اور ضابطہ یہ ہے کہ قضا اور حکم حاکم سے مسائل مجتہد فیہ میں موجود اختلاف رفع ہو جاتا ہے اور اس صورت میں حاکم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اسی کی بات مانی جائے گی[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح "اخبار الاخیار" میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں، لکھتے ہیں۔

"منقول ہے کہ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاء کے کچھ مریدین نے ایک مجلس منعقد کی اور عورتوں کے دف سے گانا سننے لگے، شیخ نصیر الدین محمود رح بھی اسی مجلس میں موجود تھے، آپ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو اٹھ کر مجلس سے باہر جانے لگے، مگر آپ کے ساتھی وہیں بیٹھے رہے، آپ نے فرمایا" یہ خلاف سنّت فعل ہے:" ان لوگوں نے جواب دیا کیا آپ سماع کا انکار کرتے ہیں اور اپنے پیر کے راستے کو چھوڑتے ہیں؟" شیخ نے جواب دیا "کسی کا عمل حجت نہیں" (چنانچہ اگر میرے پیر سماع کرتے ہوں تو کیا کریں ان کا سماع فرمانا حلت سماع کیلئے دلیل نہیں کیونکہ) حجت صرف کتاب وسنت ہی ہیں۔

---

[1] السنۃ الجلیہ ص ۲۸، ۲۹، وفوائد الفواد ص ۴۲۳، ۴۲۴۔

بعض غرض مندوں نے یہ بات حضرت نظام الدین اولیاء تک پہونچا دی کہ شیخ محمود تو ایسا ایسا کہہ رہے تھے، حضرت نظام الدین اولیاء نے جو شیخ محمود کے خلوص و صدق سے بخوبی واقف تھے، جواب دیا "محمود ٹھیک کہتے ہیں، حق بات وہی ہے جو انھوں نے کہی۔"

"سیرالاولیاء" میں لکھا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کی مجلس میں نہ باجے بجتے، نہ تالی پیٹی جاتی۔ بلکہ اگر کوئی مرید باجے تاشے قسم کی کوئی چیز سننے کے لئے بھی جاتا تو آپ اسے منع کر دیتے اور فرماتے۔ "یہ اچھا نہیں کیا"

"خیر المجالس" میں ہے کہ شیخ نصیر الدین محمود رح کی خدمت میں ایک عزیز آیا اور کہنے لگا۔ بتائیے: یہ کہاں سے جائز ہے کہ محفل میں باجے، دف تاشے اور رباب وغیرہ ہوں اور صوفیاء رقص کریں؟ شیخ نے جواب دیا کہ۔ باجے باجماع ناجائز ہیں، (دیکھو) اگر سلوک کے کسی ایک طریق کو چھوڑ دو گے (اور دوسرا اختیار کر و گے) تو کم از کم شریعت میں تو رہو گے، اور اگر شریعت کو چھوڑ دو گے تو کہاں جاؤ گے؟ اور پھر اختلاف تو صرف سماع کے بارے میں ہے کہ بعض علماء کے نزدیک سماع چند شرائط کے ساتھ اہل حضرات کیلئے مباح ہے۔ جہاں تک باجوں کا تعلق ہے وہ تو باجماع حرام ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے "فرع الاسماع" میں لکھا ہے کہ۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مریدین کہتے ہیں کہ "ہمارے شیخ کا فرمان ہے کہ جو شخص راگ کو باجوں کے ساتھ سنے وہ ہماری بیعت وارادت سے نکل گیا۔"[1]

شیخ علی بن محمد جاندار رح نے جو حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں سے ہیں "درر نظامیہ" میں لکھا ہے:

شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کہتے ہیں کہ سماع کی چار قسمیں ہیں، حلال، حرام مکروہ اور مباح۔ ان میں سے مباح کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔

(۱) معنی مرد کامل ہو نہ امرد ہو نہ عورت۔

(۲) سامع اللہ والا ہو نفس پرست نہ ہو۔

(باقی برصفحہ ۲۱۷)

---

[1] السنۃ الجلیہ ص ۵۵، ۵۶ واخبار الاخیار ص ۸۰۔ [2] السنۃ الجلیہ ص ۵۷ و فرع الاسماع ص ۳۹۔

از جناب پروفیسر خلیق نظامی صاحب

تصوف اور صوفیہ کا مقصد حیات

تصوف کی تعریفیں مشائخ کی کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں لیکن ان تعریفوں کی بنا پر صوفیہ کرام کے مقاصد کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، حضرت شیخ ابوالحسن فوشنجہ رح فرمایا کرتے تھے:

التصوف الیوم اسمٌ ولا حقیقۃ	تصوف آج کل ایک بے حقیقت نام ہے
وقد کان حقیقۃ ولا اسمٌ [1]	اس سے پہلے حقیقت بلا نام کے تھا

اس لئے مناسب یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ خود صوفیۂ کرام کی زندگی میں تصوف کے معنی تلاش کئے جائیں اور ان کے مقاصد کا تعین اسی کی بنا پر کیا جائے

محبت الٰہی

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رح ایک خط میں مولانا فخر الدین مروزی رح کو لکھتے ہیں۔

اتفاق اصحاب طریقت و ارباب حقیقت است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العلمین است۔ [2]	اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس باب میں اتفاق ہے کہ انسان کی پیدائش کا اہم مطلوب اور بڑا مقصود رب العٰلمین کی محبت ہے

ضروری ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی روشنی میں محبت الٰہی کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھا جائے، قرآن میں ایمان کی سب سے بڑی علامت اور خاصیت محبت الٰہی کو قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ - ۲۰)	اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

---

[1] کشف المحجوب، ص ۷۷ (اردو ترجمہ) [2] سیر الاولیاء، ص ۴۵۵، ۴۵۲۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی محبت الٰہی میں سرشاری کی زندگی تھی، آپ دعا فرمایا کرتے تھے

اَللّٰھُمَّ اجعل حُبّك احبَّ اِلیَّ من نفسی و اھلی ومنَ الماءِ البارد۔ (ترمذی)	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے میرے اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ محبت ہی راز حیات ہے، اگر اس کی آگ دل میں نہ ہو تو وہ گوشت کا ایک بے جان ٹکڑا ہے اگر عشق کی گرمی ہو تو انوار ربانی کا محل سے

سلامتی دِل عشاق از محبت تست
وگرنہ ایں دِل پر خوں چہ جائے منزل تست

محبت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی سمٹ کر ایک مرکز پر آجائے، اس کا بال بال یہ پکارنے لگے۔

اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

اس کو ایک لمحہ بھی بغیر اللہ کے چین نہ ملے، شبلیؒ کا یہ قول اس کے حالات کا آئینہ دار بن جائے۔

الفقیر من لا یستغنی بشیٔ دون اللہ	فقیر سوائے حق کے کسی چیز سے آرام نہیں پاتا[1]

وہ عملاً اس ارشاد خداوندی کی تفسیر ہو۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ۔	میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں

اس کے نفس کے تقاضے خاموش ہوجائیں رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو وہ اپنے لئے رہنا چھوڑدے خدا کے لئے جینے لگے۔

خدا کے لئے جینا کہنے تو ایک معمولی سا جملہ ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارتقار انسانیت کی آخری منزل یہی ہے "خدا کیلئے

---
[1] کشف المحجوب ص۱۱

جینے "کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا وما فیہا سے قطع تعلق کرلے اور ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے، وہ شادی بھی کرے، کھائے بھی، اللہ کی مخلوق سے ملے بھی، لیکن اس طرح کہ وہ علائق کے ہجوم اور تعلقات کے اژدہام میں گرفتار ہو کر اپنے معبود حقیقی کو بھول نہ جائے، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو لیکن دنیا کی محبت اس کے دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے، وہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا طلبگار ہو۔ خدا کیلئے جینا نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے۔ ایسا انقلاب جو انسانی زندگی کے مرکز و محور کو بدل دیتا ہے انسان کا ہر کام کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کیلئے ہونے لگتا ہے وہ دنیا کا ہر کام کرتا ہے لیکن اس کی نیت عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے

جب زندگی اس طرح بسر کی جائے تو اس کی اساس ہی بالکل بدل جاتی ہے، انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے، عبادت کے اسی مفہوم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح سمجھایا کہ ایک مرتبہ حضرت سعدؓ نے ارادہ کیا کہ اپنی ساری دولت راہ خدا میں دے دیں، تو فرمایا: اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مقصود ہے اس کا تمکو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ میں دو اس کا بھی ثواب ہے ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابومسعود انصاری سے فرمایا: مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔

یہ ھے خدا کیلئے جینا اور یہ ہے نیت کا وہ انقلاب جو انسان کی زندگی میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔

جب خدا کے لئے جینے کا یہ وسیع مفہوم تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان کا ہر دنیوی کام عبادت بن جائے بلکہ اس کی پوری زندگی ہی عبادت الٰہی ہو جائے، ویسی ہی عبادت جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔ میں نے جنوں کو اور انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں

صوفیاء کا کہنا ہے کہ زندگی صرف وہی ہے جو یاد حق میں بسر کی جائے باقی سب سراب ہے اور دھوکا۔ حضرت محبوب الٰہی رح فرمایا کرتے تھے کہ زندگی تو عبادت ہی یاد حق سے ہے

"حیات آنست کہ درویش بذکر حق مشغول باشد"[۱]

انسانی کردار کے نشوونما اور تشکیل میں اس احساس کا کر وہ اپنی روزی کے لئے کسی دنیوی طاقت کا محتاج ہے بڑا مہلک اثر پڑتا ہے۔ "تعمیر خودی" اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان اپنے پورے ایمانی جذبہ کے ساتھ حق تعالیٰ کو اپنا روزی رساں نہ مان لے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اللہ کی محبت انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو اس کی زندگی کا سانچہ ہی بدل جائے، فکر و عمل کی پابندی، خدمت خلق، راست بازی اور سچائی — کتنی خوبیاں ہیں جو صرف اسی جذبہ کا نتیجہ ہیں۔

محبتِ الٰہی کی عملی راہ

یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندے کے لئے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ — مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں۔

خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گذری ہے، جو انسان چاہتا ہے خدا سے محبت کرے، اسے چاہئے، خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ (۲ : ۱۷۷)

اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶ : ۸)

اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا یہ کھانا کھلانا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لئے ہے نہ تو ہم تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ کسی طرح کی شکر گذاری"۔[1]

احادیث نبوی میں متعدد جگہ محبت کی عملی راہ پر زور دیا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا، اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ متعجب ہو کر کہے گا کہ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العلمین ہے، خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ

[1] ترجمان القرآن جلد اول ۲۸

تیرے قریب بیمار ہوگیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی، حالانکہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا (یعنی اس کی خدمت کرنے ہی میں میرے لئے خدمت گذاری تھی) اسی طرح خدا فرمائے گا، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"[1]

حضرت براء بن عازب رضہ سے روایت ہے کہ ایک بدوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا:

"انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک"[2]

صوفیہ کرام نے محبت الٰہی کی اس عملی راہ کو اختیار کیا تھا، ان کی زندگیاں خدمتِ خلق کے لئے وقف تھیں، وہ دن رات انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے کے لئے بے چین رہتے تھے، کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو دل پریشان ہوجاتا، بھوکوں کا خیال آتا تو لقمے حلق میں اٹکنے لگتے۔ ملفوظاتِ مشائخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ خدمتِ خلق کو ان بزرگوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ بنالیا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہوگی[3]۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس حقیقت کو مختلف انداز میں متعدد جگہ سمجھایا ہے، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

طاعت دو طرح کی ہوتی ہے لازمی اور متعدی، لازمی وہ ہے جس کا نفع صرف کرنے والے کی ذات کو پہونچے، اور یہ نماز، روزہ، حج، ورد اور تسبیح ہے متعدی وہ ہے جس سے اوروں کو فائدہ پہونچے، انفاق، شفقت، غیر کے حق میں مہربانی کرنا وغیرہ اسے متعدی طاعت کہتے ہیں، اس کا ثواب بے شمار ہے[4]

---

[1] مسلم عن ابی ہریرہ [2] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یودۂ جارہ ص۳ [3] سیرالاولیاء ص۱۲۸ [4] فوائد الفواد ص۱۳-۱۴-

خود حضرت محبوب الٰہی رح کی حیاتِ طیبہ اس طاعت متعدی کی بہترین مثال ہے، حضرت بابا فرید رح کے ایک عزیز خواجہ عزیز الدین ایک دعوت میں شرکت کرنے کے بعد حضرت محبوب الٰہی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ رح نے دریافت کیا، کہاں تھے عرض کیا ایک دعوت میں گیا تھا وہاں لوگ یہ کہتے تھے۔

خدمت شیخ نظام الدین عجب فراغ باطنی دارد، اورا ہیچ غمے و اندیشۂ ایں جہاں نیست

شیخ نظام الدین رح کو بڑا فراغ باطنی حاصل ہے انھیں اس جہان کا کوئی غم اور فکر نہیں ہے۔

حضرت محبوب الٰہی رح نے فرمایا۔

ایں قدر غم و اندوہ کہ مراہست ہیچ کس را دریں جہاں نیست، زیراکہ چندیں خلق می آیند و غم و اندوہ خویش می گویند، آں ہمہ بر دل وجان من می نشیند عجب دلے باشد کہ غم برادر مسلماں بشنود و دروے اثر نکند[1]

جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے کسی کو اس جہان میں نہ ہوگا اس واسطے کہ اتنی مخلوق میرے پاس آتی ہے اور اپنے رنج اور تکلیف بیان کرتی ہے ان سب کا بوجھ میرے جان و دل پر پڑتا ہے وہ عجب دل ہوگا جو مسلمان بھائی کا غم سنے اور اس پر اثر نہ ہو۔

حضرت محبوب الٰہی رح کی پوری زندگی خلق کی اسی دردمندی میں گزری، وہ اپنے برائے سب کا غم کھاتے تھے، ہر شخص کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، لوگ جب اپنی درد بھری داستانیں سناتے تو ان کا دل بے چین ہو جاتا، جس طرح ممکن ہوتا ہر آنے والے کی دلجوئی کرتے، دشمن بُرا بھلا کہتے، گالیاں دیتے، لیکن ان کے دل پر میل نہ آتا بلکہ یہ شعر گنگنانے لگتے۔

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد
ہر کہ خارے افگند در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد[2]

ان کا یقین تھا کہ اگر برائی کا بدلہ برائی ہی سے دیا جائے تو یہ دنیا انسانوں کی بستی نہ رہے۔

---

[1] خیرالمجالس قلمی نسخہ مجلس سی دیکم۔ [2] فوائد الفواد ص۸۲ سیر الاولیاء ص۵۵

ایک دن فرمانے لگے۔

یکے خار نہد و تو ہم خار نہی
ایں خار خار باشد میاں
مرداں ہم چنیں است کہ با نغزاں
نغزی با کوزاں کوزی اما میان
درویشاں ہم چنیں نیست کہ با نغزاں
نغزی باکوزاں ہم نغزی۔[1]

اگر کوئی کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹا رکھے تو کانٹے ہی کانٹے ہوجائیں گے عام لوگوں میں تو یہ دستور ہے کہ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں لیکن درویشوں میں یہ دستور نہیں یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہئے۔

صوفیہ اور تعلیم اخلاق

خدمت خلق کے معنی صرف یہ ہی نہیں کہ چند بھوکوں کا پیٹ بھر دیا جائے یا چند حاجت مندوں کی ضرورت کو پورا کر دیا جائے بلکہ اس سے زیادہ اہم بھی ایک کام ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کو برائی سے روکا جائے اور بھلائی کی طرف بلایا جائے، مسند میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا۔

میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے۔ وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے اخلاق کی درستگی کے لئے جدوجہد وہ کام ہے جس کے لئے پیغمبر مبعوث کئے گئے ہیں۔ قرآن میں پیغمبرانہ فریضہ کے متعلق فرمایا جاتا ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

پیغمبر اُن اَن پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا ہے اور انکو کتاب حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث قدسی میں جگہ جگہ انسانی اخلاق کی درستگی کی ضرورت اور اہمیت کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، سورۂ بقرہ میں ہے۔

"نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منھ پورب یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصلی نیکی اسکی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی

---
[1] فوائد الفواد ص ۸۲

خواہش کے باوجود یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو
غریبوں کو، مسافروں، مانگنے والوں کو اور غلاموں کو آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور
زکوۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف
اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہی ہیں جو راستباز ہیں، اور یہی تقویٰ والے ہیں

ارشاد نبوی ہے کہ مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے (اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا) تمام مذہبی عبادات کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان میں اچھے اخلاق پیدا ہوں، حدیث شریف میں ہے جس کی نماز اس کی برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے[1]

ایک جگہ فرمایا جاتا ہے کہ انسان حسن خلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ قائم اللیل وصائم النہار۔

تصوف کی تعریفوں کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر تعریفیں ایسی ہیں جن میں تصوف کو اخلاق سے تعبیر کیا گیا ہے، مشائخ کے نزدیک تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور دنیا کے دوسرے بسنے والوں کو مادی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف کرے، بنی نوع انسان کے ساتھ تعلقات میں شگفتگی پیدا کرنا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا، برائی سے بچانا، بھلائی کی طرف بلانا یہ وہ کام ہیں جو عبادت سے زیادہ اہم ہیں، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے:

> بہت نماز پڑھنا اور وظائف میں بکثرت مشغول رہنا قرآن مجید کی تلاوت میں بہت مصروف رہنا یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں، ہر باہمت شخص کر سکتا ہے بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کر سکتی ہے، روزہ پر مداومت کر سکتی ہے، تہجد گذاری میں مصروف رہ سکتی ہے، قرآن مجید کے چند پارے پڑھ سکتی ہے، لیکن مردان خدا کا کام کچھ اور ہی ہے[2]

مشائخ متقدمین کی نظر میں تصوف ایک اخلاقی پروگرام کا نام تھا جس میں اپنے نیز دوسروں

---

[1] احیاء العلوم امام غزالی۔ [2] سیر الاولیاء ص ۳۴۵۔

کے اخلاق کی درستگی کو زندگی کا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسنؒ کا قول ہے۔

لیس التصوف رسوماً ولا علوماً ولکنہ اخلاق[1]	تصوف رسوم اور علوم کا نام نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا نام ہے۔

حضرت شیخ محمد بن قصابؒ کہا کرتے تھے۔

التصوف اخلاق کریمۃ ظہرت فی زمان کریم من رجل کریم مع قوم کریم[2]	تصوف اخلاق کریمہ ہیں جو بہتر زمانہ میں بہتر شخص سے بہتر قوم کیساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علیؓ بن ابی طالب کا قول ہے۔

تصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف[3]	تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے یعنی جو شخص زیادہ کرتا ہے صوفی زیادہ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ مرتعشؒ فرماتے ہیں:

التصوف حسن الخلق ۔[4]	تصوف خلق نیک کا نام ہے۔

حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف راہِ صدق واخلاق حسنہ کا نام ہے[5]۔

صوفیاء کرام کے حالات زندگی اور تصوف کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تصوف نفوس انسانی کو مادی نجاستوں سے پاک کرنے اور اعلیٰ اخلاق و کردار پیدا کرنے کی ایک عظیم الشان تحریک تھی، صوفیہ نے کار نبوی کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق و اطوار فکر و عمل کو درست کرنے کی کوششیں کیں، مشائخ متقدمین کے ملفوظات تعلیم اخلاق کی سلسبیل و کوثر ہیں جن کی خاموش روانی دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہیں اور دلوں میں اچھے عمل کا جذبہ اور ولولہ جوش مارنے لگتا ہے، ان بزرگوں کی کوشش صرف یہی نہ تھی کہ انسان کے ظاہری اعمال درست ہوجائیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ برائی کے سوت ہی بند ہوجائیں، انسان کا دل برائی کی طرف راغب ہی نہ ہو کہ دل کی نجاست جسم کی نجاست سے بدرجہا بری ہے۔

حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ فرمایا کرتے تھے۔

• جنابت بردو نوع است، جنابت	جنابت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک جنابت

---

[1] کشف المحجوب، [2] رسالۂ قشیریہ، [3] کشف المحجوب، [4] ایضاً، [5] خیر المجالس مجلس ۱۲ قلمی نسخہ

دل است وجنابت تن۔ وجنابت تن از صحبت با زن حاصل شود وجنابت دل بصحبت ناہموار جنابت تن پاک بآب شود۔ اما جنابت دل بآب دیدہ محو گردد[1]

دل کی، دوسری جنابت بدن کی، بدن کی جنابت وہ ہے جو عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے حاصل ہو، اور دل کی جنابت نالائقوں کی صحبت سے ہوتی ہے بدن کی جنابت تو پانی سے پاک ہوجاتی ہے لیکن دل کی جنابت آنسوؤں سے دھوئی جاتی۔

صوفیہ کرام کی زندگیوں کا جو پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے وہ ان کی تعلیم اخلاق ہے، جن مصنفین نے اوراد و وظائف اور کشف و کرامات کے افسانوں کو مرکزی اور بنیادی حیثیت دے دی ہے انھوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف نام ہی خدمت خلق اور تعلیم اخلاق کا ہے، ہمارے مشائخ متقدمین نے اس کو یہی سمجھا تھا اور اسی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔

ارتقاء روحانی محبت الٰہی، خدمت خلق، تعلیم اخلاق، ان سب کا نتیجہ کیا ہے، صوفیہ کا کہنا ہے کہ ان سب کا نتیجہ ارتقاء روحانی ہے، ارتقاء روحانی کی وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنئے کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں، فرماتے ہیں۔

"فی الحقیقت وہ قانون ارتقاء جو لامارک، ہیبر، ابن مسکویہ، اور ڈارون نے دریافت کیا ہے صرف مخلوقات کے جسم ہی تک محدود ہے۔ وہ کچھ نہیں بتلاتا کہ ارتقاء کی یہ زنجیر ہیکل انسانی کی کڑی تک پہونچ کر پھر کہاں چلی جاتی ہے، اور اس کے بعد ارتقاء کے منازل باقی رہتے ہیں یا نہیں؟ لیکن وہ قانون ارتقاء جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا وہ تبلاتا ہے کہ بلاشبہ انسانیت کے مرتبہ تک پہونچنے کے بعد "ارتقاء جسمی" تو ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس کے بعد ایک "ارتقاء روحانی" کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جسم حیوانی کو انسان کا ہیکل اختیار کرنے کے بعد بھی انسان بننے کیلئے بہت کچھ بننا اور ترقی کرنا باقی رہتا ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جن

[1] اخبار الاخیار ص ۲۳

وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ (۵۸ : ۱۱)

لوگوں نے علم حق حاصل کیا سو اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو ترقی دیتا ہے اور ارتفاع بخشتا ہے

یہی مدارج ہیں جو اولیاء اللہ اور اصحاب الجنۃ کے ذہاب الی اللہ کی مختلف منزلیں ہیں ایمان باللہ اور محبت الٰہی اس ارتقاء روحانی کی اصل ہے اور ارتقاء انسانی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پر ایمان وایقان ترقی کرے اور اللہ کی ولایت اور دوستی اپنے اونچے مرتبوں اور مقاموں تک بلند ہوجائے۔

اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵ : ۱۱)

کلمات طیبات اور صالح اللہ ہی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور وہ عمل صالح کرنے والوں کو ارتفاع بخشتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو چیزیں بیان کی ہیں "کلم الطیب" اور "عمل صالح" پس انسانیت کی تکمیل اور ارتقاء کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں ہیں "کلم الطیب" سے مقصود ایمان باللہ ہے اور "عمل صالح" سے مقصود انسان کے وہ تمام کام جو صحت و اصلاح اور عدل و حقیقت کے مطابق ہوں، فرمایا کہ ایمان باللہ صعود کرتا ہے اور بلند ہوتا ہے اور عمل صالح کو خدا اونچے درجوں تک لے جاتا ہے[1]

تصوف اور صوفیہ کرام کے مقصد حیات کے متعلق جو گفتگو گذشتہ صفحات میں ہم نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے محبت الٰہی کو اپنا مقصد حیات قرار دیا تھا، خدمت خلق کو انھوں نے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا، اس کا صلہ "ارتقاء روحانی" کی شکل میں ان کو ملا، اور یہ "ارتقاء روحانی" انسانیت کی تکمیل تھی۔



[1] اولیاء اللہ اولیاء الشیطان طبع ثانی ۱۹۳۶ء لاہور ص ۵۵،۵۴۔

بیعت کا مقصد

بیعت کے معنی ہیں: دست بر دست یک دیگر نہادن و عہد بستن
کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔

جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے اے محمدؐ! وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، سو جو عہد شکنی کرتا ہے تو اپنی ذات کی مضرت پر عہد توڑتا ہے اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اللہ سے کیا تھا ان کو عنقریب اجر عظیم ملے گا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مختلف مقاصد کے لئے بیعت لی تھی کسی سے جہاد کیلئے، کسی سے ہجرت کے لئے، کسی سے ارکان اسلام کی پابندی کے لئے اور کسی سے سنت نبوی کے تمسک پر، بعض احادیث میں ہے کہ حضور نے انصار عورتوں سے نوحہ نہ کرنے پر بیعت لی تھی، ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ محتاج مہاجرین سے اس پر بیعت لی کہ وہ کسی کے آگے دست سوال نہ پھیلائیں، بعد کو ان لوگوں کا حال یہ ہوگیا تھا کہ کسی کا کوڑا ہاتھ سے گرجاتا تو خود گھوڑے سے اتر کر اٹھاتا تھا اور کسی سے کوڑا اٹھانے تک کا سوال نہ کرتا تھا۔

بہرحال احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ بیعت کسی بھی مقصد کے لئے لی جاسکتی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کیا حکمت تھی، اور مشائخ چشت کس مقصد کیلئے بیعت لیتے تھے؟

لہ سبع سنابل میر عبد الواحد بلگرامی مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ ص ۳۶۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رح بیعت کی حکمت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فاعلم ان اللہ تعالیٰ اجریٰ سنتہ ان یضبط الامور الخفیۃ المضمرۃ فی النفوس بافعال و اقوالٍ ظاھرۃٍ وینصبھا مقامھا کما ان التصدیق باللہ ورسولہ والیوم الاخر خفیٌ فاقیم الاقرارُ مقامہ وکما ان رضی المتعاقدین ببذل الثمن والمبیع امرخفیٌ مضمرٌ فاقیم الایجاب والقبول مقامہ فکذلک التوبۃ والعزیمۃ علی ترک المعاصی والتمسک بحبل التقوی خفیٌ مضمرٌ فاقیمت البیعۃ مقامھا

معلوم کر سنت اللہ یوں جاری ہے کہ امور خفیہ جو نفوس میں پوشیدہ ہیں ان کا ضبط افعال اور اقوالِ ظاہری سے ہو افعالُ اقوال قائم مقام ہوں امورِ قلبیہ کے چنانچہ تصدیق اللہ اور اس کے رسول اور قیامت کی امر مخفی ہے تو اقرار ایمان کا بجائے تصدیقِ قلبی کے قائم کیا گیا اور جیسے کہ رضامندی بائع اور مشتری کی قیمت اور مبیع کے دینے میں امر مخفی پوشیدہ ہے تو ایجاب اور قبول کو قائم مقام رضائے مخفی کے کر دیا، سو اسی طرح توبہ اور عزم کرنا ترک معاصی کا اور تقویٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنا امر مخفی اور پوشیدہ ہے تو بیعت کو اس کے قائم مقام کر دیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ بیعت میں ایک نفسیاتی مصلحت پوشیدہ ہے، جب انسان اپنے ماضی کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو بہت سی باتیں اس کو اخلاق و مذہب کے خلاف نظر آتی ہیں، اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے، وہ دل ہی دل میں اپنی معصیتوں سے توبہ کرتا ہے لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا اس سے قلب میں ایک بے چینی سی پیدا ہوجاتی ہے، ماضی کا تصور اس کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے، اس کی توبہ اس تصور پر غالب نہیں آتی۔ اب وہ ایک ایک باطن نیک نفس انسان کے ہاتھ پر ترکِ معاصی اور تقویٰ کا عہد کرتا ہے، شیخ یقین دلاتا ہے کہ "تائب با متقی برابر است"[2] اس کے دل کے زخموں پر ایک پھایا سا

---

[1] القول الجمیل شاہ ولی اللہ دہلوی دمعہ حواشی شاہ عبدالعزیز رح و اردو ترجمہ مولوی خرم علی (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ) ص ۱۳۔ [2] فوائد الفواد، ص ۳-۲۔ حدیث نبوی ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (ابن ماجہ باب ذکر التوبہ)

لگ جاتا ہے۔ تکلیف وہ ماضی سے اس کا رشتہ منقطع ہوجاتا ہے اور وہ اپنے مستقبل کو نئی امیدوں محکم یقین اور بیدار احساس کے ساتھ سنوارنے کی کوشش کرنے لگتا ہے

مشائخ چشت جس مقصد کے لئے بیعت لیتے تھے اس کا اندازہ شیخ نظام الدین اولیاء کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں

چوں کسے بخدمت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز بیامدے بہ نیت ارادت اول فرمودے فاتحہ و اخلاص بخوانید بعدہٗ آمن الرسول بخواندے بعدہٗ شھد اللہ تا ان الدین عند اللہ الاسلام خواندے، بعدہ فرمودے کہ بیعت کردی بریں ضعیف و خواجہ ایں ضعیف و خواجہ خواجگان ما و بر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و با حضرت عزت عہد کردی کہ دست و پائے و چشم نگاہ داری و بر نہج شرع باشی۔[1]	جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں ارادت کی نیت سے آتا تو اول آپ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم فرماتے بعدہٗ آمن الرسول پڑھتے اس کے بعد شھد اللہ انہ ان الدین عند اللہ الاسلام تک پڑھتے، پھر فرماتے کہ (کہو) تو نے اس ضعیف اور اس کے خواجہ خواجگان اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی اور خدائے تعالیٰ سے اس بات پر عہد کیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ پر نگاہ رکھے گا اور شرع کے طریقے پر چلے گا۔

انسان کو اخلاقی عیوب سے بچانا اور اس کو راہ شریعت دکھانا مشائخ چشت کی کوششوں کا مرکز و محور تھا۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۴۳۔ "و چشم نگاہداری" میں جو مصلحت پوشیدہ ہے اس پر حافظ ابن القیم کی یہ تشریح بہت اہم ہے، فرماتے ہیں "نگاہ شہوت کی قاصد اور پیامبر ہوتی ہے اور نگاہ کی حفاظت دراصل شرمگاہ و دیگر شہوت کی جگہ کی حفاظت ہے، جس نے نظر کو آزاد کردیا اس نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اور نظر ہی ان تمام آفتوں کی بنیاد ہے جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے کیونکہ نظر کھٹک پیدا کرتی ہے، پھر کھٹک فکر کو وجود بخشتی ہے اور فکر شہوت کو ابھارتی ہے، شہوت ارادہ کو جنم دیتی ہے ارادہ قوی ہوکر عزیمت میں تبدیل ہوجاتا ہے اور عزیمت میں مزید پختگی ہوکر فعل واقع ہوتا ہے (الجواب الکافی ص ۲۰۴)

ماخوذ از تاریخ مشائخ چشت

ہندوستان کے قدیم اولیاء و مشائخ

(قاضی اطہر مبارکپوری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت اور آپ کی تعلیم و تربیت کے فیض یافتہ نفوس قدسیہ صحابہ کہلائے، صحابہ کی مجلس تعلیم و تربیت سے اٹھنے والے حضرات تابعین کے لقب سے یاد کئے گئے، اور تابعین کے اصحاب و تلامیذ کو تبع تابعین کہا گیا، ان تینوں طبقوں میں جو حضرات خشیت خداوندی، زہد فی الدنیا، تعلق باللہ، تقویٰ، طہارت اور عبادت و ریاضت میں نمایاں اور مشہور رہے ان کو عبّاد و زہّاد کے نام سے یاد کیا گیا، حتیٰ کہ دوسری صدی کے آخر میں ان کے لئے صوفی اور صوفیہ کے الفاظ سنائی دیئے، مگر تیسری اور چوتھی صدی تک عبّاد و زہّاد کا عام رواج رہا۔

اس مقالہ میں ہم ہندوستان کے ایسے ہی بزرگوں کا مختصر تعارف کرائیں گے جو تصوف کے مختلف مکاتیب فکر سے پہلے گذرے ہیں، ان میں اکثریت ان حضرات کی ہوگی جو پانچویں صدی سے پہلے تھے اور ان کا تعلق ہندوستان میں چارسو سالہ عرب دور حکومت و امارت سے ہے ان میں تین طبقے ہیں، پہلا طبقہ ان واردین عبّاد و زہّاد کا ہے جو فتوحات جہاد، امارات اور مختلف وجوہ کے سلسلہ میں یہاں آئے ان میں اکثریت عرب اور اس سے ملحق علاقوں کے بزرگوں کی ہے، دوسرا طبقہ ان صادرین بزرگوں کا ہے جو یہاں سے باہر گئے ان میں بھی اکثریت عرب ممالک میں جانے والوں کی ہے، یہ دونوں طبقے کتاب و سنت فقہ و فتاویٰ اور دینی علوم سے وافر حصہ رکھتے تھے، اور فقہاء و محدثین میں شمار ہوتے تھے مگر چونکہ ان پر زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کا رنگ غالب تھا اس لئے ان کو اولیاء مشائخ اور عباد و زہاد کے طبقہ میں شمار کیا گیا اور طبقات و تراجم کی کتابوں میں ان کا تذکرہ اس طرح کیا گیا کہ ان کے احوال و ملفوظات اور کشوف و کرامات کے مقابلہ میں ان

کی علمی حیثیت دب گئی۔ تیسرا طبقہ ان مشائخ و صوفیہ کا ہے جو ہندوستان میں مقیم رہ کر اپنے فیوض و برکات عام کرتا رہا، اس میں اکثریت بلاد ماوراء النہر اور عجم کے بزرگوں کی ہے جو پانچویں صدی کے حدود میں سلطان محمود غزنوی اور سلطان شہاب الدین غوری کی فتوحات کے بعد یہاں آئے اور یہیں رہ بس گئے، مذکورہ بالا دونوں طبقوں کے حالات چند کے علاوہ یہاں کی کتابوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں اس لئے ہم نے ان کا مختصر تعارف کرایا ہے، اور تیسرے طبقہ کے حالات یہاں تفصیل سے لکھے گئے — اور ان پر خصوصی توجہ دی گئی اس لئے ہم نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے خلافت راشدہ اور خلافت امویہ کا پورا دور اسلامی فتوحات کا زریں دور ہے اسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی شاندار فتوحات ہوئیں، اس دور کے غازیوں اور مجاہدوں میں صحابہ تابعین اور تبع تابعین کی اکثریت تھی جن میں بڑے بڑے عباد و زہاد و اہل اللہ اور اصفیاء و اتقیاء کی اچھی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ ان کے وجود کی برکت سے مسلمانوں کو فتح و کامرانی سے نوازتا تھا۔ امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے۔

وکان فی عساکرھم وجیوشھم فی الغزو الصالحون والأولیاء والعلماء من کبار التابعین فی کل جیش منھم شرذمۃ عظیمۃ ینصر اللہ بھم دینہ (البدایہ والنہایہ ص۸۷ ج۹)

ان کے لشکر میں کبار تابعین کے صلحاء اولیاء اور علماء کی ایک بڑی جماعت ہر فوجی دستہ میں رہا کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اپنے دین کی نصرت فرماتا تھا۔

خلافت راشدہ میں ہندوستان کی فتوحات کے شرکاء وامراء میں صحابہ کی ایک جماعت تھی چند حضرات کے نام یہ ہیں۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی۔ حضرت حکم بن ابی العاص ثقفی، حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفی، حضرت حکم بن عمرو ثعلبی غفاری، حضرت خریت بن راشد سامی، حضرت ربیع بن زیاد حارثی، حضرت سہل بن عدی خزرجی انصاری، حضرت صحار بن عباس عبدی، حضرت عاصم بن عمرو تمیمی، حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ قرشی، حضرت عبیداللہ بن معمر تیمی قرشی، حضرت عمیر بن عثمان بن سعد، حضرت مجاشع بن مسعود سلمی، حضرت منذر بن جارود عبدی رضی اللہ عنہم

یہ اکابر صحابہ اور اصاغر صحابہ اور دیگر تمام صحابہ امت محمدیہ میں سب سے بزرگ و برتر اور اعلیٰ

وافضل ہیں، ان حضرات کے بارے میں ان ہی میں سے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ افضل امت ہیں ان کے دل سب سے زیادہ پاک ونیک ہیں وہ دینی علم میں سب سے زیادہ تہ کو پہونچے ہوئے ہیں، اخلاق میں سب سے اچھے تکلف میں سب سے کم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لئے منتخب کیا ہے تم لوگ ان کی فضیلت کا اعتراف کرو اور ان کی اتباع کرو جہاں تک ہوسکے ان کے اخلاق پر چلو، کیونکہ وہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں، یہی حضرات ہندوستان کے اولیاء اصفیاء کے سرخیل ہیں اور ان کے قدوم کی برکت سے یہاں دین وایمان کی دنیا آباد ہوئی ہے

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود ان ہی کی لگائی ہوئی ہے

بنو امیہ کا پورا دور اس ملک میں تابعین اور تبع تابعین کی آمد کا ہے جن میں مشاہیر صلحاء اولیاء، عباد، زہاد اور مشائخ شامل ہیں مثلاً سنان بن سلمہ بن محبّق ہذلی، ابوالیمان معلی بن راشد ہذلی بصری، ابوالحسن معلی بن زیاد قردوسی بصری، کرز بن ابوکرز وبرہ حارثی کوفی، کہمس بن حسن بصری صاحب الحسن ابوموسی اسرائیل بن موسی بصری صاحب الحسن، ربیع بن صبیح سعدی صاحب الحسن رحمہم اللہ۔ ان بزرگوں میں امیر شہر، مجاہد، رضاکار اور داعی ومبلغ سب ہی شامل ہیں، جو اپنی مفوّضہ خدمات دینی نقطۂ نظر سے نہایت اخلاص وایثار اور امانت ودیانت کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

عباسی دور خلافت میں ان کے فیض یافتہ حضرات ان کے جانشین بن کر یہاں آئے اور یہ سلسلہ عرب حکومتوں کے دور تک جاری رہا حتیٰ کہ ۴۱۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد مستحکم سلطنت کا قیام ہوا اور ملک عرب کے مقابلہ میں بلاد ماوراء النہر اور عجم کے اہل علم اور ارباب فضل وکمال جوق درجوق یہاں آنے لگے، جو دوسرے دینی علوم کے مقابلہ میں فقہ تصوف اور معقولات سے زیادہ شغف رکھتے تھے، ان حضرات میں حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری لاہوری رح اپنے دینی وعلمی اور روحانی فیض رسانی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔
ہندوستان سے باہر جانے والے قدیم اولیاء ومشائخ میں حضرت شیخ عبدالرحیم بن حماد

ثقفی دیبلی ہمارے علم میں پہلے بزرگ ہیں جن کی مشیخت کا شہرہ ہندوستان سے عرب تک پہونچا وہ حضرت حارث بن اسد محاسبی، حضرت حاتم اصم اور حضرت شقیق بلخی کے ہم پلہ بزرگ تھے، ان بزرگوں کے احسانی و روحانی تعلقات بیرونی مشائخ سے نہایت گہرے تھے ان میں حضرت بایزید بسطامی کے استاذ و شیخ ابو علی سندی، ان کے بھانجے ابو موسیٰ دیبلی، حضرت جنید بغدادی کے مرید ابوالحسن منصوری، حضرت بشر حافی کے مرید اسمٰعیل سندی، حضرت ابوالعباس بن سریج کے مرید شیخ عثمان سندی اور ابوبکر احمد مستجاب الدعاء اور ابدال جیسے اکابر اولیاء و مشائخ کے نام پائے جاتے ہیں، یہ تمام اولیاء و مشائخ فقہاء و محدثین میں سے ہیں مگر چونکہ ان پر زہد و تصوف کا رنگ غالب رہا اس لئے ہم نے ان کو صوفیہ و مشائخ کی حیثیت سے یہاں درج کیا ہے ان میں ان علماء و محدثین کا ذکر نہیں ہے جو اس دور میں ہندوستان اور باہر میں تعلیم و تدریس اور تحدیث و روایت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان اولیاء و مشائخ کے ذکر میں حروف تہجی کا خیال رکھا گیا ہے حالانکہ زمانی ترتیب ہوتی تو اچھا تھا

واردین اولیاء و مشائخ

شیخ احمد بن حسین دماوندیؒ

شیخ احمد بن حسین بن علی دُماوندی حنفی رحمۃ اللہ علیہ رَے اور طبرستان کے درمیان مقام دُماوند میں سنہ ۴۹۰ھ کے حدود میں پیدا ہوئے، ایک قول کے مطابق قاضی ابو یوسف کی اولاد سے ہیں، تقی الدین عبدالقادر تمیمی مصری نے ان کے حال میں لکھا ہے۔

کان فقیھًا، عالمًا، فاضلًا، زاھدًا ورعًا، کثیر المحفوظ متواضعًا ...... له بیت مشھور بالعراق وسافر الی بلاد غزنۃ والھند واقام بھا مدۃ وصحب الکبار۔ (انساب سمعانی اور الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ)	وہ فقیہ، عالم، زاہد، پرہیزگار متواضع تھے احادیث و مسائل بہت زیادہ یاد تھے۔ ان کا خاندان عراق میں علم و فضل میں مشہور رہے غزنین اور ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں ایک مدت تک قیام کر کے کبار علماء و مشائخ کی صحبت اٹھائی

انکا انتقال مرو میں ۲۳ر رمضان ۵۵۶ھ میں ہوا اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں زیادہ مدت تک قیام کر کے یہاں کے اولیاء و مشائخ اور علماء کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہوگا

شیخ ابوالعباس احمد بن عثمان تونسیؒ ملتانی

شیخ احمد بن عثمان بن عبدالجبار تونسی ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا حال نیل الابتہاج میں تونسی کے ساتھ ملتانی نسبت سے ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افریقہ کے ملک تونس کے رہنے والے تھے اور ملتان میں زیادہ اقامت کی وجہ سے اس کی طرف منسوب ہوئے اس کی تائید اس تصریح سے بھی ہوتی ہے۔

رحل للمشرق ولقی فضلاء اجلۃ ثم رجع فسکن بجایۃ واقرء بھا واسمع، لہ علم بالعربیۃ والفقہ واصولہ، واصول الدین وحظ من التصوف ونصیب من العبادۃ۔

(نیل الابتہاج بتطریز الدیباج)

انھوں نے مشرقی ممالک کا سفر کر کے جلیل القدر علماء وفضلاء سے ملاقات کی اور واپس آکر افریقہ کے شہر بجایہ میں سکونت اختیار کرلی دہیں تعلیم دی، وہ عربی زبان وادب، فقہ اصول فقہ، اصول دین کے عالم تھے، ساتھ ہی تصوف اور عبادت وریاضت سے وافر حصہ رکھتے تھے

نہایت جلیل القدر فاضل، کامل، مستند اور عابد د زاہد مالکی مسلک کے عالم تھے، افریقہ کے بعض حکمرانوں نے ان کو اپنے دارالسلطنت میں بلا کر استفادہ کرایا۔

شیخ ابواسحاق ابراہیم بن مالک بغدادی

شیخ ابواسحاق ابراہیم بن مالک بن بہبود بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے روح بن عبادہ، ابواسامہ، محمد بن عبید، زید بن حباب وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، ابن ابوحاتم رازی اور امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے ان سے حدیث پڑھی ہے نہایت صالح اور بزرگ عالم تھے ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ سندھ آکر کھجور کے پودے لے جاتے اور بغداد میں لگاتے اور ہر پودے پر قرآن ختم کرتے تھے۔

وکان من الصالحین وکان یغرس النخیل الصغار فاذا غرس نخلۃ لم یبرح حتی یختم القرآن وکان یحمل النخیل من السند

وہ صلحاء میں تھے، کھجور کے چھوٹے چھوٹے پودے بوتے تھے اس کے بعد ایک ختم قرآن کی تلاوت کرتے تھے یہ پودے سندھ سے لاتے تھے

اسّی سال کی عمر میں رجب ۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔ (کتاب الجرح والتعدیل، تاریخ بغداد، المنتظم)

ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی | ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری رحمۃ اللہ علیہ امام حسن بصری کے تلمیذ خاص اور صاحب الحسن کی نسبت سے مشہور ہیں، انھوں نے حسن بصری ابوحازم الشیخ، محمد بن سیرین، وہب بن منبہ وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے سفیان ثوری، سفیان بن عُیینہ، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ نے روایت کی ہے، ان کے حال میں لکھا ہے

وھو بصری کان یسافر فی التجارۃ الی الھند واقام بھا مدۃ۔ — وہ بصری ہیں تجارتی سلسلہ میں ہندوستان کا سفر کرکے وہاں زیادہ دنوں تک قیام کرتے تھے

اس لئے ان کو نزیل الہند اور ہندی کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، دوسری صدی کے طبقہ عبّاد و زہّاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک ہیں، راقم نے ان کا مستقل حال لکھا ہے جو "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" نامی کتاب میں چھپا ہے۔

شیخ الاسلام ابوعثمان صابونی | شیخ الاسلام ابوعثمان اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن صابونی رحمۃ اللہ علیہ خطیب، واعظ، مفسر، محدّث اور اپنے زمانہ میں جامعیت میں بے مثل تھے، ورع و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں بلند پایہ رکھتے تھے، انھوں نے نیشاپور، خراسان، غزنین، بلاد ہند، زمل، طبرستان، شام، بیت المقدس اور حجاز میں حدیث کی تعلیم دی ہے ستّر سال تک مسلسل وعظ بیان کیا ہے، ہندوستان کے بادشاہ کی دعوت پر یہاں آئے اور واپسی کے بعد ہرات میں کئی دن تک روایت حدیث اور وعظ کی مجالس منعقد کیں، محرم ۴۴۹ھ میں انتقال کیا۔ (تاریخ ابن عساکر اور معجم البلدان)

شیخ حسین بن منصور حلّاج | شیخ حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ ہیں، شیخ جنید بغدادی، شیخ ابوالحسن نوری اور دیگر مشائخ سے فیض پایا ہے وہ ہندوستان میں آئے اور یہاں کے معتقدین ان کو مغیث کے لقب سے یاد کرتے تھے اور ان سے خط و کتابت رکھتے تھے، ان کے بارے میں طبقۂ صوفیا و مشائخ میں اختلاف ہے، ذی قعدہ ۳۰۹ھ میں قتل کئے گئے (طبقات کبریٰ شعرانی وغیرہ)

شیخ حسین زنجانی لاہوریؒ

شیخ حسین زنجانی۔ لاہوری رحمۃ اللہ علیہ مشہور مشائخ میں تھے، زہد وتقویٰ کے ساتھ فقہ میں مہارت رکھتے تھے انھوں نے طریقت کی تعلیم وتربیت شیخ ابوالفضل ختلی سے پائی تھی اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر لاہور آگئے اور جس دن شیخ علی ہجویری لاہور تشریف لاتے اس دن ان کا انتقال ہوا (فوائد الفواد، نزہۃ الخواطر)

حبیش بصریؒ

حبیش بصری رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ راہب الامت حضرت عامر بن عبدالقیس عنبریؒ کے بھتیجے ہیں، سندھ کی فتوحات میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھے، ایک مرتبہ محمد بن قاسم نے ان سے کہا کہ راجہ داہر کہیں چھپا ہوا ہے تم اپنے قبیلہ بنی عنبر کے سپاہیوں سے کہو کہ اس کی طرف سے غافل نہ رہیں، اس پر حبیش نے کہا کہ اے امیر! میرا دل کہہ رہا ہے کہ داہر مارا گیا، چنانچہ ایسا ہی تھا (چچ نامہ)

ابوحفص ربیع بن صبیح بصریؒ

ابوحفص ربیع بن صبیح سعدی بصری رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن بصری کے خاص تلمیذ اور صاحب الحسن کی نسبت سے مشہور ہیں، عابد وزاہد اور مجاہد ومحدث وفقیہ ہیں ان کے تلامذۂ حدیث میں سفیان ثوری، وکیع بن جراح، عبدالرحمن بن مہدی، ابو داؤد طیالسی جیسے اساطین علم وفضل پائے جاتے ہیں، بصرہ کے عبّاد وزہّاد میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ۱۶۰ھ بزمانۂ خلیفہ مہدی ہندوستان کے جہاد پر آئے اور گجرات کے مقام باربد (بھاڑ بھوت) کی فتح میں شریک رہے واپسی پر یہیں ۱۶۰ھ میں انتقال کر گئے اور یہیں دفن ہوئے، ایک روایت کے مطابق وہ اسلام میں حدیث کے پہلے مصنف ہیں، راقم نے ان کے مفصل حالات جمع کئے ہیں جو اسلامی ہند کی عظمت رفتہ میں شامل ہیں۔

شیخ ابوعثمان سعید بن محمد ملقابادی

ابوعثمان سعید بن محمد بن احمد بحیری ملقابادی رحمۃ اللہ علیہ کا گھرانہ بیت التزکیہ والعدالۃ تھا، جلیل القدر، کبیر الشان، اور ثقہ محدث ہیں، تصوف میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، مولقاباد میں ان کی مستقل خانقاہ، کتب خانہ اور مسجد تھی جن میں وہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی کے ساتھ بہادری

مردانگی اور ہمت وحوصلہ میں مشہور تھے، عراق اور خراسان میں جاکر حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی، ان کی اولاد میں صوفیہ ومشائخ گذرے ہیں، شیخ ابوعثمان ملقابادی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان کے جہاد میں شریک رہے اور شاندار خدمات انجام دی ہیں، ربیع الآخر ۱۵۴ھ میں انتقال کیا۔

(کتاب السباق بحوالہ عروبۃ العلماء)

شیخ علی بن عثمان ہجویری لاہوری

شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے اولیاء کبار میں ہیں بہت بڑے عالم وفقیہ تھے طریقت ومعرفت کی تعلیم وتلقین شیخ ابوالفضل ختلی سے حاصل کی نیز شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری اور دوسرے مشائخ ومحدثین سے کسب فیض کیا، بہت زیادہ سیر وسیاحت کی آخر میں لاہور آکر یہیں مقیم ہوگئے، اور ۴۶۵ھ میں انتقال کیا، ان کی کتاب کشف المحجوب تصوف کی مشہور کتاب ہے۔ (نزہۃ الخواطر)

شیخ ابوعلی شقیق بلخیؒ

شیخ ابوعلی شقیق بن ابراہیم بلخی رحمۃ اللہ علیہ خراسان کے مشہور اور اجلہ مشائخ میں ہیں، قزوینی نے آثار البلاد میں لکھا ہے کہ ابتداء حال میں وہ بسلسلہ تجارت ہندوستان گئے اور ایک بت خانہ میں جاکر دیکھا کہ ایک آدمی سر اور ڈاڑھی کے بال منڈوائے ہوئے بت کی پوجا کر رہا ہے، شقیق نے اس سے کہا کہ تمھارا معبود تو خالق ورازق ہے تم اس کی عبادت کرو اور بت پرستی چھوڑ دو، یہ بت نفع نقصان نہیں پہونچا سکتا، یہ سن کر اس آدمی نے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو تم اپنے گھر میں کیوں نہیں بیٹھے رہے بلاوجہ تجارت میں تکلیف اٹھاتے ہو، وہ تم کو گھر میں روزی دے دیگا، اس کی یہ بات شقیق کے دل کو لگ گئی اور اسکے بعد زہد وتقویٰ کی زندگی اختیار کرلی، بعض لوگوں نے اس واقعہ کا تعلق بلاد روم یا دوسرے ملک سے بتایا ہے حضرت شقیق ۱۹۴ھ جنگ کولان میں شہید ہوئے۔

(آثار البلاد، قزوینی)

کرز بن ابوکرز وبرہ حارثی کوفیؒ

حضرت کرز بن ابوکرز وبرہ حارثی عبدی کوفی رحمۃ اللہ علیہ قبیلۂ بنی عبدالقیس سے تابعی یا تبع تابعی ہیں، زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت میں اپنے زمانہ میں سب سے آگے تھے مکہ مکرمہ آئے تو وہاں

کے عباد وزہاد کو پیچھے کر دیا، مستجاب الدعا بزرگ تھے، کہتے ہیں کہ بادل ان پر سایہ کرتا تھا، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کے لئے اس شرط پر دعا مانگی تھی کہ وہ اس سے دنیا نہیں حاصل کریں گے ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ روزانہ تین ختم قرآن کی تلاوت کرتے تھے

حضرت کرز بن مالک زویرہ حارثی ۴۵ھ میں عبداللہ بن سوار عبدی کے ساتھ سندھ کی فتوحات میں شریک تھے، اس کے بعد عبداللہ بن سوار عبدی ان کو یہاں اپنا قائم مقام اور امیر بنا کر حضرت معاویہ کے پاس چلے گئے، ۹۸ھ میں یزید بن مہلب کی امارت میں جرجان کی فتح میں شریک رہے اور وہیں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے

انھوں نے نعیم بن ابو ہند وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے سفیان ثوری، ابن شبرمہ، فضیل بن غزوان اور ورقاء بن عمر وغیرہ نے روایت کی، ابن حبان نے ان کو ثقات میں بتایا ہے ان کا مفصل حال تاریخ جرجان میں ہے۔

(تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب الجرح والتعدیل، الاصابہ، حلیۃ الاولیا، تاریخ جرجان، تاریخ خلیفہ بن خیاط)

ابو عبداللہ کہمس بن حسن قیسی بصری

ابو عبداللہ کہمس بن حسن قیسی بصری رحمۃ اللہ علیہ بصرہ کے عباد و زہاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ اور مشائخ کبار میں سے ہیں، تبع تابعی ہیں اور اجلہ تابعین سے حدیث کی روایت کی ہے، رات دن میں ایک ہزار رکعات نماز پڑھتے تھے، روزانہ گچ کاری سے دو دانق مزدوری پاتے تھے اور اسی سے اپنی والدہ کے لئے میوہ خرید لاتے تھے، ایک درم کا آٹا خرید کر کھاتے رہے، جب زیادہ دن ہو گئے تو اس کو وزن کیا اس میں کمی نہیں ہوئی تھی اس کے بعد آٹا کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا، بصرہ میں رہ کر اپنی والدہ کی خدمت کرتے رہے ان کے انتقال کے بعد مکہ مکرمہ چلے گئے اور زندگی عبادت و ریاضت میں گذار دی،

حضرت کہمس بن حسن ہندوستان کے جہاد میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھے، خلیفہ بن خیاط اور امام ذہبی نے ان سے ۹۳ھ میں راجہ داہر سے جنگ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھا، راجہ داہر بہت بڑی فوج لے کر ہمارے مقابلے کے لئے آیا، اس کے ساتھ ستائیس جنگی ہاتھی تھے، ہم نے دریائے سندھ پار کر کے اس کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شکست

دی، راجہ داہر اپنی فوج لے کر بھاگ گیا۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے بچی کھچی فوج لے کر رات میں ہم پر حملہ کیا اس میں اس کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر برہمن آباد میں پناہ گزیں ہوا، مسلمانوں نے یہاں بھی اس سے جنگ کرکے شکست دی، اس کے بعد محمد بن قاسم نے کیرج کو فتح کیا۔

(تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ الاسلام ذہبی، صفۃ الصفوہ وغیرہ)

شیخ ابوسعد محمد بن حسین حرمی ہروی

شیخ ابوسعد محمد بن حسین بن محمد حرمی ہروی حرم مکی کی طرف منسوب ہیں، حافظ حدیث کے ساتھ اولیائے کاملین میں سے ہیں، ہندوستان آئے تھے، سمعانی نے لکھا ہے

و کانت لہ رحلۃ الی بلاد الھند انھوں نے ہندوستان کے شہروں کا بھی سفر ایضاً۔ کیا ہے۔

حافظ محمد بن حسن بن محمد ہمدانی کا بیان ہے کہ ابوسعد حرمی اوتار و ابدال میں سے تھے، میری آنکھوں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، ہرات کے مشائخ کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوسعد حرمی بیس سال سے یہاں مقیم ہیں مگر ہم لوگ ان کے بارے میں حیرت زدہ ہیں اور ان کی بود و باش کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے، وہ لوگوں سے کنارہ کش رہتے ہیں ایک اور بزرگ ابوحامد خیّام واعظ کا قول ہے کہ اگر ہرات میں اللہ کا کوئی ولی ہے تو ابوسعد حرمی ہیں، ان کا وصال شعبان ۴۹۱ھ میں ہوا۔

(انساب سمعانی اور العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین)

ابوالیمان معلّی بن راشد نبّال ہذلی

ابوالیمان معلّی بن راشد ہذلی بصری رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی ہیں، نبل یعنی نیزہ بناتے اور اس سے روزی کماتے تھے، حضرت سنان بن سلمہ بن محبق ہذلی کے غلام ہیں، ائمہ حدیث نے روایت کی ہے، ۵۰ھ میں حضرت معاویہ کے زمانہ میں سندھ کے شہر قیقان میں اپنے آقا سنان بن سلمہ کی امارت میں جہاد کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ میدان جنگ میں سنان بن سلمہ نے مجاہدین سے کہا کہ تم لوگوں کو بشارت ہے جنت اور غنیمت میں ایک چیز تم کو ملنے والی ہے اس کے بعد انھوں نے سات عدد پتھر لئے اور مجاہدین کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ جب میں حملہ کروں تو تم لوگ بھی حملہ

کرنا اور دوپہر کو تکبیر کہتے ہوئے ایک پتھر پھینکا، اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پتھر پھینکتے رہے اور جب سورج ڈھل گیا تو ساتواں پتھر پھینکا اور حٰمٓ لا ینصرون پڑھ کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن پر حملہ کر دیا، ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہی حملہ آور ہوگئے اور دشمن کو شکست دی، وہ ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ ہم تعاقب کرتے ہوئے ان کے پاس پہونچ گئے، انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ تم لوگوں نے ہم سے جنگ نہیں کی ہے، وہ اور لوگ تھے جن کو ہم تمہارے گروہ میں نہیں دیکھ رہے ہیں وہ لوگ ابلق گھوڑوں پر سفید عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

ابوبسطام مقاتل بن حیّان بلخیؒ

ابو بسطام مقاتل بن حیان نبطی بلخی رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی، حافظ حدیث اور عالم خراسان ہیں انھوں نے شعبیؒ، سعید بن مسیب، عکرمہ مولی ابن عباس، سالم بن عبداللہ بن عمر، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز وغیرہ سے حدیث کی روایت کی اور ان سے عبداللہ بن مبارک اور ابراہیم بن ادہم وغیرہ نے روایت کی۔

امام صالح صادق، عبادت گذار، نیک اور جلیل القدر مشائخ میں ہیں، ابومسلم خراسانی کے فتنہ میں کابل چلے آئے اور ان کی دعوت پر بہت سے انسان اسلام لائے، ایک روایت کے مطابق کابل میں ۱۵۰ھ سے پہلے انتقال کیا مگر شمس الدین داؤدی مصری نے طبقات المفسرین میں لکھا ہے کہ مات قبیل الخمسین ومائۃ بارض الہند یعنی ۱۵۰ھ سے کچھ پہلے سرزمین ہند میں انتقال کیا (تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، طبقات المفسرین)

ابوالحسن معلّی بن زیاد قردوسی بصری

ابو الحسن معلّی بن زیاد بن حامز قردوسی بصری رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی ہیں انھوں نے حسن بصری، حنظلہ دوسی، معاویہ بن قرہ، علاء بن بشر وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، اور ان سے حماد بن زید، ہشام بن حسّان، جعفر بن سلیمان اور یوسف بن عطیہ صفّار وغیرہ نے روایت کی ہے، ثقہ، محدث تھے اسی کے ساتھ زہد و تقویٰ اور عبادت میں بصرہ کے عبّاد وزہّاد میں سے بھی تھے، ابن ابی حاتم نے لکھا ہے۔ کان یُعَدّ من عبّاد اھل البصرۃ وزھّادھم اور ابن حجر نے لکھا ہے ھو معدود من زھّاد اہل البصرۃ، یعنی ان کا شمار بصرہ کے عابدوں اور

زاہدوں میں تھا وہ ہندوستان میں کئی مرتبہ امیر رہے ہیں اور مفوضہ خدمات بحسن وخوبی انجام دی ہیں
(کتاب الجرح والتعدیل، تہذیب التہذیب، انساب سمعانی وغیرہ)

صادرین اولیاء ومشائخ

شیخ ابوالعباس احمد بن محمد دیبلی مصری رح

شیخ ابوالعباس احمد بن محمد دیبلی مصری رحمۃ اللہ علیہ سندھ کے شہر دیبل کے رہنے والے تھے مصر جاکر وہیں مستقل قیام کیا اور وہیں فوت ہوئے. امام سبکی رح نے ان کو الحافظ الزاہد لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ

وکان رجلا صالحا من ارباب الاحوال والمکاشفات له کرامات ظاهرة واحوال سنية.

وہ بزرگ آدمی اہل کرامات ومکاشفات میں ہیں ان کی کھلی کھلی کرامتیں ہیں اور ان کے حالات زہد وتقویٰ کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

اور شیخ عبداللہ بن حجازی شرقاوی نے ان کے بارے میں لکھا ہے

كان جيد المعرفة بالمذهب كثير النظر في الام زاهدا كثير التلاوة والصيام سليم القلب صاحب كرامات۔

شافعی مذہب کے زبردست عالم تھے، کتاب الام بہت زیادہ دیکھتے تھے، زاہد تھے قرآن کی تلاوت بہت زیادہ کرتے تھے روزہ بہت زیادہ رکھتے تھے، سلیم القلب صاحب کرامات بزرگ تھے

ان کا ذریعہ معاش خیاطت یعنی سلائی تھا، جمعہ کے دن ایک کرتہ ایک درم، دو یا تین دانق میں سلتے تھے اور اسی سے گرانی ہو یا ارزانی اپنے کھانے پہننے کا انتظام کرتے تھے شافعی المسلک اور شافعی فقہ کے زبردست فقیہ تھے۔ ان کا وصال قابلِ رشک انداز میں ہوا، ابوالعباس نسوی اور ابوسعید مالینی بیان کرتے ہیں کہ ہم دونوں ان کے انتقال کے وقت موجود تھے انھوں نے بیماری کی وجہ سے مغرب اور عشار کی نماز مغرب کے وقت ادا کی اور سحر

کے وقت کہا کہ مجھے قبلہ رُخ کرد، اس کے بعد تلاوت قرآن شروع کی اور اسی حال میں انتقال کر گئے، یہ رمضان ۳۰۲ھ کا واقعہ ہے، ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مصر میں کوئی قابل ذکر انسان ایسا نہ رہا جو ان کے جنازہ میں شریک نہ ہوا ہو۔

(طبقات الشافعیہ الکبریٰ سبکی اور التحفۃ البہیہ فی طبقات الشافعیہ قلمی)

شیخ ابوبکر احمد بن سندی بغدادی

امام ابوبکر احمد بن سندی بن بحر حداد سندی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اولیائے کبار اور علمائے عظام میں تھے، خطیب بغدادی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

وکان ثقۃ، صادقا، خیرا، فاضلا	ثقہ، صادق، نیک اور فاضل بزرگ تھے، بغداد
یسکن قطیعۃ بنی حداد	کے محلہ قطیعہ حداد میں قیام کرتے تھے۔

حافظ ابونعیم نے ان کو مستجاب الدعا ابدال میں بتایا ہے۔

وکان یعد من الابدال وکان	ان کا شمار ابدال میں تھا مستجاب الدعا
یقال انہ مجاب الدعوۃ۔	بزرگ تھے

انھوں نے حدیث کا سماع محمد بن عباس مودب، حسن بن علویہ قطان، اور حافظ موسیٰ بن ہارون سے کیا تھا، اور ان سے ابن رزقویہ نے ابو حذیفہ بخاری کی تصنیف کتاب المبتدأ کی روایت کی نیز ابو علی بن شاذان، ابونعیم اصفہانی وغیرہ نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے ——

—————— ، ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں ان کا حال تفصیل سے بیان ہے اور حدیث تفسیر اور زہد ورقائق سے متعلق بہت سی روایات ان سے نقل کی ہیں جو حضرت علی حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مقداد بن اسود، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، ابورجاء عطاردی، مالک بن دینار، ابو عمران جونی، سعید بن جبیر شعبی، وہب بن منبہ میمون بن مہران وغیرہ رحمہم اللہ کے بیان میں موجود ہیں، امام ابوبکر احمد بن سندی کا وصال ۳۵۹ھ میں بغداد میں ہوا۔ (تاریخ بغداد، انساب سمعانی، شذرات الذہب، حلیۃ الاولیاء)

شیخ ابوالعباس احمد بن عبداللہ دیبلی نیشاپوریؒ

شیخ ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن سعید دیبلی نیشاپوری

رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سمعانی کا بیان ہے۔

من الغرباء المتقدمین فی طلب العلم ومن الفقراء الزھاد یسکن نیسابور ایام ابی بکر محمد بن اسحاق بن خزیمۃ۔

وہ طلب علم میں پیش پیش رہنے والے غریب الدیار طالب علموں اور فقرائے زہاد میں سے تھے، امام ابوبکر بن خزیمہ کے زمانہ میں نیسابور میں سکونت اختیار کر لی تھی

خود حسن بن یعقوب حدادی کی خانقاہ میں مقیم تھے اور اندرون شہر ان کے بال بچے رہتے تھے، خانقاہ میں ایک کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا، جامع مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے اور وہاں سے اندرون شہر بال بچوں میں آتے تھے، صوف کے کپڑے پہنتے تھے اور اکثر پیدل چلتے تھے۔

حدیث کے بہت بڑے عالم تھے بصرہ میں قاضی ابو خلیفہ سے، بغداد میں جعفر بن محمد فریابی سے، مکہ میں مفضل بن محمد جندی اور اپنے ہم وطن محمد بن ابراہیم دیبلی سے مصر میں علی بن عبد الرحمن اور محمد بن زبان سے، دمشق میں ابو الحسن احمد بن عمیر بن جوصا سے، بیروت میں ابو عبد الرحمن مکحول، ابو عروبہ بحران، اور حسین بن ابو معشر سے، تستر میں احمد بن زہیر تستری سے عسکر میں حافظ مکرم بن عبدان بن احمد سے اور نیشاپور میں ابوبکر محمد بن خزیمہ اور ان کے معاصرین سے حدیث کی روایت کی اور ان سے حاکم ابو عبداللہ نیشاپوری وغیرہ نے حدیث کی روایت کی تھی، ان کا انتقال نیشاپور میں رجب ۳۴۳ھ میں ہوا اور مقبرۂ حیرہ میں دفن کئے گئے

(انساب سمعانی)

شیخ ابو العباس احمد بن نصر دیبلی موصلیؒ

قاضی ابو العباس احمد بن نصر بن حسین دیبلی، انباری، موصلی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں انبار کے بیان میں کیا ہے اور ان کے متعلق لکھا ہے وکان من الصالحین ورعا، دینا، خیرا لہ اخبار حسان فی ورعہ ودینہ وامتناعہ من امضاء الحکم فیما لا یجوز ورد امر من لا یمکن ردہ ایستجرأ علیہ وکان لا یاخذہ فی الحق لومۃ لائم۔

بغداد میں قاضی القضاۃ نے ان کو اپنا نائب بنایا تھا، قاضی القضاۃ کے معزول ہوجانے

کے بعد خود علیحدہ ہو گئے اور موصل میں اقامت اختیار کر لی یہاں تک کہ یہیں ۵۹۸ھ میں انتقال کیا (معجم البلدان)

شیخ ابوابراہیم اسمٰعیل بن سندی بغدادیؒ

شیخ ابوابراہیم اسمٰعیل بن سندی بغدادی خلال رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ اور شیخ بشر بن حارث حافی بغدادیؒ کے صحبت وتربیت یافتہ اور ان کے اقوال واحوال کے ناقل ہیں، انھوں نے مسلم بن ابراہیم وراق سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے محمد بن مخلد نے روایت کی ہے۔

بغداد کے محلہ باب الشام میں رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے بشر حافی سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ تم اللہ سے ڈرو۔ اگر حدیث سے دنیا کا ارادہ کرتے ہو تو اپسامت کرو اور اگر آخرت کا ارادہ کرتے ہو تو تم نے اس کو حاصل کر لیا ہے، امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ (تاریخ بغداد)

شیخ ابومحمد بختیار بن عبداللہ ہندی مروزیؒ

شیخ ابومحمد بختیار بن عبداللہ ہندی مروزی رحمۃ اللہ علیہ اللہ کے نیک بندوں میں نہایت بزرگ عالم تھے، امام سمعانی کے والد کے آزاد کردہ غلام ہیں، فصد کھولنے میں ماہر تھے اسی لئے فصاد مشہور ہیں، انھوں نے اپنے آقا کے ساتھ عراق وحجاز کا تعلیمی سفر کیا اور آقا نے ان کو احادیث کثیرہ کا سماع کرایا، بغداد میں ابومحمد جعفر بن احمد بن حسن السراج، ابوالفضل محمد بن عبدالسلام بن احمد انصاری اور ابوالحسین مبارک بن عبدالجبار طیوری سے ہمدان میں ابومحمد عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن دونی سے، اصفہان میں ابوالفتح محمد بن حداد وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، سمعانی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے چند احادیث کا سماع کیا ہے، ان کا انتقال مرو میں صفر ۵۴۱ھ میں ہوا۔ (انساب سمعانی)

شیخ ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی بوشنجیؒ

شیخ ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ امام سمعانی نے اس طرح شروع کیا ہے۔ الصوفی، الزاھد، الھندی عتیق محمد بن اسمٰعیل الیعقوبی القاضی من اھل بوشنج، شیخ صالح سدید السیرۃ

صوفی، زاہد، ہندی قاضی محمد بن اسمٰعیل یعقوبی کے آزاد کردہ غلام تھے، بوشنج کے رہنے والے شیخ صالح نیک سیرت بزرگ تھے۔

انھوں نے اپنے آقا کے ساتھ عراق، حجاز اور اہواز کا تعلیمی سفر کیا، اور بغداد میں شریف ابونصر محمد، ابوالفوارس طراد بن محمد بن علی زینبی اور ابومحمد رزق اللہ بن عبدالوہاب تمیمی سے، بصرہ میں ابوعلی احمد بن علی تستری، ابوالقاسم، عبدالملک بن خلف بن شعبہ، ابویعلی احمد بن محمد بن حسن عبدی کے علاوہ اصفہان، خوزستان اور بلاد جبل کی جماعت کثیرہ سے حدیث کی روایت کی سمعانی نے ان سے بوشنج اور ہرات میں حدیث پڑھی، ۵۴۲ھ یا ۵۴۳ھ میں انتقال کیا۔

(انساب سمعانی)

شیخ ابومحمد جعفر بن خطاب قصداری بلخیؒ

شیخ ابومحمد جعفر بن خطاب قصداری رحمۃ اللہ علیہ بلوچستان کے شہر قصدار کے رہنے والے تھے، بلخ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، سمعانی نے ان کو فقیہ، زاہد لکھا ہے۔ کان فقیھا زاھدا سکن بلخ وھو من قصدار۔ وہ فقیہ زاہد تھے بلخ میں سکونت اختیار کی قصدار کے رہنے والے تھے۔

انھوں نے حدیث کی تعلیم ابوالفضل عبدالصمد بن نصیر عاصمی سے کی ہے اور ان سے حافظ ابوالفتوح عبدالغافر بن علی کاشغری نے روایت کی ہے، یہ بزرگ پانچویں صدی سے پہلے گذرے ہیں۔ (انساب سمعانی)

شیخ ابوداؤد سیبویہ بن اسمٰعیل قزداری مکیؒ

شیخ ابوداؤد سیبویہ بن اسمٰعیل قزداری رحمۃ اللہ علیہ بلوچستان کے شہر قصدار کے رہنے والے تھے جس کو خضدار اور قزدار بھی لکھتے ہیں، اپنے زمانہ کے مشہور شیخ بزرگ تھے، یہاں سے مکہ مکرمہ گئے اور وہیں مجاورت کرکے عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کی اور وہیں حدیث کی تعلیم بھی دی انھوں نے ابوالقاسم علی بن محمد بن عبداللہ حسینی ابوالفتح، رجاء بن عبدالواحد اصفہانی حافظ ابوالحسین، یحییٰ بن ابوالحسن قزوینی سے حدیث کی روایت کی، ۵۶۰ھ یا اس کے بعد انتقال کیا۔ (انساب سمعانی)

شیخ عبداللہ بن حسن بن سندی اندلسیؒ

شیخ عبداللہ بن حسن بن سندی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے مشہور مشائخ و محدثین میں تھے، انھوں نے زہد کے موضوع پر بہت ضخیم کتاب تصنیف کی تھی، حافظ ابن حجرؒ نے اس کی بیسویں جلد دیکھی تھی، علماء و مشائخ کی ایک جماعت نے اس کتاب میں روایت کی تھی، سندھ سے منتقل ہوکر اندلس میں سکونت اختیار کرلی تھی، ۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔

(تاریخ ابن عساکر اور بغیۃ الملتمس ضبی)

شیخ عبدالرحیم بن حماد دیبلی مصریؒ

شیخ عبدالرحیم بن حماد ثقفی دیبلی بصری رحمۃ اللہ علیہ طبقۂ تبع تابعین کے اولیائے عظام اور مشائخ کرام میں ہیں، محمد بن قاسم کے ساتھ قبیلۂ بنو ثقیف سے جو لوگ سندھ آئے تھے ان میں بڑے بڑے علمائے کرام و مشائخ عظام پیدا ہوئے ان ہی میں شیخ عبدالرحیم بھی ہیں، ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں امام عقیلی کے دادا کا بیان نقل کیا ہے۔

قدم علینا من السند شیخ کبیر کان یحدث عن الاعمش وعمرو بن عبید۔	ہمارے یہاں سندھ سے ایک بہت بڑے بزرگ آئے جو اعمش اور عمرو بن عبید سے روایت کرتے تھے۔

انھوں نے بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، ان سے علمائے عراق نے حدیث کی روایت کی تھی، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے، معجم ابن جمیع میں سند عالی سے ان کی حدیث مروی ہے، ذہبی نے ان کو شیخ واہی یعنی غیر ثقہ بتایا ہے، شیخ عبدالرحیم زہد و تقویٰ اور احسان و تصوف میں حارث محاسبی، حاتم اصم اور شقیق بلخی جیسے مشائخ عظام کے صف کے بزرگ تھے، ایک واقعہ سے ان کے علوئے مرتبت کا پتہ چلتا ہے، خطیب بغدادی نے سعید بن عمرو بردعی سے روایت کی ہے کہ میری موجودگی میں امام ابوزرعہ رازی سے حارث محاسبی اور ان کی کتابوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ خبردار ان کتابوں کو ہاتھ نہ لگانا، ان میں بدعات اور گمراہی کی باتیں ہیں، تم حدیث پر عمل کرو اس میں ایسی باتیں پاؤگے جو تم کو ان کتابوں سے بے نیاز کردیں گی، جو شخص کتاب اللہ سے سبق حاصل نہیں کرسکتا وہ ان کتابوں

سے کیا حاصل کرے گا؟ مالک بن انس، سفیان ثوری اور اوزاعی وغیرہ نے کتابیں لکھیں جن میں سب کچھ ہے، اس کے بعد امام ابو زرعہ نے کہا۔

فأتونا مرةً بالحارث المحاسبی ومرة بعبد الرحیم الدیبلی ومرة بحاتم الاصم ومرة بشقیقٍ، ثم قال ما اسرع الناس الی البدع۔

تم لوگ ہمارے پاس کبھی حارث بن اسد محاسبی کو کبھی عبدالرحیم دیبلی کو، کبھی حاتم اصم کو، کبھی شقیق بلخی کو لاتے ہو، کس قدر جلد لوگ بدعات کی طرف مائل ہو گئے۔

حضرات محدثین حدیث کی روایت میں شدت احتیاط کی وجہ سے صوفیہ و مشائخ کی روایات پر ان کی بزرگی اور نیک نفسی کی وجہ سے اعتماد نہیں کرتے تھے، اور ان کے احوال و اقوال کو حدیث کے روایتی اور درایتی معیار سے کم سمجھتے تھے، اس لئے لوگوں کو ان کے بارے میں باخبر رکھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب و سنت کو چھوڑ کر لوگ بزرگوں کے احوال و ملفوظات ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لیں، بہر حال اس واقعہ سے شیخ عبدالرحیم دیبلی کی مشیخت و بزرگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ (لسان المیزان اور تاریخ بغداد)

شیخ عثمان سندی بغدادیؒ

شیخ عثمان سندی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی صدی میں بغداد کے مشائخ کبار میں تھے، ابن جوزی نے المنتظم میں شیخ ابو العباس احمد بن عمر بن سریجؒ متوفی ۳۰۶ھ کے حال میں شیخ عثمان کا بیان نقل کیا ہے کہ شیخ ابو العباس بن سریج نے مرض الموت میں مجھ سے کہا کہ رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تیرا رب تبارک و تعالیٰ تجھ کو خطاب کر رہا ہے اس کے بعد میں نے سنا بِمَا اَجَبْتُمُ المُرْسَلِيْن (تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا) اس کے جواب میں میرے دل میں آیا کہ ایمان اور تصدیق سے جواب دیا، اس کے بعد بھی مجھ سے کہا گیا کہ بما اجبتم المرسلین تو میرے دل میں خیال آیا کہ جواب میں مزید کچھ مطلوب ہے اور میں نے کہا بالایمان والتصدیق غیرانا قد اصبنا من ھذہ الذنوب (ایمان اور تصدیق سے جواب دیا البتہ ہم نے گناہ کئے ہیں، تو کہا گیا کہ اما انی قد غفرتُ لکم (ہم نے تمہاری مغفرت کر دی) اس واقعہ سے شیخ عثمان کی مشیخت و بزرگی کا پتہ چلتا ہے (المنتظم)

شیخ عمر ہندی مصریؒ اور شیخ محمد ہندیؒ

شیخ عمر ہندی، شیخ محمد ہندی اور ہندوستان کے دوسرے مشائخ مصر کی خانقاہوں، زاویوں اور رباطوں میں مستقل طور سے رہتے تھے اور مقبرۃ الہند کے نام سے ان کا قبرستان مشہور تھا، ان ہندی مشائخ کے حالات معلوم نہیں، صرف ان میں سے دو حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں

"الکواکب السائرۃ فی ترتیب الزیارۃ" میں شیخ شمس الدین محمد بن ناصر الدین ابن زیات مصری نے لکھا ہے کہ مصر کے بڑے قبرستان میں مشرقی جانب مقبرۃ الہند کی جانب تم کچھ چلو گے تو ایک سنگی قبر ملے گی جس کے سرہانے اور پائینتی پتھر نصب ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ بعض ہندی مشائخ کی قبر ہے، یہ صحیح نہیں ہے، مقبرۃ الہند سیدی عبداللہ رومی کی تربت کے قریب ہے، یہ جگہ "زقاق الہند" کے نام سے مشہور ہے، میں نے یہاں ایک قبر پر شیخ عمر الہندی اور دوسری قبر پر شیخ محمد الہندی لکھا ہوا دیکھا ہے، یہاں ہندی مشائخ کی ایک جماعت دفن ہے جن کا نشان مٹ چکا ہے۔

شیخ ابونصر فتح بن عبداللہ سندیؒ

شیخ ابونصر فتح بن عبداللہ سندی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار امام شافعیؒ کے تلامذہ کے دوسرے طبقہ میں ہے، آل حسن بن حکم کے آزاد کردہ غلام ہیں، آزادی کے بعد فقہ اور علم کلام کی تعلیم میر علی محمد بن عبدالوہاب ثقفی سے حاصل کی، شافعی فقہ اور علم کلام میں مہارت رکھتے تھے اسی کے ساتھ طبقۂ مشائخ میں ان کا شمار تھا اور زہد و تقویٰ میں بلند مقام و مرتبہ رکھتے تھے، عبداللہ بن حسین کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابونصر سندی کے ساتھ چل رہے تھے، ان کے پیچھے چلنے والے بہت زیادہ لوگ تھے راستہ میں ہم کو ایک شریف (آل رسول سے) ملا، جو بدمست کیچڑ میں پڑا تھا، اس نے ہم لوگوں کو دیکھ کر ابونصر کو گالی دی اور کہا کہ اے غلام! ہم تو اس حال میں پڑے ہیں اور تمہارے پیچھے پیچھے یہ لوگ چل رہے ہیں، ابونصر نے اس سے کہا

ایھا الشریف! اتدری لم ھذا — اے شریف! تم سمجھتے ہو یہ بات کیوں ہے؟

لانی متبع آثار جدک وانت — بات یہ ہے کہ میں تمہارے نانا کے نقش قدم

متبع آثار جدی۔ | پر چلتا ہوں اور تم سیر نانا کے نقش قدم پر چلتے ہو۔

ابونصر شیخت کے ساتھ حدیث وفقہ کے عالم تھے۔ انھوں نے محدثین سے حدیث کی روایت کی اور اہل علم نے ان سے روایت کی۔

(الانساب المتفقہ ابن قیسرانی، طبقات الفقہاء الشافعیہ، عبادی انساب سمعانی معجم البلدان یاقوت حموی)

شیخ ابوعبداللہ محمد بن آدم لاہوری غزنویؒ

شیخ ابوعبداللہ محمد بن آدم لاہوری غزنوی قزوینی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

عبدالکریم بن محمد رافعی نے اپنی کتاب "التدوین فی اخبار قزوین" میں تفصیل سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں

محمد بن آدم الغزنوی ابوعبداللہ المقری المعروف باللهاوری، شیخ متقن فی القراءة بارع فی الورع وحسن السمت ومتانة الديانة مداوم على العبادة مواظب التهجد۔

ابوعبداللہ محمد بن آدم غزنوی مقری لہاوری (لاہوری) کی نسبت سے مشہور ہیں وہ شیخ فن قرأت میں ماہر، تقویٰ میں بہت آگے، نیک سیرت اور دیانت میں بلند مرتبہ ہیں، عبادت پر مداومت اور تہجد پر مواظبت کرنے والے ہیں

وہ نماز پڑھ رہے تھے اور طلبہ کی ایک جماعت ان کے یہاں قرآن پڑھ رہی تھی اسی دوران بحالت نماز گر گئے، اور طلبہ طرح طرح کا گمان کرنے لگے، ان کے خادم خاص نے جاکر دیکھا اور بتایا کہ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ شیخ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور کھانا بہت کم کھاتے ہیں اسی لئے غشی چھا گئی ہے، وہ ہر معاملہ میں شدت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ میرے خیال میں وہ اپنے کو محمد ابن آدم کہتے تھے اور اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نسبت مراد لیتے تھے۔ نسب کے بارے میں یہ ان کی شدت احتیاط تھی۔

وہ قزوین آکر پہلے جوہر خاتون کی خانقاہ میں اترے جس کا دروازہ جامع مسجد کی طرف کھلتا ہے، پھر مدرسہ عنبریہ میں منتقل ہوگئے، جہاں ان کے علم وعمل سے استفادہ اور ان کی سیرت سے برکت حاصل کی جاتی رہی، یہاں تک کہ ۵۴۵ھ میں انتقال کیا اور باب المشبک میں دفن کئے گئے۔ ان کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے، ان سے قزوین میں علماء کی ایک جماعت نے تحصیل

علم میں) میرے والد نے بھی ان سے امام ابوبکر بن مہرانی کی کتاب الغایۃ پڑھی تھی (التدوین فی اخبار قزوین)

شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی شامیؒ

شیخ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی شامی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ابن جوزی نے صفۃ الصفوۃ میں سندھ کے شہر دیبل کے برگزیدہ اولیاء میں کیا ہے، اور ان کی طے الارض کی کرامت بیان کی ہے، خود ان کا بیان ہے کہ میرے بعض دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنے اہل وعیال کیلئے مکان خرید لوں، چنانچہ میں نے مکان خرید لیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے طے الارض کی جو نعمت دی تھی ختم ہو گئی، ان ہی ایام میں میرے بعض دوستوں نے کہلا بھیجا کہ آج رات فلاں فلاں مقام پر ہم سے ملاقات کرو، یہ مقامات لمبی مسافت پر تھے، میں نے کہلا بھیجا کہ میری طے الارض کی کرامت جاتی رہی، اس کے بعد ان کی توجہ سے پھر مجھے یہ کرامت حاصل ہو گئی۔

شیخ ابو عبداللہ دیبلی تجوید وقرارت کے مشہور عالم بھی تھے، جعفر بن محمد بن سقیط سے یہ فن حاصل کیا تھا، اور ان سے عبدالرزاق بن حسن اور سکن بن بکرویہ نے قرآت سیکھی۔

(صفۃ الصفوۃ ابن جوزی اور غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ابن جزری)

شیخ ابوالعباس محمد بن محمد دیبلیؒ

شیخ ابوالعباس محمد بن محمد بن عبداللہ دیبلی وراق رحمۃ اللہ علیہ عابد وزاہد اور نہایت نیک عالم تھے، کتابت کرکے روزی کماتے تھے، سمعانی نے لکھا ہے

الوراق، الزاھد وکان صالحاً عالماً وہ وراق (کاتب) زاہد اور نہایت بزرگ عالم تھے

انھوں نے ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی، جعفر بن محمد بن حسن فریابی، عبدان بن احمد بن موسیٰ سکری، محمد بن عثمان بن ابوسوید بصری، اور ان کے معاصرین سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے حاکم ابوعبداللہ وغیرہ نے روایت کی، رمضان ۳۵۴ھ میں انتقال کیا، نماز جنازہ ابوعمرو بن نجید نے پڑھائی۔ (انساب سمعانی)

شیخ مبارک ہندی حلادی مصریؒ

شیخ مبارک ہندی حلادی مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں یوں کیا ہے کہ جو زاویۂ حلادی قاہرہ میں جامع ازہر کے قریب واقع ہے اس کے بانی وہی ہیں

انشأھا الشیخ مبارک الھندی السعودی الحلاوی احد الفقراء من اصحاب الشیخ ابی السعود بن ابی العشائر البارینی الواسطی فی سنۃ ثمان وثمانین وستمائۃ واقام بھا الی ان مات ودفن فیھا ۔

اس زاویہ (خانقاہ) کو شیخ ابوالسعود بن ابوالعشائر بارینی واسطی کے مرید وخلیفہ ایک مردفقیہ شیخ مبارک ہندی سعودی حلاوی نے ۶۸۸ھ میں تعمیر کرکے اسی میں قیام کیا حتی کہ اسی میں انتقال کیا اور اسی میں دفن کئے گئے

ان کے بعد ان کے پوتے شیخ عمر بن علی بن مبارک جانشین ہوئے وہ عالم تھے اور احادیث کی روایت کی تھی، ان کے بعد ہمارے شیخ جمال الدین عبداللہ بن شیخ عمر بن شیخ علی بن شیخ مبارک ہندی جانشین ہوئے، انھوں نے حدیث کا درس دیا، میں نے اسی خانقاہ میں ان سے حدیث پڑھی ہے۔ ان کا انتقال صفر ۸۰۰ھ میں ہوا، ان کی اولاد اسی میں رہتی ہے۔ یہ قاہرہ کی مشہور خانقاہوں میں ہے (کتاب الخطط والآثار)

شیخ ابومحمد ہارون بن محمد بروجی اسکندریؒ

شیخ ابومحمد ہارون بن مہلب بروجی ہندی رحمۃ اللہ علیہ گجرات کے شہر بھروچ کے رہنے والے تھے، حج کے بعد مصر کے شہر اسکندریہ میں مستقل قیام کرلیا تھا نہایت نیک اور عابد و زاہد بزرگ تھے، اسکندریہ کی ایک مسجد میں اذان دیتے تھے، ان کو عربی اور فارسی زبان پر قدرت نہیں تھی، بڑی مشکل سے اپنے مطلب بیان کرتے تھے ساتویں صدی کے بزرگ تھے۔ (معجم البلدان)

شیخ ابوالمحاسن یوسف سندی مصریؒ

شیخ ابوالمحاسن یوسف سندی مصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ابن زیات نے الکواکب السائرۃ میں صرف اتنا لکھا ہے کہ قاہرہ میں باب الشافعی کے قریب ایک مختصر سا قبرستان ہے جس میں شیخ ابوالمحاسن یوسف سندی کی قبر ہے جو صاحب الربّانہ کے لقب سے مشہور ہیں اور اس کے پہلو میں شیخ حمزہ تقدوسی خیّاط کی قبر ہے (الکواکب السائرہ)

شیخ ابوالحسن منصوری بغدادیؒ

شیخ ابوالحسن منصوری بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سندھ کے قدیم شہر منصورہ کے رہنے والے تھے

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے اصحاب کبار میں ہیں، سبکی نے طبقات الشافعیہ میں حضرت جنید بغدادی کے تذکرہ میں ان سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا کہ بندہ کو کس وقت عاقل کہا جا سکتا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ میں نے سری سقطیؒ سے سنا ہے کہ جب بندہ کے جوارح سے کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے برا بتایا ہے تو وہ عاقل ہو جاتا ہے۔ (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)

شیخ ابو عبداللہ سندی طالقانیؒ

شیخ ابو عبداللہ سندی طالقانی رحمۃ اللہ علیہ طالقان رے میں قیام کرتے تھے، کبار مشائخ میں نہایت جلیل القدر بزرگ تھے، سمعانی کہتے ہیں۔ من کبار مشائخہم وجلتہم یعنی وہ صوفیہ کے مشائخ کبار میں تھے۔ اور قزدینی نے لکھا ہے لہ آیات وکرامات یعنی وہ صاحب کشوف و کرامات بزرگ تھے، شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی نے تاریخ الصوفیہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ۳۰۱ھ سے پہلے انتقال کیا۔ (انساب سمعانی اور التدوین فی اخبار قزدین)

شیخ ابو علی سندی بغدادیؒ

شیخ ابو علی سندی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے اولیائے کبار اور اہل حقائق ومواجید میں تھے، حضرت بایزید بسطامی کے شیخ اور استاد ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں شیخ ابو علی کو فرائض کی تعلیم دیتا تھا اور وہ مجھے صرف توحید وحقائق کی تعلیم دیتے تھے، نیز ان کا بیان ہے کہ ایک دن میرے استاد ابو علی سندی میرے پاس آئے، ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور اس کو میرے سامنے الٹ دیا تو اس میں سے قسم قسم کے جواہر زمین پر بکھر گئے، میں نے دریافت کیا کہ یہ جواہر آپ کو کہاں سے ملے ہیں۔ بتایا کہ میں فلاں جگہ سے گذر رہا تھا اور یہ جواہر چراغ کی طرح چمک رہے تھے، ان ہی میں سے میں نے اٹھا لیا ہے، میں نے پوچھا اس وقت آپ کس حال میں تھے؟ بتایا کہ یہ فترت کا وقت تھا، یعنی وجد وکیف ان جواہر کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔

(جامع کرامات الاولیاء، شیخ یوسف نبہانی اور نزہۃ الخواطر)

شیخ ابو محمد دیبلی بغدادیؒ

شیخ ابو محمد دیبلی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت جنید بغدادیؒ کے اصحاب کبار میں ہیں، خطیب بغدادی نے

شیخ ابو محمد جریری کے ذکر میں لکھا ہے کہ ابو محمد دیبلی کا بیان ہے کہ حضرت جنید کی وفات کے وقت میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم کس کی مجلس میں بیٹھیں گے تو کہا کہ ابو محمد جریری کے پاس بیٹھنا، شیخ ابو محمد جریری اولیائے کبار میں تھے، شیخ جنید ان کا بہت احترام کرتے تھے
(تاریخ بغداد)

شیخ ابو موسیٰ دیبلی بغدادیؒ

شیخ ابو موسیٰ دیبلی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تصریح ہے کہ کان ابن اخت ابی یزید البسطامی یعنی شیخ بایزید بسطامی کے بھانجے تھے اپنے وقت کے مشہور عابد و زاہد اور شیخ تھے، ان کا مستقل حال معلوم نہ ہو سکا، البتہ کتابوں میں حضرت بایزید بسطامی کے بہت سے اقوال ان سے مروی ہیں مثلاً صفۃ الصفوہ میں ہے کہ ابو موسیٰ نے کہا ہے کہ میں نے بایزید سے سنا ہے کہ لوگ قیامت کے دن حساب سے بھاگتے ہیں اور میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے حساب لے، لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں چاہتے ہو تو بتایا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس درمیان میں مجھے یاعبدی (اے میرے بندے) کہے اور میں لبیک کہوں اس کا مجھے عبدی (میرے بندے) کہہ دینا میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے، اس کے بعد جو چاہے کرے صفۃ الصفوہ میں اس طرح ان کے کئی اقوال ابو موسیٰ سے منقول ہیں اور ابو عبدالرحمٰن سلمی نے طبقات الصوفیہ میں شیخ ابو موسیٰ دیبلی سے روایت کی ہے کہ میں نے بایزید سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو لذت و حلاوت عطا کرتا ہے اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب کے حقائق سے نوازتا ہے۔
(صفۃ الصلوٰۃ اور طبقات الصوفیہ)

شیخ غلام ہندیؒ

شیخ غلام ہندی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے رہنے والے تھے، اور حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ متوفی ۴۲۵ھ کے اصحاب و مریدین میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ ان کا مستقل حال نہیں مل سکا، اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ غلام نوکر اور ملازم کے معنی میں تھے یا واقعی غلام تھے، ایک واقعہ سے ان کے علوِ مرتبت کا پتہ چلتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ایک مرتبہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ان کی مسجد میں ملاقات کرنا چاہا تو پہلے اپنے آدمی کو ان کے پاس بھیج کر معلوم کیا کہ وہ سلطان محمود کو پہچانتے ہیں یا نہیں؟

جب شیخ ابوالحسن خرقانی نے سلطان کو مسجد کے اندر آتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ

آن را خدا فرا پیش کرد واست بگویدت کہ فرا پیش آید

اے محمود! اللہ نے جس کو مقدم کیا ہے تم سے کہتا ہے کہ تم بھی اس کو مقدم رکھو۔

سلطان محمود شیخ کے سامنے مؤدب بیٹھ گیا اور آپ نے اس کو وعظ ونصیحت فرمائی، اس وقت مسجد کے دروازے پر ایک ہندی غلام کھڑا ہوا شیخ کی طرف دیکھ رہا تھا، شیخ نے کہا کہ غلام سامنے آؤ اور جب وہ سامنے آگئے تو شیخ نے سلطان محمود سے کہا کہ محمود! تم اس غلام کو پہچانتے ہو؟ سلطان نے نفی میں جواب دیا تو شیخ نے کہا کہ تمھارے لشکر میں اس کالے غلام جیسے کتنے سپاہی ہوں گے؟ سلطان نے کہا کہ شاید دس ہزار تک ان کی تعداد پہونچ جائے۔ شیخ نے کہا کہ اس غلام کے علاوہ کوئی ایسا تمھارے لشکر میں نہیں ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہو، یہ جملہ سنتے ہی سلطان نے جلدی سے اٹھ کر اس غلام سے معانقہ کیا اور کہا کہ آپ اس کے اور میرے مابین بھائی بندی کرادیں۔

اس کے بعد سلطان محمود نے شیخ ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں دینار کی تھیلیاں پیش کیں اور شیخ کے انکار پر کہا کہ یہ رقم آپ اپنے اصحاب ومریدین میں تقسیم کردیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم نے اپنے لشکر کو پہلے ہی تنخواہ دیدی ہے جو ان کو پہونچ چکی ہے، تم اس رقم کو اپنے لشکر کے لئے محفوظ رکھو (انساب سمعانی)

بقیہ ص۱۷۶ = سماع صوفیاء کرام کی نظر میں۔

(۳) مضمون فحش اور ناجائز نہ ہو۔

(۴) سماع کے ساتھ آلات موسیقی اور باجے نہ ہوں۔

"اقتباس الانوار" سے لے کر یہاں تک تمام تر عبارات مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب السنۃ الجلیۃ فی الچشتیۃ العلیۃ" کے مختلف مقامات سے نقل کی گئی ہیں۔

یہ ہیں ائمہ مجتہدین کے مذاہب اور بزرگان دین کے اقوال جنھیں بڑی عرق ریزی اور محنت سے جمع کیا گیا ہے تاکہ قارئین کے سامنے متعلقہ مسئلہ کے تمام پہلو واضح ہوجائیں چنانچہ اب اللہ کے فضل وکرم سے مسئلہ کی حقیقت تک پہنچنا آسان ہوگا ہے

[illegible]

پروفیسر نثار احمد فاروقی نئی دہلی

حضرت خواجہ معین الدین سجزی اجمیریؒ

ہندوستان میں تصوّف کے دو خانوادوں نے سب سے پہلے نفوذ کیا، سہروردی سلسلہ مغربی علاقوں میں خاصا مقبول ہو چکا تھا اور اس کے مبلغین شمالی ہندوستان کی طرف بھی بڑھتے آرہے تھے، لیکن چشتیہ سلسلے کا فروغ حضرت خواجہ معین الدین سجزی علیہ الرحمۃ کے قدوم میمنت لزوم کے ساتھ ہوا، اور آپ نے مغربی سرحدوں سے آگے بڑھ کر ہندوستان کے قلب میں اپنے مشن کی تبلیغ کی، اور اجمیر کو ہمیشہ کے لئے روحانیوں کا قبلہ و کعبہ بنادیا۔

سہروردی سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے بھی فیض حاصل کیا تھا، اور ان کی بلند پایہ تصنیف عوارف المعارف تو کہنا چاہئے کہ اہل تصوف کی رہنما کتاب تھی، اور یہ ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جن میں ایک تو قرآن و سنّت کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تصوّف محض عجمی اور غیر اسلامی چیز نہیں ہے بلکہ یہ دین کی روح کا نام ہے۔ دوسرے اس کے تمام نظری مباحث پر پوری وضاحت سے لکھا گیا ہے علمائے ظاہر نے اہل تصوف کے خلاف جو محاذ تیار کیا تھا اسے عوارف المعارف اور کشف المحجوب جیسی کتابوں نے بیت عنکبوت سے زیادہ کمزور بنا دیا ہے اور لے دے کر صرف ایک سماع کا مسئلہ ایسا رہ گیا تھا جس پر وہ "محضر" تیار کرسکتے تھے، سہروردی بزرگوں نے تصوف کے نظری مباحث پر خوب خوب لکھا اور یہ سلسلہ بعد میں کئی صدیوں تک جاری رہا لیکن چشتیہ سلسلے کی مقبولیت کے دو بڑے اسباب تھے، ایک تو یہ کہ چشتی بزرگوں نے حاکمانِ وقت سے اپنے روابط نہیں رکھے بلکہ عوام کے پس ماندہ طبقوں سے گہرا تعلق قائم کیا، سلاطینِ تغلق کے زمانے تک سہروردی سلسلے کے بزرگوں کو قصرِ سلطانی میں اتنا رسوخ حاصل تھا کہ وہ نہ صرف حاجت مندوں کی عرضیاں لے کر بادشاہ کو پیش کرتے تھے بلکہ حضرت رکن الدین ملتانیؒ نے اپنا رسوخ استعمال کرکے محمد تغلق کے ہاتھوں ملتان کو قتل عام سے بچالیا تھا، مگر چشتیہ سلسلے

کے بزرگ اس کے برعکس ان پریشان حال درماندہ اور حاجت مندوں کے لئے دعا اور تعویذ ہی پر قناعت کرتے تھے، اس کی نوبت تقریباً نہیں آتی تھی کہ وہ کسی کے لئے بادشاہِ وقت سے سفارش بھی کریں، اس طرح ابتداء میں اس خانوادے کے بزرگوں نے تصنیف وتالیف سے احتراز کیا چنانچہ اگر حضرت نظام الدین نے یہ فرمایا کہ

"ہمارے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی"

تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چشتی بزرگوں نے تصوّف کے نظریاتی مباحث پر ایسی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جیسی مرصاد العباد، قوت القلوب، کشف المحجوب، التعرّف، عوارف المعارف یا آداب المریدین وغیرہ ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ چشتی بزرگوں نے تصوف کو سراسر "حال" سمجھا اور اس میں "قال" کو دخل نہیں دیا، وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تصوّف تمام تر عمل ہے اس کا فلسفے کی طرح شرح وبیان میں آنا مشکل ہے، اور جو کچھ قیدِ الفاظ میں آئے گا وہ "تصوف" نہیں ہوگا، عبدالرحیم خان خاناں کا دوہا اسی مضمون کا ہے

رَحیمَن بات اَگمَ کی کہَن سُنَن کی ناہیں
جانَت ہیں سو کہَت نہیں، کہَت سو جانَت ناہیں

اور حضرات چشتیہ کے اس نظریے کو شیخ سعدی شیرازیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے

اے مرغِ سحر عشق زپروانہ بیاموز — کاں سوختہ را جاں شد وآواز نیامد
ایں مدعیان در طلبش بے خبر انند — آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لئے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے تصوف کی نظری صورت کو چھوڑ کر اس کی عملی شکل پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور انھیں اپنا پیغام عام کرنے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کا راز بھی یہی تھا

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک دن ایک نوجوان اپنے ساتھ اپنے ایک ہندو دوست کو لے کر حضرت نظام الدین اولیارہ کی خانقاہ میں آیا اور اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "ایں برادر من است"

حضرتؒ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ "تمھارے اس بھائی کو کچھ اسلام کی طرف بھی رغبت ہے یا نہیں؟"

اس نے کہا میں اسے مخدوم کی خدمت میں لے کر اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی نگاہ کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آنکھیں نم ہوگئیں اور فرمایا:

"ایں قوم را چنداں بگفتہ کسے دل نگردد، اما صحبتِ صالح بیابد امید باشد کہ برکت صحبت او مسلماں شود"

(اس قوم پر کسی کے کہنے سننے سے اثر نہیں ہوتا ہاں اگر کسی صالح کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی برکت سے مسلمان ہو جائے)

یہ واقعہ فوائد الفواد میں ۴ر رمضان ۷۱۵ھ کی مجلس کے بیان کے ضمن میں آگیا ہے لیکن یہ چشتی صوفیہ کے مشن کو سمجھنے کے لئے بے حد اہم اور قابلِ غور نکتہ ہے، خود حضرت کا سوال کرنا کہ "ایں برادر تو ہیچ میل بہ مسلمانی دارد؟ دعوتِ حق سے گہرے قلبی تعلق کو ظاہر کرتا ہے اور جب اس لڑکے نے دعا کی درخواست کی تو آپ کا "چشم پر آب" ہو جانا قرآن کے اس فرمان کی نہایت گہری اور اصلی عملی ترجمانی ہے کہ۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (پارہ ۴ آیت ۱۰۴)

اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام کی روح کو ان بزرگوں نے کیسا سمجھا تھا حدیث شریف میں ہے کہ "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" دین خیر خواہی کا نام ہے، اور یہی وہ سچی خیر خواہی ہے جو حضرت نظام الدینؒ کو اس موقع پر چشم پُرآب کر دیتی ہے، آپ نے تبلیغ دین کا اصول بھی بتا دیا کہ جس "خیر" کی طرف تم کسی کو بلا رہے ہو اُس کا نمونہ خود بن کر دکھاؤ تب دعوت الی الخیر کا حق ادا ہوگا۔ قرون وسطیٰ میں علمائے سُوء کا کردار کچھ بھی رہا ہو لیکن جو صاحب کردار علمائے شرع تھے انھوں نے بھی خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان میں دعوت دین کیلئے "تصوف" کی ضرورت ہے، بحث و مناظرے کی نہیں۔

حضرت خواجہ غریب نواز کے ہم عصر مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار بہت ممتاز محدث اور عالم تھے، ان کے ہم عصر علماء میں کوئی بھی علم حدیث اور فقہ میں ان کا ہم پایہ نہ تھا، وہ ان معدودے چند علماء میں سے تھے جنھوں نے اس زمانے میں بغداد اور حجاز پہنچ کر

حدیث کی سماعت کی تھی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فوائد الفواد میں ان کی تعریف میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ ان کی تالیف مشارق الانوار آج بھی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور حدیث کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے، علامہ صغانی کی ایک اور تالیف مصباح الدجیٰ بھی تھی، چنانچہ جب مولانا ناگور پہونچے ہیں تو انھوں نے ایک محفل میں اور ایک ہی نشست میں پوری مصباح الدجیٰ کی قرأت کی تھی اور سماعت کرنے والوں کا بڑا بھاری مجمع تھا جس میں قاضی حمیدالدین ناگوریؒ اور قاضی کمال الدینؒ جیسے فضلاء بھی استفادے کیلئے موجود تھے۔ مولانا صغانی خوب بڑی سی پگڑی باندھتے تھے جس کی چھور آگے کی طرف نکلی ہوتی تھی، بہت لمبی چوڑی آستینوں کا کرتا ہوتا تھا، یہ اس زمانے کے علماء کی ہیئت تھی، یہیں ناگور کے ایک صاحب نے مولانا سے بہت اصرار کیا کہ میں آپ سے کچھ "علم تصوف" سیکھنا چاہتا ہوں، مولانا نے کہا کہ یہاں تو مجھے بالکل فرصت نہیں ہے لوگ حدیث کی سماعت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اتنا وقت نہیں بچتا کہ تمھیں علم تصوف سکھاؤں، البتہ اگر تمھیں ایسی ہی خواہش ہے تو میرے ساتھ چلو، جب ہم غیر مسلموں کے علاقے میں پہونچیں گے جہاں علم حدیث اور فقہ کے طلب گاروں کا اتنا ہجوم نہیں ہوگا تو میں تمھیں اطمینان سے علم تصوف سکھا دونگا چنانچہ مولانا اور یہ تصوف کے طالب علم نکلے اور ناگور سے جالور کی طرف راہی ہوئے، گجرات کی سرحد کے شروع ہوتے ہی مولانا نے اپنا لمبی آستینوں والا کرتا اور بڑی پگڑی لپیٹ کر ایک بقچے میں رکھی اور کوتاہ آستینوں کا درویشوں والا لباس زیب تن کیا، سر پر کلاہ، پاؤں میں جوتے کی جگہ کھڑاویں آگئیں، ایک مٹی کا آبخورہ پانی پینے کے لئے لے لیا، اور نماز و نوافل پڑھتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کرنے لگے، جب اس طرح کئی دن گذر گئے تو اس طالب علم تصوف نے کہا کہ مولانا آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے کچھ علم تصوف سکھائیں گے اور اس امید پر میں گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ لگ گیا ہوں مگر آج اتنے دن ہوگئے آپ نے ایک بات بھی نہیں سکھائی، مولانا فرمانے لگے کہ میاں علم تصوف "قال" نہیں ہے "حال" ہے جیسے میں عبادت کر رہا ہوں اور عام لوگوں سے برتاؤ کر رہا ہوں بس ویسے ہی تم بھی کئے جاؤ۔ یہی علم تصوف کہلاتا ہے۔[1]

---

[1] سرور الصدور و نور البدور (قلمی) نسخہ حبیب گنج علی گڑھ

مولانا صغانی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور محدث ہوئے ہیں، اس دور کے جید علماء اُن کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے، لیکن وہ بھی یہ نکتہ اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے کہ یہ معقولی اور منقولی بحثیں، یہ مناظرے اور مکابرے، یہ فلسفہ اور منطق یہ مسئلے اور تاویلیں صرف اسلام کے ظاہر کو پیش کرسکتی ہیں، اس کی روح کو اور بھی خفی اور بے اثر بنا دیتی ہیں، اسلام کی اصلی تعلیم وہی ہے جسے صوفیا اپنے عمل سے پیش کر رہے ہیں اور اسی نے ہندوستان میں اسلام کو فروغ دیا اور دلوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے، چنانچہ مولانا صغانی بھی جب غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں جاتے ہیں تو صوفیا کا لباس زیب تن کرلیتے ہیں اور اپنا چوغا تہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔

اس مقدمے میں دو باتیں واضح ہوگئیں، ایک تو یہ کہ سہروردی سلسلے کے بزرگوں نے تصوف کی نظری سطح پر تشریح و تفسیر کی اور اس کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر کتابیں تصنیف کیں جن سے دوسرے سلسلے والوں نے بھی فائدہ اٹھایا مگر اپنے خانقاہی نظام عمل میں انھوں نے دین اور دنیا کے جام و سندان کو ایک توازن کے ساتھ یکجا رکھنا چاہا اور حاکمانِ وقت پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی، اس لئے ان کی خانقاہیں زمان و مکان کے اعتبار سے محدود ہو کر رہ گئیں جب کہ چشتیوں کی خانقاہیں چھوٹے چھوٹے دیہات و قصبات تک میں پہنچ گئیں اور عوام کے دلوں میں ان کے لئے گھر بن گئے۔ اس دین و دنیا کی آمیزش سے پیدا ہونے والے تضاد کو ابتدا ہی میں محسوس کرکے چشتی صوفیا نے "ترک" کے فلسفے پر زور دیا اور اپنے مریدوں کو اس کی تربیت دینے کے لئے "چہار ترکی" کلاہ پہنانی شروع کردی، ان کا کہنا تھا کہ

" مرد عالی ہمت نشود تا ترک دنیا نگیرد "

اور اس "ترک" کا پھل یہ تھا کہ جب دہلی کے "شیخ الاسلام" کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی سے حسد ہونے لگا اور اس کی شکایت پر حضرت خواجہ غریب نواز رح نے یہ فرمایا کہ :

" قطب الدین تم میرے ساتھ اجمیر چلو میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی جانشین کی وجہ سے کسی کو تکلیف پہونچے "

اور حضرت بختیار کاکیؒ اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں دہلی کو خیر باد کہہ کر جانے لگے تو آپ کو رخصت کرنے کیلئے ہزار ہا مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے گریہ و زاری کرتے ہوئے آپ کے پیچھے پیچھے شہر پناہ سے باہر تک نکل آئے۔ اس ہجوم میں بوڑھا بادشاہ التمش بھی موجود تھا سب کی یہ حالت دیکھ کر حضرت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا ارادہ فسخ کر دیا۔

یہ واقعہ بہت ہی مشہور ہے اور کتب تواریخ میں چشتی حضرات کے عوام سے براہ راست رابطے کی سب سے قدیم اور بدیہی مثال بھی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بزرگ خانقاہوں میں بیٹھ کر محض انفرادی نجات کے حصول کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی مسائل سے خود کو بہت گہرائی تک وابستہ کر لیا تھا، انھوں نے ملوک و سلاطین اور سرکار دربار کو کبھی منہ نہیں لگایا، نہ کبھی دنیا کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کی اور وہ آئی تو اسے جمع کر کے نہیں رکھا، اس طرح اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ دراصل فقر بھی ایک عظیم دولت ہے

وہ غریبوں، مسکینوں، درماندہ حال اور پس ماندہ طبقے کے انسانوں کی نمائندگی کرتے تھے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی متابعت کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ غریبوں اور مسکینوں سے سچی محبّت کی مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی اور موت اور حشر و نشر بھی ان کے ساتھ طلب کیا جائے، چشتی بزرگوں کی خانقاہوں میں ہمیشہ مفلسوں اور مسکینوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے

حضرت نظام الدین اولیاءؒ جب بارہ تیرہ برس کے ہی تھے اور بدایوں میں علم لغت پڑھ رہے تھے اس وقت ایک قوال نے جس کا نام ابوبکر خرّاط تھا۔ ان کے استاد کے سامنے بہت سی اُن خانقاہوں اور درویشوں کا تذکرہ کیا جہاں وہ حاضری دے چکا تھا، اس نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ کی خانقاہ کا تذکرہ کیا تو اُس کے ساتھ ان کی دولت مندی اور خدم و حشم کا ذکر ہونا لازمی تھا، حضرت نظام الدینؒ نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا مگر حضرت بابا فریدؒ کے فقر محض کا حال سنکر انھیں خاص کیفیت کا احساس ہوا اور انھوں نے اُسی وقت یہ طے کر لیا تھا کہ کبھی نہ کبھی شیخ کی خانقاہ میں حاضری ضرور دیں گے۔ ان کی یہ طبعی کشش بھی دراصل چشتی فقر کی طرف تھی جس کی ترویج کے لئے آگے چل کر آپ کو اپنی زندگی وقف کرنا تھی، بقول خود ان کے

پیر و مرشد حضرت بابا فرید کا یہ حال تھا کہ "دونوں عالم نظر میں ہیچ تھے"۔

ایک بار عصا لے کر چل رہے تھے اس پر تکیہ کرنے کا خیال آیا تو فوراً ہاتھ سے پھینک دیا اور ان کے یہ مرید بھی ایسے تھے کہ جب انھوں نے کسی سے سُنا کہ حضرت بہاء الدین زکریا نے اپنے بیٹے شیخ رکن الدین کو کوئی خاص وظیفہ تعلیم کیا تھا تو آپ کو بہت دنوں تک یہ فکر رہی کہ کسی طرح وہ وظیفہ معلوم ہوجائے ۔ بارے جب شیخ رکن الدین ملتانی سے ملاقات ہوئی تو آپ نے وہ وظیفہ حضرت نظام الدین کو بھی بتادیا ۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں ایک جگہ لفظ "یا مُسبّب الاسباب" بھی آتا ہے، بس یہ "اسباب" کا نام دیکھ کر طبیعت نے اِبا کیا اور جس دُعا کے حصول کے لیے آپ برسوں منتظر رہے تھے، جب وہ مل گئی تو اسے کبھی ایک بار بھی نہیں پڑھا۔

چشتی سلسلے کے ممتاز بزرگوں میں حضرت بابا فرید اور حضرت نظام الدین اولیاء کے کچھ حالات اور واقعات ہمیں مل جاتے ہیں جن سے چشتی خانقاہوں کے نظام اور بزرگوں کی تعلیمات کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں تاریخ اور تذکرے ہمیں بہت ہی کم معلومات فراہم کرتے ہیں اور بعد کے زمانے میں کچھ روایات کے اضافوں نے اس تھوڑے سے تاریخی مواد کو بھی مبہم بنادیا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خواجہ صاحب کے حالات میں قدیم ترین کتاب سیر الاولیاء ہے جو حضرت خواجہ اجمیری کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد مرتب ہوئی ہے، اس میں جو معلومات درج ہیں ان پر کچھ اضافہ شیخ جمالی دہلوی مؤلف سیر العارفین نے کیا ہے جو سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے اور عہد ہمایوں بادشاہ میں سیر و سیاحت کرنے بھی نکلے تھے، وہ خواجہ بزرگ کے وطن اصلی سیستان بھی پہونچے تھے اور انھوں نے حضرت خواجہ اور آپ کے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ مواد وہاں کی مقامی روایتوں سے بھی فراہم کیا ہوگا۔ لیکن بہ حیثیت مؤرخ پروفیسر محمد حبیب کا یہ خیال صحیح ہے کہ خواجہ بزرگ اور شیخ جمالی دہلوی کے عہد میں تقریباً تین صدیاں حائل ہیں، اور یہ بات بہت ہی مستبعد اور مشتبہ ہے کہ شیخ جمالی کو اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی سیستان

میں کچھ ایسے معتبر رُواۃ مل سکے ہوں جو خواجہ بزرگؒ کے بارے میں کچھ مستند معلومات فراہم کرسکتے ہوں

خواجہ بزرگ کے جو حالات اب ہمیں معلوم ہیں اور متداول تذکروں میں ملتے ہیں ان میں شیخ جمالی کے سفر سیستان وغیرہ کی "رہ آورد" کیا ہے؟ اور اس کا استناد کس درجے کا ہے؟ یہ ایک علیحدہ تحقیق کا موضوع ہے، لیکن مجھے سردست صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پروفیسر محمد حبیب کی اس رائے میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ جہاں تک خواجہ صاحب کے بارے میں تاریخی شہادتوں کا سوال ہے۔ عہد وسطیٰ کے بعض مؤرخوں کی رائے میں آپ کا تذکرہ سب سے پہلے طبقات ناصری میں پایا جاتا ہے جو ۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء) کی تصنیف ہے، اس کے مصنف قاضی منہاج سراج جوزجانی ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں پیدا ہوئے تھے، اور اجمیر، سوالک، ہانسی، سرسی وغیرہ علاقے رائے پتھورا کی شکست کے بعد ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں فتح ہوئے تھے اس سے اگلے سال ۵۸۹ھ میں قطب الدین ایبک نے پہلے میرٹھ پھر دہلی کو فتح کیا تھا، ۶۲۱ھ (۱۲۲۴ء) میں وہ ایک سفارت لے کر قہستان گئے تھے، اور وہاں سے واپس آنے کے بعد ۶۲۴ھ میں مدرسہ فیروزی اوچھ کے نگراں مدرس بنادیئے گئے تھے، وہ ۶۲۵ھ میں التمش کے لشکر کے ساتھ دہلی آگئے تھے اس لئے اگر خواجہ بزرگ سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس کا زمانہ ۶۲۵ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان آٹھ سال کا عرصہ ہوسکتا ہے جب وہ لشکر شاہی میں شامل ہوکر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہے تھے مگر انھوں نے خواجہ بزرگ سے اپنی ملاقات کا حال واضح اور راست انداز میں کہیں نہیں لکھا ہے۔ جہاں رائے پتھورا کی شکست کا ذکر ہے اس موقعے پر کہتے ہیں:

"ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارفِ جبالِ بلادِ تولک بود، لقب اُو معین الدین او می گفت کہ من دراں لشکر با سلطان غازی بودم عدد سوارِ لشکر اسلام دراں وقت صد و بست ہزار برگستواں بود" [1]

طبقات ناصری کے اس حوالے کا بھی گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، مجھے یہ ماننے میں بہت تامل ہے کہ یہ بیان حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں ہوسکتا ہے، یہ درست

[1] طبقات ناصری، ص ۱۹

ہے کہ اکثر فاتحین نے اپنے لشکر کے ساتھ چشتی بزرگوں کو برائے حصولِ برکت شریک سفر رکھا ہے
اور یہ بزرگ زمین یا خزانوں کے لالچ میں نہیں بلکہ تبلیغ دین اور حمایت شرع مبین کے جذبے کے ساتھ
اس لشکر کشی میں شامل ہوتے تھے. خواجہ بزرگ بھی اس وقت ہندوستان میں تھے اور شہاب الدین
غوری اپنی ہر مہم میں کچھ درویشوں، بزرگوں اور عالموں کو ساتھ لیکر نکلتا تھا، چنانچہ علی گڑھ کی مہم
میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے نورالدین مبارک غزنوی اور ان کے بھانجے حضرت
نظام الدین ابوالمؤید اس کے ساتھ تھے اور فتح کے بعد اس علاقے کی قضا ان کے خاندان کے حوالے
کی گئی تھی، اجمیر کی مہم میں خواجہ بزرگ کی روحانیت نے جو مدد کی اس کا حوالہ سینہ بہ سینہ چلنے والی
روایات میں بھی آتا ہے لیکن یہاں منہاج سراج نے جس انداز سے تذکرہ کیا ہے اسے دیکھ کر یہ خیال
ہوتا ہے کہ خواجۂ بزرگ کی سی عظیم شخصیت کا ایسا سرسری حوالہ نہیں ہوسکتا کہ صرف «از ثقہ
شنیدم» کہہ کر گذر جائیں۔

اگر طبقات ناصری کے اس بیان کو خواجہ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو پھر آپ کا
قدیم ترین حوالہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں ملتا ہے، فوائد الفواد میں حضرت
خواجہ معین الدین حسن سجزی علیہ الرحمۃ کا نام مبارک صرف تین مقامات پر آیا ہے وہ بھی براہِ راست
نہیں ہے بلکہ ضمناً ہے۔

۱۵ محرم ۷۱۰ھ کی مجلس میں یہ تذکرہ تھا کہ سلامتی ایمان کی کیا علامت ہے، حضرت
نظام الدین اولیاء نے حاضرین سے فرمایا کہ نگاہ داشتِ ایمان کے لئے نماز مغرب کے بعد دو
رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، پھر ان کی ترکیب بیان فرماکر یہ واقعہ سنایا کہ:

"میں نے شیخ معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے پوتے خواجہ احمد
کی زبانی سُنا اور یہ خواجہ احمد بہت ہی صالح تھے انھوں نے کہا کہ میرا ایک
ساتھی تھا سپاہی، وہ ہمیشہ دو نفل حفظ ایمان کے لئے پڑھا کرتا تھا حتی کہ
ایک بار ہم لوگ ناوقت حدود اجمیر میں تھے، مغرب کی نماز کا وقت آگیا اُس
علاقے میں رہزنوں کا بہت اندیشہ تھا اور ڈاکو دور سے نظر بھی آنے لگے ہم
نے جلدی جلدی تین فرض اور دو سنتیں پڑھیں اور شہر کی طرف آگئے وہ ساتھی باوجود

اس کے کہ رہزن نمودار ہو گئے تھے، یہ نفل پڑھنے میں مشغول ہو گیا، پھر جب اس دوست کے انتقال کا وقت آیا تو میں تفحص احوال کیلئے اس کی تربت پر آیا تو دیکھا کہ جس شان سے اسے دنیا سے جانا چاہیئے تھا اسی طرح گیا ہے، حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ خواجہ احمد تو اس جوان کے انتقال کا قصہ سنا کر یہ کہتے تھے کہ اگر مجھے گواہی کے لئے کسی قضا کے سامنے لے جائیں تو میں گواہی دوں گا کہ وہ باایمان گیا ہے"۔[1]

دوسرے موقع پر ۱۲ ذی قعدہ ۷۱۸ھ کی مجلس میں شیخ حمید الدین سوالی کے بیان میں یہ فرمایا کہ۔

"مرید شیخ معین الدین بود ہم خرقہ شیخ قطب الدین"۔[2]

تیسرا حوالہ ۵ رمضان ۷۲۰ھ کی مجلس میں اس طرح ہے کہ

"حضرت شیخ معین الدین سجزی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے خواجہ وحید الدین اجودھن میں حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں آئے اور ان سے بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی، بابا صاحب نے فرمایا کہ مجھے یہ نعمت آپ کے ہی خاندان سے ملی ہے میرے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ کو بیعت کروں مگر انھوں نے بہت اصرار والحاح کیا کہ مجھے تو آپ سے ہی مرید ہونا ہے تو بابا صاحب نے دست بیعت بڑھا دیا"۔[3]

ان تین حوالوں کے سوا خواجہ بزرگ کے نام فوائد الفواد میں اور کہیں نہیں آیا اور ان میں بھی آپ کے دو پوتوں خواجہ احمد اور خواجہ وحید الدین علیہما الرحمۃ کا تذکرہ ہے خود خواجہ صاحبؒ کا نہیں، اگر منہاج سراج والے حوالے کو خواجہ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو فوائد الفواد وہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں خواجہ بزرگ کا اسم مبارک پہلی بار ۷۱۰ھ کی مجلس میں ملتا ہے، اگر فوائد الفواد کے ان حوالوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ حضرت خواجہؒ سے براہ راست متعلق نہیں ہیں بلکہ آپ کے پوتوں کے تذکرے میں ضمناً آپ کا نام مبارک آیا

---

[1] فوائد الفواد: ص ۷۶، ۷۷۔ [2] ایضاً: ص ۳۴۶۔ [3] ایضاً، ص ۴۰۵۔

ہے تو پھر ہمارے معلوم اور موجود ماخذ میں سیرالاولیا ہی وہ قدیم ترین کتاب رہ جاتی ہے جس میں حضرت خواجہ بزرگ کا تذکرہ ملتا ہے، سیرالاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجۂ بزرگ بیس سال تک سفر وحضر میں اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے ساتھ رہے تھے، اس کتاب سے آپ کا بغداد اور حجاز کا سفر کرنا اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونا بھی دریافت ہوتا ہے حالانکہ حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ میں سے کسی نے حج نہیں کیا، مؤلف سیرالاولیاء نے حضرت خواجہ بزرگ کی چند کرامتیں بھی لکھی ہیں جن کا دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی اعادہ ہوا ہے، لیکن امیر خورد نے سب سے اہم بات یہ لکھی ہے کہ۔

"آپ کی کرامات اور علوے درجات کے ثبوت میں اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ خواجہ بزرگ کے سلسلے سے وابستہ ہونے والے ایسے عظیم المرتبت انسان ہوئے ہیں اور انھوں نے بندگان خدا کی ایسی دستگیری کی ہے اور انھیں دنیا کے مکر و فریب سے بچایا ہے کہ قیام قیامت تک ان کی عظمت کا غلغلہ فلک و ملک کے کانوں میں گونجتا رہے گا۔ اور ان سے محبت کرنے والی مخلوق کو اس محبت کے طفیل "مقعد صدق" میں جگہ ملتی رہے گی، پھر مؤلف کہتا ہے کہ اس آفتاب اہل یقین نے ہندوستان کو نور اسلام سے ایسا منور کر دیا ہے کہ آپ کی تعلیم و تبلیغ کی بدولت جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی اولاد میں جب تک سلسلۂ ایمان و اسلام کا جاری رہے گا اس کا اجر و ثواب آپ کی بارگاہ باجاہ میں پہونچتا رہے گا۔

سیرالاولیاء نے آپ کے کچھ ملفوظات بھی درج کئے ہیں، خواجۂ بزرگ نے فرمایا کہ حق کو پہچاننے کی علامت خلق سے کنارہ کشی ہے اور معرفت میں خاموش رہنا ہے، اور فرمایا کہ جب ہم نے عالم ظاہر سے نکل کر نگاہ کی تو عاشق و معشوق و عشق کو ایک ہی پایا یعنی عالم توحید میں وحدت ہی وحدت ہے۔

اور فرمایا کہ حاجی اپنے جسم (قالب) سے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں مگر جو عارف ہیں وہ اپنے دل (قلب) سے عرش اور حجاب عظمت کے گرد طواف کرتے ہیں اور رب کعبہ کی

رؤیت کے طالب ہوتے ہیں۔

اور فرمایا شقاوت کی نشانی یہ ہے کہ گناہ کرے اور پھر بھی مقبولیت کی امید رکھے، فرمایا کہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ فرشتوں کو فرمان دے گا کہ دوزخ کو دہانِ مار سے باہر نکالیں، پھر اسے دہکایا جائے گا پھر وہ ایک پھونک مارے گا تو سارا میدانِ حشر دھوئیں سے اٹ جائیگا اس دن کے عذاب سے جو اپنے تئیں بچانا چاہے اسے وہ عبادت کرنی چاہیئے جس سے بہتر عبادت اللہ کے نزدیک اور کوئی نہ ہو۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ عبادت ہے، بےکسوں کی فریاد سننا، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا اور بھوکے کو کھانا کھلانا۔

اور فرمایا جس میں یہ تین خصلتیں ہوں سمجھ لو کہ وہ بے شک اللہ کا دوست ہے ایک دریا کی سی سخاوت دوسرے آفتاب کی سی شفقت، تیسرے زمین کی سی تواضع۔

سیرالاولیاء کی تالیف فیروز تغلق کے زمانے میں ہوئی ہے اور اس کے آخر میں جو ایک تاریخ درج ہے جس سے فیروز شاہ تغلق کی تاریخ وفات ۷۹۰ھ برآمد ہوتی ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ امیر خورد اس وقت تک زندہ تھے اور انھوں نے کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد بھی ۲۵، ۳۰ برس تک اس پر نظر ثانی و اضافے کا کام جاری رکھا ہے، اس پر نگاہ رکھیئے تو سیرالاولیاء میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم عصر بیان نہیں ہے اور خواجہ بزرگ کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد لکھا گیا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و ملفوظات میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ماخذ سرورالصدور و نورالبدور ہے جو آج تک نہیں چھپی ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی اب ساری دنیا میں صرف دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں

حضرت خواجہ بزرگ سے لاکھوں انسانوں کو فیض پہونچا اور آج بھی اسی طرح جاری ہے اور آپ کی حیاتِ ظاہری کے زمانہ میں ہزارہا انسان بیعت ارادت کے شرف سے سعادت اندوز ہوئے مگر آپ کے خلفاء میں صرف تین نام ملتے ہیں، خلیفۂ اول حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ ہیں، جن کا انتقال اپنے پیر و مرشد کی حیات ہی میں ہو گیا تھا، دوسری

خلافت خواجہ بزرگ اور قطب صاحب دونوں نے مل کر حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کو دی تھی، لیکن بابا صاحب کو خلافت اولیٰ حضرت قطب صاحب سے پہونچی تھی اسلئے آپ ان کے ہی جانشین اور خلیفہ مانے جاتے ہیں تیسری خلافت سلطان التارکین ابواحمد شیخ حمیدالدین بن محمد سوالی ناگوری علیہ الرحمۃ کو ملی، یہ میدان ترک و تجرید کے ایسے یکہ تاز تھے کہ خود خواجہ بزرگ نے انھیں "سلطان التارکین لقب مرحمت فرمایا تھا، آپ نے طویل عمر پائی اور ۹ ربیع الآخر ۶۷۳ھ میں وصال ہوا، مزار مبارک ناگور میں مصدر فیوض و مرجع خلائق ہے

شیخ حمیدالدین ناگوری فرمایا کرتے تھے کہ،

" اوّل مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانۂ مسلماناں آمد منم "

اور جیسا کہ ہم نے ابتدا میں ذکر کیا کہ دہلی کی فتح قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں ہوئی، اور یہی شیخ ناگوری کی ولادت کا سنہ ہے، اس حساب سے انھوں نے تقریباً ۸۴ سال کی عمر پائی، شیخ ناگوری عالم اور صاحب تصانیف بزرگ تھے، ان کی کتابیں حضرت نظام الدین اولیاء کے زیر مطالعہ رہتی تھیں، اور انھوں نے کتابوں کے بعض اقتباسات اپنے قلم مبارک سے نقل کر رکھے تھے۔ جنھیں مؤلف سیرالاولیاء نے بھی اخذ کیا ہے ۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ ناگوری کی تصانیف کے بعض اقتباسات درج کئے ہیں اور یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سے ان کی ملاقات ہوئی ہوگی، شیخ ناگوری کے پاس دو طناب زمین تھی جس میں اپنے ہاتھ سے تخم ریزی کرتے تھے اور اس کی پیداوار سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے، ان کے فرزند عزیز الدین تھے جن کے تین بیٹے ہوئے، شیخ وحیدالدین ۶۲۴ھ (۱۲۲۶ء) میں انتقال فرما گئے تھے، دوسرے شیخ نجیب الدین ابراہیم تھے، انھوں نے دہلی جا کر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں بھی کچھ وقت گذارا تھا، اور ان سے استفادہ کیا تھا، کہتے تھے :

" ایک دن میں شیخ نظام الدین کی خدمت میں گیا ہوا تھا ایک بوڑھے مولوی

صاحب بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے آئے اور شیخ کی خدمت میں بیٹھ گئے، کہنے لگے حضرت! آخر قاضی عالم کو یہ قبولیت کہاں سے نصیب ہوئی ہے ہم یہاں سرائے میں پڑے رہتے ہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ جیسے ہی آتے ہیں لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اعزاز و اکرام بھی کرتے ہیں آج ہی ایسا ہوا کہ فوراً انھیں آگے آگے لے گئے خوب نذریں ملیں اور اعزاز و اکرام الگ رہا :

حضرت نظام الدین رہ خاموشی سے مولوی صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور کچھ نہیں فرمایا، پھر وہ مولوی صاحب خود ہی کہنے لگے، میں نے سنا ہے کہ ناگور میں کوئی پیر تھے، ان کا نام شیخ حمید الدینؒ تھا، یہ قاضی عالم ان کے نظر یافتہ ہیں، جب مولوی صاحب نے یہ جملہ کہا تو حضرت نظام الدین رہ نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ صاحب انھیں کے پوتے ہیں، مولوی صاحب نے اٹھ کر میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔

شیخ عزیز الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ فرید الدین چاک پڑان بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ہم عصر تھے انھوں نے ایک بار صفر ۷۲۹ھ (دسمبر ۱۳۲۸ء) کی ایک مجلس میں فرمایا کہ میں ۷۰ سال سے وعظ کہہ رہا ہوں اور پہلی بار سات سال کی عمر میں منبر پر قدم رکھا تھا اس حساب سے ۷۲۹ھ میں آپ کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی اور ولادت کا سنہ ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء) تسلیم کیا جائیگا ان کے والد شیخ عزیز الدین کا انتقال ۶۶۶ھ اور ۶۷۷ھ کے درمیان کسی وقت ہوا

شیخ فرید الدین ناگوری دہلی آتے رہتے تھے اور آخر عمر میں یہیں آکر بس گئے تھے ان کا انتقال ۷۳۴ھ (۱۳۳۳ء) میں حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال سے نوسال کے بعد ہوا، آپ کی زندگی کے آخری ایام میں ۷۲۹ھ اور ۷۳۴ھ کے مابین آپ کی مجالس اور ملفوظات قلم بند کئے گئے جس میں آپ نے اپنے دادا شیخ حمید الدین ناگوری رہ کے ملفوظات بھی بیان فرمائے ہیں اور اسی کا نام "سرور الصدور و نور البدور" ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جھنجھنوں کے حضرت شاہ نجم الدین صوفی کی خانقاہ میں تھا جس کی ایک نقل ۱۳۰۱ھ میں تیار کی گئی اور وہ نواب حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ ۲۵۹ اوراق کا نسخہ ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ "سرور الصدور" پر مشتمل ہے باقی دو تہائی کتاب میں شیخ حمید الدین صوفی، شیخ عزیز الدین اور شیخ فرید الدین ناگوری علیہم الرحمۃ کے مکتوبات اور رسائل وغیرہ ہیں اور ان میں بھی بہت کارآمد مواد موجود ہے۔

ان مکتوبات و رسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین صوفی پہلی بار صفر ۶۸۱ھ (اپریل ۱۲۸۲ء) میں دہلی آئے تھے، اور یہاں سے انھوں نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین ابراہیم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرت نظام الدین شیخ وقت ہیں، تم جب بھی مجھے خط لکھو، اپنی اور تمام اعزا کی جانب سے ان کی خدمت میں سلام ضرور لکھنا۔ اس میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔

"در مکتوبات کہ ایں طرف بفرستند برائے شیخ الوقت شیخ نظام الملت والدین سلام بنویسند و از زبان یاران جملہ بجانب او سلام بنویسند تقصیر نکنند، مرد صاحب درد، در جملہ دہلی جز اُو را نیافتم او صَلّی اللہُ بَرَکَاتِ اَنْفَاسِہٖ اِلیٰ کَافَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ۔

حضرت نظام الدین اولیاء ان سے ملاقات کرنے کے لئے دوبارہ بنفس نفیس تشریف لے گئے اور ان کا وعظ سننے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا، جس حجرے میں یہ ٹھہرے ہوئے تھے اُسے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار فرمایا کہ آپ اس تنگ و تاریک حجرے میں کیسے رہے ہیں؟ پھر غیاث پور جا کر اپنے ایک خادم محمد صوفی کو بھیجا کہ وہ شیخ فرید الدین کا سامان لے آئے اور ان سے کہے کہ میرے حجرے کے اوپر اتنی جگہ ہے کہ آپ وہاں آرام سے ٹھہر سکتے ہیں، شہر میں جہاں کہیں حضرت نظام الدینؒ کو بلایا جاتا تھا آپ کہلا بھیجتے تھے کہ شیخ فرید ناگوری بھی میرے ساتھ آئیں گے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالیٰ بسیار تقاضائے تذکیر می کند و ایں ضعیف چو الطاف و کرم او از جملہ گذشتہ است دفع نمی تواند گفت ان شاء اللہ تعالیٰ باحسن الاحوال میسر گردد

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالیٰ وعظ کا بہت تقاضا کرتے ہیں اور چونکہ ان کا الطاف و کرم سب سے زیادہ ہے اس لئے یہ ضعیف انکار بھی نہیں کر سکتا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہت اچھی طرح میسر ہوگا، شیخ نظام الدین نے فرمایا

شیخ نظام الدین فرمودہ بود و دو بار بریں ضعیف آمدہ بود، بغایت تعجب کرد کہ دریں حجرہ چہ گونہ می باشید؟ بعدازاں بدست حاجی محمد پیغام کرد کہ ایں جا موضع است بربالائے حجرۂ من اگر بیایند کرم کردہ باشند و دعاگوئے چوں ایں جا مسجد جمعہ نزدیک بود، بخدمت مولانا شرف الدین موضحی سلمہ اللہ رفتہ می باشد، عذر گفت، دریں مدت بخانہ مراجعت خواہد افتاد زحمت دادہ نمی آید مع ہذا ہر کجا بدعوتے اورا بطلبند ایں ضعیف را بطلبند دانچہ از کرم طبع ایشاں سزد از اکرام دریغ نداشت حق سبحانہ وتعالیٰ توفیق حق گذاری الطاف ایشاں کرامت کناد۔"

تھا اور دو بار اس ضعیف کے پاس تشریف بھی لائے تھے، بہت تعجب کیا کہ تم اس کوٹھری میں کس طرح رہ رہے ہو؟ پھر حاجی محمد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ یہاں میرے حجرے کے اوپر ایک جگہ موجود ہے، اگر آپ یہاں آجائیں تو کرم ہوگا، مگر اس دعاگو نے اس لئے معذرت کرلی کہ یہاں سے جامع مسجد قریب ہے اور مولانا شرف الدین موضحی سلمہ اللہ کی خدمت میں بھی جانا ہوتا رہتا ہے، اس مدت میں گھر کو واپسی ہوجائے گی اور زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، علاوہ ازیں جہاں کہیں انھیں دعوت میں بلایا جاتا ہے اس ضعیف کو بھی بلا لیتے ہیں اور جوان کی طبیعت کے شایانِ شان ہے عزت واکرام میں دریغ نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے الطاف وکرم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسری بار شیخ فرید صوفی دہلی کب آئے اس کا علم نہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اس بار دہلی سے واپسی محرم ۶۸۷ھ (فروری ۱۲۸۸ء) میں ہوئی تھی، آخری سفر میں زن وفرزند کے ساتھ دوشنبہ ۱۲ رمضان ۷۳۰ھ کو دہلی پہونچے تھے، اس وقت دہلی بالکل اجڑ چکی تھی، سلطان محمد بن تغلق نے ساری آبادی کو یہاں سے دولت آباد منتقل کردیا تھا مگر ۷۲۹ھ میں ملتان میں کچھ شورش ہوئی، اسے دفع کرنے کی نیت سے محمد تغلق دہلی آیا ہوا تھا، اس نے شیخ فریدالدین صوفی کو بھی دولت آباد جانے کا حکم دیا اور یہ ۷۳۱ھ کے آخر میں وہاں تشریف لے گئے، اُس وقت حضرت برہان الدین غریبؒ اور امیر حسن علا سجزی دہلویؒ

دونوں دولت آباد میں موجود تھے، اس لئے یقین ہے کہ ان بزرگوں سے بھی ملاقات رہی ہوگی۔

ملتان میں غیاث الدین تغلق کے متبنّیٰ ملک ابراہیم کی بغاوت کو دبانے کے لئے محمد بن تغلق کو جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے یہ سبق ضرور مل گیا کہ دولت آباد میں بیٹھ کر شمالی ہندوستان پر حکومت کرنا آسان نہیں ہوگا، اس لئے پھر دہلی واپس جانے کا حکم جاری کر دیا گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین ناگوری بھی شعبان ۷۳۲ھ (اپریل ۱۳۳۲ء) میں پھر دہلی واپس تشریف لے آئے، دہلی میں بیجے منڈل سے مشرق کی جانب ان کا مکان تھا اور اب اسی جگہ مزار مبارک ہے۔ انتقال ہفتے کے دن یکم جمادی الاولیٰ ۷۳۴ھ (۸ رجنوری ۱۳۳۴ء) کو ہوا تھا۔

سرور الصدور میں حضرت شیخ حمید الدین ناگوری علیہ الرحمۃ کے بارے میں ان کے فرزند شیخ عزیز الدین کی روایات بھی ہیں اور خود شیخ فرید الدین نے بھی اپنے مشاہدات و معلومات درج کئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حمید الدین سوالی نے حج بھی کیا تھا اور وہ حضرت خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین غریب نواز قدس سرہ کی خانقاہ میں امامت سے مشرف تھے، خواجۂ بزرگ ان کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شخص کچھ پوچھنے یا وضاحت طلب کرنے کے لئے آجاتا تھا اور خواجۂ بزرگ اسے شیخ حمیدالدین ناگوری کی طرف بھیج دیتے تھے، ایک بار خواجۂ بزرگ اجمیر کے قلعے میں تشریف فرما تھے، ایک درویش آئے اور انھوں نے پوچھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو ایک تارک دنیا میں پائی جانی چاہئیں، حضرت خواجۂ خواجگان نے فرمایا کہ "شریعت میں تو صرف یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے کرنے کا حکم دیا ہے اسے کرے اور جن باتوں سے باز رہنے کو کہا ہے ان کے پاس نہ پھٹکے، ایسے شخص کو اگر کوئی تارک دنیا کہے تو بے جا نہ ہوگا مگر طریقت میں نو باتیں اور ہیں جب تک وہ پوری نہ ہوں کسی کو تارک دنیا نہیں کہا جا سکتا"۔ پھر آپ نے حضرت شیخ حمیدالدین صوفی ناگوری کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم ان درویش کو "ترک" کے بارے میں تفصیل بتادو، اور لکھ کر بھی دے دو تاکہ یہ کسی 'عالم خدا' کو دکھائیں اور پھر بہت سے مسلمانوں کو نفع پہونچائیں"۔ اب ان درویش کو شیخ ناگوری رحمہ نے بتایا کہ صوفیائے چشت کے نزدیک "ترک" کیا ہے۔ اوّل یہ کہ کسب نہ کرے، دوسرے قرض نہ مانگے، تیسرے یہ کہ اگر سات روز کا فاقہ ہو

تب بھی کسی کے سامنے اپنا راز فاش نہ کرے اور اس سے مدد طلب نہ کرے، چوتھے یہ کہ اگر بہت سا کھانا یا روپیہ یا غلہ یا کپڑا اسے مل جائے تو اگلے روز کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھے، پانچویں یہ کہ کسی کے حق میں دعائے بد نہ کرے، اگر کوئی بہت ستائے تو بس اتنا کہے کہ یا اللہ اپنے اس بندے کو راہِ راست دکھادے، چھٹے یہ کہ اگر کوئی اچھا کام بن پڑے تو اسے اپنے پیر کی شفقت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور حق تعالیٰ کی رحمت جانے۔ ساتویں یہ کہ اگر کوئی بُرا فعل سرزد ہو تو اسے اپنے نفس کی شومی سمجھے، خود کو برے اعمال سے بچائے رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تاکہ آئندہ وہ خطا پھر سرزد نہ ہو، جب اس منزل تک پہنچ جائے تو آٹھواں مرحلہ یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھے اور رات کو قیام کرے، نویں یہ کہ خاموش رہے اور صرف اسی وقت کلام کرے جب حاجت اصلی ہو، چنانچہ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہی ہے کہ بولنا حرام ہے، اور خاموش رہنا بھی حرام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بات بولے جس کا مقصد خوشنودی حق تعالیٰ کا حصول ہو۔"

اس مختصر تقریر میں جو نو نکات پر مشتمل ہے، شیخ ناگوری نے اپنے پیر و مرشد کی ایما سے سلوکِ طریقت کا خلاصہ پیش کردیا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب اس کی تفسیر ہے، یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ "ترک" پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں "ترک دنیا" صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اوامر و نواہی کا خیال رکھیں اور خدا نے اور اس کے رسول نے جن باتوں کو چھوڑنے کیلئے کہا ہے ان کے پاس نہ پھٹکیں۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی بھی اپنے مریدوں سے یہی فرمایا کرتے تھے کہ

"وصیت ہمین است کہ انچہ خدا و رسولِ خدا منع کردہ است آں نکنی۔"

شیخ ناگوری رہ نے فرمایا کہ کل خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تم ہمارے لئے کیا لے کر آئے؟ یہ پوچھے گا کہ بتاؤ ہماری خاطر تم نے کیا چیز ترک کی تھی؟

یہ "الدین یسر" کے مصداق وہ فلسفہ ہے جس کا عام مسلمان کو مکلف کیا گیا ہے، اس کے بعد نو مرحلے اپنے شیخ کی نیابت میں حضرت ناگوری نے بیان فرمائے، وہ دراصل ایک درویش سے مطالبہ ہے یعنی ان شرائط کی تکمیل کی توقع ان خواص سے کی جائے گی جو روح شریعت تک

پہونچنے کے آرزومند ہیں۔

طبقہ علماء ہی میں نہیں اس وقت صوفیا میں بھی ایسے بزرگ تھے جنھوں نے دنیا جمع کر رکھی تھی اور اس کی بدولت ان پر وہ آفتیں آرہی تھیں جو دولت کے ساتھ آنی چاہئیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ غنا افضل ہے یا فقر، شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں "جدالِ سعدی با مدّعی" کے عنوان سے پورا معرکہ فقر و غنا کے موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ اور اس بارے میں وہ دوسرے درویشوں سے مراسلت بھی رکھتے تھے چنانچہ ناگور میں ایک تاجر تھا وہ ہر سال تل لے کر ملتان کی منڈی میں بیچنے جاتا تھا اور وہاں سے روئی لے کر ناگور آتا تھا۔ وہ شیخ حمید سوالی کے خطوط حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نام لے جاتا تھا اور ان کا جواب لاکر حضرت کو دیا کرتا تھا۔ ان خطوط میں شیخ ناگوری رح نے حضرت ملتانی کی دولت مندی پر اعتراضات کئے تھے۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ خدا نے متاعِ دنیا کو متاعِ قلیل فرمایا ہے۔ "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ" اور میرے پاس اس کا اقلِ قلیل ہے۔ اس پر شیخ ناگوری نے پھر کچھ لکھا تو حضرت ملتانی نے جواب نہیں دیا۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ نجم الدین صغریٰ نے شیخ جلال تبریزیؒ پر اتہام لگایا اور التمش کے دربار میں ان کے خلاف محضر مقرر ہوا اور انھوں نے شیخ بہاء الدین ملتانی کو اپنا گواہ بناکر پیش کیا تو اس محفل میں صوفی حمید الدین ناگوری رح بھی موجود تھے، انھوں نے شیخ ملتانی سے کہا کہ جہاں کہیں مال ہوتا ہے وہاں مار (سانپ) بھی رہتا ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ چنانچہ کہاوت بھی ہے کہ "گنج با مار و گل با خار" مال اور مار میں کچھ صوری مناسبت بھی ہے مگر معنوی مناسبت کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا، شیخ ملتانی نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں میں کوئی صوری مناسبت نہیں ہے البتہ معنوی مناسبت موجود ہے اور وہ یہ کہ اپنے زہر کی وجہ سے مار (سانپ) ہلاک ہے اور مال بھی اکثر لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، شیخ ناگوری نے فرمایا: اس کا مطلب یہ ہوا کہ مال اور مار ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں تو جو مال جمع کرتا ہے، وہ گویا مار جمع کر رہا ہے۔ شیخ ملتانی سمجھ گئے کہ یہ میری دولت کی طرف اشارہ ہے۔ فرمانے لگے کہ اگر کسی کو سانپ کا منتر یاد ہو تو اسے سانپ کا زہر کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا

شیخ ناگوری نے کہا کہ ایک پلید، زہردار اور پرُخار جانور کو پالنا اور پھر اس کا منتر یاد رکھنے کے جھنجھٹ میں پھنسنا کون سی دانائی ہے؟ جب شیخ ملتانی نے دیکھا کہ ان کی دلیل قوی ہوتی جارہی ہے تو کہنے لگے کہ یہ الزام تو مجھ پر ہی نہیں، میرے پیر و مرشد پر بھی عائد ہوتا ہے، اسی وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی روح پرفتوح حاضر ہوئی اور کہا کہ بہاء الدین ان سے یہ کہدو کہ تمہاری درویشی میں ایسا حسن وجمال نہیں ہے جسے نظر لگنے کا اندیشہ ہو اور ہماری درویشی میں اتنا جمالِ کمال ہے کہ اسے نظرگذر سے بچانے کے لئے ٹیکا بھی درکار ہے، اس لئے ہم نے " وسمۂ سیاہئ دنیا" اسکے چہرے پر لگا دیا ہے، جب شیخ ملتانی نے حضرت ناگوری سے یہی بات کہی تو انھوں نے فرمایا:

" سبحان اللہ آپ کی درویشی میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشی سے زیادہ تو حسن وجمال نہیں ہے"۔ آنحضرت ص نے غنا پر فقر کو ترجیح دی ہے اور فرمایا" اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَ اَلْفَقْرُ مِنِّیْ"۔" اس پر شیخ ملتانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ملتانی کے ایک صاحبزادے ناگور تشریف لائے تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ حمیدالدین ناگوری جمعہ کی نماز میں موجود نہیں تھے، اس پر انھوں نے خاصا ہنگامہ کیا تو شیخ ناگوری رہ نے فرمایا کہ ناگور مصر کے حکم میں نہیں ہے اس لئے یہاں جمعہ کا وجوب بھی نہیں ہے۔ مگر انھوں نے علماء کو ساتھ ملا کر خاصی بحث کی، شیخ نے فرمایا کہ تم نے ناحق ہمارے اوقات میں خلل ڈالا ہے۔ اتنی دیر کے لئے - ماترا حبس درویشاں دادیم"۔

شیخ حمید کے انتقال کے بعد حضرت ملتانی کے یہ فرزند کہیں جارہے تھے، راستے میں ایک ڈاکو نے انھیں گرفتار کرلیا اور کہا کہ تمھیں اپنے والد ماجد کی چھوڑی ہوئی جائداد سے اتنا مال ملا ہے وہ سب لاؤ جب رہا کروں گا، انھوں نے اپنے بھائی شیخ صدرالدین ملتانی کو قید کا ماجرا اور رہائی کی شرط لکھی وہاں سے مال آیا تب انھیں نجات ملی۔

حضرت ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ملتانی علیہ الرحمۃ ۷۲۰ھ میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی دعوت پر دہلی آئے تھے جس نے انھیں حضرت نظام الدین اولیاء کا اثر و رسوخ ختم کرنے کی نیت سے بلوایا تھا مگر اسی سال خسرو خاں نے سلطان کو قتل کردیا

اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ حضرت شیخ رکن الدین پھر بھی چار سال تک دہلی میں رہے، انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی اور اس وقت یہ فرمایا تھا کہ:

"امروز مرا تحقیق شد کہ چہار سال کہ مرا در دہلی داشتند مقصود ایں بود کہ بہ شرف امامت نماز جنازہ سلطان المشائخ مشرف شوم"۔ (سیر الاولیاء)

لیکن دہلی میں ان کے طویل قیام کا سبب معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی خسرو خاں کے محل کے زینے سے گر پڑے تھے جس سے چہرۂ مبارک پر بہت چوٹ لگی تھی اور پاؤں کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی یہ ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) کا واقعہ ہوگا کیونکہ اسی سال چار ماہ اور چند روز کے لئے برسر اقتدار رہ کر غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں خسرو خاں مارا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس مجبوری کی وجہ سے آپ کو ایک طویل عرصے تک دہلی میں قیام کرنا پڑا ہوگا۔

شیخ فریدالدینؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے سنا ہے حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے ؎

ہاں اے دل گرم، بادم سرد بساز　　بادیدۂ لعل و بارُخ زرد بساز
فریاد رسے چو نیست فریاد مکن　　درماں چو نمی بینی، با درد بساز

اور فرمایا کہ شیخ جیو نے یہ اشعار بھی اکثر خواجہ جیو کو پڑھتے سنا ہے ؎

اے دل غم آں مخور کہ فردا چہ شود　　زیرا کہ ہمہ خوشی دراں پے بشود
حکمے کہ بکر داست خداوند جہاں　　دانم چہ شود واگر ندانم چہ شود؟

۵ رجمادی الثانی ۷۵۶ھ کی مجلس میں شیخ فرید ناگوری نے فرمایا:-

شیخ بزرگ قدس اللہ روحہ العزیز امامت خواجہ جیو ہم کردے، چوں خواجہ جیو اجمیر فرود آمد ملکے کہ دراں وقت بود خواجہ جیو را مرید شد و دختر کے بخدمت خواجہ فرستاد و خواجہ جیو دراں وقت معمر شدہ بود میگویند عمر ایشاں بنود سال رسیدہ بود، خواجہ جیو را ازاں دختر کہ دو فرزنداں شدند تا وقتیکہ شیخ بزرگ را گفت: حمید چیست اینکہ ہرگاہ کہ ما را دراں جوانی کہ مجرد بودہ ایم حاجتے بشدے دعا میکردیم و در حال اجابت شدے و ایں ساعت کہ پیر شدیم و فرزنداں آمدند ہرگاہ کہ حاجتے می شود بسیار می باید و دعا ہم کردہ شود ولیکن بعد از دیر تر باجابت

می رسد و حاجت بر می آید این حکمت چیست؟ شیخ بزرگ فرمود گفتم یا شیخ شمارا بہتر روشن است از قصۂ مریم، دراں وقت کہ مجرد بود بے خواست او میوۂ زمستانی بتابستاں می رسید و میوۂ تابستاں بزمستاں می آمد کہ دلش بخدا یکتا بود، چوں عیسیٰ علیہ السلام بزاد، مریم علیہا السلام منتظر بود کہ ہم چناں خواہد رسید فرمان آمد وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ چوں دلت باو یکتا بود ـ نخواستیم کہ برائے نان دو دلہ مانی"

از شیخ خواجہ جیو چوں ایں شنیدند پسندیدند"

سرور الصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں (۶۳۳ـ ۶۰۷) چالیس یاروں کا قافلہ ایک ساتھ دہلی میں آیا تھا، ان میں سے ہر ایک کو سلطان نے جائزہ گراں دیا تھا. ان میں شیخ نجیب الدین نخشی بھی تھے. انھوں نے اپنا حصہ کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کردیا اور کچھ دوستوں کی ضیافت میں، التمش نے انھیں اپنا منھ بولا باپ بنالیا تھا اور دہلی کی شیخ الاسلامی ان کو تفویض کی، اس لئے تو دہلی میں رہنے لگے، دوسرے احباب مختلف شہروں میں جاکر بس گئے، حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ تشریف لے آئے. جب شیخ نجیب الدین دہلی کے شیخ الاسلام تھے. خواجہ بزرگ ان سے ملاقات کے لئے دہلی تشریف لاتے تھے اور شیخ حمید الدین ناگوری بھی دہلی آیا کرتے تھے. ایک بار کہیں دعوت میں یہ سب بزرگ موجود تھے. شیخ نجیب الدین نخشی، شیخ معین الدین، شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیاری، اور شیخ حمید الدین صوفی ناگوری، اس وقت موضوع گفتگو یہ تھا کہ اس زمانے میں "شیخ وقت" کون ہوسکتا ہے؟ اور کون ہے؟، سب اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے، شیخ حمید الدین ناگوری نے کہا کہ اس زمانے میں شیخ وقت "جیتل" (پیسہ) ہے، سب حضرات کہنے لگے کہ شیخ! ہم سنجیدگی سے بات کر رہے ہیں. اور تم مذاق میں جواب دے رہے ہو، شیخ ناگوری نے کہا کہ میں بھی سنجیدگی سے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس زمانے میں جس کے پاس جیتل زیادہ ہوں ، وہی "شیخ وقت" مانا جاتا ہے. ان کا یہ پرمعنی فقرہ سن کر سب خاموش ہوگئے ـ

شیخ حمید الدین صوفی نے ایک بار ۵/ جمادی الاولیٰ ۶۶۲ھ کو فرمایا کہ میرے

تین پیر ہیں۔ ایک پیر ارادت حضرت شیخ معین الدین اجمیری، دوسرے پیر صحبت مولانا شمس الدین حلوائی۔ تیسرے پیر خرقہ شیخ حمید الدین محمد جوئنی۔

لیکن انھیں حضرت خواجہ بزرگ غریب نواز سے بھی خرقۂ ارادت ملا تھا اور وہ تبرکات ان کے پوتے شیخ فرید الدین صوفی کے پاس محفوظ تھے۔ جمال الدین کلدنی متصرف ناگور کو انھوں نے ایک کلاہ بھیجی اور اسکے ساتھ خط لکھا تھا:

"کلاہے کہ ایں ضعیف را از شیخ رسیدہ است و شیخ را از خدمت اجل شیخ معین الدین سجزی قدس اللہ روحہ رسیدہ است فرستادہ شد باید کہ بحرمت و تعظیم تمام برسر نہند و دوگانہ گذارند و مرادے کہ پیش دل آید بخواہد یقین است کہ بیابد بفضل اللہ"

حضرت خواجہ بزرگ کا خرقہ بھی شیخ فرید الدین صوفی تک پہنچا تھا، انھیں بیعت کرتے وقت یہ اقرار لیا تھا کہ

"درویشی را دوست دارم و درویشاں را خدمت کنم"

پھر اپنا جبہ اتار کر پہنایا اور کہا۔

"ایں خرقہ شیخ است کہ بمن رسیدہ بود ترا می پوشانم و ایں ضعیف را پوشانیدند"

غرض یہ کتاب حضرت خواجہ بزرگ اور ان کے ایک جلیل القدر خلیفہ کے حالات و ملفوظات کا سب سے اہم اور قابل قدر ماخذ ہے، اس میں ایک کتاب شرف الانوار کا حوالہ بھی آیا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات پر مشتمل تھی اور فصل اور نوع کے عنوان سے مختلف فصول و ابواب میں تقسیم کرکے لکھی گئی، اب یہ ناپید ہوچکی ہے۔ اگر کہیں اس کا نسخہ دستیاب ہوجائے تو اس میں بھی حضرت خواجہ اجمیریؒ کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملیں گی، اور یہ حضرت کے حالات میں سرور الصدور سے بھی قدیم ماخذ ہوگی۔



دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ دارالعلوم

ماہ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۳ء

شمارہ نمبر - جلد نمبر

فی شمارہ ۶/ سالانہ ۶۰/

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

مدرس دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ	۲۵۰/ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم "	۱۰۰/ "
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم "	۸۰/ "

[illegible]

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے



از :- ادارہ،

ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی واقع ہونگی

جمہور ائمۂ سلف وخلف کا فیصلہ

آج کل خدا جانے کن اغراض کے تحت علمائے غیر مقلدین ایک مجلس میں یا ایک کلمہ کے ذریعہ دی گئی تین طلاقوں کے مسئلہ کو بڑی شدومد کے ساتھ اُچھال رہے ہیں، اردو، ہندی، انگریزی اخبارات اور دیگر سرکاری وغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عام مسلمانوں کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک نشست میں تین مرتبہ دی گئی طلاقوں کو تین طلاق قرار دینا باطل اور شریعت کے ساتھ کھلواڑ کرنا ہے۔

جب کہ ایک مجلس میں ایک لفظ سے یا متعدد الفاظ سے دی گئی تین طلاقیں شرعاً تین ہی واقع ہوتی ہیں، شریعت اسلامی کا یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اہل سنت والجماعت کے ہر چہار امام ابوحنیفہ، مالک شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا اتفاق ہے، علاوہ ازیں دیگر ائمہ فقہ وحدیث مثلاً امام اوزاعی، امام نخعی امام ثوری، امام اسحاق، امام ثور، امام ابن حزم ظاہری، امام بخاری وغیرہ کا بھی یہی قول ہے، بلکہ جمہور صحابہ، تابعین اور جمہور ائمہ سلف وخلف اسی کے قائل ہیں۔

امام نووی شرح مسلم شریف میں لکھتے ہیں۔

واختلف العلماء فیمن قال لامرأتہ: أنت طالق ثلاثا۔ فقال الشافعی ومالك

یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ "تجھے تین طلاقیں" تو اس مسئلہ میں علماء مختلف ہیں

وابو حنیفة واحمد وجماهیر العلماء من السلف والخلف "یقع الثلاث"	امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور سلف وخلف میں سے جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاقیں واقع ہوں گی۔

اور حافظ ابن رجب حنبلی اپنی مشہور کتاب "مشکل الاحادیث الواردة فی ان الطلاق الثلاث واحدة" میں لکھتے ہیں۔

اعلم انہ لم یثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعین ولا من ائمة السلف المعتمد بقولهم فی الفتاوی فی الحلال والحرام شیٔ صریح فی ان الطلاق الثلاث بعد الدخول یحسب واحدة اذا سبق بلفظ واحد	جاننا چاہئے کہ صحابہ، تابعین اور ان ائمہ سلف میں سے جن کے اقوال پر دربارۂ حلال وحرام اعتماد کیا جاتا ہے کسی سے بھی صراحت کے ساتھ منقول نہیں ہے کہ صحبت کے بعد تین طلاقیں جب ایک لفظ سے دی جائیں تو وہ ایک سمجھی جائیں گی۔

(بحوالہ اعلاء السنن ۴۵۶/۱۱)

امام ابوالولید الباجی "المنتقیٰ" میں لکھتے ہیں۔

فمن اوقع الثلاث بلفظة واحدة لزمه ما اوقعه من الثلاث وبه قال جماعة الفقهاء والدلیل علی ما نقوله اجماع الصحابة لان هذا روی عن ابن عمر وعمران بن حصین وعبداللہ بن مسعود وابن عباس وابی هریرة وعائشة ولا مخالف لهم۔	جس شخص نے ایک کلمہ سے تین طلاقیں دیں تو اس کی دی ہوئی یہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی جماعت فقہاء اسی کی قائل ہے ہمارے اس قول کی دلیل صحابہ کا اجماع ہے کیونکہ یہی فیصلہ عبداللہ بن عمر، عمران بن حصین، عبداللہ ابن مسعود ابن عباس، ابوہریرہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس بارے میں ان کا کوئی مخالف نہیں۔

(بحوالہ اعلاء السنن ۴۵۵/۱۱)

امام الباجی کی اس تحریر میں مذکور حضراتِ صحابہ کے علاوہ حضرت عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوسعید خدری، انس بن مالک حسین بن علی بن ابی طالب مغیرہ بن شعبہ وغیرہ اجلہ صحابہ رضوان اللہ علیہم سے بھی یہی فیصلہ کتب

حدیث میں نقل کیا گیا ہے، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی ثابت ہے کہ ایک لفظ سے دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔ بغرض اختصار اس موقع پر صرف تین حدیثیں نقل کی جارہی ہیں

(۱) بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے۔

إنّ رجلاً طلّق امرأتهُ ثلاثاً فتزوجت فطلق فسئل النبي صلى الله عليه وسلم أتحل للأوّل قال: لا، حتّى يذوق عسيلتها كما ذاق الأوّل۔

(بخاری ص۷۹۱ ج۲، و مسلم ص۴۶۳ ج۱۔)

ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، عورت نے دوسرے سے نکاح کر لیا، شوہر ثانی نے (قبل دخول) طلاق دے دی، آنحضرتؐ سے پوچھا گیا، کیا اب یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی؟ آپ نے فرمایا نہیں! تاوقتیکہ دوسرا شوہر اس عورت سے لطفِ صحبت نہ پائے جس طرح پہلے شوہر نے لطفِ صحبت پایا ہے۔

حدیث پاک کے الفاظ "طلق امرأته ثلاثاً" بظاہر ایک ساتھ تین طلاقوں پر دال ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری ص۲۹۵ ج۹ اور علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص۵۴۳ ج۹ میں لکھتے ہیں۔

فالتمسك بظاهر قوله "طلقها ثلاثاً" فانه ظاهر في كونها مجموعة۔

یعنی امام بخاری نے طلقہا ثلاثاً کے ظاہر سے استدلال کیا ہے کیونکہ یہ الفاظ تینوں طلاقوں کے یک وقت ہونے میں ظاہر ہیں۔

لہذا بغیر کسی قرینہ کے ظاہر کو چھوڑ کر غیر ظاہر مراد نہیں لیا جاسکتا۔

(۲) ابن ابی شیبہ، بیہقی اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عمر کے طلاق کے مشہور واقعہ کو روایت کیا ہے جس کے آخر میں ہے۔

فقلت یارسول الله افرأیت لو انی طلقتها ثلاثا كان يحل لي ان اراجعها؟ قال: لا، كانت تبين منك وتكون معصية۔

اس پر میں (عبداللہ بن عمر) نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر میں اس کو تین طلاقیں دیدیتا تو کیا میرے لئے اس سے رجعت کر لینا حلال ہوتا؟ آپ نے فرمایا نہیں! وہ تجھ سے جدا ہوجاتی اور یہ کارروائی معصیت ہوتی۔

اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ تین طلاقوں کے بعد رجوع کرلینا حلال نہیں اور اس حدیث کے راویوں پر جو کلام کیا گیا ہے اس کا شافی جواب حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب محدث اعظمی رحمہ اللہ نے "الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ" میں دیا ہے۔

(۴) دارقطنی نے روایت کی ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بی بی عائشہ خثعمیہ کو اس طرح طلاق دی کہ "اذھبی فانت طالق ثلاثا" یعنی تو چلی جا تجھ کو تین طلاق ہے، عائشہ چلی گئیں بعد میں جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ عائشہ کو جدائی کا بڑا رنج ہے تو رو دیئے اور فرمایا:

لولا انی سمعت جدی او حدثنی ابی انہ سمع جدی یقول: ایما رجل طلق امرأتہ ثلاثا مبھمۃ او ثلاثا عند الاقراء لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ لراجعتھا۔

یعنی اگر میں نے اپنے نانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا یا یوں فرمایا کہ اگر میں نے اپنے والد سے اور انھوں نے میرے نانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا کہ جو شخص اپنی بیوی کو تین مبہم یعنی بیک لفظ تین طلاق دیدے یا تین طہروں میں تین طلاقیں دے تو جب تک وہ عورت دوسرے سے نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی تو میں عائشہ سے رجعت کرلیتا۔

یہ حدیث حسن لذاتہ یا حسن لغیرہ سے کم نہیں ہے، لہذا یہ بھی حجت ہے اور اس کے دو راویوں پر جو معمولی کلام کیا گیا ہے اس کا جواب "الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ" میں ہے، ان کے علاوہ اور متعدد احادیث صریحہ موجود ہیں۔ جن میں سے دو صحیح حدیثوں کا تذکرہ آگے آرہا ہے، ایک محمود بن لبید والی روایت اور دوسری عویمر عجلانی کا واقعہ۔

غیر مقلد مفتی صاحب کے دلائل کی حقیقت

موصوف نے اپنے فتویٰ کی تائید میں حضرت رکانہ کی حدیث کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

انہ طلق امرأتہ سھیمۃ البتۃ فاخبر بذالک النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال، واللہ ما اردت الا واحدۃ فقال

حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو لفظ بتہ سے طلاق دیدی اس کی اطلاع آنحضرت ﷺ کو دی اور کہا بخدا میں نے ایک طلاق کی نیت کی تھی، تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اردت الا واحدۃ؟ فقال رکانۃ: واللہ ما اردت الا واحدۃ فردھا الیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فطلقھا الثانیۃ فی زمان عمر والثالثۃ فی زمان عثمان، رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی الا انھم لم یذکروا الثانیۃ والثالثۃ۔ (مشکوۃ ص۲۸۴)

آنحضرت ؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ واقعی تم نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا؟ انھوں نے قسم کھا کر کہا ہاں! میں نے صرف ایک ہی کی نیت کی تھی تو آنحضرت ؐ نے ان کی جانب ان کی بیوی کو لوٹا دیا، پھر رکانہ نے انھیں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں دوسری اور حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں تیسری طلاق دے دی

لفظ بتہ کے مصداق کے بارے میں امام سفیان ثوریؒ اور اہل کوفہ ابوحنیفہؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک یا تین طلاقیں مراد لی جاسکتی ہیں، امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ دو کا ارادہ بھی درست ہے، بس غیر مقلد مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ میں "بتہ" کا جو ترجمہ طلاق مغلظ سے کیا ہے وہ غلط ہے اور تلبیس پر مبنی ہے، مفتی صاحب کا یہ رویہ علمی دیانت کے سراسر منافی ہے، بتہ کا لفظ طلاق مغلظ کے معنی میں متعین ہوتا تو آنحضرت ؐ رکانہ سے سوال ہی کیوں فرماتے کہ تم نے اس لفظ سے کیا نیت کی تھی، یہ سوال اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک کا ارادہ کرنے سے ایک اور تین کا ارادہ کرنے سے تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہوں، نیز اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی تو ایک اور تین میں سے کسی ایک کی تعیین بھی بے معنی ہوگی پھر اس حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ لفظ بتہ سے تین طلاقیں یکبارگی پڑسکتی ہیں، ورنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رکانہ کو قسم دے کر ان کی نیت کیوں معلوم کرتے، اس لئے یہ حدیث تو جمہور کے مسلک کی تائید کر رہی ہے، نہ کہ مفتی صاحب کے مزعومہ کی، پھر نہ جانے کیا سوچ کر انھوں نے یہ حدیث اپنے فتویٰ میں نقل کی ہے عہ

عہ واضح رہے کہ مذکورہ روایت کے بعض طرق میں لفظ البتۃ کے بجائے ثلاثا کا لفظ آیا ہے مگر محدثین کے نزدیک ثلاثا والی روایت نہایت ضعیف ہے جو کسی درجہ میں قابل استدلال نہیں ہے۔
(نووی شرح مسلم ص۴۷۸ ج۱، محلی لابن حزم ص۱۶۸ ج۱۰)

اسی طرح موصوف نے حضرت محمود بن لبید کی حدیث بھی نقل کی ہے، اور اپنی حاشیہ آرائی کے ذریعہ یہ تأثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ حدیث ان کے حق میں جارہی ہے جب کہ یہ بھی ان کا نرا زعم ہے، اسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیک لفظ تین طلاقوں پر آپ انتہائی ناراض ہوئے، آنحضرت م کی اسی ناراضگی کی بنا پر علمائے احناف اس قسم کی طلاق کو بدعی اور مکروہ کہتے ہیں لیکن اس سخت ناراضگی کے باوجود حسب تصریح قاضی ابوبکر ابن العربی (ابن العربی کے اس قول کو امام ابن القیم نے بغیر کسی تبصرہ کے ذکر کیا ہے) آپؐ نے ان تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا، جس طرح عویمر عجلانی رضؓ کی تینوں طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا (دیکھئے تہذیب سنن ابی داؤد ص۱۲۹ ج۳ طبع مصر)

لہٰذا یہ روایت بھی جمہور کی مؤید ہے۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ظاہر قرآن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یکبارگی دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، اور اس طرح طلاق دینے والے پر اس کی بیوی حرام ہوجائے گی، امام شافعی علیہ الرحمہ کتاب الام ص۱۶۵ ج۵ میں لکھتے ہیں۔

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غيره. القرآن. والله اعلم يدل على من طلق زوجة له دخل بها اولم يدخل بها ثلاثا لم تحل له حتی تنکح زوجا غيره.

سو اگر اس نے اس کو اور طلاق دیدی تو اب وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے، امام شافعی رح فرماتے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ قرآن کریم کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں خواہ اس سے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو تو وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے۔

اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ امام شافعی رح اس عورت کے لئے بھی یہ حکم عام مانتے ہیں جس سے ہم بستری نہ ہوئی ہو تو وہ تین طہر تک غیر مدخول رہتے ہوئے دوسری و تیسری طلاق کی اہل کیسے رہے گی، کیونکہ وہ تو پہلی ہی طلاق سے اپنے شوہر سے بائن اور جدا ہوچکی ہے، اس لئے آیت کا ظاہر اسی بات کا مؤید ہے کہ تین طلاقیں جو ایک مجلس میں دی گئی ہیں وہ تین ہی مانی جائیں گی،

ہاں، عموم الفاظ اور دیگر دلائل سے ہر طہر میں الگ الگ دی گئی طلاق بھی اس کے عموم میں شامل ہے چنانچہ علامہ ابن حزم ظاہری "فان طلقہا فلا تحل لہ من بعد" کے تحت لکھتے ہیں۔

فھذا یقع علی الثلاث مجموعۃ ومفرقۃ ولا یجوز ان یخصص بھذہ الآیۃ بعض ذالک دون بعض بغیر نص، (محلی ص۲۰۷ ج ۱۰)

یعنی فان طلقہا کا لفظ ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتا ہے جو اکٹھی ہوں اور ان پر بھی جو متفرق طور پر ہوں، اور بغیر کسی نص کے اس لفظ کو کسی خاص طلاق پر محمول کرنا غلط ہے۔

اور جو لوگ ابوالصہباء کی ایک روایت کی بنیاد پر یہ خیال باندھے بیٹھے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دینا حضرت فاروق اعظم رض کے زمانہ سے شروع ہوا ہے، اس سے پہلے ان کو ایک طلاق قرار دیا جاتا تھا، یہ محض فریب خوردگی ہے، کیونکہ وہ روایت اولاً تو صحیح نہیں بلکہ محض وہم اور غلط ہے، علامہ ابن عبدالبر رح نے اس کی تصریح کی ہے نیز وہ شاذ اور منکر ہے اور دیگر متعدد وجوہ سے قابل استدلال نہیں ہے، جس کی تفصیل الاعلام المرفوعہ میں ہے، علاوہ ازیں محدث ابوزرعہ، علامہ ابوالولید باجی، قاضی ابومحمد عبدالوہاب ابن العربی اور علامہ ابن قدامہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ عہد نبوی، دور صدیقی اور ابتدائی دور فاروقی میں لوگ تین طلاقوں کے استعمال کے عادی نہیں تھے بلکہ ایک ہی طلاق دے کر چھوڑ دیتے تھے، عدت کے بعد عورت بائنہ ہوجاتی تھی، بعد میں لوگ تینوں طلاقیں ایک ساتھ دے کر فوراً بائنہ کرنے لگے تو حضرت عمر رض نے نئی پیش آمدہ صورت کے بارے میں صحابہ کرام سے مشورہ کیا، تو بالاتفاق یہ طے پایا کہ جس طرح ایک طلاق دینے سے واقع ہوجاتی ہے اگر کوئی نادانی یا جہالت سے تین طلاقیں ایک ساتھ دیدے گا تو وہ بھی واقع ہوجائیں گی۔ فالحدیث علی ھذا اخبار عن الواقع لا عن المشروع؛ یعنی حدیث میں صورت حال کا بیان ہے، مسئلہ طے کرنے کا بیان نہیں ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے حکومت سعودیہ کی تحقیقاتی کمیٹی کا فیصلہ (حکم الطلاق الثلث بلفظ واحد مجلۃ البحوث الاسلامیۃ المجلد الاول العدد الثالث ۱۳۹۷ھ شائع شدہ از ریاض)۔

اگر بالفرض مان لیا جائے کہ حضرت عمر رض کے زمانہ ہی میں یہ فیصلہ ہوا ہے تو یہ فیصلہ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے، ایجاد بندہ نہیں ہے، جیساکہ مشہور غیر مقلد مولانا ابراہیم سیالکوٹی المتوفی ۱۳۷۵ھ نے

اعترافِ حق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے (اخبار اہل حدیث ۱۵ر نومبر ۱۹۲۹ء) دلائل کی اسی قوت نے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (جنھیں غیر مقلدین اپنا پیشوا گردانتے ہیں) کو مجبور کیا کہ وہ اپنے مقتدا حافظ ابن القیم اور علامہ ابن تیمیہ کے تفرد اور شاذ مسلک کو چھوڑ کر اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ ہی کی پیروی کریں (الهدیۃ السُّنیۃ بحوالہ وعایات مکشفیہ از مولانا منظور نعمانی مدظلہ)

حرمین شریفین کی مجلس کبار علماء بھی کافی بحث وتحقیق کے بعد بالآخر اسی نتیجہ پر پہونچی کہ اس مسئلہ میں حق وصواب جمہور ہی کے ساتھ ہے، اور اب حرمین شریفین میں ارباب افتاء وقضاء مجلس کے فیصلہ کے مطابق جمہور ہی کے قول پر فتویٰ دینے کے پابند ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ امت کا یہ سوادِ اعظم شریعت کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے یا وہ مٹھی بھر لوگ جو ظاہر قرآن، احادیث صحیحہ، اجماع صحابہ اور مذہب سلف وخلف کو پس پشت ڈالکر خوارج اور روافض کی ہم زبانی وترجمانی میں اپنا زور صرف کر رہے ہیں ایک ایسے وقت میں ب کہ ملت اسلامیہ ہند اپنی جان ومال اور عزت وشریعت کے بارے میں انتہائی تشویشناک ورتِ حال سے دوچار ہے، اس مسئلہ کو چھیڑ کر اسلام اور مسلمانوں کے یہ نادان دوست ت اسلامیہ کی نہ معلوم کون سی خدمت انجام دے رہے ہیں، درحقیقت یہ لوگ اپنے اس ط رویہ سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو تقویت پہونچا رہے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ آمین صلی اللہ علی النبی الکریم۔



ایک اہم فتویٰ

تین طلاقوں کی حیثیت

کتاب و سنت کی روشنی میں

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مفتی اعظم دار العلوم دیوبند و مظاہر علوم سہارنپور، یو، پی

استفتاء ۵۸۔ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام مسئلہ ذیل میں:۔

۱۔ طلاق رجعی بائن مغلظہ کسے کہتے ہیں اور اس کے کیا احکام ہیں۔

۲۔ ایک مجلس میں تین طلاق دینے سے کتنی طلاق واقع ہوتی ہیں، قرآن و حدیث کے دلائل کے ساتھ بالتفصیل جواب مرحمت فرمائیں۔ المستفتی العبد انوار احمد جامعی۔

باسمہ سبحانہ و تعالیٰ۔

الجواب:۔ حامداً و مصلیاً:۔ جب ایک شخص نے اپنی مدخولہ بیوی کو ایک دفعہ کہا کہ "میں نے تجھے طلاق دی"، تو اس سے طلاق رجعی واقع ہوگئی، جب دوسری دفعہ عدت ختم ہونے سے پہلے اسی مجلس یا دوسری مجلس میں کہا "میں نے تجھے طلاق دی" تو دوسری طلاق رجعی واقع ہوگئی، ان دو طلاقوں کا حکم یہ ہے کہ اندرون عدت اس کو رجعت کا حق حاصل ہے، اگر اس نے ایک دفعہ یا دو دفعہ طلاق دے کر رجعت نہیں کی اور عدت گذر گئی تو حق رجعت ختم ہوگیا، طرفین کی رضامندی سے تجدید نکاح کی اجازت ہے، حلالہ کی ضرورت نہیں۔

یہی حکم اس وقت ہے جب اس طرح کہا ہو کہ "میں نے تجھے طلاق دی" دو طلاق الگ الگ دینے اور بیک لفظ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر تیسری دفعہ اسی مجلس میں یا بعد میں عدت ختم ہونے سے پہلے کہا کہ "میں نے تجھے طلاق دی"، تو اب طلاق مغلظہ ہوگئی، اب بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح کی بھی گنجائش

صفحہ ۱۴

یہی حکم اس وقت ہے جب اس طرح کہا ہو کہ میں نے تجھے تین طلاق دی۔ تین طلاق الگ الگ دینے اور بیک لفظ دینے سے وقوع طلاق میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اگرچہ ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا بہت مذموم و قبیح ہے جیسے کہ حالت حیض میں طلاق دینا مذموم و قبیح ہے، اس سے اجتناب لازم ہے، لیکن اگر اس طرح طلاق دیگا تب بھی بلاشبہ واقع ہو جائے گی۔

یہ مسئلہ قرآن کریم کی آیت الطلاق مرتان الی قولہ تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ اھ سے ماخوذ ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دو دفعہ طلاق کے بعد رجعت کا حق حاصل ہے تیسری کے بعد حق نہیں. نکاح بالکل ختم ہو کر حرمت مغلظہ ہو جاتی ہے. ایک مجلس یا دو تین مجلس کی قید نہیں بلکہ مطلق ہے۔

جب مسئلہ کی دلیل قرآن حکیم میں موجود ہو تو پھر کسی اور دلیل پر اس کا ثبوت موقوف نہیں لیکن حدیث بھی چونکہ قرآن کریم کے لئے شرح اور تفسیر کے درجہ میں ہے اس لئے اس سے بھی مسئلہ کی تائید اور تقویت پیش کرنا ضروری ہے

اصح الکتاب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف ۸۰۱ میں ہے کہ عویمر عجلانی رضنے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث مذکور ہے ۴۸۹ ابو داؤد شریف ۳۰۶ ج ۲ کے الفاظ یہ ہیں فطلقها ثلث تطليقات عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فانفذه رسول الله صلى الله عليه وسلم اھ

علامہ شوکانی نے نیل الاوطار ۲/۲۴۴ میں لکھا ہے ورجاله رجال الصحيحين جمع الفوائد ۶۲۲/ ج۱ میں بھی بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ کے حوالہ سے مذکور ہے۔

نسائی شریف ۹۹ ج۲ میں عنوان قائم کیا ہے الثلث المجموعة وما فيها من التغليظ اس کے ذیل میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ ایک شخص نے تین طلاق یکدم دیدی "طلق امرأته ثلث تطليقات جميعا" تو آپ غضبناک ہوئے اس لئے کہ تین طلاق یکدم دینا مذموم و قبیح ہے مگر یہ نہیں فرمایا کہ یہ واقع نہیں ہوئی، پھر امام نسائی نے باب منعقد کیا ہے "باب الرخصة فی ذالک" اس میں عویمر عجلانی رض کا تین طلاق دینے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

امام بخاری رح نے باب من اجاز طلاق الثلث منعقد کر کے عویمر عجلانی رض کا واقعہ بیان کیا ہے جس میں

تین طلاق دینا مذکور ہے، اسی باب میں امرأۃ رفاعہ کا واقعہ لکھا ہے جن کو بغیر حلالہ کے شوہر اول کے لئے جائز نہیں فرمایا، حضرت عائشہؓ کی حدیث بیان کی ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی تھی اس کو بھی بغیر حلالہ کے شوہر اوّل کے لئے جائز نہیں فرمایا۔

سنن دارقطنی ص۴۳۳ میں حضرت علیؓ کی روایت مرفوعاً ہے، من طلق البتۃ الزمناہ ثلاثا فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ اھ جو شخص طلاق البتہ دیدے اس پر بھی تین طلاق کو لازم کردیا گیا، حالانکہ اس نے لفظ طلاق تین دفعہ کہا نہ لفظ ثلث کہا۔

اس سے بھی زیادہ صاف اور مفصل بطور ضابطہ کلیہ کے فرمادیا گیا جو کہ روافض کے لئے خاص طور پر قابل غور ہے۔ ایما رجل طلق امرأتہ ثلاثا مبھمۃ او ثلاثا عند الاقراء لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ اھ (دارقطنی ص۴۳۷) یعنی جو شخص بھی اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے خواہ تینوں مبہم طور پر یک وقت دے خواہ تین طہر میں الگ الگ دے وہ اس کے لئے جائز نہیں رہی جب تک حلالہ نہ ہوجائے

سلف کا اجماع بھی اسی پر ہے چنانچہ حافظ ابوبکر جصاص رح نے احکام القرآن جلد اول ص۴۵۹ میں لکھا ہے فالکتاب والسنۃ و اجماع السلف توجب ایقاع الثلث معا وان کانت معصیۃ، پس یہ مسئلہ کتاب وسنت واجماع سے اسی طرح ثابت ہے، ائمہ اربعہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ احمدؒ رحمہم اللہ تعالیٰ سب اسی پر متفق ہیں، البتہ روافض اور اہل الظاہر (داؤدی) تین طلاق کے منکر ہیں، دو چیزوں سے ان کو شبہ پیدا ہوگیا، ایک ابن عباس کا مقولہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کے وقت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے شروع دو سال میں تین طلاق ایک تھی پھر حضرت عمرؓ نے تین کو تین ہی قرار دیدیا مگر شروح حدیث نووی، عینی، فتح الباری، بذل المجہود، اوجز المسالک وغیرہ میں اس پر آٹھ طرح سے کلام کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مقولہ مسئلہ مذکور پر استدلال کے لئے کافی نہیں ہے، صاحب استذکار فرماتے ہیں ان ھذہ الروایۃ وھم وغلط لم یعرج علیھا احد من العلماء اھ یعنی یہ روایت وہم اور غلط ہے، علماء میں سے کسی نے بھی اس کو قابل التفات نہیں سمجھا (الجواہر النقی ج۲ ص۱۱۳)

اس سے زیادہ سخت الحسین بن علی الکرابیسی نے کتاب ادب القضا میں روایت کیا ہے، اخبرنا علی بن عبد اللہ (وھو ابن المدینی، عن عبد الرزاق عن معمر عن ابن طاؤس عن طاؤس انہ قال من حدثک عن طاؤس انہ کان یروی طلاق الثلث واحدۃ کذبہ اھ

یعنی طاؤس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ جو تم سے بیان کرے کہ طاؤس حدیث طلاق الثلث واحدۃ کو روایت کرتے ہیں، تم اس کی تکذیب کرنا، اس کو جھوٹا سمجھنا، میں اس کو روایت نہیں کرتا، میری طرف اس کی نسبت غلط ہے اھ۔

نیز حضرت ابن عباس کی دوسری روایت اس مقولہ کے خلاف ہے اور وہ روایت قرآن کریم مستند احادیث اور اجماع سلف کے موافق ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن ابن عباسؓ والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروء ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق اللہ فی ارحامھن الآیۃ وذالک ان الرجل کان اذا طلق امرأتہ فھو احق برجعتھا وان طلقھا ثلثاً فنسخ ذالک فقال ـــــ الطلاق مرتان الآیۃ (ابو داؤد شریف باب فی نسخ المراجعۃ بعد التطلیقات الثلث اھ (بذل المجہود ص۶۱ ج ۳)

یعنی تین طلاق کے بعد بھی رجعت کی اجازت تھی اس کو اس آیت نے منسوخ کردیا الطلاق مرتان الآیۃ ایسا نہیں تھا کہ تین طلاق دینے پر بھی ایک ہی ہوتی، البتہ تین کے بعد بھی رجعت کا حق تھا نزول آیت کے بعد وہ حق ختم ہوگیا۔

اگر بالفرض شراح کے پیش کردہ اشکالات کے باوجود ابن عباس کی سبت کردہ مقولہ کو صحیح کرلیا جائے تو اس کا ایک بے غبار مطلب یہ ہے کہ تین الفاظ سے تین طلاق دے کر اگر کوئی شخص کہتا کہ میری نیت دوسرے اور تیسرے لفظ سے تاکید کی تھی جدید طلاق کی نیت نہیں تھی تو غلبۂ صدق اور سلامت صدر کی بنا پر اس کا قول قضاءً تسلیم کرلیا جاتا اور ایک ہی طلاق کا حکم کیا جاتا تھا۔

پھر جب حضرت عمرؓ کے وقت میں طلاق ثلث کے واقعات بکثرت پیش آنے لگے اور صدق میں کمی ہوئی تو انھوں نے تین لفظ سے تین ہی طلاق کا حکم فرمادیا اور نیت تاکید کو نہیں مانا اصل بھی یہی ہے کہ تین طلاق سے تین ہی کا حکم ہو غلبۂ صدق کی بنا پر اصل کے خلاف ہونے کے جو نیت کا اعتبار کرنے کی جو وجہ تھی وہ ختم ہوگیا اور اس کلام کا اصل مطلب جو تھا وہی متعین کردیا گیا نہیں تھا کہ تین کو ایک تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ تین کا ایک ہونا تو کسی طرح بھی درست نہیں، ابن عباسؓ صریح فتویٰ بھی یہی ہے کہ تین طلاق ایک مجلس میں دینے سے بھی تین ہی واقع ہوتی ہیں جیسا کہ ابوداؤد شریف میں ہے کہ مجاہدؒ، ابن جبیرؒ، عطاءؒ، مالکؒ، ابن الحارثؒ، عمرو بن دینارؒ سب نے

ابن عباسؓ کا فتویٰ یہی نقل کیا ہے عن ابن عباسؓ کلھم قالوا فی الطلاق الثلث انہ اجازھا اھ (بذل ص ج ۳)
اس لئے بھی ابن عباس کے اس مقولہ کے ذریعہ تین طلاق کو ایک قرار دینا صحیح نہیں۔

شبہ کی دوسری وجہ حدیث رکانہ ہے، اس پر محدثین نے کلام کیا ہے کہ یہ واقعہ رکانہ کا ہے یا ابو رکانہ کا نیز اس کی سند میں بعض راوی ایسے ہیں جن کی روایت ضعیف و معلول ہے۔ خیر اس سب سے قطع نظر اصل واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے صراحۃً تین طلاق نہیں دی تھی بلکہ طلاق البتہ دی تھی، چونکہ طلاق البتہ بھی بعض دفعہ تین کی جگہ استعمال ہوتی تھی اس لئے ان سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف دیکر پوچھا کہ تمھاری نیت ایک ہی طلاق کی تھی اس نے بحلف جواب دیا کہ جی ہاں! ایک ہی طلاق کی تھی اس لئے آپ نے اس کو ایک ہی قرار دیا۔

ترمذی شریف ص ۱۴۰ ج ۱ میں ہے عن عبداللہ بن یزید بن رکانۃ عن ابیہ عن جدہ قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت یا رسول اللہ انی طلقت امرأتی البتۃ فقال ما اردت بھا فقلت واحدۃ قال قال واللہ قلت واللہ قال فھو ما اردت اھ اسی کو امام ابوداؤد نے اصح کہا ہے (بذل ص ج ۳)

جن روایات میں طلقتھا ثلثا ہے وہ روایت بالمعنی ہے اس لئے اس البتہ میں اختلاف ہے حضرت عمرؓ اس کو ایک قرار دیتے ہیں، حضرت علیؓ تین قرار دیتے ہیں، امام ثوری اور اہل کوفہ نیت پر مدار رکھتے ہیں، ایک کی نیت ہو تو ایک ہے تین کی ہو تو تین ہے، امام شافعیؒ بھی نیت پر مدار رکھتے ہیں بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ دو کی نیت ہو تو دو کا حکم ہوگا، امام ترمذیؒ نے یہ سب اقوال نقل کئے ہیں۔ وقد اختلف اھل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرھم فی طلاق البتۃ فروی عن عمر بن الخطابؓ انہ جعل البتۃ واحدۃ وروی عن علی انہ جعلھا ثلثا وقال بعض اھل العلم فیہ نیۃ الرجل ان نوی واحدۃ فواحدۃ وان نوی ثلاثا فثلث وان ثنتین لم تکن الا واحدۃ وھو قول الثوری واھل الکوفۃ۔ وقال مالک بن انسؒ فی البتۃ ان کان قد دخل بھا فھی ثلث تطلیقات وقال الشافعی ان نوی واحدۃ فواحدۃ یملک الرجعۃ وان نوی ثنتین فثنتین وان نوی ثلثا فثلث اھ

(ترمذی شریف ص ۱۴۰ ج ۱)

تین طلاق سے متعلق آثار صحابہ

موطاامام مالک

(۱) اثر ابن عمر رضی اللہ عنہ:۔ بخاری و مسلم میں مذکور ہے کان ابن عمر اذا سئل عمن طلق ثلثا قال لو طلقت مرة او مرتين فان النبي صلى الله عليه وسلم امرني بهذا فان طلقتها ثلاثا حرمت عليك حتى تنكح زوجا غيره یعنی جب کوئی شخص تین طلاق دیکر حضرت ابن عمر سے فتویٰ پوچھتا تو وہ فرماتے کہ اگر تم نے ایک بار یا دو بار طلاق دی ہوتی (تو رجعت کر سکتے تھے اس لئے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اسی کا حکم کیا تھا، لیکن اگر تم نے تین طلاق دیدی ہیں تو وہ تم پر حرام ہو گئی جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرے تمھارے لئے حلال نہیں ہو سکتی، حضرت ابن عمر سے وقوع ثلاث کا فتویٰ مصنف عبدالرزاق والی روایت جوہر ص ۱۱۰ ج ۲ میں ہے۔

(۲) اثر عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ:۔ موطائے مالک ص۹۹ میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے اپنی بی بی کو آٹھ طلاقیں دیدیں آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ (یعنی صحابۂ کرام) کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ میری بی بی بائن ہو گئی، ابن مسعود نے فرمایا کہ وہ لوگ سچ کہتے ہیں حکم شرعی ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اور سنن سعید بن منصور میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دے ڈالیں۔ اس نے ابن مسعود سے مسئلہ پوچھا تو فرمایا بانت منك بثلاث وسائرهن عدوان (ترجمہ) وہ تین طلاق سے بائن ہو گئی اور باقی طلاقیں تعدی اور زیادتی ہیں۔ اس اثر کی سند یہ ہے سعيد قال نا ابو معاوية قال نا الاعمش عن ابراهيم عن علقمة (باب التعدي في الطلاق)

(۳) اثر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ:۔ موطا اور شرح معانی الآثار میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ کوئی اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دیدے تو کیا حکم ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کی عورت ایک طلاق سے بائنہ ہو جائے گی، اور تین سے ایسی حرام ہو جائے گی کہ جب تک دوسرا شوہر نہ کرے گی حلال نہ ہوگی، سنن سعید بن منصور میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے ساتھ ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس کا یہ فتویٰ مروی ہے کہ جو غیر

مدخولہ کو تین طلاقیں دیدے اس کے لئے وہ اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرلے۔

(۴) اثر حضرت انس رضی اللہ عنہ:۔ شرح معانی الآثار میں ہے کہ حضرت انس رضؓ مطلقہ ثلاث کی نسبت یہ فتویٰ دیتے تھے کہ وہ جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرے پہلے کیلئے حلال نہیں ہوسکتی۔

(۵) اثر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ:۔ مؤطا اور شرح معانی الآثار میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس و ابوہریرہ رضؓ سے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بی بی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دیدی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ ایک طلاق اس کو بائنہ کرنے کے لئے کافی ہے اور تین سے تو ایسی حرام ہوجائے گی کہ جب تک دوسرا نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔

ان آثار کے علاوہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عائشہ نے بھی وقوع ثلاث کا فتویٰ دیا۔ فتح القدیر میں حضرت علی اور حضرت عائشہ کا یہ مذہب صاحب سبل السلام اہل حدیث نے درج کیا ہے، حضرت ابن عباس کا فتویٰ مؤطا امام مالک، شرح معانی الآثار اور دار قطنی میں موجود ہے حضرت عمر کا فتویٰ شرح معانی الآثار اور دار قطنی میں مذکور ہے کہ تین مرتبہ طلاق دینے سے بھی تین ہی واقع ہونگی

وقوع ثلاث پر صحابہ کرام کا اجماع

شرح معانی الآثار ص۳۳ج۲ فتح الباری ص۲۹۳ج۹ اعلان الموقعین ص۲۷ج۲ وغیرہ میں مذکور ہے کہ حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں صحابۂ کرام کے مجمع میں فرمایا کہ لوگوں کے واسطے طلاق کے معاملہ میں بڑی گنجائش اور خاصی مہلت تھی کہ ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق دیتے اس صورت میں ان کے لئے رجعت کا کافی موقع ملتا، لیکن لوگوں نے جلد بازی کی اور ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے لگے، لہذا ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی اور رجعت جائز نہ ہوگی۔ صحابۂ کرام میں سے کسی نے حضرت عمر رضؓ کی مخالفت نہ کی بلکہ سب نے موافقت کی۔

علامہ ابن تیمیہ کا مذہب ائمہ اربعہ سے جداگانہ ہے وہ ان سب سے منفرد ہیں، وہ تین صریح طلاق کو ایک ہی مانتے ہیں، ان کے تلمیذ علامہ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں اس پر بڑی طویل بحث کی ہے مگر ان کے تلامذہ اور ان کے اقران اہل علم ان کے ساتھ نہیں سب مخالف ہیں، حتیٰ کہ علامہ ابن رجب نے مستقل کتاب اس پر تصنیف کی ہے جس میں اغاثۃ اللہفان کے پیش کردہ دلائل کو پوری طرح رد کردیا ہے اور ہر چیز کا جواب شافی دیا ہے اس کا نام بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلاث واحدۃ ہے۔



بے بنیاد اور ناقابل فہم سمجھوتہ

اسلام خالص دین توحید ہے۔ اس میں صرف خدا پرستی کا جواز ہے، غیر اللہ کی چاہے نبی رسول ہوں یا فرشتے یا کوئی بزرگ ولی یا دیگر مظاہر قدرت، سورج چاند آگ، اینٹ، پتھر، مورتی یا جانور پرستش کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام تصور توحید کی بقاء وحفاظت کی خاطر ہر طرح کی قربانی اور قیمت ادا کرنے کیلئے تیار ہے۔ اس معاملہ میں اس قدر غیور واقع ہوا ہے کہ تمام اعمال صالحہ ایک طرف اور ادنی ارتکاب شرک ایک طرف، سب کو حبط کرکے رکھ دیگا چاہے اس کا مرتکب کوئی ہو، سمجھوتے کا کوئی سوال نہیں۔

قرآن حکیم کی سورہ ۶ کے ایک ہی رکوع میں اٹھارہ حضرات انبیاء کے اسماء گرامی ذکر کئے گئے ہیں، اور بقیہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا اجمالاً ذکر ومن ابائهم وذریاتهم واخوانهم میں کردیا گیا ہے، اور آخر میں تمام حضرات انبیاء اور ان کی ذریات کے بارے میں کہا گیا ہے۔

"اگر وہ لوگ بھی شرک کرتے تو یقینی طور پر وہ کچھ ضائع ہوجاتا جو انھوں نے کیا تھا (ولو اشرکوا لحبط عنهم ما کانوا یعملون (سورۂ انعام پ رکوع ۱۱)

اس آیت سے تصور وتعلیم توحید کی اہمیت اور شرک کی مضرت وقباحت کی شدت کو محسوس کیا جاسکتا ہے، حضرات انبیاء سے ارتکاب شرک شرعًا محال ہے تو اگر بالفرض ان سے بھی (نعوذ باللہ) صدور شرک ہوجاتا تو ان کے تمام اعمال ضائع ہوجاتے۔

بالکل یہی بات دوسری جگہ سورۃ ۹۳ میں خصوصی طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے کہی گئی ہے (سورۃ الزمر پ۲۴ رکوع ۷) یہی وجہ ہے کہ ہر دور، ہر زمانے میں باشعور اہل ایمان کے ذہن میں توحید کا تصور وعقیدہ اور شرک کی قباحت ومضرت راسخ رہی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوئی

لیکن جس طرح چشمہ سے نکلا ہوا پانی جوں جوں اپنے منبع سے دور ہوتا جاتا ہے باہری گرد و غبار سے اس میں تھوڑا گدلاپن آ ہی جاتا ہے، ایسا ہی کچھ اسلامی تصور توحید کے ساتھ بھی ہوا کہ اس کے چشمۂ صافی میں عجمی افکار و خیالات اور منافی توحید نظریات کے گرد و غبار نے کچھ بلکہ کہئے کہ بہت حد تک گدلاپن پیدا کر دیا اور ہندوستان میں اسلام جہاں بقول علی میاں ندوی" ترکستان، ایران اور افغانستان کا چکر کاٹ کر اپنی بہت کچھ تازگی اور توانائی کھو کر ان لوگوں کے ذریعہ پہونچا جو براہ راست فیضان نبوت سے مستفیض نہیں ہوئے تھے اور جن میں سے بہت سے اپنے قومی اور نسلی اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے تھے؛ اور جن کے رگ و پے میں وثنیت اور شرک جاری و ساری تھا اور جو ان آخری صدیوں میں وثنیت کا سب سے بڑا نمائندہ اور جاہلیت قدیم کا امین و محافظ رہ گیا تھا۔[1] اس کا رنگ اور گہرا اور چوکھا ہو گیا۔[2]

گرچہ علماء حق اور حضرات صوفیاء باصفا نے چشمۂ توحید کو اپنی حالت میں صاف ستھرا رکھنے کی اپنی سی ہر ممکن کوشش کی لیکن فلسفۂ ویدانت راہ اعتدال سے ہٹی ہوئی آزاد فارسی اردو شاعری اور عجمی تصوف اپنا اثر دکھا کر ہی رہا، اور رہی سہی کسر غلط نظریہ وحدت الوجود نے پوری کر دی، پھر کیا تھا، بت پرستی عین خدا پرستی ہو گئی، حق پرستی بت پرستی کے مترادف ہو گئی، کفر و اسلام کی تفریق پر اظہار حیرت کیا جانے لگا کہ ؎

در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دیں چرا است
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است[3]

اور یہ کہ تمام مذاہب برحق ہیں (سچے ہیں) راستے الگ الگ ضرور ہیں لیکن سب کی منزل ایک ہی ہے سب میں حق کی جلوہ گری اور سچائی کی روشنی نظر آتی ہے، نتیجۃً اب یہ وقت کا سب سے زیادہ چلتا ہوا نظریہ بن گیا ہے اور لہرا کے کہا جاتا ہے۔

چشم وحدت سے گر کوئی دیکھے
بت پرستی بھی حق پرستی ہے (جوشش)

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ص ۱۳۰ مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ، نیز مقدمہ سیرت سید احمد شہید۔ [2] اس کی خوبصورت اور عبرت انگیز تصویر کشی علامہ حالی نے مسدس میں کی ہے۔
[3] عابد رضا بیدار کی کتاب نئے اور پرانے چراغ ص ۱۲۵ مطبوعہ رام پور ۱۹۶۸ء

بہادر شاہ ظفر (جو عقیدۃً و عملاً شیعہ ہوگیا تھا) کا ایک شعر ہے

مئے وحدت کی ہم کو مستی ہے
بت پرستی خدا پرستی ہے

شاہ نیاز بریلوی ایک عظیم صوفی گذرے ہیں وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے ان کا کہنا ہے

جو رب الحرم ہے صنم بھی وہی ہے
میں دیر و حرم ایک ساں دیکھتا ہوں
اسے برہمن اور اُسے شیخ مانے
یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

انھیں کا ایک شعر اور ہے۔ •

یہاں تک دیا مجھ کو حسن، عروج
کہ بندہ سے مولا بنایا مجھے لہ

توحید کا یہ وہ تصور و تعلیم ہے جس سے حضرات انبیاء اور رسول پاکؐ سے لے کر تمام حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حتی کہ تابعین و محدثین ناآشنا تھے، اور ہمارا احساس تو یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ صوفیاء اور شعراء دور رسالت عہد صحابہ میں ہوتے تو یہ کہنے/ مشورہ دینے سے نہیں چوکتے کہ آپ حضرات خواہ مخواہ ہی رب الحرم اور لات ومنات (صنم کعبہ) کے جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ ایک لاحاصل اور بظاہر ایک چھوٹی سی بات کو لے کر اپنا گھر، در، اہل وعیال حتی کہ جان ومال تک کو داؤ پر لگا دیا ہے، حالانکہ رب الحرام اور صنم تو حقیقتاً ایک ہی ہیں، شاید اسی فکری انقلاب کو دیکھتے ہوئے علامہ حالی نے کہا تھا کہ بدلا گیا آ کے ہندستان میں۔

اسلامی تصور توحید اور بت پرستی، مورتی پوجا دو متضاد نظریے ہیں ایک میں صرف ایک ذات بے ہمتا خدا کی پرستش صرف وہی لائق عبادت اور معبود ہونے کے قابل ہے جب کہ دوسرے میں من سے لے کر تینتیس کروڑ تک معبودوں کا لامتناہی سلسلہ ہے، پھر دونوں میں کس طرح اتحاد

• بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اس طرح کے اشعار کو محترم پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی مشہور کتاب تاریخ مشائخ چشت جلد اول ذکر نیاز کے بیان میں عشق حقیقی کے عنوان کے تحت نقل کیا ہے۔

اور سمجھوتہ ہوسکتا ہے؟ اس کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے تو "سب مذاہب میں بنیادی سچائی موجود ہے" کیوں کر مبنی بر حقیقت ہوسکتا ہے؟ اس سوال واشکال کے رفع کے لئے کچھ لوگوں نے کہا کہ مورتی پوجا تصور توحید کے منافی نہیں ہے۔

چنانچہ مشہور لغت نویس صاحب فرہنگ آصفیہ جناب مولوی سید احمد دہلوی مرحوم اپنی لغت فرہنگ آصفیہ کی جلد اول ص۵۲ پر رقم طراز ہیں۔

"بتوں کی پوجا اور آتش واجرام کی پرستش توحید کے منافی نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ یہ دونوں لفظ ہندی وفارسی میں تعظیم وعبادت میں مشترک ومشتمل ہیں، ایک گروہ اپنے پیشوایان دین کی مورتی کو ان کے تصور کے بجائے سامنے رکھ کر ان کے توسّل سے عبادت کرتا اور نجات کا طالب ہوتا ہے اور دوسرا جرم نورانی کو سمت قبلہ کے بجائے قرار دیکر کام نکالتا ہے۔"

دیکھ رہے ہیں آپ ذہنی وفکری بھٹکاؤ؟ ابھی حال ہی میں شائع ہونے والی تازہ بتازہ کتاب ویدک دھرم اور اسلام ص۴،۵،۷، میں فرہنگ آصفیہ کے مذکورہ بالا اقتباس کو مزید زائد کے ساتھ نقل کرنے کے بعد صاحب کتاب علامہ اخلاق حسین دہلوی (قاسمی نہیں) نے لکھا ہے کہ سید احمد دہلوی نے لفظی تحقیق سے اس گتھی کو بخوبی سلجھا دیا ہے اور بتادیا کہ مورتی پوجا کا مدعا تصور کی پختگی ہے۔ لیکن راقم الحروف دلائل وحقائق کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ فرہنگ آصفیہ کی تحقیق ناکافی غور وفکر کا نتیجہ ہے اور علامہ اخلاق حسین نے جس گتھی کے بخوبی سمجھ جانے کی بات کہی ہے وہ نری لفاظی اور خود فریبانہ خوش فہمی ہے۔

بلاشبہ لفظ "پوجا" ہندی میں احترام واکرام کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے قابل احترام باپ کے لئے ہندی میں पूज्य पिताजी کہا جاتا ہے لیکن یہ پوجا کا مجازی معنی ہے حقیقی اور معنی اول عبادت ہے، فرہنگ آصفیہ سوم دہلی منشی مولوی سید احمد دہلوی کی قابل قدر تصنیف اور لائق تحسین کاوش وکارنامہ ہے تاہم ان کی ہر بات کو حرفِ آخر اور مبنی بر حقیقت سمجھنا صحیح نہیں ہوگا، فرہنگ آصفیہ کے بہت سے مقامات پر معانی الفاظ کے تعین وتبیین میں وہ غچہ کھا گئے ہیں جس کی نشاندہی متعدد اہل علم اور ماہر لسانیات نے کی ہے، مثال کے طور پر رشید حسن خاں کا نام لیا جاسکتا ہے

انھوں نے ماہنامہ فاران کراچی بابت ۱۹۶۴ء کے متعدد شماروں میں اور اپنی کتاب زبان اور قواعد (مطبوعہ انجمن ترقی اردو بیورو) میں فرہنگ آصفیہ کی بہت سی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے، ہمارے نزدیک ان ہی خامیوں/کمیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صاحب فرہنگ آصفیہ نے حقیقت سے صرف نظر کرتے ہوتے۔ "پوجا" کے بیسوں معنوں میں سے ایک مجازی معنی پر اپنے دعویٰ کی پوری عمارت کھڑی کردی جبکہ وہ خود ہی مانتے ہیں کہ لفظ پوجا عبادت واحترام دونوں میں مشترک ہے اور لفظ مشترک کا مطلب ہے اس کا مدلول ومصداق متعدد معانی ہوں، جیسے لفظ "عین" ہے، آنکھ، چشمہ کے علاوہ چالیس دیگر معنوں پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن معنی کا تعین سیاق وسباق سے کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی لفظ "پوجا" ہے اس کا متبادر معنی عبادت/پرستش ہے اور جب پوجا کو مورتی سے جوڑدیا جائے تو عبادت و پرستش کا معنی بالکل متعین ومتیقن ہوجاتا ہے، یہ بالکل سماج/معاشرہ میں رائج وشائع ہے، لہذا عبادت کے اس متعین ومتیقن معنی کو ایک مجازی معنی کا سہارا لے کر بدلا نہیں جاسکتا ہے۔

ماں باپ یا اپنے بزرگوں کی تعظیم وتکریم بلاشبہ تصور توحید کے منافی نہیں ہے لیکن ہمارے غیر مسلم بھائیوں کا اپنے بتوں اور پتھر، لکڑی، سونے، چاندی کی مورتیوں کے ساتھ جو تعظیمانہ و تکریمانہ معاملہ ہے وہ قطعی طور پر تصورِ توحید وعظمت انسانی کے منافی ہے اور جو کچھ وہ خود بنائی ہوئی مورتیوں کے ساتھ کرتے ہیں وہ اظہار تعظیم وتکریم بھی ہے اور طریقۂ عبادت وپرستش بھی اگر یہ بات نہ مانی جائے تو بتایا جائے کہ ہندو بھائیوں کے یہاں پھر طریقۂ عبادت وپرستش کیا ہے؟ اگر صاحب فرہنگ آصفیہ اور ان جیسے خیال کے دوسرے حضرات کی بات تسلیم کرلی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں عبادت وپرستش کا وجود ہی نہیں ہے، حالانکہ یقینی طور پر ہندو بھائی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اور نہ صاحب فرہنگ آصفیہ جیسے لوگ ہی۔ علامہ اخلاق حسین صاحب کہتے ہیں کہ صاحب فرہنگ آصفیہ نے لفظ پوجا کی لفظی تحقیق کرکے گتھی کو بخوبی سلجھادیا ہے[1] جب کہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے لفظ پوجا کے ایک مجازی معنی کو اصل معنی پر انطباق کرکے مسئلے کو مزید الجھادیا ہے کہ ہندوؤں میں عبادت وپرستش کا کوئی وجود وثبوت ہی نہیں ہے۔

صاحب فرہنگ آصفیہ نے پوجا کے ایک مجازی معنی لے کر مورتی پوجا کے لئے جواز فراہم کرنے کی جو سعی نامشکور کی ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے کہ میں کہوں کہ پوجا کے معنی احترام وتعظیم کے نہیں

---

[1] ویدک دھرم اور اسلام ص۴۲، ص۴۵۔

بلکہ خوب قاعدے سے پٹائی کرنے کے معنی میں آتا ہے[۲] مثلاً کسی معتوب و ماخوذ آدمی سے کہا جاتا ہے "گھبراؤ مت ابھی تمھاری ڈھنگ سے پوجا کرتے ہیں" ظاہر ہے کہ یہاں پوجا احترام کے معنی میں نہیں بولا گیا ہے، یہ بات آپ کو تقریباً ہندی کے تمام مستند لغات اور ڈکشنریوں میں ملے گی، صرف یہی نہیں بلکہ پوجا رشوت دینے کے معنی میں بھی آتا ہے[۳] مثلاً کہا جاتا ہے "ارے بھائی یہ کلرک یا افسر بغیر پوجا کے تھوڑے ہی مانے گا"

اب اگر کوئی آدمی ان محاوری و مجازی معانی کو لے کر یہ کہنے لگے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ گنیش تو اپنے پتا کی پوجا کرتا ہے ــــ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے پتا کو رشوت دے رہا ہے یا خوب مارپیٹ کر رہا ہے، کیا کوئی باشعور سنجیدہ آدمی اس معنی کو ماننے کے لئے تیار ہوگا؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہی کہا جائیگا کہ معنی کی تعیین موقع و محل کے لحاظ سے کی جائے گی، لہذا جب یہ کہا جائے کہ دھرم پال کارتک وشنو یا ہنومان کی پوجا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ عبادت و پرستش کے تمام لوازمات اپناتے ہوئے اپنے اندرونی جذبات و کیفیات اپنے معبود کے حضور میں انڈیل رہا ہے نہ کہ ماں باپ کے احترام کی طرح کچھ کر رہا ہے۔ احترام والدین بالواسطہ عبادت ہے یعنی کار ثواب ہے نہ کہ بلا واسطہ، مثال کے طور پر کتاب وسنت میں احترام والدین کی پر زور انداز میں تاکید آئی ہے، لیکن غیر اللہ کی پرستش سے سختی سے روکا گیا ہے، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ احترام والدین الگ چیز ہے اور پرستش و عبادت الگ، اس تعلق سے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ غایت اور انتہائی درجے کے احترام و تذلل اور محبت کے مجموعے ہی کا نام عبادت ہے[۴] جب یہ جذبہ دل میں موجزن ہوتا ہے تو انسان اسے بلا اختیار بارگاہ معبود میں پیش کرنے کے لئے اپنا سر نیاز خم کر دیتا ہے اگر مستحق معبود حق کی بارگاہ میں ہو تو توحید ہے اور اگر غیر مستحق باطل الٰہ کے حضور میں ہو تو شرک بن جاتا ہے، جس طرح ایک موحد مومن خدا کو اپنا حاجت روا مشکل کشا، فریاد رس سمجھتے ہوئے اس کے حضور میں انتہائی

---

[۱] راج پال ہندی شبد کوش ص۵۱۳ [۲] ایضاً، نیز بیوہارک ہندی شبد کوش ص۱۴۲۳ [۳] غایۃ الخضوع والتذلل، لسان العرب جلد دوم ص۲۴۳ و مختار الصحاح ص۴۰۸، لفظ العبودیۃ یتضمن کمال الذل وکمال الحب رسالۃ العبودیۃ، از امام ابن تیمیہ، نیز تفسیر ابن قیم ص۶۵، تفسیر ابن کثیر جلد اول ص۲۵۔

پستی، عاجزی اور محبت کا اظہار کرتا ہے اسی طرح غیر اللہ پرست وہی معاملہ مورتیوں کے ساتھ کرتا ہے اور یہی شرک ہے اور منافی توحید بھی۔

مورتی پوجا تصور توحید کے منافی نہیں، اور مورتی پوجا کے باوجود ایک آدمی موحد ہو سکتا ہے اس کا ماخذ و دلیل کیا ہے ؟ جس طرح ماضی بعید میں یونانی تفلسف، ایرانی افکار، عجمی تصوف اور غلط وحدت الوجودی نظریئے کے حامل حضرات نے کوئی صحیح و معقول دلیل نہیں دی ہے اسی طرح بعد کے لوگوں نے جیسے منشی سید احمد دہلوی اور ان کے بعد آنے والوں نے بھی کوئی معقول دلیل نہیں دی ہے صرف مستقل غیر مستقل اور مظہر الٰہی کے غیر متعلق بات کہہ کر حقیقت کو الٹنے اور غلط کو زرنگار ویُر فریب پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شرک اور غیر اللہ پرستی کے جو اسباب و علل ہندوستان میں تھے اور ہیں وہی عرب سمیت پوری دنیا میں پائے جاتے تھے اور پائے جاتے ہیں۔ پھر دونوں میں تفریق کی کیا وجہ ہے ؟، کفار قریش اور مشرکین عرب بھی تو اپنے بتوں کو مستقل معبود نہیں مانتے و سمجھتے تھے[1]

یہ عجیب بات ہے کہ اسلامی تعلیم و تصور توحید سے متأثر ہو کر ہندو اہل علم یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ مورتی پوجا اصل ہندو دھرم کے منافی اور قدیم ویدک تعلیم کے خلاف ہے بھکتی تحریک میں یہ بات بڑی نمایاں نظر آتی ہے[2] اور ماضی قریب میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند نے پرزور انداز میں مورتی پوجا کی تکذیب و تردید کی ہے جیسا کہ ان کی مشہور و معروف کتاب ستیارتھ پرکاش شاہد عدل ہے، سوامی دیانند کا کہنا ہے کہ مورتی پوجا جینی فرقے کی ایجاد ہے[3] اس کے برعکس کچھ مسلم دانشور بے معنی قسم کی رواداری کے جوش میں مورتی پوجا کی بیجا تاویل کرکے سند جواز فراہم کر رہے ہیں اور کمال یہ ہے کہ دوسرے ہی سانس میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ بت پرستی یا مورتی پوجا ہندو دھرم کی اصل تعلیم میں موجود نہیں ہے، یہ زبردست ذہنی تضاد ہے جسے غلط سوچ نے پیدا کر دیا ہے۔

اسلام میں مورتی پوجا یا غیر اللہ پرستی کی کسی لحاظ سے بھی گنجائش نہیں ہے، اس معاملہ میں

---

[1] اس پہلو پر آئندہ صحبت میں قدرے تفصیلی گفتگو کی جائے گی، ان شاء اللہ۔ [2] اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر (از ڈاکٹر تاراچند) میں تفصیل دیکھئے۔ [3] ستیارتھ پرکاش ص ۴۳۶ تا ۴۳۸۔

اسلام نہایت باعزت اور حساس واقع ہوا ہے اس لئے اس کا نام لے کر اپنے خود ساختہ و مفروضہ نظریے کی تبلیغ و اشاعت کی کسی کو بھی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی جب ہندو دھرم کی بنیادی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں متعدد مقامات پر ذاتِ واحد کی عبادت اور توحید کی تعلیم ملتی ہے مثلاً ہندو دھرم کی سب سے قدیم اساسی کتاب رگوید میں توحید کی تعلیم یوں دی گئی۔

- وہ ایک ہی ہے اسی کی عبادت کرو[1] خدا کے سوا کسی کو مت پوجو[2] وہ زمین و آسمان کا مالک ہے اسے چھوڑ کر تم کون سے خدا کو پوج رہے ہو[3]

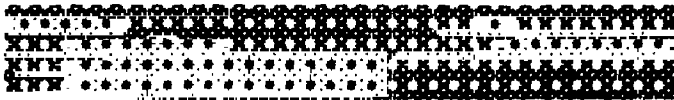
اس کے علاوہ یجروید جو درحقیقت رگوید سے ماخوذ ہے میں ایک جگہ کہا گیا ہے جو لوگ باطل وجود والے دیوی دیوتاؤں کی عبادات کرتے ہیں وہ اندھا کر دینے والے گہرے اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں[4] اس ذات کی کوئی مورتی تصویر نہیں ہے[5] جب دیوی دیوتاؤں کا وجود ہی باطل ہے تو اس کی پوجا کیوں کر توحید کے منافی نہیں ہوگی، ہندوؤں میں سب سے زیادہ مقدس کتاب گیتا سمجھی جاتی ہے گھر سے لے کر عدالت تک میں اس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اس میں اٹھارہویں ادھیائے (باب) میں ایک جگہ کہا گیا ہے، صرف ایک پرمیشور ہی میں من لگاؤ اسی کی بھگتی کرو اسی کے لئے سب کام کرو اس کے سامنے سر جھکاؤ[6]

گرچہ ویدوں کے بہت سے اشلوکوں سے اور گیتا کے بہت سے مقامات سے مظاہر پرستی کی تائید و تصویب ہوتی ہے اور یہ بات بہت حد تک صحیح بھی ہے کہ ہندو دھرم میں توحید کا تصور بہت ہی غیر واضح متضاد اور گنجلک ہے تاہم جدید ہندو دانشور و معلمین مورتی پوجا اور مظاہر پرستی کی تاویل و انکار کرتے ہیں[7] کل ملا کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ مورتی پوجا غلط ذہنیت اور سوچ کی پیداوار اور قطعی طور پر تصور توحید کے منافی ہے اور ماضی میں اور موجودہ دور میں جدید دانش ور و داعی حضرات غلط رواداری اور بھائی چارگی کے قیام کے جوش میں مورتی پوجا وغیرہ کی تاویل کر کے اس کی قباحت

---

[1] رگوید ۶-۴۵-۱۴ [2] ایضاً ۸-۱-۱ [3] ایضاً ۱۰، ۱۱، ۱ [4] یجروید ۴۰-۶۰ [5] ایضاً ۳۲، ۳ [6] گیتا ۱۸-۶۴، ۶۵، ۶۶ [7] ستیارتھ پرکاش از سوامی دیانند، گیتا اور قرآن از پنڈت سندر لال، وشنو رہسیہ، از ڈاکٹر چمن لال گوتم، تحفۃ الموحدین از راجہ رام موہن رائے نیز اروند گھوش

واشاعت کو کم کرنے میں لگے ہوتے ہیں، وہ ہندو دھرم کے ساتھ خیرخواہی نہیں ہے بلکہ بدخواہی ہے کہ اسے تعلیم توحید کی طرف لوٹنے کے لئے راستہ ہموار کرنے کے بجائے غیراصل (مورتی پوجا) جو انسانی عظمت کے منافی ہے پر ڈٹے رہنے کے لئے شہ دے رہے ہیں نتیجۃً بہت سی احیاء پسند ہندو تنظیمیں اپنی غلطیوں کو سدھارنے کے بجائے بے بنیاد قسم کی احساس برتری کا شکار ہو کر پورے سماج کو پیچھے کی طرف لے جانے کے لئے کوشاں ہیں، گذشتہ چند سالوں میں کچھ ایسی تحریریں سامنے آئی ہیں[1] جن کا مقصد دعوتی ہے اور خیرخواہانہ طور پر برادرانِ وطن کو ہندو دھرم کی گمشدہ متاع کی جستجو اور اپنانے کی دعوت دی گئی ہے، لیکن اخذ نتائج کا انداز ایسا ہے کہ سرمایہ کی گمشدگی کا احساس جاگنے کے بجائے پائے ہوئے ہونے کا احساس زیادہ ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ جس قافلہ کو احساس زیاں ہی نہ ہو اسے اصل سرمایہ کی بازیابی اور منزل کا رخ صحیح کرنے کا خیال کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔



---

[1] مثلاً - اگر اب بھی نہ جاگے تو " از شمس نوید عثمانی ، ویدک دھرم اور اسلام، از علامہ اخلاق حسین دہلوی اور سنڈے ٹائمز (ٹائمز آف انڈیا) بابت ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر طاہر محمود کا مضمون ملاحظہ ہوں۔ مذکورہ ویدک حوالے شمس نوید صاحب نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں دیئے ہیں -

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم غیرمسلموں کی نظر میں

قسط اول

مولانا محمد جنید صاحب چاٹگامی
جامعہ اسلامیہ بابونگر چاٹگام بنگلہ دیش

نام مصطفے ؐ کی عظمت

جس وقت خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم ؓ یا حضرت ابراہیم ؓ کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تو کفار مکہ (جو ہمیشہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی کے درپے رہتے تھے) آپؐ کو "ابتر" کہہ کر طعنہ دینے لگے۔ "ابتر" محاورۂ عرب میں وہ شخص کہلاتا ہے جس کی اولاد ذکور مرجائے یعنی مقطوع النسل، ایسا طعنہ دینے والوں میں عاص بن وائل کا نام بطور خاص ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو کہتا تھا کہ ان کی بات چھوڑو، یہ کچھ فکر کرنے کی چیز نہیں کیونکہ وہ ابتر (مقطوع النسل) ہیں، جب انتقال ہوجائے گا ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ بقول بعض مفسرین اس کے جواب میں سورۂ کوثر نازل ہوئی (تفسیر قرطبی ص۲۲۳ ج۲۰، وابن کثیر ص۵۵۹ ج۴) اس سورۃ میں ارشاد ہے۔

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ — بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہے۔

یعنی خواہ ظاہری نسل اس دشمن کی چلے یا نہ چلے لیکن دنیا میں اس کا کوئی ذکر خیر باقی نہ رہیگا چنانچہ وہ اعداء رسول ؐ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل ایسے بے نام ونشان ہوئے کہ ان سے منسوب ہوکر کوئی ابوجہلی یا ابولہبی کہنے والا نہیں پایا جاتا ہے، نہ ان کی اولاد میں سے نہ غیر سے بخلاف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپؐ کی نسل نسبی بھی انشاء اللہ دنیا میں تاقیامت باقی رہے گی، اگرچہ دختری اولاد سے ہو، اور معنوی و روحانی نسل یعنی آپؐ پر ایمان لانے والے مسلمان

جو درحقیقت نبی کی اولاد معنوی ہوتے ہیں وہ تو اس کثرت سے ہوں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امتوں سے بڑھ جائیں گے، چنانچہ ترمذی اور دارمی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امت محمدیہ کے جنتیوں کی تعداد دوسری امتوں کے مقابلہ میں دو تہائی زائد ہوگی (مشکوٰۃ شریف ص۴۹۸ ج ۲)

اور یہ کروڑوں مسلمان آپ کا ذکر اور مبارک تذکرہ بڑی عظمت بے انتہاء محبت اور اعتقاد کے ساتھ ہمیشہ سے کرتے آرہے ہیں اور تا ابد کرتے رہیں گے، اور جان تک کی بازی لگا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے تسلسل کو قیامت تک انشاء اللہ باقی رکھیں گے۔

غور کیجئے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو حق تعالیٰ نے کیسی نیک نامی، رفعت اور عظمت عطا فرمائی کہ آپ کے عہد مبارک سے آج تک پوری دنیا کے چپہ چپہ پر آپ کا نام مبارک ہر روز پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ اذانوں میں پکارا جاتا ہے، نمازوں میں التحیات کے اندر کم از کم روزانہ پانچ وقت کروڑوں مسلمان مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر آپ کا ذکر جاری ہوتا ہے۔

لاکھوں محدثین کرام اپنے اپنے درس حدیث کے حلقوں میں بے پناہ کثرت اور بے انتہاء محبت و عظمت کے ساتھ آپ کا نام لیتے ہیں، ہزاروں شعراء اپنے نعتیہ کلاموں میں بڑی خوبی اور دلکش طریقہ سے آپ کا ذکر خیر کرتے ہیں، دنیا بھر میں آپ پر اور آپ کے آل و اصحاب پر درود بھیجا جارہا ہے، کروڑوں مسلمانوں کو صرف آپ ہی سے نہیں بلکہ آپ کے ساتھیوں تک سے نسبت پر فخر ہے کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی صدیقی ہے کوئی فاروقی ہے، کوئی عثمانی ہے، کوئی عباسی، کوئی ہاشمی کوئی زبیری، کوئی انصاری، مگر نام کو بھی (جیسا کہ گذرا) کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ غرض خانقاہوں سے لیکر میدانِ جہاد تک دینی کاموں کے ہزارہا شعبوں میں کروڑوں امتانِ محمدی اور عاشقانِ مصطفےٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے آخری پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت اور آپ کے تذکرۂ خیر میں بڑی یکسوئی، محبت اور خود فراموشی کے ساتھ مصروف اور رواں دواں ہیں۔ اسلامی کاموں کے اس حیرت انگیز تسلسل اور تنوع کی کوئی نظیر دوسرے ادیان میں نہیں مل سکتی، اور دنیا میں کسی بڑے سے بڑے فلسفی، ادیب، مفکر یا لیڈر اور رہنمائے قوم کا ذکر و تذکرہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور ذکر مبارک کے کروڑویں حصہ کے برابر بھی نہ ہوگا۔ الغرض تاریخ نے پوری وضاحت سے ثابت کردیا کہ ابتر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں

بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

رسول مقبولؐ کے متعلق غیر مسلموں کی شہادتیں

پھر صرف اپنوں نے نہیں بلکہ سینکڑوں غیر مسلم مفکروں، ادیبوں، لیڈروں اور اہل قلموں نے بھی ہمارے پیارے نبی، محبوب کبریا، سید کون ومکان، محسن نوع بشر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک خدمت میں تحائف عقیدت پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا اور بڑے بلند پایہ الفاظ میں آپ کی اور آپ کے لائے ہوئے "دین اسلام" اور قرآن کریم کی تعریفیں کی ہیں اگر وہ سب تعریفیں جمع کی جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہوجائے۔ شاعر کہتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں ؛ گفتہ آید در حدیث دیگراں

اس مختصر مقالہ میں اس سلسلے کے چند اقوال اور حوالے نقل کئے جاتے ہیں، جن میں اکثر اقوال مشاہیر مفکرین یورپ کے اور کچھ ہندو فضلاء کے ہیں۔

(۱) انگلستان کا نامور مؤرخ ڈاکٹر گبن اپنی تصنیف "سلطنت روما کا انحطاط وزوال" (جلد ۵، باب ۵۰) میں لکھتا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت سب پر حاوی ہے یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی" (معارف القرآن ص ۱۲۳ جلد ۱)

(۲) بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک مسیحی نامہ نگار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک مضمون لکھا، اس میں وہ لکھتا ہے کہ۔

"پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کردیئے کیونکہ مسلمان جب قرآن وحدیث میں غور کریں گے تو وہ اپنی ہر دینی ودنیوی ضرورت کا علاج اس میں پائیں گے، انھوں نے اپنے پیروؤں کے لئے ایک عالمگیر کانفرنس کی بنیاد ڈالی، یعنی حج کے ذریعہ تمام دنیا کے صاحب ثروت اور بااثر لوگ ایک جگہ جمع ہوکر آپس میں ربط واتحاد بڑھا سکتے ہیں انھوں نے زکوۃ فرض کرکے فقرائے قوم کا کافی بندوبست کردیا کہ قوم میں کوئی فقیر باقی نہ رہے انھوں نے ایک زندۂ جاوید زبان مسلمانوں کے لئے قائم کردی کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا سمجھنا

ہر مسلمان پر فرض ہے، عام افراد قوم کے لئے ابھرنا اور ترقی کرنا آسان کر دیا، کیونکہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقویٰ کے اور کسی چیز کے سبب ترجیح نہیں دی، مسلمان اپنے پریسیڈنٹ کا جس کو وہ خلیفہ کہتے ہیں خود انتخاب کرتے تھے، غیر مسلم یعنی ذمیوں کے لئے اسلامی ممالک میں عیش و راحت کے ساتھ رہنا آسان کر دیا، کیونکہ حکم دیا کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے اور سب سے پسندیدہ خدا کے نزدیک وہ ہے جو اس کی اولاد کو نفع پہونچاتے (واضح رہے کہ مخلوق خدا کی عین اولاد نہیں بلکہ اولاد کے حکم میں ہے) انھوں نے عورت کے مرتبہ کو بلند کر دیا، بیت المال کے لئے قواعد مرتب کئے اور حکمت و دانائی کو مسلمانوں کا گم شدہ مال قرار دیا اور اسکے حاصل کرنے کی تاکید کی۔

(آئینہ حقیقت نما ص ۵۰)

(۳) پروفیسر ایڈورڈ مونٹ پروفیسر السنہ مشرقیہ جلیوا یونیورسٹی کہتے ہیں:"آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اصلاح اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی اس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسن اعظم یقین کرنا پڑتا ہے (کتاب مذکور ص ۶۱، ۶۲)

(۴) چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں ایک آرٹیکل لکھنے والا اسلام اور اسلامی تعلیمات کی نسبت لکھتا ہے

"مذہب اسلام کے نہایت کامل اور روشن حصے یعنی قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم میں ناانصافی کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزاء، طمع، اسراف، عیاشی، بدگمانی نہایت قابل ملامت قرار دی گئی ہے، نیک نیتی، فیاضی، حیا، تحمل، صبر، بردباری، کفایت شعاری، سچائی، راست بازی، ادب، صلح، سچی محبت اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اس کی مرضی پر توکل کرنا، سچے ایمان دار کرنا اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے . . . . . یورپ میں علوم و فنون کی ترقی کا اصل سبب بھی اسلام ہی ہوا ہے" (کتاب مذکور ص ۵۴)

(۵) ڈاکٹر گستاولی بان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں صفائی سے لکھتا ہے۔

"اس پیغمبر اسلام اس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو جو اس وقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہ آئی تھی رام کیا اور اس درجہ پر پہونچا دیا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اور اس وقت بھی وہی نبی امی اپنی

قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمۂ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے (معارف القرآن ص۱۲۳ ج۱)

(۶) **مسٹر طامس کارلائل** اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے۔

"ان کے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے۔ وہ ایک سرگرم اور پر جوش ریفارمر تھے جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا ایسے شخص کا کلام خود خدائی آواز ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انتھک کوشش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی، دنیا کے ہر حصہ میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کامیاب ہوئی" (المنہاج الواضح ص۵۴)

(۷) مصر کے مشہور **اخبار ایجیٹ** میں ایک مسیحی نے لکھا تھا۔

"ہم عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں تو ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ عیسائی مذہب کے راستے میں جب علوم وفنون آگئے تو اس نے نہایت بیدردی سے ان کو پامال کیا، لیکن اسلام نے خود علوم وفنون کی بنیادیں قائم کیں۔ اور عیسائیت دمجوسیت نے جن شائقینِ علوم کو شوقِ علم کے جرم میں جلاوطن کیا اسلام نے ان کو اپنے دامن میں پناہ دی .... جس طرح عیسائیت علم اور تمدن کے میدان میں اسلام کے دوش بدوش نہیں چل سکتی اسی طرح اخلاقی حیثیت سے بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی" (آئینۂ حقیقت نما ص۵)

(۸) لندن کا مشہور اخبار **نیو ایسٹ** لکھتا ہے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم وارشاد کی قدر وقیمت اور عظمت وفضیلت کو اگر ہم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل ودانش سے بیگانہ ہیں"

(خطبۂ صدارت از شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح بحوالہ المنہاج الواضح ص۵۵)

(۹) **جارج برنارڈ شا** کہتا ہے کہ

"ہمارے قرون وسطیٰ کے پادریوں نے یا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے یا افسوسناک تعصب کی وجہ سے پیغمبر کی جلیل القدر شخصیت اور آپ کے مذہب اسلام کو نہایت ہی تاریک شکل میں پیش کیا ہے۔ میں پوری بصیرت کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نسل انسانی کے ہادی اور نجات دینے والے تھے، بلکہ میں صاف طور پر اعلان کرتا ہوں کہ

آج دنیا کی حکومت اور ڈکٹیٹرشپ محمدؐ ایسے کامل انسان کے سپرد کر دی جائے تو آپ اس کرۂ ارض کے تمام مسائلِ حیات اور مشکلات کو اس طرح حل کریں کہ تمام دنیا امن و راحت کا گہوارہ بن جائے گی۔"

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۷۰ء)

(۱۰) ہندوستان کے سابق وزیراعظم **اندرا گاندھی** لکھتی ہیں۔

"پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے، انھوں نے جشن میلاد النبیؐ کے لئے اپنے پیغام میں کہا کہ اسلام کی اشاعت سے مساوات اور انسانی برادری کے نئے تصورات نے جنم لیا ہے۔" (روزنامہ جنگ کراچی ۲۶ راپریل ۱۹۸۳ء)

(۱۱) **جے ایم راڈویل کہتا ہے:**

"دلیلوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ لوگوں کو جہالت اور بت پرستی سے چھڑائیں اور یہ کہ ان کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ تھی کہ امرِ حق یعنی توحیدِ الٰہی کا جوش جو ان کی روح پر غایت درجہ مستولی ہو رہا تھا اس کا خوب اشتہار و اظہار کریں .... قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح رہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں۔" (آئینہ حقیقت نما ص ۵۹)

(۱۲) **ریورینڈ رڈ ڈبلیو اسٹیفن لکھتا ہے۔**

آنحضرتؐ نے بت پرستی کے ایک منتشر انبار کے عوض میں خالص توحید کا عقیدہ قائم کیا ...ب نے لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کیا، اور ان کی تمدنی حالت کو ترقی دی اور ایک سنجیدہ اور ...نول طریق عبادت جاری کیا، آخر کار آپ نے اس ذریعہ سے بہت سے وحشی اور آزاد قبیلوں ...ؤ محض ذرّوں کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے تھے باہم ملا کر ایک ٹھوس ملکی جماعت کی ...ں میں منتقل کر دیا .... بہت سی قابلِ نفرت اور وحشت انگیز رسمیں جو آپ کے ...لک عرب میں رائج تھیں ان پر آپ نے زبردست حملہ کیا، اوباشانہ زندگی اور بدکاری کے بجائے ...وجات کا ایک بااحتیاط اور باضابطہ اصول منضبط کیا، دختر کشی کی رسم کا پورا پورا انسداد کیا، ترک ...ستانی حبشی اور بربری اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اپنے بتوں کو اٹھا کر پھینک دیں۔" (آئینہ حقیقت نما)

(باقی رہ ۱۴۰، ص ۲۱ر)

مولانا اخلاق حسین قاسمی

سماع کے مسئلہ میں حضرت سلطان المشائخ کا مسلک

شیخ الاسلام حضرت مدنی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ ہمارے مشائخ دیوبند اگرچہ چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں مگر ہمارے حضرات پر چشتی نسبت غالب ہے۔

حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی حیات مبارکہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپ علم و عمل، ایثار و قربانی کی شاندار روایات کے حامل ہونے کے ساتھ تواضع و خاطرداری اور اہل ضرورت کی ہر ممکن اعانت کے معاملہ میں حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کی تابندہ مثال تھے۔

شیخ مدنی رح ہدایت فرماتے تھے۔

جو سلوک کلام اللہ کے ذریعہ ہو وہ قوی اور پائیدار ہوتا ہے مگر دیر سے ہوتا ہے کیونکہ انسان قرآن حکیم کے دیگر عجائبات میں لگ جاتا ہے اور ذکر کے ذریعہ طبیعت جلد متوجہ ہوتی ہے مگر وہ اس قدر پائیدار نہیں ہوتی۔ (سات مجلسیں ص۴۲)

مراد آباد جیل میں شیخ مدنی علیہ الرحمہ نے درس قرآن کریم کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مولانا محمد میاں صاحب مفتی اعظم ہند (جنھیں مولانا احمد سعید صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کا ذوالنون مصری کہا کرتے تھے) نے وہ درس قرآن سات مجلسوں کے نام سے مرتب کیا ہے۔

یہ قول حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کا ہے جو آپ نے اپنے مرید خاص مولانا فخرالدین زرّادی علیہ الرحمہ کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔

مولانا نے سوال کیا تھا کہ تلاوت قرآن افضل ہے یا ذکر الٰہی؟ آپ نے اس کے جواب میں وہی بات فرمائی جو شیخ مدنی رح نے ارشاد فرمائی۔ (سیر الاولیاء ص۶۸۴)

حضرت مدنی رح سلطان المشائخ رح کے لئے اپنے دل میں خاص احترام رکھتے تھے، چنانچہ مرض الوفات کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی شیخ مدنی رح سے ملنے آئے

شیخ نے پوچھا، کہاں سے آئے ؟ مولانا نے جواب دیا۔ نظام الدین سے۔ شیخ کو اس غیر مؤدب جواب سے تکدر ہوا۔ فرمایا۔
ہاں مولانا! کبھی لوگ کہتے تھے! حضرت نظام الدین اولیاء سے۔ پھر کہا جانے لگا، حضرت سلطان جی سے۔ اور یہ کہا جاتا ہے۔ نظام الدین سے۔

یہ نہایت مؤثر تنبیہ تھی کہ اولیاء صالحین کے ادب واحترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے حضرت مدنی علیہ الرحمہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت اور اہل اللہ کے ادب واحترام کے مسئلہ میں اپنے اکابر دیوبند کے مسلک کی جو ترجمانی کی ہے اسے دیکھا جائے (نقش حیات جلد اول ص۱۰۵)

فوائد الفواد کی اہمیت

مشائخ تصوف کے ملفوظات واقوال کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مستند کتاب سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات پر مشتمل فوائد الفواد ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے اپنے ملفوظات میں اس کتاب کو چشتی مشائخ کا لائحہ عمل قرار دیا ہے۔

ہمارے حضرات دیوبند اپنے مواعظ ومکتوبات میں اکثر فوائد الفواد کا حوالہ دیتے ہیں اس ناچیز کو فوائد الفواد اپنے مطالعہ میں رکھنے کا شوق تھا۔ اور مطالعہ کے دوران یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اہل علم کو اس کتاب تصوف کی اہمیت سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ موجودہ خانقاہی رسموں کی وجہ سے اہل علم اس کتاب کو صوفیت کے رواجی تصور کی کتاب سمجھتے ہیں۔

حالانکہ حضرت سلطان المشائخ ایک صوفی کامل ہونے کے ساتھ علم حدیث وتفسیر پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے اور شیخ علیہ الرحمہ نے ان ملفوظات میں جو بنیادی کام کیا ہے وہ تصوف کی اصلاح ہے اور شریعت اور طریقت کے درمیان پیدا کی گئی دوری کو ختم کرتا ہے

الحمدللہ فوائد الفوائد کی (۸۸) مجلسوں میں بیان کردہ احادیث اور تفسیر قرآن کریم کے لطائف اور تصوف کے اہم نکات کی اصل ماخذ کتابوں سے مطابقت اور تشریح کا کام مکمل ہو گیا، ذیل میں صوفیاء اور فقہاء کے درمیان مشہور نزاعی مسئلہ سماع، کے بارے میں حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمہ کا مسلک تحریر کیا جارہا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ جو شیخ طریقت قرآن کریم سے عشق رکھتا تھا ۔ سلطان جی خود حافظ تھے آپ نے اپنے شیخ حضرت بابا صاحب سے تجوید پڑھی تھی، آپ کی خانقاہ میں حفظ قرآن کا نہایت اہتمام رہتا تھا، آپ بہتر سے بہتر حافظ و قاری کو حفظ قرآن کے لئے مقرر کرتے تھے اور مصنف مشائخ چشت کے مطابق سلطان جی کی خانقاہ حفظ خانہ معلوم ہوتا تھا۔ اس شیخ رح کے سلسلہ کی خانقاہیں اب اصل مقصد سے غافل نظر آتی ہیں، اور سماع کی وہ صورت ہی اصل تصوف بن کر رہ گئی ہے جسے حضرت سلطان المشائخ رح نے ناپسند قرار دیا۔

سماع سے دلچسپی کا کیا مطلب !

مشائخ چشت میں حضرت محبوب الٰہی علیہ الرحمہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ کو سماع سے بڑی دلچسپی تھی، فوائد الفواد کے مقدمہ (اردو) میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے شیخ علیہ الرحمہ کی اس دلچسپی کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کبھی قوالوں کو دیکھ کر رونے لگتے تھے، کسی نے اس پر سوال کیا تو آپ نے فرمایا ـــــ یہ قوال محبوب کے پیامی ہیں انھیں دیکھ کر تو رونا آنا ہی چاہیئے،

غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں علماء شریعت کے ساتھ شیخ علیہ الرحمہ کے سماع کے جواز و عدم جواز پر مباحثہ کا تذکرہ بھی آیا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے مشائخ نے سماع کی اباحت کے بارے میں احادیث نبوی سے مواد جمع کر کے شیخ علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھیجا، تاکہ شیخ علماء دین سے مناظرہ کر سکیں اس مناظرہ کی یہ روداد بھی نقل کی گئی ہے کہ مناظرہ کی مجلس میں علماء کرام نے امام ابوحنیفہ رح کا قول طلب کیا اور حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے احادیث نبوی سے استدلال فرمایا۔

علماء نے جب قول امام پیش کرنے کا تقاضا کیا تو شیخ مجلس سے اٹھ کر چلے آئے، اور یہ فرمایا ـــــ وہ شہر کیوں برباد نہیں ہوجاتا جہاں حدیث نبوی کے مقابلہ میں قول ابی حنیفہ رح طلب کیا جاتا ہے اور احادیث نبوی سننے سے بھی انکار کیا جاتا ہے (ص ۱۴۰)

یہاں تک کہ شیخ علیہ الرحمہ کی اس وصیت کا بھی تذکرہ آیا ہے کہ آپ نے اپنے جنازہ کے ساتھ اہل سماع کو چلنے کی وصیت کی تھی، مگر اسے شیخ رکن الدین ملتانی رح نے یہ کہہ کر رکوا دیا

کہ اگر ایسا ہوا تو شیخ علیہ الرحمہ جنازہ سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس ساری بحث سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سماع سے کیا مراد ہے ؟

سماع بالمزامیر یا سماع سادہ . بلا مزامیر :-

ہوسکتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے چشتی بزرگوں کی موجودہ خانقاہوں میں سماع بالمزامیر کے عام رواج کو دیکھ کر اس مسئلہ کو مختصر رکھا ہو۔ لیکن صوفیار ربانی میں قرآن وحدیث اور فقہ حنفی پر ایک وسیع النظر عالم اور محبتِ حق اور خوفِ آخرت کے جذبات سے معمور دل رکھنے والے شیخ طریقت کے تعلق سے اس نزاعی مسئلہ کو تشنہ چھوڑنا کسی طرح شیخ علیہ الرحمہ کے ساتھ عقیدت وانصاف نہیں کہا جاسکتا۔

ہمیں شیخ علیہ الرحمہ کے ملفوظات میں اس مسئلہ پر کئی جگہ بحث ملتی ہے (۱) ملفوظات شیخ علیہ الرحمہ جلد ۳ مجلس ۵ صفحہ ۵۱۲ تا ۵۱۷ (۲) جلد ۵ مجلس ۲۰ صفحہ ۱۰۲۱۔

یہ دونوں ملفوظ پورے پڑھنے کے قابل ہیں۔ پہلے ملفوظ میں آپ نے واضح طور پر فرمایا "من منع کردہ ام کہ مزامیر ومحرمات درمیان نباشد" میں نے منع کیا ہے کہ مزامیر ومحرمات نہ ہونے چاہئیں —— پھر فرمایا " نماز کے اندر امام کو کوئی عورت کسی غلطی پر متنبہ کرے تو ہتھیلیاں نہ بجائے کہ اس سے کھیل تماشے کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے —— پھر سماع میں تو اور بھی ضروری ہے کہ یہ چیزیں (تالیاں) بجانا وغیرہ نہ ہو۔

سیر الاولیاء کے مؤلف امیر خورد نے بھی یہ الفاظ نقل کئے ہیں (ص۴۹۱)

سماع کے جائز ہونے کی چار شرطیں :-

دوسرے ملفوظ گرامی میں سماع کے جائز ہونے کی چار شرطیں بیان فرمائیں۔

"ہرگاہ کہ چند چیز موجود شود آنگاہ سماع شنود"

(۱) پہلی شرط :- مُسمع گوئندہ است، آدمی باید کہ مرد باشد ومرد تمام باشد کودک نباشد وعورت نباشد

گانے والا مرد کامل ہو یعنی نوعمر لڑکا اور عورت نہ ہو۔

(۲) دوسری شرط :۔ مسموع، آنچہ می گویند باید کہ ہزل وفحش نہ باشد۔
جو کچھ پڑھا اور گایا جائے وہ بے ہودہ گوئی اور بے حیائی کا کلام نہ ہو۔
(۳) تیسری شرط مستمع آنکہ می شنود او باید کہ حق شنود و مملو از یاد حق باشد۔
،جو کلام سنا جائے وہ حق کیلئے سنا جائے اور وہ یاد حق سے بھرا ہوا ہو۔
(۴) چوتھی شرط :۔ آلۂ سماع، آں مزامیر است چوں چنگ و رباب ومثل آں باید کہ درمیاں نباشد
سماع کا آلہ ۔ وہ مزامیر ہے جیسے چنگ و رباب اور انھی جیسی چیزیں، وہ سماع کے اندر نہ ہوں۔
ایں چنیں سماع حلال است، آنگاہ فرمود کہ سماع صوتے است موزوں، آں چرا حرام باشد ۔؟
۔ اس قسم کا سماع حلال ہے۔ پھر فرمایا ۔ سماع ایک موزوں آواز ہے، یہ حرام کیسے ہوسکتی ہے ۔؟
و آنچہ می گویند کلامیست مفہوم المعنی، آنچہ حرام باشد؟ دیگر تحریک قلب است
آں اگر تحریک بیاد حق باشد مستحب است و اگر میل بہ فساد باشد حرام است ۔
" گانے والے جو کچھ گاتے ہیں وہ بامعنی کلام ہے وہ کیسے حرام ہو سکتا ہے؟ پھر یہ سماع اگر
یاد حق کی قلبی تحریک اور دلی جذبہ کے تحت ہے تو مستحب ہے اور اگر گندے جذبہ کے تحت ہے تو حرام ہے۔
مزامیر عربی لفظ مزمار کی جمع ہے جس کے معنی بانسری کے ہیں لیکن عرف عام میں ہر قسم کے باجے
پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور عوام ہر قسم کے باجے کو مزمار کہتے ہیں (لغات کشوری)

تلاوتِ قرآن شعر گوئی پر غالب رہے !

سماع یعنی عارفانہ شعری کلام سے حضرت شیخ علیہ الرحمہ کو بڑی دلچسپی اور اس کا بڑا ذوق تھا، لیکن اسی کے ساتھ شیخ علیہ الرحمہ اس بات کی بھی ہدایت فرماتے تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت شعر گوئی پر غالب رہنی چاہیئے۔

خواجہ حسن علیہ الرحمہ نے عرض کیا۔

بندہ عرض داشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ شدہ است می باید کہ
قرآن خواندن بر شعر گفتن غالب آید بہ برکت نفس مخدوم بندہ ہر روز قرآن خواند امید آنکہ
از آنچہ گفتہ شدہ است دمی شود ہم توبہ کردہ آید انشاء اللہ تعالیٰ ایں عرضداشت پسندیدہ افتاد

یعنی بندہ نے عرض کیا کہ زبان مبارک سے بارہا سنا گیا ہے کہ قرآن کی تلاوت کرنا شعر گوئی پر غالب رہنا چاہئے، مخدوم کے حکم کی برکت سے بندہ روزانہ یہ امید رکھ کر قرآن پڑھتا ہے کہ جو کچھ شعری کلام کہا جا چکا ہے اور جو کچھ کہا جائے گا اس سے بھی توبہ کر لی جائے، یہ گذارش پسند کی گئی۔

بارہا از لفظ کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ برابر یہ تاکید فرماتے تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت کا عمل زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور سماع اسکے مقابلہ میں کم سنا جائے۔

یہ کلام الٰہی کے ادب کا تقاضا تھا جو ایک شیخ کامل کے حلقہ میں ہونا چاہئے تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے سماع میں سنائے جانے والے شعری کلام کے لئے یہ ضروری ہدایت فرمائی کہ اس میں یاد حق اور ذکر حق موجود ہو۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کے سامنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارک تھی۔

لاتکثر الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ قسوۃ للقلب وان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی (مشکوٰۃ ص ۱۹۸ عن ابن عمر بحوالہ ترمذی)

آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کیا کرو کیونکہ ایسے کلام سے جو ذکر حق سے خالی ہو قلب میں قساوت اور سختی پیدا ہوتی ہے اور سخت دل آدمی خدا تعالیٰ سے تمام برے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ دور ہوتا ہے۔

جہاں تک خوش آوازی اور لب ولہجہ کے حسن واثر کا تعلق ہے وہ خدا تعالیٰ کا انعام قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے۔

حسنوا القرآن باصواتکم فان الصوت الحسن یزید القرآن حسنا (مشکوٰۃ ص ۱۹۱ عن براء بن عازب)

قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے حسین بناؤ کیونکہ اچھی آواز سے تلاوت کرنا قرآن کریم کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔

تلاوت قرآن میں خوش آوازی کی اتنی اہمیت ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا لیس منا من لم یتغن بالقرآن۔ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کریم کو خوش آوازی سے تلاوت نہ کرے۔

ائمہ فن قرات نے فرمایا ہے حسن لہجہ سے آواز کا قدرتی اور فطری حسن مراد ہے، اللہ تعالیٰ نے

یہ کمال درجہ بدرجہ تمام انسانوں بلکہ تمام پرندوں کو بھی عطاء کیا ہے۔

وہ خوش آوازی جو باقاعدہ فن تجوید کی تعلیم و مشق سے حاصل ہوتی ہے ہر شخص کو اس کا مکلف نہیں بنایا گیا۔

مولانا رومیؒ نے سماع کی یہ صوفیانہ مصلحت بیان کی ہے ؎

پس غذائے عاشقاں آمد سماع — کہ در وباشد خیال اجتماع
قوت گیرد خیالات ضمیر — بلکہ صورت گردد از بانگ وصفیر
آتش عشق از نوا ہا گشت تیز — آنچنانکہ آتش آں جوز ریز

سماع اہل عشق کی غذا ہے، اس سے اس کے خیالات یکسو ہو جاتے ہیں اور دل کے خیالات میں قوت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ گانے کی آواز سے اس کے جذبات مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

یہ اہل سماع صوفیاء کی بڑی مؤثر ترجمانی ہے

مزامیر کے معاملہ میں مکمل احتیاط :-

سماع کے بارے میں جو نظریہ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے واضح فرمایا ہے اس کی روشنی میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

۱ :- شیخ علیہ الرحمہ کے مذکورہ نظریہ پر اس عہد کے علماء کو آخر اعتراض کیا تھا؟ یہ بات سمجھ میں آنے کے قابل نہیں۔

شیخ علیہ الرحمہ کی مجلسیں (۱۸۸) منعقد ہوئیں جو (۱۵ سال) پر پھیلی ہوئی ہیں، شیخؒ نے کسی مجلس میں مزامیر کی وکالت نہیں فرمائی، یہاں تک کہ بخاری کی صحیح روایت کے مطابق انصار کی لڑکیوں کے دف بجانے کا واقعہ بھی بیان نہیں کیا۔

صوفیاء کرام کے قصوں میں ضرور اس کا ذکر آیا لیکن شیخ علیہ الرحمہ نے اس معاملہ میں اپنی ذاتی دلچسپی کا اظہار نہیں فرمایا۔

۲ :- کیا وہ علمائے کرام صرف سماع کے لفظ سے بھڑک جاتے تھے یا وہ شیخؒ کے سماع کو دوسرے حضرات کے سماع بالمزامیر پر قیاس کر کے شور مچاتے تھے ؟

فوائد الفواد کے مترجم اردو خواجہ حسن ثانی ؒ نے شیخ علیہ الرحمہ کے لفظ سماع کا ترجمہ قوسین میں قوالی کے لفظ سے کیا ہے۔

اور یہ احتیاط کے خلاف ہے کیونکہ قوالی کا لفظ موجودہ مروجہ قوالی کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے کیا ایسا ہی اس دور کے صوفی حضرات شیخ علیہ الرحمہ کے سماع کی اپنے خیال و ذوق کے مطابق ترجمانی کرتے تھے، اور اس سے علماء میں غلط فہمی پھیلتی تھی؟

شیخ علیہ الرحمہ نے سماع کا جو مفہوم بیان کیا ہے اس کی روشنی میں سماع کا ترجمہ حمد گوئی نعت گوئی اور کلام معرفت ہو سکتا ہے۔

فیروز شاہ تغلق کے دربار میں شیخ ؒ کے حاسدین نے سماع کے مسئلہ پر جو مناظرہ کیا اس میں شیخ ؒ نے علمائے دین کو جس اصولی نکتہ پر لاجواب کیا اور کامیاب ہو کر واپس تشریف لائے وہ بڑی دلچسپ روداد ہے جسے امیر خورد ؒ نے سیر الاولیاء میں بیان کیا ہے۔

بقیہ:- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم

(۱۳) محقق و مذہبی مصنف موسیو لیبلی کا قول ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں اس طرح نقل کیا ہے کہ:

"اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہ (مسلمان) قوم جس کو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اسے سبق لینا چاہیئے (کتاب مذکور ص ۶۱)

(۱۴) امریکہ کے مشہور عالم ڈریپر کا قول ہے۔

"دنیا کی تاریخ میں کوئی مذہب اتنی جلدی اور اس قدر وسعت کے ساتھ نہیں پھیلا جتنا کہ مذہب اسلام تھوڑے ہی عرصہ میں کوئی التائی سے لے کر بحر الکاہل تک اور ایشیا کے مرکز سے افریقہ کے مغربی کناروں تک جا پہنچا" (کتاب مذکور ص ۵۲) (باقی آئندہ)

اصلاحِ قلب کامیابی کی ضمانت

از: سید کمال اللہ بختیاری، ندوی، ایم اے

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

قلب کی اہمیت

انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک اس کا ظاہری ڈھانچہ ہے جیسے ہاتھ پیر، ناک، کان وغیرہ۔ دوسرا اس ظاہری ڈھانچہ میں دماغ اور ایک باطنی سانچہ ہے جسے قلب اور دل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں قلب کو مرکزی حیثیت دی جارہی ہے اس لئے دماغ پر تفصیل نہیں ہے۔ درحقیقت بدنِ انسانی میں دل ہی ایک ایسا گوشت کا لوتھڑا ہے جو تمام امورِ دینی و دنیاوی میں محور کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی کا سارے جوارح پر کنٹرول چلتا ہے جس کو قلب کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں بھی یہی بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اَلَااِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَاوَهِيَ الْقَلْبُ۔ (حدیث)۔ آدمی کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوجاتا ہے تو تمام بدن درست ہوجاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، سن لو وہ دل ہے۔ طبی لحاظ سے بھی اس بات کی تحقیق و تصدیق ہوچکی ہے کہ دل کی سالمیت وحفاظت ہی میں انسان کی زندگی مضمر ہے۔ اس حدیث پاک سے بھی دل کی مرکزیت پر دلیل ملتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَايَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ (حدیث) اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا لیکن وہ تمہارے دلوں کو اور اعمال کو دیکھتا ہے یعنی دلوں کی کیفیات و اعمال کی نیّات کو دیکھتا ہے۔

ارشاد ربّانی بھی یہی ہے: يَوْمَ لَايَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّامَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (سورہ الشعراء ۸۸/۸۹) اس دن (قیامت) مال اور اولاد کام نہیں آئیں گے مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس سلامتِ قلب لے کر آئے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اسلام کا انحصار و سارے اعمال کا دارومدار اسی قلب

پر ہے اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ تقویٰ و پرہیزگاری، اخلاص و توکل خشیتِ الٰہی و خوفِ خداوندی دیانت داری و امانت داری غرضکہ تمام امورِ دینیہ کا تعلق اسی قلب سے ہے۔

کیفیاتِ قلب

اس قلب کی کیفیات ہیں ان کیفیات کے مدارج و مراتب ہیں دل کی ایک عمومی کیفیت ہے جسے عرفِ عام میں ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ضمیر

اس کا ذکر قرآن و حدیث میں اس طرح آیا ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرًا وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (آیت) انسان خود اپنے آپ پر آگاہ ہوتا ہے اگرچہ زبان سے عذر خواہی کرتا ہے: کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ (حدیث مشکوٰۃ) ہر وہ بچہ جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ فطرت سلیمہ، اسلام اور (ضمیر) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ محققین کے نزدیک یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ فطرت بلاتفریق ہر بچہ میں موجود ہوتی ہے۔ ضمیر کے معنی لغت میں چھپے ہوئے کے ہیں یعنی وہ کیفیت جو دل میں چھپی ہوئی ہے ضمیر کی آواز کبھی بھی انسان کو برائی و بدی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ ہمیشہ انسان کو اس راستہ سے روکتی اور منع کرتی رہتی ہے اور اس راستہ کے نقصانات و مضرات سے آگاہ کرتی رہتی ہے یہ کیفیت عمومی ہے جو ہر شخص کی ملکیت ہے۔ فلاسفہ، شعراء و ادباء نے ضمیر کو ایک مستقل شئی کے طور پر پیش کیا ہے درحقیقت ضمیر کوئی الگ شئی نہیں بلکہ قلب ہی کی ایک عمومی کیفیت کا نام ہے۔ جبلی صلاحیت فطری قوت کا بھی نام ضمیر ہے۔

مندرجہ ذیل حدیث بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے: اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ (حدیث احمد ترمذی دارمی) اپنے دل سے پوچھو نیکی وہ ہے جس پر تمہارا قلب یعنی ضمیر مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور جس میں تردد ہو خواہ لوگ فتویٰ دیتے رہیں اور قرآنِ کریم و حدیث شریف کے ان استدلالات سے یہ بات وثوق کے درجہ میں ثابت ہو گی کہ ضمیر کسے کہا جاتا ہے۔

روح و نفس

اسی طرح قلب کی ایک کیفیت کا نام ہے جسے نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے تین مراتب ہیں جو قرآن و حدیث کی روشنی میں ثابت ہیں۔ لفظِ نفس بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے

وَلَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۔ کہیں قلب، علم اور عقل کے معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ غرضیکہ انسان کے ظاہری و باطنی دونوں پہلوؤں پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ درحقیقت نفس اپنے مراتب و مدارج کے ساتھ قلب کی کیفیات اور اس کے شعبہ جات ہی میں سے ہے اس طرح انسان کے باطن میں دو چیزیں ہوئیں ایک نفس ایک روح، روح کا تعلق فرشتوں (ملائکہ) سے اور فرشتوں کا تعلق جنت سے ہے۔ نفس (امارۃ) کا تعلق شیاطین سے اور شیاطین کا تعلق دوزخ سے ہے۔ نفس و روح کی ایک کشمکش جاری ہے۔ نفس (امارۃ) اصل میں مرکزِ شر کا نام ہے۔ اس کے شر کی تمام قوتیں اس میں مجتمع ہیں اور روح مرکزِ خیر کا نام ہے اگر نفس غالب ہوجائے اور روح مغلوب ہوجائے تو نفس شیطان کے ساتھ مل کر انسان کی طبعی زندگی کو غارت کردیتا ہے۔ یہی تباہی و بربادی عالم مابعد الطبع میں عذاب بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر روح غالب آجائے تو نفس روح کے تابع ہوکر کنٹرول میں ہوجاتا ہے پھر انسان کی زندگی کامیاب و کامران ہوجاتی ہے۔ اللہ نے فطرتِ انسان میں دونوں قسم (اعلیٰ و ادنیٰ) رکھے ہیں اس لئے کہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ جذبات عالیہ و صالحہ غور و فکر، حفظ و نگہداشت کے محتاج ہیں ان کے نشو نما کے لئے محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔ تب جاکر انسان کو معرفتِ الٰہی و حق شناسی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف سفلیٰ و ادنیٰ جذباتِ شہوانی و خواہشاتِ حیوانی خود بخود آسودگی و بالیدگی ذائقہ و مزہ حاصل کر لیتے ہیں بلکہ ہمہ وقت انہی کے حصول کے چکر میں سرگرداں و پریشاں رہتے ہیں انسان کو ان کے تعاون کے سلسلہ میں محنت تو درکنار تھوڑی بہت کوشش کی بھی نوبت نہیں آتی۔ اسکی مثال اس طرح ہے جس طرح اناج و غلہ پھول و پھل کی دستیابی و حصولیابی کے لئے تخم ریزی و آبیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف گھاس پھوس کے لئے کسی محنت و مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ اپنے آپ اُگ جاتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں جذبۂ حیوانی و جذبۂ ملکوتی دونوں رکھے ہیں۔ اس حیثیت سے انسان کو دونوں پر اختیار دیا گیا ہے۔ اس آیت سے یہی بات واضح طور سے معلوم ہوتی ہے۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (آیت) اور انسان اور اس کی ذات کی قسم جس نے اس کو درست کیا پھر اس کو (بدکاری و پرہیزگاری دونوں) جس نے اپنی روح کو پاک کیا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے آلودہ کیا گھاٹے میں رہا۔

نفس کی تین حالتوں کو تفصیل سے پیش کیا جا رہا ہے۔

نفس امارة سوءِ معرفت، سوءِ رسم اور سوءِ طبع اور اتباع شیطان کی بنا انسان کا نفس، نفس امارۃ بن جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان انسان نہیں حیوان بن جاتا ہے بسا اوقات حیوان سے بدتر خود شیطان بن جاتا ہے اور یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔

سوءِ معرفت سوءِ معرفت یہ ہے کہ آدمی عقل وضمیر، قلب ونظر سے فائدہ نہ اٹھائے اور حقائقِ زندگی و کوائفِ زمانی و مکانی سے تجربہ نہ حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات و حادثات، انقلابات و حالات پر غور و فکر سے کام نہ لے تو خواہشاتِ نفسانی و حیوانی میں الجھ کر نعمتِ معرفت و دولتِ حقیقت سے دور ہو جاتا ہے خدا کی وحدانیت و دین کی حقانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں بار بار کائنات و حالاتِ کائنات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

سوءِ رسم سوءِ رسم یہ ہے کہ انسان سماجی، تہذیبی، تمدنی، خاندانی، روایتی و ماحولیاتی اثرات و عادات میں ملوث ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے سنتوں سے دوری، دین قیم سے ہجوری، صراطِ مستقیم سے بے زاری محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس بدعات وخرافات اور سماج ورواج کے بے جا بے بنیاد نظریات و تصورات میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ نکلنا اس کیلئے مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم مسلمانوں کی اکثریت اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

سوءِ طبع سوءِ طبع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو فطری وجبلی خیر کی صلاحیت ودیعت کی ہے اگر استعمال نہ کرے، ضمیر کی آواز پر لبیک نہ کہے تو انسان کی طبیعت میں جو نیکی و بھلائی ہے ختم ہو جاتی ہے۔ سوءِ رسم و سوءِ معرفت کے نتیجہ میں منکرات و ممنوعات میں گرفتار ہو جاتا ہے خواہشات و جذبات میں اس قدر جڑ پکڑ جاتا ہے کہ شیطان کے زوردار حملوں و چالوں کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ اب انسان کا کام ہے کہ ان تینوں کا علاج کرے اور شیطان سے اپنے دامن کو بچائے اس لئے کہ انہیں کی وجہ سے نفس امارہ کو تقویت ملتی ہے۔ اور نفس امارہ شرک، کفر، حسد، غیبت، سود، جوا، زنا مکر و فریب میں ڈھکیل دیتا ہے۔ اس لئے کہ نفس امارۃ رذائل کی طرف جلد لپکتا ہے۔ لذائذ جسمانی فوائد دنیاوی سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے اور انسان کو فوراً گناہ پر آمادہ کر لیتا ہے، اس کا

علاج یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطری خوبی و جبلی اچھائی کو پہچاننے اور بروئے کار لانے کی کوشش کرے جو ان تین چیزوں پھر شیطان کی وجہ سے دبی دبی سی رہ جاتی ہے اگر انسان زندگی کی سچائیوں کو پہچان لیتا ہے، خالق و مخلوق کے رشتہ کو جان لیتا ہے، آنے والی زندگی کے انجام پر غور و فکر سے کام لیتا ہے، بری رسموں، ریتوں، رواجوں و عادتوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے تو اس کو خیر و شر میں تمیز کرنے والی ایک حس نیکی و بدی میں فرق کرنے والی ایک فکر ملتی ہے جس کی بدولت شر سے دور خیر سے قریب ہو جاتا ہے اور انسان کا نفس، نفس امارۃ انسان کے اس اقدام سے گھبرا کر سنبھلنے لگتا ہے اور ضمیر کی آواز کو دبانے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ انسان اگر اس کے خلاف محاذ آرائی جاری رکھتا ہے تو نفس امارۃ بدل کر نفس لوامۃ بن جاتا ہے۔

نفسِ لوامۃ ارشادِ ربانی ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (آیت) اللہ تعالیٰ انسان پر اس کی صلاحیت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا یعنی مکلف نہیں بناتا تمام معروفات و منکرات کے احکامات عین فطرتِ انسان کے مطابق ہیں۔

عزم و ہمت ہو اگر انسان میں
ہے عبث اس کے لئے لفظِ محال
کتنا اچھا ہو کہ ہم قائم کریں
بزمِ ہستی میں کوئی روشن مثال

نفس امارۃ کے ختم ہونے پر روح غالب ہونے لگتی ہے اور ملکوتی طاقتیں انسان کے حق معاون و ممد کا کام کرنے لگتی ہیں۔ نفس لوامۃ کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب کبھی نفس امارۃ کا ہونے لگتا ہے تو نفس لوامۃ شکار ہونے سے بچا لیتا ہے اور ضمیر کی آواز کو سننے اور ہمہ وقت پر عمل کرانے پر مصر ہوتا ہے۔

نفس لوامۃ کی وجہ سے دل دماغ ہر طرح کے فکری و نظریاتی انتشار و خلفشار سے اور جوارح ہر بے اعتدالیوں و ناہمواریوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس باطنی پاکی و صفائی کا اثر اس کے نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اعضاء و جوارح صحیح سمت پر کام کرنے لگتے ہیں۔ شیطانی طاقتیں اور امارۃ کی قوتیں انسان کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ دراصل عبادت و ریاضت، تقویٰ و

پرہیزگاری، خشیتِ الٰہی و خوفِ خداوندی اخلاص کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔ اس کے بعد انسان کا نفس، نفس مطمئنۃ بن جاتا ہے۔ یعنی نفس روح کے مطابق و موافق ہوجاتا ہے۔

نفسِ مطمئنۃ

باطنی کشمکش دور ہوکر نفس و روح میں کلی مصالحت ہوجاتی ہے نفس مطمئنۃ اور روح ایک ہوجاتے ہیں۔ نفس روح کے تابع ہوکر روح کی سرپرستی و رہنمائی قبول کرلیتا ہے۔ اس طرح انسان اللہ کے امر و نہی کے ادا کرنے میں سکونِ قلب حاصل کرتا ہے۔ عبادت و عبودیت، بندگی و تابعداری کا پیکر بن جاتا ہے شیطانی حملے نفس امارۃ کے حربے، سماج و رواج کے طور طریقے، بدعات و خرافات کے راستے انسان سے اتنی دور ہوجاتے ہیں کہ ان کے منحوس سائے بھی انسان پر نہیں پڑتے۔ اس حال میں انسان کو ایمان و اطمینان، سکون وچین نصیب ہوتا ہے۔ فرحت و مسرت سے انسان کا رشتہ مضبوط ہوجاتا ہے۔ کسی کا ڈر کسی کا خوف غرضکہ دنیاوی پریشانی و بے چینی کے ختم ہونے سے اخروی زندگی کی خوشی و شادمانی کا مزہ انسان اسی زندگی میں چکھنے لگتا ہے۔ اسلام کا معیارِ ایمانی بھی یہی ہے۔ اس حال میں پیغامِ خداوندی انسان کا ان الفاظ میں استقبال کرتا ہے "اے نفس مطمئنۃ چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے نیک انجام سے) خوش اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ و محبوب ہے" (الفجر آیت ۲۷، ۲۸)

قرآن مجید کی تمام آیتوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام روایتوں اور تمام اکابر امت و صلحاء کی حکایتوں میں یہی معیارِ ایمانی و دینی کارفرما نظر آتا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح

مؤلف :۔ مولانا فرید الوحیدی

تبصرہ :۔ پروفیسر بدرالدین فاضل دیوبند صدر شعبۂ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی بنارس۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی ذات گرامی کسی تعارف و تعریف کی محتاج نہیں ہے، ان کی وفات کے بعد ۳۵ برس کے عرصے میں پاکستان اور ہندوستان میں اس عظیم شخصیت پر پچاسوں کتابیں، خصوصی شمارے اور روئدادیں شائع ہو چکی ہیں، مگر ہر کتاب کی اشاعت پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کی زندگی کے بہت سے گوشے اس سے تشنۂ تفصیل رہ گئے تھے، اس سلسلے کی ایک نئی تالیف مولانا فرید الوحیدی کی زیر تبصرہ کتاب جو بلاشبہ ایک مثالی اور کامیاب پیش رفت قرار دی جا سکتی ہے۔

ابتداءً یہ خیال گذرا تھا کہ اس کتاب کی تالیف میں بہت تاخیر ہوئی ہے، اس کا صحیح وقت پہلے تھا مگر نومبر ۱۹۹۲ء کے بعد سے ملک خصوصاً مسلمان اور دوسری اقلیتیں اور کمزور و نادار جس بھیانک اور تباہ کن صورت حال سے دوچار ہیں ان کے پیش نظر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ قدرت نے فاضل مؤلف کے ذریعہ ایک بروقت اور دیر آید درست آید خدمت انجام دلائی ہے کتاب کا مطالعہ عام وخاص مسلمانوں میں یہ سیاسی شعور بیدار کرنے میں کافی حد تک مفید ہے کہ ماضی قریب میں ان کے غور و فکر اور سرگرمیوں کا رخ کیا رہا ہے اور آئندہ کیا ہونا ہے۔ کتاب اپنے عنوان کی بنیاد پر بادی النظر میں ایک مرشد، محدث اور برگزیدہ ذات گرامی کی سوانح نظر آتی ہے، مگر درحقیقت یہ سوانح سن اٹھارہ سو ستاون سے لے کر سن انیس سو سینتالیس تک کی جدوجہد آزادی کی مکمل مگر مجمل تاریخ ہے جس میں اس دور کے معاشی، تہذیبی اور انقلابی پہلوؤں پر بھی ایک جاذب توجہ طائرانہ نظر پڑتی چلی جاتی ہے، ترتیب میں سب سے پہلے حضرت کے خاندان، ان کے والد ماجد اور بھائیوں، بھتیجوں کا اس قدر تفصیل کے ساتھ ذکر ہے کہ ڈیڑھ سو

صفحات تک کتاب حضرت شیخ الاسلام کے بجائے ان کے والد حضرت مولانا حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتی ہے، مؤلف خود بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ حصہ ان کے اور بعض مخصوص احبا افراد کے لئے تو اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے مگر عام قاری کو اس سے زیادہ دلچسپی شاید ہی ہوسکے تاہم اس جز میں ضمنی طور پر دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی حالات، اس کے بعض علماء و فضلاء اور خصوصاً حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں شامل ہوگیا ہے، اس لئے اس مدرسے سے تعلق رکھنے والوں کے لئے یہ باب افادہ اور استفادہ سے یکسر خالی بھی نہیں کہا جا سکتا۔

'مالٹا کے قیدی' کے عنوان سے مؤلف نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی اسارت، مالٹا کے احوال بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں، ہندوستان کی جنگ آزادی کے اس اہم واقعہ کا ذکر جس خوبی تفصیل اور دلکش انداز میں کیا گیا ہے یہ مؤلف ہی کا حصہ تھا، اس ذیل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء کی اسارت کا بھی نہایت شرح و بسط کے ساتھ ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ باب بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔

حضرت کی زندگی کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برسہابرس تک درس و تدریس حدیث و تفسیر اور دین و شریعت کی خدمات انجام دینے کے بعد وہ کون سے عوامل تھے جن سے مجبور ہو کر حضرت نے میدان جنگ اور سیاسی جدوجہد میں شمولیت اختیار کی؟ اس مسئلے پر فاضل مؤلف نے کتاب کے صفحہ ۳۶۰ اور اس کے سیاق میں بڑی مدلل اور مفصل تحریر سپرد قلم کی ہے، اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بعض علاقوں میں انگریزوں کے بے پناہ مظالم اور چیرہ دستیوں کے دردناک واقعات نے حضرت کو مضطرب اور بیتاب کردیا، وہ بے چین اور دردمند ہوگئے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان مظالم سے مظلوم مسلمانوں کو نجات دلائیں اسی بنا پر وہ سامراج کی مخالفت کو مقدس فریضہ گردانتے اور جدوجہد آزادی کو اسلامی جہاد کا درجہ دیتے تھے، مؤلف نے اس جہاد میں حضرت کی سرفروشیوں کی جو جھلکیاں پیش کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام کی شخصیت ہندوستان ہی کی یا عالم اسلامی ہی کی نہیں بلکہ پوری عالم انسانی کی محسن تھی۔ حضرت کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق، مصر، فلسطین و حجاز وغیرہ بھی انہی

مصیبتوں کا شکار بنے ہوئے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ ان تمام ممالک کی مصیبتیں صرف ہندوستان کی غلامی کے سبب سے ہیں، لہٰذا ہر مسلمان کا مذہبی اور دینی فریضہ ہے کہ اس ظالمانہ شہنشاہیت کے بارگراں کو جلد از جلد ہندوستان سے ہٹاکر عدل وانصاف کی حکومت قائم کرے۔"

کانگریس میں شمولیت اور جدوجہد آزادی میں شرکت کے بیان کے ذیل میں مؤلف نے حضرت کی سرفروشیوں کو دوسرے مجاہدین آزادی سے جس خوبصورتی اور مضبوط دلائل کے ساتھ الگ اور نمایاں کیا ہے اسے ان کی ایک تاریخی تحقیق قرار دیا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دوسرے لیڈران، سیاسی جماعتیں اور ہندوستان کے اعیان جس جدوجہد کو تحریک آزادئ ہندوستان، اور جس جنگ کو سیاسی اور ملکی لڑائی اور جن قربانیوں اور سرفروشیوں کو لیلائے آزادی کے حضور نذرانہ قرار دیتے تھے، حضرت کے مسلک میں وہ ساری سرگرمیاں اور قربانیاں ایک مذہبی فریضہ تھیں، ایک ایسی جدوجہد جس کے ذریعہ حجاز مبارک حرمین شریفین، بیت المقدس، عرب ومصر، خلافتِ اسلامیہ ہندوستان اور سب ہی اسلامی طاقتوں کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہوں اور بیڑیاں کٹ رہی ہوں وہ جہاد مقدس کے دینی فریضہ کے علاوہ ہو بھی کیا سکتی ہے؟ خوب سمجھ لیجئے کہ حضرت کے نزدیک جہاد آزادی ہند وہ معرکہ تھا جس کی راہ میں سر دینے والا شہید اور سر لینے والا غازی کے مناصب عالیہ کا مستحق تھا۔" (ص ۳۶۷)

اس مسلک پر مؤلف کے جمع کردہ دلائل اور حضرت کے بیانات بڑی خوبی کے ساتھ کتاب میں پیش کئے گئے ہیں۔

جنگ آزادی کے نتیجہ میں ملک جس مرحلہ سے دوچار ہوا، کتاب میں اس کی تفصیل بھی بڑی عبرت انگیز ہے، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے تمام عمر سنگلاخ صحراؤں اور خارزاروں میں جادہ پیمائی کرنے کے بعد جب اپنی پیرانہ سالی میں قدم رکھا تو لیلائے آزادی نے اپنی رخ زیبا سے نقاب اٹھائی مگر پردے کے پیچھے سے جو چہرہ برآمد ہوا اس پر اُس حسن اور تابندگی کے آثار بالکل مفقود تھے جن کا ان مجاہدین نے خواب دیکھا تھا، روز اول ہی سے اس پر کچھ ایسی خونخوار روحوں

کا سایہ منڈلانے لگا جس سے ہر محب وطن کا دل لرز اٹھا۔

آزادی کا سورج اپنے ساتھ جو دل دہلانے والی خوں چکاں داستانیں لے کر نمودار ہوا اس کی بعض مثالیں اور واقعات پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے، اس وحشتناک ماحول میں ہزاروں خون آلود انسانیت کش داستانوں نے جنم لیا ہوگا مگر مؤلف کی نگاہ انتخاب نے چند چیدہ مثالوں اور واقعات پر اکتفا کیا ہے اور اپنے پردرد الفاظ میں اس طرح سپرد قلم کیا ہے کہ ان تصویروں کے نقوش ذہن سے محو ہونے مشکل ہیں۔

اس ذیل میں حضرت کی آخری اور آزادی کے بعد کی سرفروشی اور جرأت مندانہ خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک باب، ایک مثالی اور تاریخی کردار، قائم کیا ہے۔ اس میں حضرت رح کی بے مثال اور سرفروشانہ تصویر نہایت درخشندہ اور تابناک ہو کر ابھرتی ہے، اس سلسلے میں مؤلف نے واضح کیا ہے کہ ہمارے اکابر کو بھی ان فرقہ پرست ذہنوں سے بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا، ایک موقعہ پر وزیر اعلیٰ پنت نے حضرت سے فرمایا کہ آپ کہیں تو دارالعلوم کی حفاظت کے لئے فوج بھیجدی جائے۔ اس پر حضرت نے سختی کے ساتھ جواب دیا کہ دارالعلوم خدا کا ہے اس کی حفاظت وہ خود کریگا، آپ سہارنپور کی خبر لیجئے، اگر آپ مسلمانوں کے تحفظ کے بارے میں تذبذب میں ہیں یا اس میں ناکامی کا شبہ ہے تو مجھے اجازت دیجئے میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ وہ اپنی حفاظت خود کریں" ص ۶۵۲۔

۱۹۴۹ء میں جمعیۃ علماء ہند نے لکھنؤ میں ایک تاریخی اجلاس منعقد کیا اس میں مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "خوف و ہراس، بزدلی اور کم ہمتی کو دل سے نکال دو، اور یہاں سے عہد کر کے جاؤ کہ ہر ظلم اور ناانصافی کا ڈٹ کر مقابلہ کرو گے، ہم نے جس طرح مسلم فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح جن سنگھ مہا سبھا، آر ایس ایس اور ہندو فرقہ پرستی کو بھی کچل کر دم لیں گے، کانگریس اور حکومت کا فرض ہے کہ آزادی ضمیر کی فضا اور ملک کی یک جہتی کیلئے اپنی آخری کوششیں صرف کردے"

(الجمعیۃ مجاہد ملت نمبر بحوالہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد ص ۲۳۶)

آخری صفحات میں مؤلف نے "رخصتی نصیحتیں اور آخری وصیتیں" کے عنوان سے حضرت کی وصیتیں لکھی ہیں، اس باب میں مذہبی، تعلیمی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی مسائل اور مشکلات کا پروگرام پیش کیا ہے، اس موضوع کو پڑھ کر عزم و حوصلوں کو تقویت و تازگی ملتی ہے اور یقین ہے آج کے دور میں نیز آج سے پچاس سو برس بعد بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر اور کامیاب

لائحہ عمل ملنا مشکل ہے۔

حضرت کے خطبات صدارت، تقریریں اور بیانات بلاشبہ اس تاریخی اہمیت کے مستحق ہیں کہ انھیں پوری تحقیق وتفصیل کے ساتھ یکجا کر کے شرح وحواشی کے ساتھ شائع کیا جائے، افسوس ہے کہ اس قیمتی اور مفید سرمایہ پر اب تک توجہ نہیں کی گئی، فاضل مؤلف ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مشہور اور منتخب خطبات صدارت کا ملخص اس ربط وبسط کے ساتھ شریک کتاب کر دیا ہے کہ بڑی حد تک یہ ضرورت پوری ہوگئی ہے۔

کتاب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں کا قابل قدر مقدمہ بھی شامل ہے جس میں موصوف نے جہاں کتاب کی اہمیت اور اس کی افادیت کی جانب اشارہ کیا ہے وہیں بعض کمزوریوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اس مقدمہ کی وجہ سے یہ تالیف پوری طرح مستند اور مصدق ہوگئی ہے۔

مذکورہ خصوصیات اور اوصاف کے ساتھ ایک بڑی اور قابل تعریف خوبی مؤلف کا دلچسپ طرز بیان، سادہ اور جاذب توجہ اسلوب نگارش اور معیاری زبان ہے، جا بجا ایسے برمحل اشعار اور نظمیں پیش کی گئی ہیں گویا یہ اسی موقعہ کے لئے معرض وجود میں آئی ہیں، پوری کتاب ایک طرح کے مصورانہ اسلوب میں لکھی گئی ہے کہ ایک بار شروع کر دینے کے بعد ہاتھ سے چھوٹنی مشکل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف آنکھوں دیکھی حکایت بیان کر رہا ہے اور اپنے قاری کو اسی ماحول میں پہونچا دیتا ہے جس سے یہ تاریخ تعلق رکھتی ہے، تحریر کی ایک علمی اور تاریخی خوبی یہ ہے کہ صرف دعووں اور بیانات پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر واقعہ اور حادثہ کے ثبوت میں مکمل استدلال اور مستند حوالے بڑے سلیقہ سے پیش کئے گئے ہیں، مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب نے مؤلف کو ایک محقق مورخ اور صاحب طرز ادیب کے درجہ تک پہونچا دیا ہے۔

خیال ہوتا ہے کہ قومی افادیت تاریخی اہمیت اور ملک وملت کے لئے مکمل لائحہ عمل ہونے کے پیش نظر کتاب کا انگریزی، ہندی، گجراتی، ملیالم اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا اور ملک کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور مدارس کی لائبریریوں میں اس کی موجودگی ازبس ضروری ہے

ان تمام خوبیوں اور خصوصیات کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی رہ گئی ہیں، حضرت کی روحانی علمی، تدریسی اور حدیثی خدمات، بلند کرداری اور مکارم اخلاق بے نفسی اور بے غرضی وہ صفات حسنہ

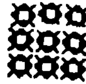
ہیں جنھوں نے حضرت شیخ الاسلام رحمہ کو اپنے عصر اور معاصرین میں ممتاز ترین اور بے مثال مقام تک پہونچا دیا تھا، کتاب میں ان عظمتوں اور عزیمتوں کا کما حقہ تفصیلی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اس کے بغیر کتاب ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

انگریزی ماخذ سے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان کے صرف ترجمہ پر اکتفار کیا گیا ہے، احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ اصل عبارت بھی پیش کی جاتی۔

واقعات کی ترتیب میں کہیں کہیں تکرار ہوگئی ہے یا یوں سمجھئے کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف پیرایہ میں دو جگہ بیان کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

کتاب نہایت اعلیٰ کاغذ پر خوبصورت کتابت اور بے داغ طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے جلد اور گردپوش نہایت مضبوط جاذب نظر اور سادگی اور حسن کی مثال ہے، ان خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ساڑھے آٹھ سو صفحے کی اس کتاب کی قیمت دوسو پچاس روپیہ اس ہوش ربا گرانی کے زمانہ میں زیادہ معلوم نہیں ہوتی، تاہم ممکن ہے کہ ناشرین. قومی کتاب گھر ۲۵۸ ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ آئندہ ایڈیشنوں میں اس قیمت پر نظر ثانی کریں۔



صومالیہ کی بگڑتی صورت حال

نوآبادیاتی نظام کی دین

عادل صدیقی

صومالیہ کی حالیہ تباہی و بربادی کے خوفناک مناظر بیان سے باہر ہیں، صرف گذشتہ ایک سال میں جنگ اور بھوک سے ساڑھے تین لاکھ بے گناہ انسان جاں بحق ہوچکے ہیں۔ یہ ملک قحط سالی کا شکار ہے، اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دو ہزار افراد جن میں زیادہ تر خواتین اور بچے شامل ہیں، روزانہ بھوک سے مر رہے ہیں بین الاقوامی برادری کے لئے یہ ایک زبردست چیلنج ہے، صومالیہ کے عوام نے "آپریشن ریسٹور ہوپ" کے نام سے اس امریکی اسکیم کا خیر مقدم کیا ہے جو اس نے وہاں کے لوگوں کی امداد کے لئے شروع کی ہے۔

صومالیہ کی تازہ ترین صورت حال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاید حالات میں بہتری آئے اب لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا سلسلہ کچھ کم ہے، امریکی فوجوں کی واپسی کا عمل شروع ہوچکا ہے اور اقوام متحدہ کی افواج کی موجودگی کے لئے راستہ ہموار ہوا ہے، صومالیہ میں جنگ بندی پر رضامندی ہوگئی ہے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں عدیس آبابا میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی مصالحتی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے گا، لیکن صومالیہ کا بحران ابھی حل نہیں ہوپایا ہے۔

پس منظر:— صومالیہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ یہاں سے عرب ممالک کی طرف جایا جاسکتا ہے، بحر قلزم میں آنے کے لئے بھی اس سے راستہ مل جاتا ہے، عرب ممالک جو اپنی تیل کی پیداوار کے لئے مشہور ہیں اور خلیجی ممالک جو تیل اور قدرتی وسائل کی یافت کا ذریعہ ہیں، ان سے صومالیہ کا قریبی تعلق ہے، ۱۸۶۹ء میں نہر سوئز کے کھل جانے کے بعد صومالیہ یوروپی طاقتوں کے لئے بے حد اہمیت اختیار کرگیا، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی عرصے میں برطانیہ، فرانس، اور اٹلی نے صومالیہ کے طویل ساحل کو آپس میں بانٹ

لیا اور اپنی اپنی نوآبادیاں قائم کرڈالیں، اس کے ساتھ ہی ایتھوپیا (حبش) کا شہنشاہ اپنی سرحدوں کی توسیع کا خواہشمند تھا، ان حالات میں ان یوروپی مملکتوں کی سرحدیں آپس میں وجہ نزاع بن گئیں اور ان کی وجہ سے آپس میں رنجش پیدا ہوگیا، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ایتھوپیا پر حملہ کردیا، ۱۹۴۶ء میں دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے ایک تجویز رکھی کہ صومالیہ کا تمامتر رقبہ اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں لے آیا جائے، لیکن روس اور امریکہ نے اس تجویز کو مسترد کردیا، صرف اٹلی کے زیرنگیں صومالی رقبہ اقوام متحدہ کی ٹرسٹی شپ میں رہا، یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو ری پبلک آف صومالیہ آزاد ہوئی مگر اس میں صومالیہ کے پانچ حصوں میں سے صرف دو حصے شامل رہے، ان دو کے نام ہیں برطانیہ کے زیرنگیں صومالیہ اور اطالوی ٹرسٹ کے ماتحت صومالیہ کا علاقہ، باقی تین حصے یہ ہیں۔ فرانس کے زیرنگیں صومالی رقبہ (ڈجی بوٹی) ایتھوپیا کا اوگادن خطہ اور کینیا میں شمالی سرحدی ضلع (این ایف ڈی) یہ تینوں غیرملکی نگرانی میں رہے، صومالی باشندوں کا کہنا ہے کہ صومالی قوم نوآبادیاتی نظام سے بھی پہلے کی ہے، یہ سچ بھی ہے، صومالی قوم ایک سے طرز کے عوام پر مشتمل ہے یہ سب کے سب کھیتی کرتے ہیں، مویشی چراتے ہیں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور سب کے سب مسلمان ہیں، ان کے رسم و رواج اور ثقافتی انداز ایک ہی سے ہیں، ۱۹۶۰ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے ایک اہم سیاسی شخصیت سید باری نے بجاطور پر کہا تھا کہ صومالیہ کی تباہی کی تمامتر ذمہ داری نوآبادیاتی نظام پر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ملک پانچ حصوں میں تقسیم ہوا، دو حصے برطانیہ کے پاس ہیں ایک حصہ اٹلی کے پاس، ایک فرانس کے پاس اور ایک ایتھوپیا کے پاس ہے، صومالیہ کے نقطہ نظر سے نئی جمہوریہ نے آزادی ضرور حاصل کرلی مگر یہ آزادی کی نصف لڑائی تھی جس پر فتح حاصل کرلی گئی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر آزاد صومالیہ کی خارجہ پالیسی نے ملحقہ خطوں کو آزاد کرانے پر زور دیا ہے یہ سب مل کر متحدہ ریاست بنانے کی کوشش کررہے ہیں، صومالیہ کے جھنڈے پر پانچ کونے والا ستارہ اس ملک کے پانچ حصوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور اس بات علامت ہے کہ یہ سب متحد ہونا چاہتے ہیں

تباہی کا پس منظر :- آزادی کے بعد صومالیہ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک

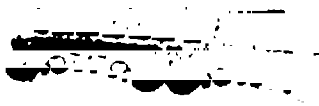
جمہوری نظام رہا اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۱ء تک مطلق العنانہ نظام تھا۔ ان دونوں نظاموں کے تحت ایتھوپیا کے اوگادن اور کینیا کے شمالی سرحدی ضلع میں چل رہی علیحدگی پسندانہ تحریکوں کی حمایت کی جاتی رہی۔ صومالیہ کو ایک بنا دینے کی تحریک نے جنگ جویانہ صورت اختیار کرلی، صومالیہ کو ایتھوپیا کے ساتھ ۱۹۶۱ء ۱۹۶۴ء اور ۷۸/۱۹۷۷ء میں جنگ کرنی پڑی، ۱۹۸۰ء کے بعد تقریباً دس سال تک بھی ان دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کی سی صورت حال چلتی رہی، ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان صومالیہ کو کینیا سے بھی جنگ کرنی پڑی، اس کے بعد دونوں میں عارضی طور پر صلح ہوگئی، صومالیہ کو سب سے زیادہ نقصان اوگادن کی جنگ سے پہونچا، اوگادن سے تقریباً دس لاکھ پناہ گزیں ۱۹۸۰ء تک صومالیہ میں داخل ہوگئے اس سے صومالیہ کی شکست خوردہ معیشت پر اور اقتصادی بوجھ پڑگیا، ۱۹۸۱ء صومالی قومی تحریک (ایس این ایم) نامی ایک تنظیم قائم ہوئی اس نے ۱۹۸۴ء کے بعد فوجی کارروائیاں تیز کردیں، ان فوجی کارروائیوں کی وجہ سے ہزارہا شہری مارے گئے، گاؤں جل کر راکھ ہوگئے، مویشی ہلاک ہوگئے اور پینے کے پانی کے ذخیروں میں زہر کا اثر آگیا، ۸۹/۱۹۸۸ء میں شدید خانہ جنگی شروع ہوئی اس سے ہرگیسیا نامی شہر تباہ ہوگیا۔

مابعد سرد جنگ:- صومالیہ کا جائے وقوع ایسا ہے کہ اس پر بڑی طاقتوں کی ہمیشہ سے نظر رہی ہے، صومالیہ کا ملحقہ خطوں سے جھگڑا بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا سبب بنا، ہر خطہ ان کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتا رہا، صومالیہ کو دونوں بڑی طاقتیں بڑے پیمانے پر اسلحہ فراہم کرتی رہیں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۵ء تک گویا کہ آزادی ملنے کے پہلے پندرہ برسوں میں روس سے ہتھیار آئے، ۱۹۶۹ء میں سید باری نے صومالیہ کو سوشلسٹ ملک بنا دیا، لیکن ۱۹۷۴ء میں ایتھوپیا کے انقلاب نے صورت حال بدل دی، امریکہ نے ایتھوپیا کو چھوڑ دیا اور صومالیہ کی سرپرستی شروع کردی، اس طرح یہ ملک اسلحہ کی ذخیرہ گاہ بن گیا، صومالیہ سرکار نے بڑے پیمانے پر یہ اسلحہ تقسیم کیا اس طرح سے وہ پڑوسی خطوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا، سب سے پہلے وہ ایتھوپیا سے لڑنا چاہتا تھا چنانچہ جنوری ۱۹۹۱ء میں صومالیہ کی راجدھانی موگا دیشو میں لڑائی زور پکڑ گئی اور صورت حال حکومت کے قابو سے باہر ہوگئی، ایک ماہ کی لڑائی کے بعد سید باری کو دست بردار ہونا پڑا،

اس وقت ملک افراتفری کا شکار ہوا، ۲۱ر جنوری ۱۹۹۱ء کے بعد جب کہ صدر مملکت سید باری حکومت کی ذمہ داریوں سے الگ کر دیئے گئے صومالیہ میں خانہ جنگی کی کیفیت ہے، ۲۹ر جنوری ۱۹۹۱ء کو ایک باغی لیڈر علی مہدی نے اقتدار سنبھالا مگر دیگر باقی رہنماؤں نے ان کی مخالفت کی، ان کے سب سے زیادہ مخالف محمد فرح ادید رہے حالانکہ ان دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے لیکن نومبر ۱۹۹۱ء میں دونوں کے درمیان مکمل جنگ کا آغاز ہوا، اس جنگ کے پہلے چھ ماہ موگا دیشو میں ۱۴ ہزار افراد مارے گئے اور ۲۷ ہزار زخمی ہوئے، سید باری کے الگ ہو جانے کے بعد اس خانہ جنگی نے وہاں کے لوگوں کو بے حد مایوس کر دیا، صومالی قومی تحریک کی حمایت خاص طور پر اسحٰق نامی قبیلے نے کی تھی اور سید باری کو الگ کرایا تھا، مگر بعد کے حالات سے اس نے مرکزی سرکار سے علیحدہ ہونے کی آواز اٹھائی، اس نے شمالی صومالیہ میں الگ سے جمہوریہ صومالی لینڈ کے قیام کا مطالبہ کیا چنانچہ ۱۸ر مئی ۱۹۹۱ء کو یہ جمہوریہ قائم ہو گئی اگرچہ اسے نہ تو کسی ملک نے اور نہ ہی کسی بین الاقوامی تنظیم نے تسلیم کیا مگر اس سے صومالیہ کا بحران اور گہرا ہو گیا۔

امن کا راستہ کیا ہو؟

اس بحران کا حل آسان نہیں ہے، البتہ خوش آئند بات یہ ہے کہ متحارب گروپ بین الاقوامی دباؤ سے مارچ ۱۹۹۳ء میں عدیس ابابا میں ہونے والی امن کانفرنس میں شرکت کے لئے تیار ہیں، لیکن محض جنگ سے باز رہنا ہی تو امن کی ضمانت نہیں بن سکتا، ملک میں خوش حالی کے پروگرام شروع کئے بغیر اس بھیانک صورت حال سے باہر نکلنا دشوار ہے۔



دار العلوم دیوبند کا ترجمان



دار العلوم

ماہ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۳ء

شمارہ نمبر ۸
جلد نمبر ۷۸

فی شمارہ ۶/=
سالانہ ۶۰/=

نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۲۵۰/= روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/= ،،
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/= ،،

یہاں اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے
اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی
مدت خریداری ختم ہو گئی ہے

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب، مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلادیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ کھیل گاؤں ڈھاکہ ۱۲۱۹ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

منیجر



دینی حلقوں میں اور

روشن خیال دانشوروں کا رویہ

اسلام دین فطرت اور ایک جامع نظام حیات ہے، جو راستی و سچائی کا آخری بیان ہونے کی بنا پر اپنے اندر کسی ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش نہیں رکھتا، اس کی تعلیمات میں ایک طرف صلابت و قطعیت ہے تو دوسری طرف وہ اپنے اندر بے پناہ جامعیت اور ہمہ گیری لئے ہوئے ہے جس میں ہر دم رواں، پیہم دواں زندگی کے مسائل کے حل کی پوری صلاحیت ہے، قرآن حکیم جو خدائے لازوال کا ابدی پیغام ہدایت ہے اصول و کلیات بیان کرتا ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان وحی ترجمان سے ان اصول و کلیات کی تشریح و توضیح اور اپنے معصوم عمل سے ان کی تطبیق و تنفیذ کا مثالی نمونہ پیش فرمایا ہے، صحابہ کرام، تابعین عظام ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین قانون اسلامی کے انہیں دونوں ماخذوں یعنی کتاب وسنت کی روشنی میں اجماع و اجتہاد کے ذریعہ اپنے اپنے دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل امت کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں، جس کا سلسلہ علمائے حق کے ذریعہ آج بھی جاری ہے، اسلام کی تاریخ ثقافت اور فقہ اسلامی کی تدوین وارتقاء سے واقفیت رکھنے والے اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے۔

مغربی تہذیب جس کی بنیاد ہی اباحیت اور مذہبی و اخلاقی قدروں کی پامالی پر ہے بدقسمتی سے آج پوری دنیا پر چھا گئی ہے جس سے ہمارا ملک بھی مستثنیٰ نہیں ہے، تہذیب جدید کی اسی اباحیت پسندی کے زیر اثر بے ضرورت مسائل کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور ملک کا روشن خیال طبقہ جو درحقیقت مغربی تہذیب کا دلدادہ ہی نہیں بلکہ نمائندہ ہے ان بے ضرورت مسائل کو اٹھاتا رہتا ہے بلکہ بعض ان مسائل میں بھی جو عہد صحابہ وغیرہ میں اجماعی و متفقہ طور پر طے پاچکے ہیں ان میں تشکیک و التباس اور شکوک و شبہات ظاہر کرکے (جس کی انھیں بطور خاص تعلیم دی گئی ہے) ان کے لئے من چاہے فیصلہ کا غیر مناسب مطالبہ کیا جاتا ہے، مزید برآں عربی زبان وادب، قرآن و حدیث، اور ان سے متعلق ضروری علوم سے واجبی واقفیت کے بغیر دینی مسائل میں اجتہاد کے فرائض انجام دینے کے خبط میں بھی یہ طبقہ مبتلا ہے، اور اس بات کا خواہاں ہے کہ سلف صالحین و ائمہ مجتہدین کی بے لوث جدوجہد کے ثمرات اور ان کی مخلصانہ کاوش سے حاصل شدہ متاع گرانمایہ جو مختلف مذاہب فقہ کی شکل میں امت کے پاس موجود ہے اسے نذر آتش کرکے از سرنو قرآن و حدیث میں غور و فکر کے ذریعہ مسائل کے حل تلاش کئے جائیں، چنانچہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کا مسئلہ اس کی زندہ مثال ہے جو آج کل ہمارے ان روشن خیال دانشوروں کی اجتہاد پسند اور اباحیت نواز فکر و نظر کا ہدف بنا ہوا ہے، ان کے اس غیر معقول رویہ سے ایک طرف تو ملت کی تضحیک ہو رہی ہے، اور دوسری جانب اسلام مخالف عناصر کے لئے مسلم پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کا جواز فراہم ہو رہا ہے، جس کا وہ ایک عرصہ سے خواہش مند ہے، مگر ہمارے یہ دانشور چپ و راست سے بے خبر شوق اجتہاد بلکہ جوشش تجدد میں اپنے ناوک قلم سے دینی احکام و مسائل میں رخنہ اندازی میں مصروف ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر ملک کے مشہور روشن خیال دانشور جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مقالہ ہے جو "تین طلاقیں ایک عالمی نظر میں" کے عنوان سے ۱۴ر جولائی ۱۹۹۳ء کو روزنامہ قومی آواز دہلی میں شائع ہوا ہے۔ موصوف متوازن فکر اور سنجیدہ قلم کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں، لیکن نہایت دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ بھی مسئلہ زیر عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے بیجا قطعیت اور خشونت و سخت کلامی سے

اپنے آپ کو بچا نہ سکے اور ان کا روایتی اسلوب اور معتدل طرز فکر تجدد پسندی کے آگے سپر انداز ہوگیا ہے اور ان کے قلم کے تیر ونشتر سے اسلام کی مایۂ صد افتخار شخصیتیں تک بھی محفوظ نہیں رہ سکی ہیں موصوف مضمون کی تمہید میں لکھتے ہیں۔

"راقم کی دسترس فقہ تک نہیں ہے، لہٰذا ان سطروں کو عالموں کی محفل میں ایک عامی کی بات کے بطور سمجھئے، یوں تو ہر دین و مذہب کے ماننے والے کو اس کا قدرتی حق ہے کہ وہ دین کے احکام اور اس کی مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے لیکن اسلام کے کلمہ گویوں کو یہ حق کچھ اور زیادہ ہے"

اہل اسلام کے اس ترجیحی حق کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اسلام میں نہ کلیسا ہے نہ کارکنان کلیسا...... نہ اس میں مٹھ ہے نہ پنڈت ہیں نہ پروہت گویا اسلام اور اسکے ماننے والے کے درمیان کسی کو حائل نہیں ہونے دیا گیا ہے"

(۱) موصوف کا یہ بیان درست ہے کہ اسلام میں کلیسائی نظام جیسی کوئی چیز نہیں، یہ بھی درست ہے کہ مذہب کے معاملہ میں پنڈتوں و پروہتوں جیسی مطلق بالادستی کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور موصوف کی یہ بات بھی صحیح ہے کہ دین کے ماننے والے کا یہ حق (بلکہ اس کی ذمہ داری ہے) کہ دین کے احکام اور اسکے مصالح کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، لیکن اسلام نے اس قدرتی حق کو اختیار کرنے کے سلسلے میں اپنے ماننے والوں کو بے مہار آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے طور پر جس طرح چاہے گرے پڑے ماخذوں سے یہ معلومات حاصل کرے بلکہ اسے پابند کیا ہے کہ اسلامی احکام اور ان کی مصلحتوں سے واقفیت رکھنے والوں ہی سے یہ معلومات فراہم کرے، کتاب الٰہی کا فرمان ہے۔ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ الآیۃ اگر تمھیں معلومات نہیں تو جاننے والوں سے دریافت کرو، اور عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اسے اسکے جاننے والے ہی سے معلوم کی جائے، اس لئے کہ جو خود نہیں جانتا وہ دوسرں کو کیا بتائے گا۔ " اوخویشتن گم است کرا رہبری کند"

علاوہ ازیں دینی احکام اور اس کے مصالح کو سمجھنے کی کوشش کرنا ایک الگ چیز ہے، اور

دینی احکام ومسائل میں اظہار رائے اور فیصلے صادر کرنا ایک الگ بات ہے، پہلی چیز ہر اسلام کے ماننے والے سے مطلوب ہے۔ ہادیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" متعلقہ دینی معلومات کا علم طلب کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔ لیکن احکام ومسائل میں بلکہ کسی بھی معاملہ میں علم وتحقیق اور غور وفکر کے بغیر بحث وگفتگو اظہار رائے اور فیصلہ صادر کرنے کی اجازت نہیں ہے، فرمانِ خداوندی ہے "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا، الآیۃ۔ اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو، بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ بے علم وتحقیق کوئی بات زبان سے نہ کہی جائے بلکہ کان آنکھ اور دل ودماغ سے کام لے کر معلومات فراہم کرنے کے بعد کوئی بات منہ سے نکالی جائے۔ سنی سنائی باتوں پر یونہی اٹکل پچو فیصلہ کرنا اور قطعی حکم لگانا آدمی کے لئے مناسب نہیں ہے۔

اسلامی علوم ومسائل کے علاوہ دنیاوی علوم وفنون کا بھی اہل فن کے نزدیک یہی حکم ہے، مثلاً ایک شخص جو سائنس کے ابتدائی اصول وقواعد سے بھی واقف نہیں وہ ماہرین سائنس کے اقوال وآراء میں محاکمہ کرنے بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ اہل فن اسے ایک مسخرہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں دیں گے، سید صاحب کو ان دونوں باتوں کے باہمی فرق کو اپنی تمہید میں واضح کرنا چاہیئے تھا تاکہ ہر ایک کا دائرہ عمل متعین ہوجاتا اور خلط مبحث سے ان کی تحریر پاک رہتی۔

آگے چل کر اصل موضوع پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ائمہ مذاہب نے مذاہب فقہ کی تشکیل کرتے وقت اپنے ادوار اور ادوار ماقبل کو پیش نظر رکھا ہے، ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ ان کی نظر اپنے بعد میں آنے والے ادوار اور ان ادوار میں تیزی سے بدلنے والے —— حالات پر بھی ہوگی ...... اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ دین کی تفہیم کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور حشر تک کھلا رہے گا۔"

(۲) تشکیل فقہ کے وقت ائمہ مجتہدین کے طریقہ کار کے متعلق سید صاحب کا ارشاد بجا اور ان کی یہ بات بھی درست کہ تفہیم دین کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لیکن سید صاحب اپنی اس تحریر سے

جوتاثر دینا چاہتے ہیں اور اس زینہ سے جس مقام تک پہونچنا چاہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ سید صاحب اس عبارت کے ذریعہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حالات و زمانہ کے تغیر سے اسلامی احکام میں تغیر ہوتا رہتا ہے لیکن سید صاحب اس حکم کو جس قدر عام بتانا چاہتے ہیں درحقیقت وہ اس قدر عام نہیں ہے وہ مسائل جن پر صحابہ یا ائمہ مجتہدین کا اجماع ہو چکا ہے، یا وہ مسائل جن کی قطعیت منصوص طور پر ثابت ہے ان میں کسی طرح کی تبدیلی اور کتر بیونت کی کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ کچھ مسائل ایسے ضرور ہیں جن میں اختلاف زمان و مکان کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے، اس موقع پر اس تقسیم کا ذکر ضروری تھا ورنہ اس سے اباحیت کا دروازہ کھل جائیگا اور دینی احکام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائیں گے۔

چند سطروں کے بعد مسئلہ زیر بحث کے متعلق اپنا قطعی فیصلہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"اسلام سہولتیں فراہم کرتا ہے اور عقوبتوں سے جہاں تک ممکن ہو بچاتا ہے، وہ فقہاء جو اسکے برعکس یعنی بیک مجلس دی گئی تین طلاقوں کو تین کی) رائے کا اظہار کرتے ہیں ان سے نادانستہ قرآن وسنت سے انحراف سرزد ہوتا ہے"

(۳) یہ بھی کیا طرفہ تماشا ہے کہ ایک طرف تو اقرار و اعتراف ہے کہ "راقم کی دسترس فقہ تک نہیں ہے" اور دوسری طرف ایک خالص فقہی مسئلہ میں محاکمہ اور قطعی فیصلہ کرنے کا منصب عظیم سنبھال لیا گیا ہے "ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند" تمہید میں دین کے مسائل و احکام کو سمجھنے کا قدرتی حق غالباً اسی مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا، اور دین کی تفہیم کا دروازہ شاید اسی غرض کے لئے کھولا گیا تھا۔

اپنے اس فیصلہ پر کہ جن فقہاء نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دیا ہے ان سے نادانستہ طور پر قرآن وسنت کے حکم سے انحراف سرزد ہوتا ہے، اگر سید صاحب کے دفتر معلومات میں قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت ہو جس سے بصراحت ثابت ہوتا ہو کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی یا کوئی ایسی حدیث ہو جو اصول محدثین کے اعتبار سے مسئلہ زیر بحث میں قابل استدلال ہو تو پیش فرمائیں ورنہ ان کا یہ بے دلیل فیصلہ جمہور فقہاء و محدثین کے مقابلہ میں ایک جسارت بیجا سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھے گا۔

موصوف کے اس فیصلہ کے برعکس ظاہر قرآن سے جمہور ہی کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

مرد کو تین طلاقوں کا جو حق دیا ہے اگر وہ اس کو بیک وقت استعمال کرے تو یہ عمل خود اس کی اپنی مصلحت کے خلاف ہوگا، کیونکہ اس طرح وہ اپنے حق رجعت کو اپنے ہاتھوں ختم کرے گا، چنانچہ سورۂ الطلاق میں فرمایا گیا "وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔ جس نے احکام الٰہی سے تجاوز کیا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تمھیں کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس طلاق کے بعد صلح و صفائی کی کوئی صورت پیدا فرمادے۔ اگر بیک مجلس تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جائے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی باقی رہتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کردے، کیونکہ تین کو ایک شمار کرنے کی صورت میں رجعت کا حق اور موافقت کی صورت باقی ہی رہے گی، قرآن کی یہ آیت طلاق دینے والے کو متنبہ کررہی ہے کہ اگر تم نے طلاق کا مکمل حق ایک بار استعمال کرلیا تو خود اپنے اوپر ظلم کروگے اور بعد میں پچھتاؤگے اور پھر بیوی سے صلح و رجعت کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی (دیکھئے شرح مسلم للنووی ص۴۷۸ ج ۱)

آیت پاک وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہورہا ہے یعنی جو شخص طلاق دینے میں خدا سے ڈرتے ہوئے حکم شریعت کی پابندی کرے گا اور تین طہروں میں وقفے کے ساتھ طلاق دے گا، اس کے لئے رجعت کی گنجائش باقی رہے گی اور اگر اس کے برعکس ایک ہی مجلس میں تینوں طلاقیں جاری کردیگا تو رجعت کی یہ گنجائش ختم ہوجائے گی اور بیوی سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونا پڑجائے گا، ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے آیت پاک کی یہی تفسیر سنن ابوداؤد ص۳۰۶ ج۱ میں منقول ہے، حضرت فاروق اعظم علی مرتضیٰ اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی تفسیر کتب حدیث و تفسیر میں نقل کی گئی ہے، کیا کوئی اس فیصلہ میں حق بجانب ہوسکتا ہے کہ قرآن پاک کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں ان کبار صحابہ کے مقابلے میں بعد کے لوگ آگے ہیں۔

احادیث صحیحہ مثلاً حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث جس میں انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ہے کہ لو انی طلقتها ثلاثا کان لی ان اراجعها قال لا کانت تبین منك وتكون معصية (بيهقی ص۳۳۰ ج ۷، ودارقطنی ص۴۳۸ ج۲) اصول حدیث کے اعتبار سے اس حدیث کے لائق استدلال ہونے میں کوئی معتبر کلام نہیں کیا جاسکتا

یہ حدیث صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ اکٹھی تین طلاقوں سے بیوی جدا ہو جائے گی گو اس طرح طلاق دینا گناہ ہے اسی حدیث کی بنا پر حضرت عبداللہ ابن عمر یکبارگی دی گئی تین طلاقوں کے تین ہونے کا فتویٰ دیا کرتے تھے، حضرت ابن عمر کا یہ فتویٰ بخاری ص۷۹۲/۲ و ص۸۰۳/۲ اور مسلم ص۴۷۶/۱ پر دیکھا جا سکتا ہے

نواسہ رسول حضرت حسن بن علی مرتضیٰ نے اپنی بیوی عائشہ بنت الفضل کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیدیں، بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ عائشہ کو مفارقت پر بہت قلق ہے تو فرط تاثر سے حضرت حسن رو دیئے اور فرمایا لولا انی سمعت جدی او حدثنی ابی انہ سمع جدی یقول ایما رجل طلق امرأتہ ثلاثا مبھمۃ او ثلاثا عند الاقراء لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ لراجعتھا۔ (دارقطنی ص۴۳۶/۲ وبیہقی ص۳۳۶) اگر میں نے اپنے نانا جان سے نہ سنا ہوتا یا یوں فرمایا کہ اگر میں نے اپنے والد سے اور انھوں نے میرے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا کہ جو شخص اپنی بیوی کو تین مبہم یعنی بیک لفظ تین طلاق دیدے یا تین طہروں میں تین طلاقیں دے تو وہ عورت جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرے پہلے کے لئے حلال نہیں ہو سکتی، تو میں عائشہ سے رجعت کر لیتا۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ اسنادہ صحیح، یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے (الاشفاق ص۲۴)

حضرت عائشہ صدیقہ رض کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، اس نے دوسرے شوہر سے نکاح کر لیا، اور دوسرے شوہر نے قبل از خلوت طلاق دیدی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا یہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو گئی، آپ نے فرمایا نہیں تاوقتیکہ دوسرا شوہر پہلے کی طرح لطف اندوز صحبت نہ ہو پہلے کے لئے حلال نہ ہو گی (بخاری ص۷۹۱/۲ ومسلم ص۴۶۳)۔ ان تین معتبر و مستند حدیثوں کے علاوہ اور حدیثیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن ارادۂ اختصار اس کی اجازت نہیں دیتا۔

ظاہر قرآن، احادیث صحیحہ کے علاوہ تقریباً سولہ حضرات صحابہ کا فتویٰ کتب حدیث میں منقول ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی اور اسی پر عہد فاروقی رض میں صحابہ کا اجماع بھی ہو چکا ہے، اس کے برعکس ایک صحابی کا بھی فتویٰ سند صحیح کیساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ایسی عورت کے متعلق جس سے ہمبستری ہو چکی یہ فتویٰ دیا ہو کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں اس کے حق میں ایک شمار ہونگی، حضرات تابعین کا بھی یہی مسلک ہے، ائمہ

مجتہدین اور اجلۂ محدثین بھی یہی کہتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن رجب اپنی کتاب "مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلاث واحدۃ" میں لکھتے ہیں۔ اعلم انہ لم یثبت عن احد من الصحابۃ ولا من التابعین ولا من ائمۃ السلف المعتد بقولھم فی الفتاوی الحلال والحرام شئ صریح فی ان الطلاق الثلث بعد الدخول یحتسب واحدۃ اذا سبق بلفظ واحد۔ صحابہ تابعین اور ائمہ سلف میں جن کے فتاوی پر مسائل حلال وحرام میں اعتماد کیا جاتا ہے کسی سے یہ بصراحت ثابت نہیں ہے کہ صحبت کے بعد کی تین طلاقیں جو ایک لفظ سے دی گئی ہوں ایک شمار ہوں گی (الاشفاق ص۳۵ مطبوعہ مصر) اور بھلا کوئی سمجھدار تین کو ایک کس طرح کہہ سکتا ہے گو عیسائیوں نے تین ایک، ایک تین کا فلسفہ ایجاد کیا مگر اس کی صحیح اور قابل قبول توجیہ پیش کرنے سے آج تک عاجز ہیں

اس لئے بغیر کسی شک و تردد کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سید صاحب سے اس فیصلہ میں قرآن وسنت سے انحراف سرزد ہوا ہے اور ان کا یہ محاکمہ رجما بالغیب کے قبیل سے ہے، کاش کہ سید صاحب اس پتھر کے پھینکنے سے پہلے یہ سوچ لیتے کہ اس سے اسلام کی کیسی کیسی برگزیدہ اور قابل احترام شخصیتیں لہولہان ہو رہی ہیں، لیکن ان کا شوق اجتہاد اور جوش تجدد اس کی فرصت ہی کہاں دیتا ہے۔

چند سطروں کے بعد اپنے ایک اور فیصلہ کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

" طلاق بدعت جو حضرت عمر فاروق کے دور خلافت میں ایک ہنگامی فتنہ کو دبانے کے لئے شروع کی گئی تھی اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد وجہ جواز کھو بیٹھی، روایت ہے کہ خود فاروق اعظم نے اپنے فیصلہ سے رجوع کرلیا تھا .... انسانی فطرت کی کجی اور چور دروازہ نکال لینے کی عادت کو کیا کہئے کہ حضرت عمرؓ کے اس ہنگامی فرمان کو رنگ دوام دے دیا گیا"

(۴) الف ۔ سید صاحب مانتے ہیں کہ وقفہ کے ساتھ تین طہروں میں دی گئی تین طلاقوں سے بیوی جدا اور شوہر کے لئے مثل ایک اجنبیہ کے حرام ہوجاتی ہے گی۔

ب ۔ موصوف کا یہ پختہ خیال ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار

ہوں گی اور اس کے بعد طلاق دینے والا رجعت کر کے عورت کو نکاح میں باقی رکھ سکتا ہے، یعنی اس طلاق کے بعد بھی عورت اس کے لئے جائز و حلال ہے

ج :۔ آنمحترم کا یہ بھی دعوی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ظالم شوہروں کے فتنۂ ظلم کا سدباب کرنے کی غرض سے ہنگامی طور پر یہ فرمان جاری کیا تھا کہ جو شخص بیک مجلس تین طلاقیں دیگا یہ تین طلاقیں اس پر لازم ہوں گی اور اس کی بیوی ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہو جائے گی

د :۔ شوہروں کا فتنۂ ظلم ختم ہو گیا تو اس سزا کا جواز بھی ختم ہو گیا اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنے اس فیصلے سے رجوع کر لیا۔

لا :۔ لیکن انسانی فطرت کی کجی اور چور دروازے نکال لینے کی عادت نے اس وقتی اور ہنگامی سزا کو دوامی حکم دے دیا۔

سید صاحب کے فیصلہ کے یہ پانچ اجزاء ہیں جن کے متعلق علی الترتیب گذارشات ملاحظہ کی جائیں، اول الذکر دو جزوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ج :۔ اسلامی قانون کی رو سے امیر و خلیفہ کو تادیب و تعزیر کا وسیع حق حاصل ہے، لیکن کیا خلیفۂ وقت کو اس کا بھی اختیار ہے کہ خدا کی حلال کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر دے یا کسی حرام کو حلال بنا دے اگر خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے جیسا کہ سید صاحب موصوف کی تحریر بتا رہی ہے تو کس دلیل سے، موصوف قرآن و حدیث سے کوئی حجت پیش فرما دیں تو ہم جیسے طالب علموں پر ان کا ایک علمی احسان ہوگا، تحلیل و تحریم کا تعلق تو امر تشریع سے ہے اور مسند ہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تحفۂ اثناعشریہ ص۱۰ میں لکھتے ہیں، "صحیح آنست کہ امر تشریع مفوض بہ پیغمبر نمی باشد زیرا کہ منصب پیغمبری منصب رسالت و ایلچی گری ست نہ نیابت خدا و نہ شرکت در کار خدا" صحیح یہ ہے کہ شریعت سازی کا کام پیغمبر کے سپرد نہیں ہے کیونکہ پیغمبری کا منصب تو پیغام پہنچانے کا ہے نہ کہ خدا کے کاموں میں شرکت کا، سورہ التحریم کی اولین آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ "اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر"۔ سے حضرت شاہ صاحب رہ کے قول کی تائید ہوتی ہے، تو جب پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست تحریم و تحلیل کا حق نہیں دیا گیا تو کسی امیر و خلیفہ کے بارے میں چاہے وہ خلیفۂ راشد ہی کیوں نہ ہو اس کا تصور بھی

نہیں کیا جاسکتا، علاوہ ازیں فرمان الٰہی ہے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا۔ اے ایمان والو حرام نہ کرو پاکیزہ چیزوں کو جنھیں اللہ نے تمھارے لئے حلال کردی ہیں (ایسا کرکے تم اپنی حد سے) تجاوز نہ کرو، کیا خلیفۂ راشد حضرت فاروق اعظم رضؓ کے متعلق یہ سوچا بھی جاسکتا ہے کہ انھوں نے حکم الٰہی کے علی الرغم پاکیزہ اور حلال بیویوں کو ان کے شوہروں کے لئے حرام کردیا، حقیقت یہ ہے کہ جن صاحب نے اپنی بات کی پچ میں قرآن وحدیث سے ماخوذ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو تعزیر کا عنوان دیا ہے انھوں نے خودپسند امراء وسلاطین کے لئے ایک ایسا دروازہ کھول دیا ہے جس کے ذریعہ خدا ورسول کے احکام میں من چاہی تبدیلی تک وہ بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔

اور بالفرض حضرت عمر فاروق رضؓ نے سزا کا یہ فرمان اپنے اختیار سے تجاوز کرکے صادر کیا تھا تو حضرات صحابہ نے اس غلط فیصلہ پر نکیر کیوں نہیں کی جب کہ اس خیرجماعت کی عورتیں تک برسرمنبر خلیفۂ وقت فاروق اعظم کو ٹوک دیا کرتی تھیں۔ پھر اگر یہ ایک ہنگامی حکم تھا جسے بعد میں ختم ہوجانا تھا تو حضرت عثمان غنی اور حضرت علی مرتضیٰ اپنے اپنے عہد خلافت میں اور دیگر حضرات صحابہ مدت العمر فاروقی فیصلہ کے مطابق کیوں فتویٰ دیتے رہے۔

اگر عہد فاروقی کے اس اجماعی فیصلہ کو تعزیر اور سزا کا نام دیا جائے تو ایک ——— طالب علمانہ اشکال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) حضرت عمرؓ کی یہ سزا مبنی برانصاف نہیں ہے کیونکہ جرم کا مرتکب تو صرف شوہر ہے لہٰذا سزا کا مستحق بھی تنہا وہی ہوگا، لیکن اس سزا نے تو مجرم شوہر کے ساتھ بیگناہ بیوی کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے کہ اسے شوہر جیسے رفیق حیات سے محروم کردیا، کیا مظلوم ہونا بھی جرم ہے جس کی سزا میں فرقت وتنہائی کی اذیت ناک قید میں اسے جکڑ دیا گیا، کیا عدالت فاروقی سے اس ناانصافی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

۵:۔ حضرت عمر رضی اللہ کا اپنے فیصلہ سے رجوع کرلینے کا دعویٰ بھی نرا دعویٰ ہی ہے جو دلیل وبرہان کی قوت سے یکسر محروم ہے، جس روایت کی بنیاد پر رجوع کی کہانی مشہور کی جارہی ہے اس کی حیثیت طبع زاد افسانے سے زیادہ نہیں ہے پھر اس افسانوی روایت میں رجوع کا ذکر ہے نہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا، روایت کے الفاظ اور ائمہ جرح وتعدیل کا اس کے راوی

پر نقد و تبصرہ اس موقع پر بغرض اختصار ترک کر دیا گیا ہے، لیکن اگر سید صاحب کا مطالبہ ہوگا تو دونوں چیزیں باحوالہ پیش کر دی جائیں گی، علاوہ ازیں جناب کے دعوی کے مطابق حضرت فاروق اعظم نے اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا تھا تو رجوع کے بعد لازمی طور پر ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں انھوں نے ایک کا فتویٰ دینا شروع کر دیا ہوگا، لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایسا ایک فتوی ہی صحیح سند کے ساتھ پیش کر دیا جائے تاکہ رجوع کا انکار کرنے والوں کا منھ بند ہو جائے۔

(۵)،۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس ہنگامی فیصلہ کو رنگ دوام دینے والے دو ایک نہیں بلکہ امت کا سواد اعظم ہے اور اس سواد اعظم میں حضرت عمر کے علاوہ دو خلیفہ راشد عثمان غنی اور علی مرتضی اور دیگر صحابہ میں زید بن ثابت، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ام سلمہ، عمران بن الحصین، مغیرہ بن شعبہ ابو ہریرہ، ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے فقہاء صحابہ شامل ہیں، اور بقول حافظ ابن القیم تابعین کا تو کچھ شمار ہی نہیں (اغاثۃ اللہفان ص ۳۲۲ ج ۱) اور مشہور غیر مقلد عالم مولانا شمس الحق ڈیانوی لکھتے ہیں، ائمہ اربعہ اور جمہور علمائے اسلام کا یہی مذہب ہے کہ بیک مجلس دی گئی تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں (عون المعبود شرح سنن ابی داؤد) تو کیا سید صاحب کے نزدیک امت کا یہ سواد اعظم جن کی پیروی کا ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کج فطرت اور اسلامی احکام میں چور دروازہ نکالنے والا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ جس کے دل میں اسلام اور اسلامی شخصیات کی معمولی سی وقعت ہوگی اس کی زبان و قلم سے ان کے بارے میں ایسا اہانت آمیز جملہ نہیں نکل سکتا، بات یہ ہے کہ موصوف جن باکمال اساتذہ کے سعادت مند شاگرد ہیں ان کا سب سے بڑا کمال ہی یہ ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے دل و دماغ سے اسلام اور اکابر اسلام کی وقعت وعظمت کا تصور حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں، اس لئے ان شاگردوں کو اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے خدنگ قلم کا نشانہ کون ہے، اور اسلام و ملت اسلامیہ پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا۔

پیراگراف ۲ میں اپنی بات میں قوت پیدا کرنے کی غرض سے تحریر کرتے ہیں کہ "کئی اسلامی ملکوں نے طلاق کی مسخ شدہ شکل کو (یاد رہے کہ مسخ کرنے کے اس عمل میں امت کا

سواد اعظم شریک ہے) درست کرنے کی کوشش کی ہے، میری محدود اطلاع کے مطابق ان میں قابلِ ذکر مصر اور شام اور پاکستان اور بنگلہ دیش ہیں، کیا ہندوستانی مسلمان جو غیر اسلامی ماحول میں پلے بڑھے ہیں یہ سوچنے میں حق بجانب ہوسکتے ہیں کہ اسلام کو سمجھنے اور برتنے میں وہ اسلامی ممالک سے آگے ہیں؟

⑤ سید صاحب کی یہ بھی خوب منطق ہے کہ ایک طرف تو وہ دین ومذہب کے ماننے والے کا یہ قدرتی حق بتاتے ہیں کہ وہ براہ راست دین کے احکام ومصالح کو سمجھنے کی کوشش کرے، نیز فرماتے ہیں کہ "اسلام اور اس کے ماننے والے کے درمیان کسی کو حائل نہیں ہونے دیا گیا ہے" لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا یہ قدرتی حق دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان مصر وشام جیسی مذہب بیزار حکومتوں کو حائل کردیں، اور اس جرم میں کہ وہ ہندوستان میں کیوں پیدا ہوگئے انھیں دین کی تفہیم میں مصر وشام وغیرہ مسلم ملکوں کا پابند بنادیں۔

سید صاحب موصوف کو جن کی بین الاقوامی معلومات کا دائرہ نہایت وسیع ہے یہ اطلاع ضرور ہوگی کہ مصر وشام اور پاکستان وبنگلہ دیش کی لادینی حکومتوں کے برعکس "مجلس کبار سعودیہ عربیہ" نے (جس کا فیصلہ مملکت سعودیہ کی عدالتوں میں واجب العمل جانا جاتا ہے اور خود شاہِ مملکت بھی اسکے پابند ہوتے ہیں) مسئلہ زیر بحث سے متعلق دونوں قسم کے دلائل وشواہد کی پوری چھان بین اور مکمل بحث ونظر کے بعد بصیرت کے ساتھ یہی فیصلہ کیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی کیونکہ دلائل وبراہین کی بنیاد پر یہی مذہب درست اور صواب ہے، موصوف نے اپنی اس اطلاع کو کس مقصد سے مخفی رکھا اس کے اظہار کی ضرورت نہیں "در مجلس رنداں خبرے نیست کہ ہست" اور اگر اس مسئلہ سے عدم دلچسپی یا کسی اور وجہ سے انھیں "مجلس کبار علماء" کے اس اہم فیصلہ سے واقفیت نہیں ہوسکی تو عرض ہے کہ "مجلۃ البحوث الاسلامیہ جلد ۱ عدد ۳ ۱۳۹۷ھ الریاض" حاصل کرکے ایک نظر دیکھ لیں اس میں مجلس کی پوری کارروائی الف سے یا تک بغیر کسی حذف واختصار کے موجود ہے۔

شاید موصوف کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہوگا کہ مصر وشام وغیرہ ممالک کے بالمقابل مملکت عربیہ سعودیہ دینی وشرعی معاملہ میں آج بھی بسا غنیمت ہے کیونکہ اس کا نظام حکومت

اسلامی ہے اور ان ملکوں کا لادینی، اس لئے شرعی مسائل واحکام میں نظیر بنائے جانے کی مستحق مملکت سعودیہ ہوگی نہ کہ مصر وشام، جہاں اسلامی تہذیب وثقافت کی باتیں کرنا بنیاد پرستی اور رجعت پسندی ہے جو مغربی تہذیب کے نزدیک ایک جرم عظیم ہے۔

رہی بات اسلام کے سمجھنے اور برتنے کی تو بحمد اللہ ہندوستان کے غیر اسلامی ماحول میں پلنے بڑھنے کے باوجود یہاں کے مسلمان مذکورہ ممالک سے اس معاملہ میں کسی طرح پیچھے نہیں ہیں جس کا اعتراف خود وہاں کے علماء وفضلاء کو بھی ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے، لیکن نہ اس کا موقع ہے اور نہ اس مختصر تحریر میں اس کی گنجائش ہی ہے۔

(۶) تقریباً دس بارہ صدیوں سے مسلمان ابنائے وطن کے ساتھ ہندوستان میں آباد ہیں اور وطن عزیز پر برطانوی سامراج کے تسلط سے پہلے یہاں کے تمام مسلمان بغیر کسی اختلاف کے مسئلہ زیر بحث میں فقہ حنفی بلکہ جمہور امت کے مسلک کے مطابق ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین شمار کرتے رہے، تاریخ سے اس کے خلاف ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی، اور آج کی طرح ہر دور میں یہاں ابنائے وطن ہی کی اکثریت رہی ہے، لیکن اس طویل مدت میں کبھی یہ سوال نہیں اٹھا کہ تین طلاقوں کو تین شمار کرنے سے مسلمان غیر مسلم اکثریت کی تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں، درحقیقت شوقِ اجتہاد اور ذوقِ اباحیت کی کوکھ سے اس سوال نے جنم لیا ہے، ورنہ تضحیک وتشنیع کا سبب یہ مسئلہ نہیں ہے، بلکہ روشن خیال دانشوروں کا یہ رویہ ہے کہ اپنے سبک دست اساتذہ کی طرح یہ لوگ مذہبی مسائل میں (جس کی انھیں بطور خاص تربیت دی جاتی ہے) تشکیک والتباس پیدا کرکے دنیا کے سامنے اسے ایک اضحوکہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اور اس کا دوسرا اہم سبب مسلم معاشرہ کی زبوں حالی ہے جس کی بناء پر بہت سارے مسائل بظاہر پیچیدہ ہوگئے ہیں اسلئے ضرورت ہے اپنے آپ کو بدلنے کی، مسلم معاشرہ کی اصلاح کی، نہ کہ دین کے غیر مجتہد مسائل میں ترمیم وتبدیلی کی، شاعر مشرق کو فقہائے حرم سے یہ شکوہ تھا کہ "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں" آج اسی تاریخ کو روشن خیال دانشور دہرانا چاہتے ہیں۔ اگر معاشرہ درست ہوجائے اور اس میں اسلام کے ضابطۂ طلاق پر عمل کرنے کا رواج ہوجائے تو یہ مسئلہ از خود حل ہوجائے گا جو آج بظاہر

(باقی برص ۳۹)

ایک مجلس کی تین طلاقیں

از
مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

اسلامی شریعت میں نکاح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس سے متعلق خصوصی احکامات صادر ہوئے ہیں اور اس کی ترغیب صریح ارشادات نبوی میں موجود ہیں۔ ایک طویل حدیث کے آخر میں آپ نے فرمایا "فمن رغب عن سنتی فلیس منی" جو میری سنتِ نکاح سے اعراض کرے گا وہ میرے طریقہ سے خارج ہے[1]۔

ایک اور حدیث میں فرمایا "ان سُنّتنا النکاح" نکاح ہماری سنت ہے[2]۔

ایک حدیث میں نکاح کو تکمیل ایمان کا ذریعہ بتایا گیا ہے جیسا کہ خادم رسول انس بن مالک راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من تزوج فقد استکمل نصف الایمان فلیتق اللہ فی النصف الباقی" جس نے نکاح کرلیا اس نے اپنے نصف ایمان کی تکمیل کرلی۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ بقیہ نصف کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے[3]۔

انہیں جیسی احادیث کے پیش نظر امام اعظم ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ سلف نے عبادات نافلہ میں اشتغال کے مقابلہ میں نکاح کو افضل قرار دیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ نکاح کی ایک حیثیت اگر باہمی معاملہ کی ہے تو اسی کے ساتھ عام معاملات ومعاہدات سے بالاتر یہ سنت وعبادت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ نکاح کی اسی خصوصی اہمیت کی بنا پر اس کے انعقاد اور وجود پذیر ہونے کے لئے باجماع کچھ ایسے آداب اور ضروری شرائط ہیں جو دیگر معاملات خرید وفروخت وغیرہ میں نہیں ہیں۔ مثلاً ہر عورت اور ہر مرد سے نکاح درست نہیں اس بارے میں اسلامی شریعت کا ایک مستقل قانون

(۱) بخاری شریف ج۲ ص۷۵۵ (۲) مسند امام احمد ج۵ ص۱۶۳ (۳) مشکوٰۃ ص۲۶۸ و مجمع الفوائد ج۱ ص۲۱۶۔

ہے جس کی رُو سے بہت سی عورتوں اور مردوں کا باہم نکاح نہیں ہو سکتا۔ دیگر معاملات کے منعقد و مکمل ہونے کیلئے گواہی شرط نہیں ہے۔ جبکہ نکاح کے انعقاد کے واسطے گواہوں کا موجود ہونا شرط ہے اگر مرد و عورت بغیر گواہوں کے نکاح کرلیں تو یہ نکاح قانون شرع کے لحاظ سے باطل اور کالعدم ہوگا۔

یہ خصوصی احکام اور ضروری پابندیاں بتا رہی ہیں کہ معاملہ نکاح کی سطح دیگر معاملات و معاہدات سے بلند ہے۔ شریعت کی نگاہ میں یہ ایک بہت ہی سنجیدہ اور قابل احترام معاملہ ہے جو اس لئے کیا جاتا ہے کہ باقی رہے یہاں تک کہ موت ہی زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کردے۔ یہ ایک ایسا قابل قدر رشتہ ہے جو تکمیل انسانیت کا ذریعہ اور رضائے الٰہی و اتباع سنت کا وسیلہ ہے۔ جس کے استحکام پر گھر، خاندان اور معاشرے کا استحکام موقوف ہے اور جس کی خوبی و خوشگواری پر معاشرے کی خوبی و بہتری کا دارومدار ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے انقطاع اور ٹوٹنے سے صرف فریقین میاں بیوی ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس کے پورے نظام خانگی کی چولیں ہل جاتی ہیں اور بسا اوقات خاندانوں میں فساد و نزاع تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے جس سے معاشرہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی بناء پر بغیر ضرورت طلاق جو رشتہ نکاح کو منقطع کرنے کا شرعی ذریعہ ہے خدائے دوجہاں کے نزدیک ایک ناپسندیدہ اور ناگوار عمل ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق" اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں طلاق سے زیادہ مبغوض اور کوئی چیز نہیں ہے۔ (۱)

اسلام کا ضابطۂ طلاق

اس لئے جو اسباب و وجوہ اس بابرکت اور محترم رشتہ کو توڑنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں انہیں راہ سے ہٹانے کا کتاب و سنت کی تعلیمات نے مکمل انتظام کر دیا ہے۔ زوجین کے باہمی حالات و معاملات سے متعلق قرآن و حدیث میں جو ہدایتیں دی گئی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ یہ رشتہ کمزور ہونے کی بجائے پائیدار اور مستحکم ہوتا چلا جائے۔ ناموافقت کی صورت میں افہام و تفہیم، پھر زجر و تنبیہ اور اگر اس سے کام نہ چلے اور بات بڑھ جائے تو خاندان ہی کے افراد کو حکم و ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

لیکن بسا اوقات حالات اس حد تک بگڑ جاتے ہیں کہ اصلاح حال کی یہ ساری کوششیں بے سود ہو جاتی ہیں اور رشتۂ ازدواج سے مطلوب ثمرات و فوائد حاصل ہونے کی بجائے زوجین کا

---

(۱) سنن ابی داؤد ج ۱ صـ ۳۰۲ المستدرک للحاکم ج ۲ صـ ۱۹۶ و قال الذہبی صحیح علی شرط مسلم۔

باہم مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ ایسی ناگزیر حالت میں ازدواجی تعلق کا ختم کر دینا ہی دونوں کے لئے بلکہ پورے خاندان کے لئے باعث راحت ہوتا ہے اسی لئے شریعت نے طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا۔ جس میں طلاق کا اختیار صرف مرد کو دیا گیا جس میں عادتاً وطبعاً عورت کے مقابلہ میں فکرو تدبر اور برداشت وتحمل کی قوت زیادہ ہوتی ہے علاوہ از یں مرد کی قومیت وافضلیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ اختیار صرف اسی کو حاصل ہو۔ لیکن عورت کو بھی اس حق سے یکسر محروم نہیں کیا کہ وہ کالمیّت فِی یَدِ الغسّال شوہر کے ہر ظلم وجَور کا ہدف بنی رہے اور اپنی رہائی کے لئے کچھ نہ کرسکے۔ بلکہ اسے بھی یہ حق دیا کہ حاکم شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے قانون کے مطابق طلاق حاصل کرسکتی یا نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔

پھر مرد کو طلاق کا اختیار دیکر اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ اسے تاکیدی ہدایت دی کہ کسی وقتی وہنگامی ناگواری میں اس حق کو استعمال نہ کرے۔ اس پر بھی سخت تنبیہ کی گئی کہ حق طلاق کو دفعتہً استعمال کرنا غیر مناسب اور نادانی ہے کیونکہ اس صورت میں غور وفکر اور مصالح کے مطابق فیصلہ لینے کی گنجائش ختم ہو جائے گی جس کا نتیجہ حسرت وندامت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی بھی تاکید کی گئی کہ حیض کے زمانہ میں یا ایسے طہر میں جس میں ہمبستری ہو چکی ہے طلاق نہ دی جائے کیونکہ اس صورت میں عورت کو خواہ مخواہ طول عدت کا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ اس حق کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس طہر میں ہمبستری نہیں کی گئی ہے ایک طلاق دیکر رک جائے، عدت پوری ہو جانے پر رشتۂ نکاح ختم ہو جائے گا۔ دوسری یا تیسری طلاق کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اگر دوسری یا تیسری طلاق دینی ہی ہے تو الگ الگ طہر میں دی جائے۔

پھر معاملۂ نکاح کے توڑنے میں یہ لچک رکھی کہ ایک یا دو بار صریح لفظوں میں طلاق دینے سے فی الفور نکاح ختم نہیں ہوگا بلکہ عدت پوری ہونے تک یہ رشتہ باقی رہے گا دورانِ عدت اگر مرد اپنی طلاق سے رجوع کرلے تو نکاحِ سابق بحال رہے گا جب کہ دیگر معاملات بیع وشراء وغیرہ میں یہ گنجائش نہیں ہے۔ نیز عورت کو ضرر سے بچانے کی غرض سے حقِ رجعت کو بھی دو طلاقوں تک محدود کر دیا گیا تاکہ کوئی شوہر محض عورت کو ستانے کے لئے ایسا نہ کرسکے کہ ہمیشہ طلاق دیتا رہے اور رجعت کر کے قید نکاح میں اسے محبوس رکھے بلکہ شوہر کو پابند کر دیا گیا کہ اختیار رجعت صرف دو طلاقوں

تک ہی ہے تین طلاقوں کی صورت میں یہ اختیار ختم ہو جائے گا بلکہ فریقین اگر باہمی رضا سے نکاح ثانی کرنا چاہیں تو ایک خاص صورت کے علاوہ یہ نکاح درست اور حلال نہیں ہوگا۔ آیت پاک "الطلاق مرتان" اور "فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره" میں یہی قانون بیان کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی نے تیسری طلاق دیدی تو معاملہ نکاح ختم ہو گیا اور اب مرد کو نہ صرف یہ کہ رجعت کا اختیار نہیں رہا بلکہ تین طلاقوں کے بعد اگر یہ دونوں باہمی رضا سے پھر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے تاوقتیکہ یہ عورت عدت طلاق گزار کر دوسرے مرد سے نکاح کرلے، نیز حقوق زوجیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے پھر اگر اتفاق سے یہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے یا وفات پا جائے تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔ آیت کریمہ "فان طلقها فلا جناح علیهما ان یتراجعا" میں اسی نکاح جدید کا بیان ہے۔ یعنی پھر اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دیدے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دوبارہ باہم رشتۂ ازدواج قائم کرلیں۔

شریعت اسلامی کے وضع کردہ اس ضابطۂ طلاق پر اگر پورے طور پر عمل کیا جائے تو طلاق دینے کے بعد نہ کسی شوہر کو حسرت و ندامت سے دوچار ہونا پڑے گا اور نہ ہی کثرت طلاق کی یہ وبا باقی رہے گی جس کے نتیجہ میں طرح طرح کے ناگوار مسائل پیدا ہوتے ہیں جو نہ صرف مسلم معاشرہ کیلئے دردسر بنے ہوئے ہیں بلکہ اسلام مخالف عناصر کو اسلامی قانون طلاق میں کیڑے نکالنے اور طعنہ زنی کا موقع فراہم کر رہے ہیں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔ "لو ان الناس اصابوا حد الطلاق ماندم رجل طلق امرأته" اگر لوگ طلاق سے متعلق پابندیوں پر قائم رہیں تو کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیکر گرفتار ندامت نہیں ہوگا۔ (۱)

اس موقع پر ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر کسی نے ازراہ حماقت و جہالت طلاق کے مستحسن اور بہتر طریقہ کو چھوڑ کر غیر مشروع طور پر طلاق دیدی مثلاً الگ الگ تین طہروں میں طلاق دینے کے بجائے ایک ہی مجلس میں یا ایک ہی تلفظ میں تینوں طلاقیں دے ڈالیں تو اس کا اثر کیا ہوگا؟ آجکل بعض جماعتیں سرکاری ذرائع ابلاغ اور میڈیا کے تعاون سے یہ باور کرانے کی کوشش

---

(۱) احکام القرآن جصاص رازی ج ۱ ص ۳۸۸۔

کہہ رہی ہیں کہ ایک مجلس یا ایک تلفظ میں دی گئی تین طلاقیں شرعاً ایک ہی شمار ہونگی اور اس طرح دی گئی تین طلاقوں کے بعد بھی ازدواجی تعلق برقرار اور شوہر کو رجعت کا اختیار باقی ہے۔ جبکہ ظاہر قرآن، احادیث صحیحہ، آثار صحابہ اور اقوال فقہاء و محدثین سے ثابت ہے کہ مجلس واحد یا کلمہ واحدہ کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہونگی۔ شریعت اسلامی کا یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر عہد فاروقی میں حضرات صحابہ کا اجماع و اتفاق ہو چکا ہے جس کے بعد اختلاف کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اسی بنا پر ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بیک زبان کہتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں چاہے بیک لفظ دی گئی یا الگ الگ لفظوں سے واقع ہو جاتی ہیں اور تین طلاقوں کے بعد چاہے وہ جس طرح بھی دی گئی ہوں رجعت کرنا از روئے شرع ممکن نہیں ہے۔ اور یہی جمہور سلف و خلف کا مسلک ہے۔

(۱) چنانچہ محقق حافظ محمد بن عبدالواحد المعروف با بن الہمام الحنفی لکھتے ہیں وذھب جمہور الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم من ائمۃ المسلمین الی انہ یقع ثلاث[۱] ——— جمہور صحابہ کرام تابعین اور بعد کے ائمہ مسلمین کا یہی مذہب ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہونگی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اسی پر اجماع ہے۔ فاجماعھم ظاھر فانہ لم ینقل عن احد منھم انہ خالف عمر رضی اللہ عنہ حین امضی الثلاث۔ اھ حضرات صحابہ کا اجماع ظاہر ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کہ تین طلاقیں تین ہیں کی کسی صحابی سے مخالفت منقول نہیں۔ (۲)

(۲) علامہ بدرالدین العینی الحنفی لکھتے ہیں۔

ومذھب جماھیر العلماء من التابعین ومن بعدھم منھم الاوزاعی والنخعی والثوری وابوحنیفۃ واصحابہ ومالک واصحابہ والشافعی واصحابہ واحمد واصحابہ واسحاق وابوثور وابوعبید وآخرون کثیرون علی من طلق امرأتہ ثلاثاً وقعن ولکنہ یأثم وقالوا من خالف فیہ فھو شاذ مخالف لاھل السنۃ وانما تعلق بہ اھل البدع ومن لا یلتفت الیہ لشذوذہ عن الجماعۃ اھ تابعین اور ان کے بعد کے جمہور علماء جن میں امام اوزاعی، امام نخعی، امام ثوری، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، امام مالک اور ان کے اصحاب، امام شافعی اور ان کے اصحاب، امام احمد اور ان کے اصحاب، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابوثور، امام ابوعبیدہ رحمہم اللہ تعالیٰ

(۱) فتح القدیر ج ۳ صفحہ ۳۳۰ (۲) فتح القدیر ج ۳ صفحہ ۳۳۰

دیگر بہت سارے ائمہ کا یہی مذہب ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہونگی۔ البتہ اس طرح طلاق دینے والا گنہگار ہوگا۔ جمہور کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جس نے مخالفت کی وہ شاذ اور مخالف اہل سنت ہے اس نے اس مسئلہ میں اہل بدعت اور ایسے لوگوں کی پیروی کی ہے جو جماعت مسلمین سے کٹ جانے کی وجہ سے قابل التفات نہیں ہیں (۱)

(۲) مفسر محمد الامین بن محمد المختار الشنقیطی اپنی تفسیر میں محدث ابن العربی المالکی کا بیان نقل کرتے ہیں۔

وغوی قوم من اھل المسائل فتتبعوا الاھواء المبتدعۃ فیہ وقالوا ان قول انت طالق ثلاثا کذب لانہ لم یطلق ثلاثا کما لو قال طلقت ثلاثا ولم یطلق الا واحدۃ .... ولقد طوفت فی الآفاق ولقیت من علماء الاسلام وارباب المذاھب فما سمعت لھذہ المسئلۃ بخبر ولا احسست لھا باثر الا الشیعۃ الذین یرون نکاح المتعۃ جائزا ولا یرون الطلاق واقعا .... وقد اتفق علماء الاسلام وارباب الحل والعقد فی الاحکام علی ان الطلاق الثلاث فی کلمۃ وان کان حراما فی قول بعضھم وبدعۃ فی قول الآخرین۔ لازم .... وما نسبوہ الی الصحابۃ کذب بحت لا اصل لہ فی کتاب ولا روایۃ لہ عن احد۔

اہل مسائل میں سے ایک قوم بھٹک گئی اور اس مسئلہ میں بدعتیوں کی ہوائے نفسانی کی پیروی کرتے ہوئے وہ کہتی ہے کہ انت طالق ثلاثا (تجھ پر تین طلاق ہے) جھوٹ ہے کیونکہ اس نے تین طلاقیں نہیں دی ہیں جس طرح سے اس کا یہ کہنا غلط ہے کہ طلقت ثلاثا (میں نے تین طلاقیں دیں) حالانکہ اس نے ایک ہی طلاق دی ہے .... میں نے اطراف عالم کی خوب سیر کی اور علماء اسلام وارباب مذاہب سے ملاقاتیں کیں اس مسئلہ سے متعلق میں نے نہ کوئی خبر سنی اور نہ کسی اثر کا مجھے علم ہوا۔ البتہ صرف شیعہ متعہ کو جائز اور تین طلاقوں کو غیر واقع کہتے ہیں ..... جبکہ علماء اسلام اور معتمد فضلائے امت متفق ہیں کہ ایک کلمہ کی تین طلاقیں (اگرچہ بعض کے نزدیک حرام اور بعض کے نزدیک بدعت ہے) لازم ہیں اور جن لوگوں نے اس قسم کی تین طلاقوں کے واقع نہ ہونے کے قول کو صحابہ کی جانب منسوب کیا ہے یہ نرا جھوٹ ہے اس کی کوئی اصل کسی کتاب میں نہیں ہے اور نہ ہی کسی صحابی سے کوئی روایت ہے۔ (۲)

---

(۱) عمدۃ القاری باب من اجاز طلاق الثلاث ج ۲۰ ص ۲۳۳ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ پاکستان (۲) اضواء البیان بحذف یسیر ج ۱ ص ۱۶۴۔

④ امام ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی المالکی لکھتے ہیں۔

قال علماءنا واتفق ائمة الفتوى على لزوم ايقاع الثلاث فى كلمة واحدة وهو قول جمهور السلف وشذ طاؤس وبعض اهل الظاهر الى ان طلاق الثلاث فى كلمة واحدة يقع واحدة ويروى هذا عن محمد بن اسحاق والحجاج بن ارطاة وقيل عنهما لا يلزم منه شئ وهو قول مقاتل ويحكى عن داؤد انه قال لا يقع والمشهور عن الحجاج بن ارطاة وجمهور السلف والائمة انه لازم واقع ثلاثا ولا فرق بين ان يوقع ثلاثا مجتمعة فى كلمة او متفرقة فى كلمات۔

ہمارے علماء کا قول ہے کہ مالکی ائمہ فتاویٰ متفق ہیں کہ ایک کلمہ کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہونگی اور اسی کے جمہور سلف قائل ہیں۔ طاؤس اور بعض اہل ظاہر اس قول شاذ کے قائل ہیں کہ ایک کلمہ کی تین طلاقیں ایک ہونگی۔ محمد ابن اسحاق، امام مغازی اور حجاج بن ارطاۃ کی جانب بھی اس قول کو منسوب کیا گیا ہے اور ان دونوں کی جانب یہ بھی منسوب ہے کہ ایک طلاق بھی واقع نہیں ہوگی یہی مقاتل کا قول ہے اور امام داؤد ظاہری کی جانب بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے اور مشہور روایت حجاج بن ارطاۃ سے اور جمہور سے یہی ہے کہ تین ہی لازم ہونگی۔ (۱)

⑤ امام محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الشافعی لکھتے ہیں۔

وقد اختلف العلماء فيمن قال لامرأته انت طالق ثلاثا فقال الشافعى ومالك وابوحنيفة واحمد وجماهير العلماء من السلف والخلف يقع الثلاث۔ جس شخص نے اپنی بیوی کو کہا تجھ پر تین طلاق ہے، اس بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ امام احمد اور جمہور سلف وخلف کا مذہب ہے کہ اس صورت میں تین طلاقیں واقع ہونگی۔ (۲)

⑥ امام حافظ ابن حجر عسقلانی جمہور کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

فالراجح فى الموضعين تحريم المتعة وايقاع الثلاث للاجماع الذى انعقد فى عهد عمر رضى الله عنه على ذلك ولا يحفظ ان احدا فى عهد عمر خالفه فى واحدة منهما وقد دل اجماعهم على وجود الناسخ وان كان خفى عن بعضهم قبل ذلك حتى ظهر لجميعهم فى عهد عمر فالمخالف بعد هذا الاجماع منابذ له والجمهور على عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق۔ پس

---

(۱) الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۹ (۲) شرح مسلم ج ۱ ص ۴۷۸۔

راجح ان دونوں قضیوں میں متعہ کا حرام ہونا اور اکٹھی تین طلاقوں کا تین ہونا ہی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کے عہد میں اس پر اجماع ہوچکا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کسی نے ان دونوں مسئلوں میں اختلاف کیا ہو صحیح روایت سے ثابت نہیں اور حضرات صحابہ کا اجماع بذات خود ناسخ کے وجود کو بتا رہا ہے اگرچہ یہ ناسخ اجماع سے پہلے بعض حضرات پر مخفی رہا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سب پر روشن ہوگیا لہٰذا اس اجماع کے بعد اس کی مخالفت کرنے والا اجماع کو پس پشت ڈالنے والا ہے اور جمہور کا اتفاق ہے کہ کسی مسئلہ پر اتفاق و اجماع ہوجانے کے بعد اس میں اختلاف پیدا کرنیوالے کا قول غیر معتبر اور مردود ہے۔ (۱)

⑦ حافظ ابن القیم الحنبلی لکھتے ہیں امام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن ابراہیم اللخمی المشطی نے الوثائق الکبیر کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اپنے موضوع پر بے مثل ہے۔ امام موصوف نے لکھا ہے۔

"الجمهور من العلماء على انه يلزمه الثلاث وبه القضاء وعليه الفتوى وهو الحق الذي لا شك فيه" جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ اس پر تین طلاقیں لازم ہیں۔ یہی فیصلہ ہے۔ اسی پر فتویٰ ہے اور بلا ریب یہی حق ہے (۲)

علامہ ابن رجب الحنبلی تلمیذ رشید حافظ ابن القیم اپنی کتاب مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلاث واحدۃ میں لکھتے ہیں۔ اعلم انه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم فى الفتاوى فى الحلال والحرام شئ صريح فى ان الطلاق الثلاث بعد الدخول يحتسب واحدة اذا سبق بلفظ واحد۔

یہ بات جان لو! کہ صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف جن کا قول در بارۂ حلال و حرام معتبر مانا جاتا ہے، کسی سے بھی بصراحت یہ ثابت نہیں ہے کہ صحبت کے بعد کی تین طلاقیں جو ایک لفظ سے دی گئی ہوں ایک شمار ہوں گی۔ (۳)

⑧ علامہ ابن تیمیہ کے جد امجد ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلام الملقب بابن تیمیہ الحنبلی اپنی مشہور کتاب منتقی الاخبار میں "باب ما جاء فی طلاق البتۃ وجمع الثلاث وتفریقها" میں احادیث و آثار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

---

(۱) فتح الباری ج ۹ ص ۳۱۹ بحوالہ اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۱۵۰۔ (۲) اغاثة اللهفان ج ۱ ص ۳۲۶ (۳) الاشفاق على احكام الطلاق ص مطبعہ مصر و سیر الحاث فی علم الطلاق ص ۱۱ للیوسف بن عبدالرحمن ابن الهادی الحنبلی، بحوالہ مجلة البحوث الاسلامیة۔ عدد ۳، ۱۳۹۷ھ الریاض المملکة العربیة السعودیة۔

"وهذا كله يدل على اجماعهم على صحة وقوع الثلاث بالكلمة الواحدة" یعنی یہ احادیث و آثار دلالت کرتے ہیں کہ ایک کلمہ سے تین طلاقوں کے واقع ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے۔(۱)

حافظ ابن الہمام، حافظ ابن حجر عسقلانی محدث ابوبکر ابن العربی، شیخ ابوالبرکات ابن تیمیہ کے علاوہ ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں امام ابوالولید الباجی نے المنتقیٰ میں ابن رجب مشکل الاحادیث الواردہ میں ابن الہادی سیر الحاث فی علم الطلاق میں امام زرقانی شرح مؤطا میں، علامہ ابن التین شرح بخاری میں، علامہ ابن حزم ظاہری نے المحلی میں، امام خطابی نے شرح سنن ابی داؤد میں اور حافظ ابن عبدالبر تمہید و استذکار میں بصراحت لکھتے ہیں کہ عہد فاروقی میں صحابہ کا اس مسئلہ پر اجماع ہو چکا ہے بغرض اختصار ان حضرات کی عبارتیں اس موقع پر حذف کردی گئی ہیں۔ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں "ان اهل السنة والجماعة متفقون على ان اجماع الصحابة حجة" اہل سنت والجماعۃ متفق ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے۔(۲)

خود علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ مشائخ علم اور ائمہ دین کسی مسئلہ پر اجماع کرلیں تو ان کا اجماع و اتفاق حجت قاطعہ ہوگا۔(۳) اور حافظ ابن القیم زادالمعاد میں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدین کے عمل کے بعد کسی اور کی بات قابل تسلیم ہی نہیں۔(۴)ــــــــ اور یہ بات ثابت اور محقق ہے کہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی مانتے ہیں۔ اس لئے ان کے مقابلے میں کسی کی بات قابلِ تسلیم نہیں ہونی چاہیئے۔

اوپر کی نقول سے مدلل طور پر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عہد فاروقی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اس پر اجماع بھی ہو چکا ہے۔ اپنے آپ کو اہل سنّت والجماعت کے زمرہ میں شمار کرنیوالوں کے لئے کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے کہ وہ اس اجماعی مسئلہ کو چھوڑ کر زید و بکر کے شاذ قول پر عمل کریں جس سے نہ صرف اک حجۃ شرعیہ کا ترک لازم آرہا ہے بلکہ بعض اہل بدع کے ساتھ مشابہت بھی ہو رہی ہے۔

جو لوگ اس اجماع کو غیر ثابت باور کرانے کے لئے ابوجعفر احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی المتوفی ۴۵۹ھ کی کتاب الوثائق سے یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی، عبدالرحمٰن بن عوف،

(۱) منتقی الاخبار ص ۲۳۷۔ (۲) فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۶۶۔ (۳) الواسطہ ص ۴، بحوالہ عمدۃ الاثاث ص ۲۲۔ (۴) ایضاً ص ۳۳۔

زبیر بن العوام، عبداللہ ابن مسعود اور عبداللہ بن عباس مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے تھے۔ انہیں سوچنا چاہیئے کہ سطور بالا میں مذکورہ اکابر حدیث ماہرین فقہ اور ائمہ مسلمین کی ثبوتِ اجماع پر ان تصریحات کے مقابلہ میں بیچارے ابن مغیث الطلیطلی کی اس روایت کی کیا حیثیت ہے؟ جب کہ خود ابن مغیث کا علم وفہم اور نقل روایت میں انکی امانت اور کردار کی پختگی علمائے رجال کے نزدیک غیر معروف ہے۔ (۱)

علاوہ ازیں ابن مغیث نے یہ روایت محمد بن وضاح کے حوالہ سے نقل کی ہے، چنانچہ وہ خود اس کی صراحت بایں الفاظ کرتے ہیں رویناذلك كله من ابن وضاح یہ ساری باتیں ہم نے ابن وضاح سے لی ہیں۔ (۲)

حالانکہ ان کے اور ابن وضاح کے درمیان صدیوں کا طویل فاصلہ ہے اس لمبے فاصلے کو کن وسائط وذرائع سے طے کر کے وہ ابن وضاح تک پہنچے اس کی تفصیل ندارد ہے اس لئے یہ بے سند روایت اصول روایت کے مطابق لائق اعتبار نہیں ہوسکتی۔

اگر راوی اور روایت کی ان خامیوں سے صرف نظر کر کے ابن وضاح کی جانب یہ نسبت درست مان لی جائے تو خود مدار روایت یعنی محمد بن وضاح اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی باتیں آنکھ بند کر کے تسلیم کرلی جائیں، اس لئے کہ الحافظ ابو الولید الفرضی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ انه كان جاهلا بالفقه و بالعربية ينفي كثيرا من الاحاديث الصحيحة فمثله يكون بمنزلة العامي وان كثرت روايته۔ ابن وضاح فقہ وعربیت سے ناواقف تھے، اکثر صحیح حدیثوں کی بھی نفی کر دیتے تھے، اس طرح کا آدمی عوام الناس میں شمار ہوگا، اگرچہ اس کی روایت زیادہ ہو۔(۳)

فن روایت کی یہ ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے روایت کی صحت مخدوش ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں بچتی کہ ارباب علم وفن اس کی جانب متوجہ ہوں، چنانچہ الحافظ للفرضی لکھتے ہیں۔ والاشتغال برأی هذا الطليطلي و ذاك المجريطي من المهملين شغل من لا شغل عنده" یہ طلیطلی اور مجریطی ایسے بے کار لوگ ہیں کہ ان کی باتوں میں وہی مشغول ہوگا جس کے پاس کوئی کام نہ ہو(۴)

(۱) ابن مغیث کے متعلق القواصم والعواصم میں محدث ابن العربی کا نقد و تبصرہ دیکھا جائے۔ (۲) الجامع لاحکام القرآن القرطبی ص ۱۳۲-۳۵۔ (۳) اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۱۶۱، بحوالہ الاشفاق۔ (۴) ایضاً۔

ان باتوں سے قطع نظر حضرات صحابہ کے آثار واقوال کے قابلِ اعتماد ماخذ کتب حدیث مثلاً صحاح ستہ اور دیگر سنن، جوامع، مسانید، معاجم، مصنفات وغیرہ ہیں جن میں صحابۂ کرام کی جانب منسوب ہر بات کو سند کے ساتھ نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور ان مستند ماخذوں سے ایسی ایک روایت بھی صحیح سند کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ مذکورہ حضرات یعنی علی مرتضیٰ، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے مدخول بہا (جس کے ساتھ ہمبستری ہوچکی ہو) کو مجلس واحد میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا ہے، بلکہ اس کے برعکس ان میں سے اکثر سے معتبر سندوں سے ثابت ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہیں اور بقیہ حضرات سے اس کے خلاف کوئی روایت نہیں ہے، چنانچہ تفصیل آئندہ آرہی ہے، یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن القیم جو اپنے شیخ علامہ احمد ابن تیمیہ کی محبت وحمایت میں ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے تین طلاقوں کو ایک ثابت کرنے پر مصر ہیں، ابن مغیث کی مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: فقد صح بلا شك عن ابن مسعود وعلی وابن عباس الالزام بالثلاث لمن اوقعها جملة و صح عن ابن عباس انه جعلها واحدة ولم نقف علی نقل صحیح عن غیرهم من الصحابة بذلك الخ بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح طور پر ثابت ہے کہ عبداللہ ابن مسعود، علی اور عبداللہ ابن عباس نے اکٹھی تین طلاقیں دینے والے پر تین ہی لازم کیا ہے اور عبداللہ بن عباس سے صحیح طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ انھوں نے تین کو ایک قرار دیا ہے، اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات صحابہ سے ہم کسی نقل صحیح پر آگاہ نہیں ہوسکے[1] (یہ موصوف کا فریب علم ہے ورنہ حضرت عبداللہ ابن عباس سے بھی مدخول بہا کی تین طلاقیں تین ہی ثابت ہے اس کے برخلاف ان سے کوئی روایت نہیں ہے، تفصیل آئندہ معلوم ہوجائے گی) گویا ابن القیم نے ابن مغیث کی بیان کردہ روایت کی تردید کردی کہ صحیح نقل سے یہ ثابت نہیں ہے بلکہ اس کا برعکس ثابت ہے اس تردید کے باوجود علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم کے مقلدین ابن مغیث کی قائم کردہ بے سروپا اور فرسودہ لکیر پیٹتے جارہے ہیں۔

---

[1] الاغاثة اللهفان ج۱، ص ۳۲۹، ۳۳۰۔

اسی طرح اس ثابت شدہ اجماع کو کالعدم بتانے کے لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے جو اس اجماع کے محرک اور نافذ کرنے والے تھے بعد میں اپنے اس فیصلے سے رجوع کر لیا تھا، علماء غیر مقلدین کے علاوہ شیعہ مجتہد اور بعض دوسرے لوگوں نے اس موضوع سے متعلق اپنی تحریروں میں یہ بات دہرائی ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی یہ زحمت گوارہ نہیں کی کہ جس روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے اسے سند کے ساتھ پیش کر دیتے تاکہ اس روایت سے استدلال کی حقیقت آشکارا ہو جاتی، شاید عصر جدید کے ان جدید محققین کے نزدیک کسی دعویٰ کے ثبوت پر "روایت ہے یا مروی ہے" کا لفظ لکھ دینا کافی ہے، دوسروں پر تقلید اور روایت پرستی کی پھبتی کسنے والوں کا یہ رویہ خود انھیں منھ چڑھا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس روایت کے سہارے رجوع کی بات اڑائی جا رہی ہے وہ اس حیثیت کی ہے ہی نہیں کہ اس سے دعوئ رجوع پر استدلال کیا جا سکے، شاید روایت کی اسی کمزوری کی بناء پر دانستہ اسے نقل کرنے سے احتراز کیا گیا ہے، اور صرف "روایت ہے" کہہ کر بات چلتی کر دی گئی ہے، ذیل میں ہم اس روایت کو اور اس کی سند پر علمائے جرح و تعدیل کے نقد کو نقل کر رہے ہیں۔

حافظ ابو بکر اسماعیلی مسند عمر میں روایت کرتے ہیں اخبرنا ابو یعلی حدثنا صالح بن مالک حدثنا خالد بن یزید[1] بن ابی مالک عن ابیہ قال قال عمر ماندمت علی شئ ندامتی علی ثلاث ان لا اکون حرمت الطلاق، وعلی ان اکون انکحت الموالی وعلی ان لا اکون قتلت النوائح۔ حافظ ابو بکر کہتے ہیں مجھے ابو یعلی نے خبر دی وہ کہتے ہیں مجھ سے صالح بن مالک نے بیان کیا صالح کہتے ہیں کہ مجھ سے خالد بن یزید نے اپنے والد کے حوالے سے کہا کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ میں کسی چیز پر نادم نہیں ہوا، اپنی تین باتوں پر ندامت کی طرح ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے طلاق کو حرام کیوں نہیں کر دیا الخ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مقولہ کے راوی خالد کے والد یزید کے بارے میں علمائے رجال نے تصریح کی ہے کہ ان کی ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، اس لئے لامحالہ

---

[1] یہ بات ملحوظ رہے کہ یزید اپنے والد کے بجائے دادا کی جانب منسوب ہیں ان کے والد عبدالرحمٰن بن ابی مالک ہیں

انھوں نے حضرت عمر کا یہ قول کسی واسطہ سے سنا ہوگا جس کا یہاں ذکر نہیں، اس لئے اس روایت میں انقطاع ہے، علاوہ ازیں امام ذہبی رہ نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ یزید بن ابی مالک مدلس تھے، یعنی اپنی روایت کی اہمیت بڑھانے کی غرض سے اپنے استاذ کا نام لینے کے بجائے استاذ کے استاذ کا نام لیتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے بھی "تعریف اہل التقدیس بالموصوفین بالتدلیس" میں امام ابومسہر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یزید بن مالک مدلس تھے، اور یزید بن مالک کے درجہ کے مدلس کی مرسل و منقطع روایت کسی کے نزدیک قابل حجت نہیں۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ خالد بن یزید اکثر علمائے جرح کے نزدیک ضعیف ہیں، چنانچہ امام اہل جرح وتعدیل ابن معین نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، امام احمد بن حنبل کہتے ہیں "لیس بشئ" یہ محض ہیچ ہے، امام نسائی نے فرمایا کہ یہ ثقہ نہیں ہے، امام ابوداؤد نے ایک مرتبہ انھیں ضعیف بتایا اور ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ منکر الحدیث ہے، علامہ ابن جارود، امام ساجی اور حافظ عقیلی نے خالد کا ذکر ضعفاء کے تحت کیا ہے، ابن حبان کہتے ہیں کہ خالد اگرچہ روایت کرنے میں سچے تھے، لیکن بیان روایت میں اکثر غلطی کر جاتے تھے اس لئے مجھے ان کی روایت سے استدلال پسند نہیں ہے، بالخصوص جب یہ اپنے والد یزید بن ابی مالک سے تنہا کوئی روایت نقل کریں۔ امام جرح یحییٰ بن معین نے غالبا اسی مذکورہ بالا روایت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: لم یرض ان یکذب علی ابیہ حتی کذب علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی خالد نے تنہا اپنے والد پر جھوٹ بولنے پر بس نہیں کیا بلکہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کذب بیانی کی ہے[1]

جس راوی کی ارباب جرح و تعدیل کے نزدیک یہ حیثیت ہو اس کی روایت کس درجہ کی ہوگی اہل علم و دانش اسے خوب جانتے ہیں "عیاں را چہ بیاں" پھر اس روایت میں ندامت کا ذکر ہے رجوع کرنے کا نہیں اس لئے ندامت کا معنی رجوع کے لینا ایجاد بندہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ ہے اس روایت کی حقیقت جس کی بنیاد پر حضرت فاروق اعظم کے اپنے فیصلے سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰۹ و مجلہ البحوث الاسلامیہ الریاض ص ۱۰۸ ع ۱ عدد ۳ سنہ ۱۳۹۷ھ۔

رجوع کر لینے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، اور ظاہر ہے۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔
اس لئے جمہور کا یہ دعویٰ کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین واقع ہونے پر عہد فاروقی میں
حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہو چکا ہے اور ہر تردد اور شک وشبہ سے بری
ہے، اور حضرات صحابہ کے بارے میں علمائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ فانهم اعرف
الناس بكتاب الله وبرسوله واعلمهم بمعانى السنة ومقاصد الشرع. حضرات
صحابہ قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت میں سب سے فائق ہیں، اور احادیث
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معانی اور مقاصد شریعت کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں
لہٰذا مسئلہ زیر بحث میں ان کے اجماع کے بعد کسی قیل وقال کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں
رہ جاتی، مسئلہ کی اسی قطعیت کی بناپر محقق ابن ہمام لکھتے ہیں "لوحكم حاكم بان الثلاث
بفم واحد واحدة لم ينفذ حكمه لانه لا يسوغ الاجتهاد فيه فهو خلاف لا
اختلاف"[1] اگر کوئی قاضی یہ فیصلہ کردے کہ ایک تلفظ کی تین طلاقیں ایک ہوں گی تو اس کا
یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، کیونکہ اس مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے قاضی کا یہ
فیصلہ اختلاف نہیں بلکہ مخالفت کے قبیل سے ہوگا، جس کا اعتبار نہیں ہوتا۔ (جاری)



بقیہ ص ۱۵ تین طلاقیں اور روشن خیال دانشوروں کا رویہ

لاینحل بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے مسائل میں تبدیلی کا غلغلہ بلند کیا جا رہا ہے، خلیفۂ راشد
امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے۔

لو ان الناس اصابوا حد الطلاق ماندم رجل طلق امرأته۔

اگر لوگ طلاق کے سلسلے میں متعین حدود پر قائم رہیں تو اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد کسی کو ندامت نہیں ہوگی۔



[1] فتح القدیر۔ ج ۳، ص ۳۳۰۔



حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم غیر مسلموں کی نظر میں

دوسری اور آخری قسط

مولانا محمد جنید صاحب چاٹگامی
جامعہ اسلامیہ بابونگر چاٹگام بنگلہ دیش

اسلام کی اشاعت تلوار سے ہوئی تھی یا محمد صلعم کے اخلاق حمیدہ سے؟

مذکورہ قول کو پڑھکر سوچنا چاہیئے کہ اسلام کی یہ حیرت انگیز اشاعت تلوار اور جبر وتشدد سے ہوئی تھی (جیسا کہ وہ بعض یوروپین مصنفین ومورخین اور بعض کمیونسٹ رہنماؤں کا خیال ہے) یا اس کی اشاعت کا ذمہ دار رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا ایمان وایقان، ایثار وہمدردی اور اخلاق حسنہ تھے؟ اس بات کا صحیح اندازہ بہت سی دلیلوں اور شہادتوں سے کیا جا سکتا ہے، جن میں سے صرف تین چار شہادتیں درج ذیل ہیں۔

(۱۵) ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی ——— جس کا ذکر اوپر آچکا، لکھتا ہے:

"جس وقت ہم فتوحات عرب پر نظر ڈالیں گے اور ان کی کامیابی کے اسباب کو ابھار کر دکھائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعت مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا، کیونکہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے، اگر اقوام عیسوی نے اپنے فاتحین کے دین کو قبول کرلیا اور بالآخران کی زبان کو بھی اختیار کیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے اپنے جدید حاکموں کو، ان قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں اس وقت تک تھے، بہت زیادہ منصف پایا، اُن کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچا اور سادہ پایا۔" (کتاب مذکور ص۵۵)

(۱۶) جون ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ خیال کہ قرآنی مذہب تلوار کے ذریعہ سے شائع ہوا تھا بالکل غلط ہے کیونکہ ہر ایک غیر متعصب آدمی ادنیٰ فکر سے معلوم کرسکتا ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب ایسا تھا کہ جس میں انسان کی قربانی اور خونریزی کی جگہ نماز اور زکوٰۃ قائم کی گئی تھی اور ہمیشہ کے جھگڑوں اور قضیوں کی جگہ باہمی اخلاص و محبت کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور یہی باعث ترقی کا ہوا تھا۔ حقیقت میں یہ مذہب اہل مشرق کے واسطے سرتاپا برکت تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز اس قدر خونریزی نہیں کی جس قدر موسیٰ علیہ السّلام نے بت پرستی کی بیخ کنی کے لئے کی تھی (یعنی ان کو کرنا پڑی) (آئینہ حقیقت نما ص۵۰)

(۱۷) ڈاکٹر ڈبلیو ٹی آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام اسی موضوع پر لکھی گئی ہے کہ:۔

"اسلام کی اشاعت بزور شمشیر نہیں بلکہ صلح و آشتی کے ساتھ ہوئی ہے" (آئینہ حقیقت نما ۶۱)

(۱۸) مہاتما گاندھی جی کہتے ہیں:۔

"اسلام اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں تعصب اور ہٹ دھرمی سے پاک تھا، اسلام نے تمام دنیا سے خراج تحسین وصول کیا، جب مغرب پر تاریکی اور جہالت کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اس وقت مشرق سے ایک ستارہ نمودار ہوا، ایک روشن ستارہ جس کی روشنی سے ظلمت کدے منور ہوگئے۔

اسلام دین باطل نہیں ہے۔ ہندوؤں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ بھی میری طرح اس کی تعظیم کرنا سیکھ جائیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ اس کی اشاعت کا ذمہ دار رسول عربی کا ایمان، ایقان، ایثار اور اوصاف حمیدہ تھے، ان صفات نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرلیا تھا، یورپی اقوام جنوبی افریقہ میں اسلام کو سرعت کے ساتھ پھیلتا دیکھ کر خوفزدہ ہیں، اسلام جس نے اندلس کو مہذب بنایا، اسلام جس نے اخوت کا درس دیا۔ جنوبی افریقہ میں یورپی اقوام محض اس لئے ہراساں ہیں کہ وہ جانتی ہیں کہ اگر اصلی باشندوں نے اسلام قبول کرلیا تب وہ ہمسرانہ حقوق کا مطالبہ کریں گے اور لڑیں گے، اگر اخوت گناہ ہے تو ان کا خوف راستی پر مبنی ہے، میں نے خود دیکھا ہے زولو عیسائیت قبول کرنے پر بھی عیسائی حقوق حاصل نہیں کرسکتا لیکن جونہی وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا مسلمانوں کے ساتھ اس کا رابطہ واتحاد پیدا ہوگیا۔ یورپ اس اتحاد اسلام سے خائف ہے" (ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۷۶ء)

دیکھیے ان غیر مسلم لیڈروں اور مفکروں کو بھی صاف اقرار ہے کہ مذہب اسلام کی اشاعت میں تلوار اور جبر وزور سے مطلق کام نہیں لیا گیا، بلکہ اس کی اشاعت اور ہمہ گیریت کے ذمہ دار صرف اور صرف رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ______ اعلیٰ اصول، مفید تعلیمات اور اوصاف حمیدہ ہی تھے، اس مسئلہ اور واضح حقیقت کا انکار یا تو تعصب وعناد کا نتیجہ ہے یا جہل ونادانی کا۔

(۱۹) **اکسفورڈ کا ایک عالم** ــــ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسوانح عمری پر تصنیفات کے غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے کہ:۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پاجانا قابل فخر چیز ہے۔ (سیرۃ النبی از علامہ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، ص ۹۲ ج ۱)

قرآن کریم کے متعلق غیر مسلموں کی شہادتیں

ذیل میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن (جو اسلام کا اساس اول ہے) کے متعلق اہل یورپ وغیرہ بعض غیر مسلم فضلاء کے چند اقوال ملاحظہ ہوں، یہ اُن اقوال کے علاوہ ہیں جو قرآن کریم کے متعلق متفرق طور پر ضمناً گزر چکے ہیں:۔

(۲۰) **مصر کے مشہور مصنف احمد فتحی بک زاغلول نے ۱۸۹۸ء میں مسٹر کونٹے ہنری کی کتاب** "الاسلام" کا ترجمہ عربی میں شائع کیا تھا، اصل کتاب فرنچ زبان میں تھی اس میں مسٹر کونٹے نے قرآن کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:۔

"عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل امی تھا، تمام مشرق نے اقرار کرلیا ہے کہ نوع انسانی لفظ ومعنی ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کردیا، ان کو خدا کا معترف ہونا پڑا، یہ وہی کلام ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے حبشہ کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے تو اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے، اور ـــــ چلا اٹھا کہ یہ کلام اُسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کا کلام نکلا تھا۔"

(شہادۃ الاقوام از حکیم الامت تھانوی، ص ۱۴، بحوالہ معارف القرآن ص ۱۶۳ ج ۱)

(۲۱) میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" ــــ میں لکھتا ہے:۔

"جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس قرآن مجید کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریک سے پاک رہی ہو" (المنہاج الواضح ص۴۲)

(۲۲) ڈاکٹر ماریس ــــ کہتا ہے:۔

"قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا۔ (حوالہ بالا)

(۲۳) ڈاکٹر سموئیل جانسن ــــ لکھتا ہے:۔

"قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کیلئے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانے کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کرلیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے" (آئینہ حقیقت نما ص۵۹)

(۲۴) انگلستان کے نامور مورخ ڈاکٹر گبن ــــ "سلطنت روما کے انحطاط و زوال" کی جلد ۵ باب ۵۰ میں لکھتے ہیں:۔

"قرآن کی نسبت بحر اٹلانٹک سے لیکر دریائے گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی روح ہے، قانونِ اساسی ہے، اور صرف اصول مذہب ہی کے لئے نہیں، بلکہ احکام تعزیرات کے لئے اور قوانین کے لئے بھی ہے، جن پر نظام کا مدار ہے، جن سے نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، جن کو حیات انسانی کی ترتیب و تنسیق سے گہرا تعلق ہے" (معارف القرآن ص۱۶۳ ج۱)

(۲۵) مسٹر عمانوئیل ـ ڈی انش ــــ کہتا ہے:۔

"قرآن کی روشنی اس وقت یورپ میں نمودار ہوئی جب تاریکی محیط ہو رہی تھی اور اسی سے یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندگی مل گئی" (تاریخ قرآن ص۶۰)

(۲۶) پروفیسر رینلڈ اے نکلسن ــــ لکھتا ہے:۔

"قرآن کے اثر سے عربی زبان تمام اسلامی دنیا کی متبرک زبان بن گئی اور قرآن نے دختر کشی کا خاتمہ کردیا" (حوالہ بالا)

(۲۷) مسٹر ایم۔ ایس لیڈر ــــ کہتا ہے:۔

"تعلیم قرآن سے فلسفہ و حکمت کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی کہ اپنے عہد کی بڑی سی بڑی یورپین

سلطنت کی تعلیم حکمت سے بڑھ گیا۔" (حوالۂ بالا)

(۲۸) مشہور مترجم قرآن جارج سیل ___ لکھتا ہے:۔

"قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا، یہ مستقل معجزہ ہے جو مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے سے بلند تر ہے۔" (المنہاج الواضح ص۴۴)

(۲۹) پادری دال ریسیس بی ڈی ___ کہتا ہے:۔

"مسلمانوں کا مذہب جو قرآن کا مذہب ہے ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔" (حوالۂ بالا)

(۳۰) مسٹر جان ڈیون پورٹ ___ اپنی کتاب "ایالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن" میں لکھتا ہے:۔

"فی الحقیقت قرآن عیوب سے ایسا مبرّا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اوّل سے آخر تک اسے پڑھ جائیے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پائیے گا جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم وحیا کے آثار پیدا کردے (کیونکہ اس میں کوئی ایسا فحش لفظ ہی نہیں ہے)

(خطبۂ صدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بحوالۂ المنہاج الواضح ص۴۵)

(۳۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۶ ص۵۹۹ میں ہے:۔

"قرآن کے مختلف حصص کے مطالب ایک دوسرے سے بالکل متفاوت ہیں، بہت سی آیات دینی داخلاقی خیالات پر مشتمل ہیں، مظاہر قدرت، تاریخ، الہامات انبیاء کے ذریعہ اس میں خدا کی عظمت، مہربانی اور صداقت کی یاد دلائی گئی ہے، بالخصوص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطہ سے خدا کو واحد اور قادر مطلق ظاہر کیا گیا ہے، بت پرستی اور مخلوق پرستی کو بلا لحاظ ناجائز قرار دیا گیا ہے، قرآن کی نسبت یہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا بھر کی موجودہ کتابوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے"

(معارف القرآن ص۱۶۳ ج۱)

(۳۲) پادری عماد الدین صاحب ___ (باوجود اسلام اور مسلمانوں کے اشد ترین دشمن ہونیکے یوں) لکھتا ہے کہ:۔

"قرآن آج تک وہی قرآن ہے جو محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد میں تھا۔"

(المنہاج الواضح ص۴۵)

(۳۳) مشہور جرمنی فاضل گوئٹے ___ لکھتا ہے:۔

"اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہان سے بڑا جہاں، اور روما الکبریٰ کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کرلی، اور جس قدر زمانہ سلطنتِ روما کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا۔" (رسالہ معجزۂ قرآن ص۱۲۲ بحوالہ کتاب مذکور)

(۴۴) موسیو کاستی کار —— لکھتا ہے:-

"روئے زمین سے اگر قرآن کی حکومت جاتی رہے تو دنیا کا امن وامان کبھی قائم نہیں رہ سکتا (جیسا کہ یہ دنیا کے شدید تکلیف دہ حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔" (تاریخ قرآن ص۷۱)

(۴۵) مشہور ہندو فاضل بابا نانک —— کہتا ہے:-

"توریت، زبور، انجیل اور وید وغیرہ سب کو پڑھ کر دیکھ لیا۔ قرآن شریف ہی قابل قبول اور اطمینانِ قلب کی کتاب نظر آئی۔ اگر سچ پوچھو تو سچی اور ایمان کی کتاب جس کی تلاوت سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے، قرآن شریف ہی ہے۔" (تاریخ قرآن ص۷۲)

(۴۶) اسی جامع و مکمل، بے نظیر اور انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور بدحواس ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم —— گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ:-

"جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔"

(خطبہ صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ص۱۵ بحوالہ المنہاج)

(۴۷) جان جاک رسیک، جرمنی فلاسفر —— لکھتا ہے:-

"جب کہ قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بیتاب ہو کر سجدے میں گر پڑتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔" (تاریخ قرآن ص۶۷)

(۴۸) ہندو فاضل بابو بپن چندر پال —— کہتا ہے:-

"قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا امتیاز موجود نہیں ہے، نہ کسی کو محض خاندانی اور مالی عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔" (کتاب مذکور ص۷۳)

(۴۹) فرانس کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر موریس بکائیے صاحب —— قرآن، بائبل اور جدید سائنس کے درمیان موازنہ و مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"جب میں نے پہلے پہل قرآنی وحی و سنزیل کا جائزہ لیا تو میرا نقطۂ نظر کلیۃً معروضی تھا، پہلے سے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ قرآنی متن اور جدید سائنس کی معلومات کے مابین کس درجہ مطابقت ہے۔ تراجم سے مجھے پتہ چلا کہ قرآن ہر طرح کے قدرتی حوادث کا اکثر اشارہ کرتا ہے لیکن اس مطالعہ سے مجھے مختصر سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جب میں نے گہری نظر سے عربی زبان میں اس کے متن کا مطالعہ کیا اور ایک فہرست تیار کی تو مجھے اس کام کو مکمل کرنے کے بعد اس شہادت کا اقرار کرنا پڑا جو میرے سامنے تھی کہ قرآن میں ایک بھی بیان ایسا نہیں ملا جس پر جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے حرف گیری کی جا سکے۔ اسی معیار کو میں نے عہد نامۂ قدیم اور اناجیل کے لئے آزمایا اور ہمیشہ وہی معروضی نقطۂ نظر قائم رکھا۔ اول الذکر میں مجھے پہلی ہی کتاب آفرینش سے آگے نہیں جانا پڑا اور ایسے بیانات مل گئے جو جدید سائنس کے مسلّمہ حقائق سے کلی طور پر عدم مطابقت رکھتے تھے"

(بائیبل، قرآن اور سائنس صفحہ ۱۶)

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما غیر مسلم اقوام کی نظروں میں

صرف یہ نہیں کہ غیر مسلم قوموں نے خاتم الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو خراج تحسین پیش کیا ہے، بلکہ آپؐ کے صحابۂ کرام بالخصوص حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما (جو آپؐ کے اخص ترین شاگرد اور نہایت معتمد علیہ و افضل ترین اصحاب اور آپؐ کے بعد باتفاقِ امت بالترتیب یکے بعد دیگرے آپؐ کے جانشین و خلیفہ تھے) کی بھی انہوں نے بڑے اونچے الفاظ میں تعریفیں کی ہیں، جن میں سے دو ایک یہاں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں۔

(۴۰) میشو رہبان تاریخ جنگ صلیبی میں ــــــ لکھتا ہے:-

"جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو انہوں نے عیسائیوں کو مطلق نہیں ستایا، برخلاف اس کے جب صلیبیوں نے اسی شہر مقدس کو لیا تو انہوں نے نہایت بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور یہودیوں کو جلا دیا" (آئینۂ حقیقت نما صفحہ ۵۶)

(۴۱) جب برطانوی دور حکومت میں ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اس وقت کانگریسی رہنما مہاتما گاندھی جی نے کانگریسی وزیروں کے لئے اخبار ہریجن میں ایک ہدایت نامہ لکھا تھا جو اس وقت کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا

اس میں انہوں نے ان وزیروں کو ہدایت کی تھی کہ وہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طرز حکومت کو مثالی رہنما کے طور پر اپنے سامنے رکھیں اور ان کے طریقہ کی پیروی کریں۔ (آگے گاندھی جی نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے تاریخ میں ان دو کے سوا کوئی مثال نہیں ملتی جس نے فقیری کے ساتھ ایسی حکومت کی ہو" (ایرانی انقلاب ص۲۱)

(۴۲) ڈاکٹر اسپرنگر کی شہادت جن علماء محققین، رجال اسلام اور محدثین نے اپنی مافوق التصور قابلیتوں، محنتوں، قربانیوں اور بے پناہ اخلاص سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور آپ کی حدیث شریف کی خدمت و حفاظت کی ہے امت مسلمہ نے ان کے مفصل حالات زندگی کتابوں میں مدوّن کر ڈالے ہیں۔ جناب ڈاکٹر اسپرنگر صاحب اس بے مثال اور عظیم الشان کارنامہ پر امت مسلمہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"علم رجال پر مسلمان جتنا فخر کریں بجا ہے۔ نہ ایسی قوم گزری اور نہ اب ہے جس نے مسلمانوں کی طرح بارہ سو برس تک کے علماء کے حالات زندگی لکھے ہوں۔ ہم کو پانچ لاکھ مشہور عالموں کا تذکرہ انکی کتابوں سے مل سکتا ہے" (امام ترمذی ص۸)

ہندو شعراء کے نعتیہ کلام

بہت سے ہندو شاعروں نے خاتم الانبیاء محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بلند پایہ نعتیہ کلام لکھے ہیں، مناسبت کے لحاظ سے دو ایک یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۴۳) پنڈت ہری چند اختر لکھتا ہے:

کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا ☆ کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر ☆ اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم ☆ اور بندوں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

کہہ دیا لا تقنطوا اختر کسی نے کان میں ☆ اور دل کو سربسر محو تمنا کر دیا

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۸۸ء)

(۴۴) لالہ پربھودیال عاشق کہتا ہے ؎

بادشاہ دوسرا ہے کون؟ کوئی بھی نہیں۔
شافعِ روزِ جزا ہے کون؟ کوئی بھی نہیں۔
صدرِ بزم انبیاء ہے کون؟ کوئی بھی نہیں۔
اور محبوبِ خدا ہے کون؟ کوئی بھی نہیں۔
میرے آقا کے علاوہ میرے حضرت کے سوا

میہمانی کے لئے گردوں پہ بلوایا کسے۔؟
صورتِ مرکب سجا جبریل کو بھیجا کسے۔؟
پردہ ہائے راز دکھلائے شبِ اسریٰ کسے۔؟
مرتبہ معراج کا اللہ نے بخشا کسے؟
میرے آقا کے علاوہ میرے حضرت کے سوا (حوالۂ بالا)

ماخذ و مراجع

۱:- سنن الترمذی۔ از: امام ابوعیسیٰ الترمذی متوفی ۲۷۹ھ
۲:- مشکوٰۃ شریف از: امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی متوفی بعد ۷۳۷ھ
۳:- تفسیر قرطبی از: علامہ ابوعبداللہ محمد القرطبی متوفی ۶۷۱ھ
۴:- تفسیر ابن کثیر از: حافظ ابن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۴ھ
۵:- آئینۂ حقیقت نما از: مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
۶:- معارف القرآن از: مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع صاحب متوفی ۱۳۹۶ھ
۷:- المنہاج الواضح از: مولانا سرفراز خاں صفدر
۸:- سیرۃ النبی از:- علامہ شبلی نعمانی متوفی ۱۹۱۴ء و علامہ سید سلیمان ندوی متوفی ۱۹۵۳ء
۹:- تاریخ قرآن از: مولانا عبدالقیوم ندوی صاحب
۱۰:- بائیبل قرآن اور سائنس از: ڈاکٹر موریس بکلیے
۱۱:- ایرانی انقلاب از: حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ
۱۲:- خمینی و شیعیت کیا ہے؟ از: " " " "
۱۳:- کشف اسرار از: قائد شیعیت خمینی صاحب
۱۴:- امام ترمذی از: جناب امتیاز احمد سعید
۱۵:- ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۷۷ء انڈیا
۱۶:- روزنامہ جنگ کراچی ۲۲ اپریل ۱۹۹۳ء پاکستان

ابو عبید القاسم بن سلام

ولادت ۱۵۱ھ — وفات ۲۲۴ھ

مولانا قاری ابوالحسن اعظمی خادم التجوید والقراءۃ دارالعلوم دیوبند

صاحب تذکرہ کی حیات اور ان کے علمی و عملی کارناموں کے جائزے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے احوال وظروف پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے جس میں اس نابغۂ روزگار شخصیت نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کے ایام گذارے۔

آپ کا زمانہ ابو عبید القاسم بن سلام کا زمانہ خلافت عباسیہ کا دور ہے، عہد عباسی کا آغاز ۱۳۲ھ سے ہوتا ہے اور اختتام ۶۵۶ھ پر ہے۔ ابن سلام کے دور میں خلیفہ المنصور (م ۱۵۸ھ) سے خلیفہ المعتصم (م ۲۲۷ھ) تک سات خلفاء سریر آرائے سلطنت نظر آتے ہیں، ۱۳۲ھ ایسا تاریخ ساز عہد ہے کہ ایک خاندان سے اس کے مکافاتِ عمل کے نتیجے میں حکومت چھن جاتی ہے، اس کی اقبال مندی کا آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو دوسرے خانوادے کی خوش بختی کا سورج طلوع ہوتا ہے اور وہ اپنے ہاتھوں میں عَلَم حکومت بلند کرتا ہے۔

تہذیب وتمدن، علم وفن اور غلبہ واقتدار کا وہ عہد زریں ہے کہ مجموعی طور پر اس کی مثال نہیں ملتی، تاریخ اسلام میں شوکت وحشمت کے اس دور کو عہد عباسی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگر ایک طرف یہاں دلکش شاہراہیں اور آسمان سے بات کرتی ہوئی عمارات اور محلات نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں تو دوسری طرف تہذیب وثقافت، غلبہ واقتدار اور علم وفن کی گہما گہمی بھی نظر آتی ہے۔

(۱) عہد عباسی کے پہلے خلیفہ ابوالعباس السفاح (م ۱۳۶ھ) کے بعد خلیفہ ابوجعفر المنصور (از ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) کے عہد میں ابو عبید القاسم ایک طفل صغیر اور کمسن بچے تھے۔

(۲) ۱۵۸ھ سے ۱۶۹ھ تک محمد بن عبداللہ المہدی کی خلافت کا دور ہے ۱۶۹ھ میں ابو عبید کی عمر اٹھارہ سال تھی۔

(۳) محمد موسیٰ بن محمد الہادی۔ مدت خلافت از ۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ۔

(۴) الرشید ہارون بن محمد۔ مدت خلافت از ۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ، ۱۹۳ھ میں ابو عبید القاسم کی عمر بیالیس سال ہو چکی تھی۔

خلیفہ ہارون رشید کا دور، بنو عباسیہ کا وہ روشن اور تابناک دور ہے کہ ایک طرف اگر فارغ البالی اور مرفہ الحالی کا دور دورہ ہے تو دوسری طرف تہذیب وتمدن اور علم وفن کے چشمے ہر طرف بہتے ہوئے نظر آتے ہیں

ہارون رشید کا دور نام ہے عدل وانصاف، امن وسکون، حدودِ سلطنت کی نگہداشت اور علم وفن کی سرپرستی کا، یہ خود بھی ایک اچھا عالم، حافظ قرآن، علوم دینیہ میں بصیرت رکھنے والا، اور علم ہیئت وریاضی کے رموز اور اس کی باریکیوں سے واقف تھا، یہ وہی عہد ہے جس میں مورخ کی زبان سے ہمیں یہ محیر العقول جملہ سنائی دیتا ہے جو اس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

امطری حیث شئت فیاتینی خراجك ! اے بادل تو جہاں چاہے جاکے برس تیرا خراج تو بالآخر میرے ہی پاس آئے گا۔

(۵) الامین محمد بن ہارون۔ مدت خلافت از ۱۹۳ھ تا ۱۹۸ھ۔

(۶) المامون عبداللہ بن ہارون، مدتِ خلافت از ۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ۔

المامون دور عباسی کا نہایت بیدار مغز اور فضل وکمال کا مالک حکمراں تھا، علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب "المامون" میں رقم طراز ہیں۔

"اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ زیادہ ہوئے، اس وسیع مدت میں ایک تخت نشین بھی ایسا نہیں گذرا جو فضل وکمال کے اعتبار سے مامون کی شان یکتائی کا حریف ہو سکتا ہو افسوس کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفاء اور سلاطین کے پہلو میں جگہ دی، ورنہ شاعری ایام العرب، ادب، فقہ، فلسفہ کی کون سی بزم ہے جہاں فخر وشرف کے ساتھ استقبال نہ کیا جاتا"

(ص۱۰۲) خلیفہ مامون کے آخر زمانے میں ابو عبید القاسم کی عمر سڑسٹھ برس تھی۔

(۷) المعتصم محمد بن ہارون۔ مدت خلافت ۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ۔

خلیفہ المعتصم کی وفات سے تین سال پہلے امام ابو عبید القاسم کی وفات ہو جاتی ہے۔

عہد عباسی کی علمی سرگرمیوں کے سلسلے میں ڈاکٹر توقیر عالم کی کتاب "عہد عباسی کے چند ائمہ علم وفن" سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"تاریخ اسلام میں سرزمین بغداد کی عظمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ منصور، ہارون رشید، اور مامون جیسے خلفاء سریر آرائے سلطنت ہوئے، بلکہ اس کی عظمت و توقیر کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اسے علماء اور ادباء کے مرکز و مامن بننے کا شرف حاصل تھا اور یہ عام تشنگان علم وفن کے لئے آب زلال فراہم کر رہا تھا اس کے علاوہ بصرہ، کوفہ، قیروان، رے اور مرو اور بخارا اس علم وفن کے مستقر بنے ہوئے تھے، گویا کہ تہذیب و تمدن کو جلا بخشی اور علوم وفنون کا فروغ ہی دراصل عہد عباسی کا تمغۂ امتیاز ہے۔" (ص۳۲)

انسان اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے، امام ابو عبید القاسم اسی تاریخ ساز عہد اور ماحول کی پیداوار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ابو عبید کے لئے ہر طرح سے سازگار، عمدہ اور پرسکون سیاسی استقرار، تہذیبی اور تمدنی اور علمی ماحول مہیا فرما دیا تھا اور بھرپور طور پر ان سے استفادہ کے مواقع عطا فرما دیئے تھے تاکہ وہ امام علم وفن بن کر دنیا کے سامنے آسکیں، اور بلاشبہ آپ نے خوب خوب استفادہ کیا، تا آنکہ امام بن گئے۔

نام ونسب آپ قاسم بن سلّام (بتشدید اللام) بن عبد اللہ، کنیت ابو عبید (بالتصغیر) البغدادی ہیں، بغداد میں آپ نے اقامت اختیار کرلی تھی ویسے آپ خراسانی الاصل تھے آپ کے والد سلّام ہرات کے ایک شخص کے غلام تھے۔

یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ ابو عبید کے والد سلّام کا کتاب اور علماء کے پاس سے گذر ہوا، ابو عبید اپنے مولا کے بیٹے کے ساتھ تھے، سلّام نے معلم سے کہا، علمی القاسم فانھا کیسۃ، یعنی قاسم کو پڑھادو، یہ بڑا عقیل وفہیم ہے، معلم کو بصیغہ تانیث خطاب کرتے ہوئے بیٹے کے لئے بھی تانیث کا صیغہ استعمال کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عجمی تھے، عربیت سے بخوبی واقف نہ تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ابو عبید القاسم جیسا بیٹا عطا کرکے باپ

کی عزت بڑھادی، ابو عبید جن کی پیشانی نجابت و شرافت اور ذکاوت و ذہانت کے نور سے روشن تھی، اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ عطا فرمادیا تھا حتیٰ کہ ان کا بیٹا دنیا کے چند منتخب ائمہ میں سے ایک امام بن گیا۔

ولادت ووفات

اس بارے میں تو اجماع و اتفاق ہے کہ آپ کی پیدائش مملکت خراسان کے شہر ہرات میں ہوئی لیکن سن ولادت و وفات میں بہت اختلاف ہے، حافظ ذہبی سن ولادت ۱۵۸ھ ذکر کرتے ہیں (سیر اعلام النبلاء ص۴۹۱ ج۱۰) ابن خلکان ابن الجوزی سے نقل کرتے ہوئے ۱۵۰ھ بتاتے ہیں (وفیات الاعیان ج۴ ص۶۲) ابوبکر الزبیدی "کتاب التقریظ" میں ۱۵۴ھ لکھتے ہیں، اور العلیمی ۱۵۰ھ یا ۱۵۴ھ لکھتے ہیں (المنہج الاحمد ص۱۴۰ ج۱)

سن ولادت کی طرح آپ کے سن وفات میں بھی خاصہ اختلاف ہے، لیکن راجح قول ۲۲۴ھ ہے یہ قول بڑے سوانح نگاروں اور اہل تراجم کا ہے جیسے امام بخاری (التاریخ الکبیر ج، ص۱۷۲) خطیب بغدادی (تاریخ بغداد ج۱۲ ص۴۱۶) ابن عبدالبر (الانتقاء ص۱۰۷) وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اور حافظ ابن حجر عسقلانی "تہذیب التہذیب" میں اسی کو اصح قرار دے رہے ہیں (ج۸ ص۳۱۶) یہی قول ابو عبید کے خصوصی شاگردوں سے بھی منقول ہے جیسے علی بن عبدالعزیز البغوی (طبقات النحویین للزبیدی ص۲۰۰)

سن ولادت و وفات کی طرح آپ کی عمر کے بارے میں بھی اختلاف ہے، بعض کا قول ہے کہ آپ کی عمر بوقت وفات سڑسٹھ ۶۷ سال تھی، اس طرح آپ کا سن ولادت ۱۵۷ھ ہوتا ہے حافظ ذہبی کے قول کی موافقت اس سے ہوتی ہے جیسا کہ اوپر گذرا، اس کے قائلین خطیب یاقوت (معجم الادباء ج۱۶ ص۲۵۴) القفطی (انباہ الرواۃ ج۳ ص۲۰) ابن الجوزی (صفوۃ الصفوۃ ج۴ ص۱۳۲) ابن الاثیر (الکامل ج۶ ص۵۰۹) ہیں

بعض کہتے ہیں آپ کی عمر تہتر سال ہے، اس طرح ولادت کا سال ۱۵۱ھ ٹھہرتا ہے، الزبیدی اسی کو بیان کرتے ہیں (طبقات النحویین ص۲۰۰) ابو عبید کے اجل تلامذہ سے نقل کرتے ہوئے اسی کو ابن عبدالبر (الانتقاء ص۱۰۷) اور ابن الجزری (غایۃ النہایہ ج۲ ص۱۸) علی بن عبدالعزیز البغوی جو ابو عبید کے ساتھ ان کی آخر عمر تک رہے یہی بیان کرتے ہیں کہ ابو عبید نے تہتر سال کی عمر پائی،

اس طرح ترجیحی قول کی بنا پر آپ کی ولادت کا سن ۱۵۱ھ اور وفات ۲۲۴ھ و عمر تہتر سال ہے۔

آپ کی تعلیم

ابتدائی علوم آپنے ہرات میں حاصل کئے، مبادیات سے فراغت کے بعد آپنے مختلف ممالک کا رخ کیا۔

پہلا علمی سفر

آپ کا پہلا علمی سفر عراق کا ہوا، بغداد، بصرہ، کوفہ وغیرہ، عراق کے یہ ایسے بڑے شہر تھے جو نور علم سے معمور تھے جس کی طرف بڑے بڑوں نے علمی اسفار کئے، جن کے بغیر کسی کو چارہ کار نہ تھا، چنانچہ ابو عبید القاسم بھی بغداد اور بصرہ و کوفہ وغیرہ طلب علم کے لئے پہنچے، اور یہاں پہونچکر آپنے حدیث کی سماعت کی، ادب کا درس لیا، فقہ میں گہری نظر پیدا کی اور تمام ہی اہم علوم سے اپنے دامنِ مراد کو خوب خوب بھرا، بصرہ اور کوفہ میں خواہ وہ فقہ ہو یا حدیث و قرارت ہو، ادب و لغت ہو، ہر صنف کے اعاظم رجال سے تعلق رکھا اور بھرپور استفادہ کیا۔

بغداد میں آپ ۱۷۶ھ میں (یا اس سے کچھ پہلے) پہونچے، یہاں آپنے بغداد کے قاضی سعید بن عبدالرحمٰن الجمحی سے روایت کی جن کا سن وفات ۱۷۶ھ ہے، نیز آپنے یہاں فرج بن فضالہ (م ۱۷۷ھ) سے بھی سماعت کی، آپنے فرج بن فضالہ سے اپنی کتاب فضائل (م ۱۲۶) میں ایک سو چھبیس نمبر کی حدیث نقل کی ہے، کوفہ میں آپ ۱۷۷ھ میں پہنچے جہاں آپ نے قاضی کوفہ شریک بن عبداللہ النخعی (م ۱۷۷ھ) سے سماعت حدیث کی۔

بصرہ میں آپ رمضان ۱۷۹ھ کے بعد پہنچے، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ بغداد میں ابو عبید سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ میں حضرت حماد بن زید سے سماعت کی غرض سے بصرہ پہونچا، جب حماد کی خدمت میں حاضری کیلئے آیا اس وقت آپ کا انتقال ہو چکا تھا، جب کہ حماد بن زید کی وفات رمضان ۱۷۹ھ میں ہو چکی تھی۔

اس طرح آپ بغداد، بصرہ، کوفہ اور عراق کے دیگر شہروں میں وہاں کے علماء اور محدثین سے اخذ و سماع کے سلسلے میں آتے جاتے رہے، ۱۹۱ھ سے پہلے پہلے آپنے رقہ کا سفر بھی کیا۔ رقہ دریائے فرات کے کنارے واقع ایک مشہور شہر ہے، شام میں دریاء فرات کے سواحل میں آج بھی یہ شہر مشہور و معروف ہے، ہارون رشید کے تعمیر کردہ آثار و کھنڈرات

آج بھی پائے جاتے ہیں۔ شہر رقہ کے بارے میں خود ابو عبید فرماتے ہیں: میں رقہ میں شیخ معمر ابو عبداللہ الرقی النخعی م ۱۹۱ھ کی مجلس میں حاضر ہو چکا ہوں۔ فرماتے ہیں۔ "وکان من خیر من رأیت" یعنی جتنے حضرات کی زیارت مجھے نصیب ہو چکی ہے ان میں آپ بہت بہتر تھے (المرشد الوجیز لابی شامۃ ص۲۰۲)

مراجعت وطن | اس سفر کے بعد آپ رقہ سے اپنے وطن اصلی خراسان واپس آ گئے، یہاں آپ نے ہرثمۃ بن اعین (مقتول ۲۰۰ھ) کی اولاد کی تعلیم و تادیب میں خود کو مصروف کر لیا۔

ہرثمہ ابن اعین خلیفہ ہارون رشید کے بڑے سپہ سالاروں میں سے تھا، ۱۷۸ھ میں ہارون رشید نے اسے مصر کا والی بنایا، اس کے بعد ۱۹۱ھ میں خراسان کا والی مقرر کیا، ۲۰۰ھ میں مامون نے اسے قتل کر دیا۔ (تاریخ طبری ج ۸ ص۳۲۴/۳۲۸، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص۲۱۴)

ہرثمہ ابن اعین کے بعد آپ کی ملاقات ثابت بن نصر بن مالک الخزاعی سے ہوئی اور آپ اولادِ ثابت کے مؤدب و معلم مقرر کئے گئے۔ ثابت بن نصر جس کے لئے تاریخ بغداد میں "صاحب فضل وصلاح" کے الفاظ مذکور ہیں۔ (ج ۷، ص۱۴۲)

ثابت بن نصر کو ۱۹۲ھ میں طرسوس کا والی مقرر کیا گیا تو ساتھ ہی الامام ابو عبید کو طرسوس کا قاضی بنا دیا گیا، آپ اس وقت تک (اٹھارہ سال) ثابت بن نصر اور اس کی اولاد کے ساتھ رہے جبتک ثابت بن نصر والی طرطوس رہے۔ "طرسوس" انطاکیہ، حلب اور بلادِ روم سے قریب شام کا سرحدی شہر ہے۔ (معجم البلدان ج ۴ ص۲۸) منصبِ قضا پر اس طویل مدت تک فائز رہنے کے بعد آپ دوبارہ واپس بغداد تشریف لائے اور یہاں والی خراسان عبداللہ بن طاہر سے ۲۱۱ھ میں ملاقات ہوئی۔

عبداللہ بن طاہر کی تعریف میں "شذرات الذہب" (ج ۲ ص۳۱) میں "کان سیداً، نبیلاً عالی الھمۃ شھماً، کان احد الاجود الاسخیاء" جیسے وقیع الفاظ نظر آتے ہیں۔ مامون رشید کو عبداللہ بن طاہر پر بڑا اعتماد تھا، اس نے ابن طاہر کو شام و خراسان کا گورنر بنایا تھا (ایضاً)

ابن طاہر نے حضرت ابو عبید کی علمی قدر و منزلت کے پیش نظر دو ہزار درہم ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی کے ساتھ ابن طاہر قدر دانِ علم و فن بھی تھا، اسی سلسلے میں درج ذیل ایک واقعہ قابل ملاحظہ ہے، جس سے اس کی قدر دانی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ابوالعباس احمد بن یحییٰ المعروف بہ ثعلب (العلامہ، المحدث، شیخ اللغۃ والعربیۃ، امام الکوفیین فی النحو واللغۃ م ۲۹۱ھ) بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن طاہر حج کے ارادے سے خراسان سے چل کر بغداد پہنچے اور اسحٰق بن ابراہیم المصعبی الخزاعی (یہ مامون، المعتصم، واثق اور المتوکل کے دور میں بغداد کا پولیس آفیسر تھا م ۲۳۵ھ) کے مکان میں فروکش ہوئے، اسحٰق نے بغداد کے علماء اور فضلاء کو ابن طاہر کی آمد کی اطلاع کی تاکہ لوگ حاضر ہوں اور ابن طاہر انہیں دیکھیں، چنانچہ بڑے بڑے اصحاب حدیث وفقہ نے حاضری دی، ان میں ابن الاعرابی اور ابونصر صاحب اصمعی جیسے ارباب فن بھی تھے۔ ابن طاہر کے حضور میں حاضری دینے کیلئے ابوعبید القاسم بن سلام کو بھی متوجہ کیا گیا، ابوعبید نے حاضری سے صاف انکار کرتے ہوئے جواباً ایک مختصر مراسلہ میں یہ بھی فرمایا "العلیم مقصد" یعنی علم اور اہل علم ہی کی خدمت میں حاضری دی جانی چاہیئے آپ کے اس مراسلہ پر اسحٰق کو سخت غصہ آیا، اپنے اس غیظ وغضب کا مظاہرہ اس نے اس صورت میں کیا کہ ابن طاہر نے ابوعبید کیلئے جو ماہانہ دو ہزار درہم کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، اسحٰق نے اسے ختم کر دیا اور اس کی اطلاع ابن طاہر کو کر دی، ابن طاہر نے جواباً اسحٰق کو لکھا: "قد صدق ابوعبید فی قولہ" ابوعبید نے بالکل سچ فرمایا، مزید برآں ابوعبید کی اس خودداری اور علمی غیرت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ منسوخ شدہ وظیفہ پھر جاری کر دیا بلکہ اسے بڑھا کر دوچند کر دیا، اور ان کے ساتھ برابر وہی معاملہ کرتا رہا جسکے وہ مستحق تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴)

مذکورہ بالا واقعہ سے ابن طاہر کی علمی قدرشناسی کے ساتھ ہی ابوعبید القاسم سے حد درجہ تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے، نیز یہ کہ ایک عالم ربّانی کو ایسا ہی غیرتمند اور خوددار بھی ہونا چاہیئے جس کا نمونہ ابوعبید القاسم نے پیش کیا۔

اسی قدرشناسی کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی امام ابوعبید القاسم کوئی کتاب تصنیف فرماتے تو اسے ابن طاہر کی خدمت میں ہدیۃً پیش کرتے اور ابن طاہر استحساناً ابوعبید کی خدمت میں ایک خطیر رقم ہدیۃً ارسال کرتے۔ (ایضاً ص ۴۰۴)

ابوعبید القاسم جب اپنی عظیم تصنیف "غریب الحدیث" ابن طاہر کی خدمت میں پیش کی تو ابن طاہر نے زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: "اِنَّ عقلاً بعث صاحبہ علی عمل

مثل هذا الکتاب لحقیق ان لا یحوج الی طلب المعاش، فاجری له عشرة الاف درهم فی کل شهر" یعنی حقیقت یہ ہے کہ ایسی عقل جس نے آدمی کو اس پائے کی تصنیف کی استعداد بہم پہنچائی اس بات کے لائق ہے کہ طلب معاش کے لئے پریشان نہ ہو، پس ابن طاہر نے ان کے لئے دس ہزار درہم ماہانہ مقرر کر دیا (ایضاً ص۴۰۶)

امام ابو عبید باوجودیکہ امراء اور وزراء کی خدمت میں حضوری اور ان کے پاس آنے جانے سے بچتے تھے اور خود کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہنے کے باوجود ان سے قریب رہ چکے تھے، جیسا کہ اوپر گزرا۔

بہرحال عبداللہ بن طاہر کی تمام قدردانیوں اور جوہر شناسیوں کے باوجود امام ابو عبید القاسم زیادہ مدت تک بغداد میں نہ ٹھہر سکے ۔ اور ان شہروں میں اپنے حاصل شدہ علوم پر اکتفا نہیں کیا، اپنی علمی تشنگی کا برابر احساس کیا، اور اکتسابِ علم میں مزید اضافہ اور زیادتی کی غرض سے آگے ہی بڑھتے رہے، اور بمصداقِ فرمان پیغمبر علیہ السلام "قال منھومان لا یشبعان منھوم فی العلم الخ" (مشکوٰۃ کتاب العلم) اس سلسلے میں آپ کا وہی حال تھا جو آپ کے دور کے علماء اور محدثین کا تھا۔

مصر و شام کا علمی سفر

چنانچہ ۲۱۳ھ میں بغداد سے امام ابو عبید نے، امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین (م ۲۳۳ھ) کی معیت میں مصر کا سفر کیا، آپ نے اپنے اس سفر و زیارت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "غریب الحدیث" ج ۳ ص۱۶۵ میں حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث کی شرح کے ضمن میں یوں اشارہ کیا ہے، "انہ کان یختضب بالقبیب فقال ابو عبید: یقال انہ ماء ورق السمسم او غیرہ من نبات الارض وقد وصف لی بمصر" الخ

(تاریخ دمشق ج ۱۴ ص۳۲)

اسی طرح آپ نے طلب علم میں دمشق کا بھی سفر کیا اور یہاں آپ نے ہشام بن عمار وسلیمان بن عبدالرحمن سے حدیث کی سماعت کی اور ان دونوں حضرات سے حدیث نقل بھی کی۔ (ایضاً ص) شام کا علمی سفر ۲۱۴ھ میں بعمر ترسٹھ سال ہوا، یہ سفر شام کے عالم حدیث جناب احمد بن خالد الوہبی الحمصی (م ۲۱۴ھ) سے سماع حدیث کی غرض سے ہوا، احمد بن خالد سے اپنی کتاب کتاب الاموال ص

(باقی ص…)

میں روایت بھی نقل کی ہے۔ اس طرح ابو عبید القاسم نے مصر و شام کا علمی سفر کیا۔ وہاں آپ نے حدیث کی سماعت کی اور کتابیں بھی تصنیف کیں اور مصر و شام سے بغداد دوبارہ واپسی ہوئی۔

سفر حج و زیارت

امام ابو عبید القاسم ۲۱۹ھ میں مکۃ المکرمہ حاضر ہوئے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو مناسکِ حج کی ادائیگی کا شرف بخشا، اسی کے ساتھ آپ مدینۃ المنورۃ حاضر ہوکر زیارت کا شرف حاصل کیا۔

اس میں شک نہیں کہ امام ابو عبید کے سارے ہی رحلات اور اسفار میں وہی شان تھی جو اہل علم حضرات کی ہوا کرتی ہے۔ آپ جہاں بھی پہونچتے یہی کوشش ہوتی کہ علوم میں مزید اضافہ ہو، افادہ و استفادہ سے کبھی اور کسی طرح بھی پہلو تہی نہ فرماتے، علماء سے ملاقات اور ان سے سماع کے لئے برابر حریص رہتے۔

مکہ واپسی

مدینہ منورہ سے واپس آپ پھر مکہ مکرمہ تشریف لائے اور پھر یہیں رہ گئے تاآنکہ ۲۲۴ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، اور معلاۃ میں جو اہل مکہ کا مقبرہ ہے آپ مدفون ہوئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔ (جاری)

بقیہ ص۵۳) وفیات

مدظلہ نے پڑھائی، جملہ عمائدین شہر و علماء نیز ضلع بھر کے تلامذہ و متعلقین نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور اپنے والد بزرگوار قطب الاقطاب حضرت مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محوِ خواب ہوگئے — موصوف مرحوم تقریباً ۷۹ برس کے تھے اپنی مختصر سی زندگی میں بیشمار قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی امور انجام دیئے جن میں مدرسہ رحمانیہ کا قیام، مسلم فنڈ کا قیام، اور اسکے تحت ایک زنانہ ہسپتال، قبرستان کی حدبندی کرنا وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں — قارئین کرام سے درخواست ہے کہ مرحوم و مغفور کیلئے دعا مغفرت و رفع درجات فرمائیں خداوند کریم پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین یارب العٰلمین۔

بقیہ ص۵۴ آزادیٔ نسواں کا غلط مفہوم۔

مل سکتی ہے۔ اور نہ کلبوں اور پارکوں میں کی جانے والی رنگ رلیوں میں شرکت کی اسے اجازت مل سکتی ہے۔ او عقل کی مفلس عورت! کبھی تم نے سوچا بھی کہ تم عزت کے کس بلند مقام پر فائز تھیں اسلام دشمن نے تم کو ذلت کی کس کھائی میں دھکیل دیا؟ اسلام نے تم کو گھر کی ملکہ بنایا تھا، اسلام دشمنوں نے تمھیں گھر سے نکال کر دفتر کا کلرک بنادیا اسلام نے عورت قدموں کے نیچے جنت سجایا، اسلام دشمن نے خود تمھارے قدموں سے ہی اسے روندنے کی اسکیم بنائی، اس سے بڑھ کر ظلم و ستم کی انتہاء اور کیا ہوگی کہ تمھارا فکر سلیم چھین لیا، تمھارے احساس کو موت کے گھاٹ اتار دیا اب وہ جسطرح چاہے تمھارا استعمال اس کیلئے آسان ہوگیا ہے اور اسکے اوپر خوبصورت اور دیدہ زیب لیبل کیا چڑھایا! آزادیٔ نسواں۔

وفیات

از ـــــــــ پروفیسر سید محمود اللہ بختیاری

ہمارے والد محترم حضرۃ مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری حسینیؒ ۱۱ رمئی ۹۳ء کی صبح دار فانی سے دارِ بقار کی طرف رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، درخواست کی جاتی ہے کہ حسنات کی قبولیت، درجات کی بلندی اور مغفرت کی دعا کی جائے، رحلت سے ایک ہفتہ قبل ذکر الٰہی جاری ہوگیا تھا، کلمہ طیبہ کا ورد زور زور سے کرنے لگے اور یہ آیت افوض امری الی اللہ .. زبان پر جاری رہی اور اسی حالت میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

والد محترم اپنے آبائی وطن رائے چوٹی ضلع کڈپہ آندھراپردیش میں قیام پذیر ہو کر دعوت و اصلاح کی عظیم ترین خدمت میں مصروف رہتے تھے، علمار کی تربیت کا ایک خصوصی پروگرام رکھتے تھے اور اس کا کورس بھی بنایا تھا، خطاب عام اور خصوصی ملاقاتیں بھی رہتی تھیں۔

دسمبر ۱۹۹۱ء میں رائے چوٹی میں بعارضہ قلب بیمار ہوئے تو اطلاع پاکر میں اور میرے فرزند مولوی سید کمال اللہ بختیاری ندوی رائے چوٹی سے مدراس لے آئے ان کے خصوصی ڈاکٹر کے مشورہ سے جنرل ہسپتال مدراس میں داخل کیا گیا، اللہ نے فضل فرما دیا اور طبیعت سنبھل گئی، تقریبًا پچاس دن ہسپتال میں رہے، مولوی سید حماد اللہ بختیاری اور مولوی سید محمد اللہ ضیار بختیاری بھی خدمت میں لگے رہے اور ہمیشہ آتے رہے۔

عارضۂ قلب اور پیرانہ سالی اور دن بدن بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر والد محترم کو ہسپتال میں شدید احساس ہوگیا تھا کہ وہ اپنے قائم کردہ اصلاحی ادارہ معہد احسانی کے مقاصد کو بروئے کار نہ لا سکیں گے، اور مزید اس بات کا بھی اظہار فرمایا کہ آئندہ اکیڈمک قسم کا کام نہیں کریں گے، اور وصیت فرما دی کہ معہد احسانی کے نام سے جو زمین رائے چوٹی میں خریدی گئی ہے اور زمین خریدنے کے بعد جو بھی رقم موجود ہے صرف اُسی رقم سے اس وقف شدہ زمین پر ایک لائبریری کی شکل دی جائے اور ان کی جملہ کتابیں جو وقف میں ترتیب

دی جائیں تاکہ اہل علم مستفید ہوں، تحریراً مجھے حکم دیا کہ ان کتابوں کی ترتیب اور حفاظت کروں اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کی سہولت جلد عطا فرمادے اور والد محترم کی یہ آخری خواہش پوری ہوجائے۔

صحت یابی کے بعد ڈاکٹروں نے مدراس میں گھر پر آرام کرنے کا مشورہ دیا، گھر پر ذیابیطس اور السر کا بھی علاج ہوتا رہا، گفتگو اور بات چیت کا سلسلہ جاری رہا، شگفتگی متانت اور گفتگو کا وہی علمی اور خصوصی رنگ رہتا، بیماری کے باوجود قوّت حفظ اور یادداشت غیر معمولی تھی مخلصین اور معتقدین ملنے آتے تو یہ شعر پڑھتے ؎

ان کے آنے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے گفتگو کرتے اور ہر ایک کی صلاحیت کے مطابق اصلاح باطن کی تلقین فرماتے اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہا، علماء تشریف لاتے تو علمی باتیں ہوتیں، تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی طرف توجہ دلاتے اور گھر والوں پر خصوصی توجہ فرماتے اور سب کو ہدایات و مشورے دیتے رہتے اور سب کے حق میں دعا فرماتے، سید محمد اللہ ضیاء بختیاری اکثر والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے، حضرت مولانا سید شاہ مرشد پیران، قادری قاضی رائے چوٹی، مولوی سید حمید اللہ بختیاری شاطر مولوی سید احمد اللہ بختیاری، مولوی سید مخدوم محی الدین قادری اور دوسرے بھائی بھی آتے رہتے، والد محترم کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ املا کرواتے کوئی علمی اور احسانیات سے متعلق بات سمجھاتے، مختلف کتابوں کو پڑھواتے اور تبصرہ فرماتے، گراں قدر مشورے دیتے کہ کس طرح جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں دینی بیداری پیدا کی جائے۔

اپنے اکابر اور اساتذہ کا بڑے احترام سے نام لیتے اور اپنی ملاقاتوں کا ذکر فرماتے ایسا معلوم ہوتا کہ کل کی بات ہے، خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح، حضرت مولانا احمد علی لاہوری رح، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح اور اپنے نانا حضرت مولانا سید شاہ قادر باشا حسینی قادری رح اور دادا حضرت

مولانا سید شاہ علیم اللہ بختیاری حسینیؒ جنھوں نے اس شہر (رائے چوٹی) میں شرک وبدعات کے خلاف دعوتی واصلاحی کام انجام دیا تھا کا ذکر کثرت سے فرماتے، اپنے ساتھیوں کا تذکرہ ہمیشہ کرتے اور واقعات سناتے، خصوصاً اپنے ساتھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی کا ذکر خیر بڑی مسرت سے فرماتے اور کہتے کہ اللہ نے انھیں خدمات دینیہ وملیہ کے لئے منتخب فرمایا ہے اور دعائے صحت کرتے رہتے۔

حضرت مولانا سید اسعد حسینی مدنی مدظلہٗ العالی جب بھی مدراس آتے مزاج پرسی کیلئے گھر پر تشریف لاتے، حضرت مولانا کی تشریف آوری سے والد محترم بہت خوش ہوتے اور اپنے والہانہ تعلق کا اظہار فرماتے اور بار بار حضرت مولانا کی دینی وملی خدمات کا ذکر کرتے اور آپ کے حق میں بھی دعا فرماتے رہتے، اپنے شاگردوں کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے خصوصاً حضرت مولانا ابوالبیان حماد عمری کا ذکر کرتے،

گھر پر ہی ڈاکٹر آتے معائنہ جات ہوتے اس طرح علاج کا سلسلہ اور تیمارداری چلتی رہی، کبھی کمزوری بڑھ جاتی اور پھر طبیعت سنبھل جاتی تقریباً چودہ ماہ گھر پر علاج اور نگرانی ہوتی رہی۔

اپریل ۹۳ئہ کے پہلے ہفتہ میں یکایک طبیعت بگڑ گئی ڈاکٹر گھر پر علاج کرتا رہا جب طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو ڈاکٹر کے مشورہ سے ۲۴ اپریل ۹۳ئہ کو عائشہ ہوسپٹل پرائیویٹ مدراس میں داخل کیا گیا، معقول علاج رہا، ہر ممکنہ تدبیر کی گئی لیکن مشیت الٰہی کو یہی منظور تھا کہ سترہ دن کی علالت کے بعد ۱۱ مئی ۹۳ئہ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ اس قدر جلد والد محترم سے ہم جدا ہو جائیں گے۔

ان کی وصیت کے مطابق آبائی وطن رائے چوٹی لے جایا گیا اور ۱۲ مئی ۹۳ئہ کی صبح تجہیز وتکفین کے بعد مدرسہ امدادیہ رائے چوٹی کے وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی، قاضی سید شاہ مرشد پیراں قادری نے نماز پڑھائی اور دعائے مغفرت کی، جس میں تمام عزیز واقارب، فرزندان ہشائخ عظام اور علمائے کرام تلامذہ، مریدین، خلفاء اور معتقدین بڑی تعداد میں شریک ہوئے، خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ دے اور درجات بلند فرما کر جنت الفردوس عطا کرے ان کے اعمال حسنہ اور خدمات دینیہ، دعوت کی تڑپ اور ملت کی خیر خواہی کو اپنے فضل ورحمت سے قبول فرما کر مراتب عالیہ سے نوازے آمین۔



از جناب عبدالرحیم بڈیڈوی صاحب

انتہائی افسوس اور رنج والم کے ساتھ خدمت عالیہ میں یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ میوات کی عظیم شخصیت، متبحر عالم، فقیہ ومحدث ومرشد کامل حضرت الحاج مولانا نیاز محمد صاحب (مجاز شیخ الاسلام مدنی) صدر جمعیۃ علماء صوبہ وامیر شریعت ہریانہ وہماچل ۱۶ر جون ۹۳ء کو صبح نو بجے اس دار فانی سے رحلت فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مرحوم کو خداوند قدوس نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ زبردست عالم ہونے کے ساتھ مرشد کامل بھی تھے دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد ۵ سال مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب (بانی تبلیغ) قدس سرہٗ کے پاس رہ کر تدریسی وتبلیغی خدمات انجام دیں، اسکے بعد ۱۹۴۸ء میں میوات کے علمی مرکز مدرسہ معین الاسلام نوح میں تشریف لائے اور مسند صدارت پر فائز رہ کر ۱۸ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ بعد ازاں اپنے ہی قائم کردہ مدرسہ قاسم العلوم واقع درگاہ حضرت شیخ موسیٰ پلہ نوح کے اہتمام وصدارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اسے ترقی دے کر دورۂ حدیث کی تکمیل تک پہنچایا جو بحمد اللہ آج بھی عروج پر ہے اسی کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھ کر عربی واردو میں تقریباً ڈھائی درجن اہم کتابیں تصنیف فرمائی جن میں الدر المنضد، عمدۃ اللبیب فتوحات الباری، النجاۃ الکاملہ ۳ حصص طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں، ارشاد وسلوک کے سلسلے میں آپ کا حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا، بڑے بڑے علماء آپ سے وابستہ رہ کر اصلاح باطن میں مصروف ہیں اور کئی حضرات کو آپ سے اجازت وخلافت بھی مل چکی ہے۔ بڑی عمر میں آپ کو قرآن کریم حفظ کرنے کا شوق ہوا اور صرف ۳ ماہ کی مدت میں مکمل قرآن شریف حفظ کرلیا آخری عمر تک تلاوت کا بہت شغل رہا، مطالعۂ کتب آپ کا محبوب مشغلہ تھا بہت ہی بلند اخلاق اور باوضع تھے، مجلس میں اکثر علمی مذاکرے اور مسائل پر گفتگو ہوتی تھی آخری وقت تک ذکر اللہ جاری رہا اور نہایت سکون کے ساتھ جان جاں آفرین کے سپرد کردی، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ پسماندگان میں ایک بیوہ دو صاحبزادے اور ۲ صاحبزادیاں ہیں، پورے گھر میں علمی ودینی ماحول ہے، آپ سے درخواست ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کیلئے ایصال ثواب ودعائے مغفرت فرمائیں۔

از
مولانا بلال احمد شیرکوٹی
جامعہ ناصر العلوم قصبہ کانٹھ مراد آباد یوپی

ایک اور آفتاب علم وعمل غروب ہو گیا

۱۲رجون ۱۹۹۳ء بروز پیر عالم ربانی استاذ الاساتذہ حضرۃ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب شیرکوٹی اپنے ہزاروں عقیدتمندوں کو سوگوار چھوڑ کر رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔

رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ کے آخری عشرے میں اپنے ایک سعیدت گرد رشید مولانا نور محمد صاحب مدظلہٗ گجراتی (جو اس وقت مکۃ المکرمہ میں مقیم ہیں) کی درخواست پر حضرت مولانا محمد محفوظ الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ بنیت عمرہ حجاز مقدس تشریف لے گئے، جانے کے فوراً بعد عمرہ ادا کیا، وہاں پر اور بہت سے تلامذہ کی کوششوں سے ویزہ میں اضافہ ہوگیا اور حج بیت اللہ تک رہنے کی اجازت مل گئی۔ عزیز واقرباء کو بھی علم ہو گیا کہ اب حضرت مولانا رح حج بیت اللہ کے بعد ہی تشریف لائیں گے سبھی متعلقین خاص طور پر آپ کے برادر کبیر حضرت مولانا محمد شریف الحسن صاحب مدظلہٗ نہایت مسرور تھے اور بار بار شکر رب العٰلمین میں رطب اللسان تھے، دوران قیام مکۃ المکرمہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ طواف، درس وتدریس جیسے مبارک اعمال صالحہ میں ہمہ تن مشغول ومصروف رہے اپنے اساتذہ سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ سب کے نام سے طواف کئے، اور تلامذہ سے غایت درجہ کی شفقت ومحبت دیکھئے کہ ہر ایک کے نام سے بھی ایک ایک طواف کیا، جن کی تعداد تقریباً ایک سو ساٹھ ہے مناسک حج کی تکمیل کے بعد مراجعت وطن کا ارادہ فرمایا، اور ۱۰رجون ۹۳ء بروز جمعرات تقریباً ۸ بجے صبح بمبئی پہونچ گئے، متعلقین نے حج بیت اللہ سے واپسی پر مرحبا کہا، بمبئی میں مقیم شاگردوں سے ملاقات ہوئی، دو دن بمبئی قیام کرکے شیرکوٹ کے لئے روانہ ہونے کا پروگرام تھا، راجدھانی ایکسپریس کا ٹکٹ تھا، مولانا رح کے ایک شاگرد رشید برادرم مولوی محمد عرفان نجم شیرکوٹی آپ کو گاڑی میں سوار کرانے کی غرض سے اسٹیشن تک آئے ہوئے تھے، حضرت رح نے ان کو ٹکٹ دیا کہ گاڑی میں سیٹ نمبر وغیرہ دیکھ کر آؤ، طبیعت بالکل ٹھیک تھی، مولانا محمد عرفان صاحب حضرت کو پلیٹ فارم پر سامان کے پاس کھڑا ہوا چھوڑ کر سیٹ تلاش کرنے کی غرض سے گاڑی میں داخل ہوئے، ادھر فرشتۂ اجل نے حضرت مولانا رح سے ملاقات کی۔

واپسی پر مولوی عرفان دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا اپنی جگہ پر نہیں ہیں، فکر لاحق ہوئی کہ آخر

اتنی جلدی کہاں چلے گئے، اِدھر اُدھر پاس میں کھڑے ہوئے مسافروں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ان کو پولیس والے اسٹریچر پر لٹا کر ایک کمرے میں لے گئے ہیں، جا کر دیکھا تو مولاناؒ زمین پر دراز ہیں اور منھ سے لعاب نکل رہا ہے، تنفس پر اتنا اثر کہ سانس بہت آہستہ آہستہ آرہا ہے، یہ گھبرائے اور فوراً قریبی ہسپتال میں لے جا کر چیک کرایا، تو یہ سنکر کہ حضرتؒ تو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں حواس باختہ ہوگئے، اِنا للہ وانا الیہ راجعون، فوراً دہلی اسٹیشن پر منتظرین آمد کو اس حادثہ فاجعہ کی بذریعہ فون اطلاع دی گئی، بس پھر کیا تھا قیامت صغریٰ برپا ہوگئی، حضرتؒ کے بڑے بھائی حضرت مولانا شریف الحسن صاحب مدظلہٗ، تو غم کی تاب نہ لاکر فوراً ہی بے ہوش ہوگئے، ہر شخص اپنا سر گریباں میں ڈالے اشکبار نظر آرہا تھا، جو گھر اس آنے والے مقدس مہمان کے خیر مقدم میں خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا چشم زدن میں ماتم کدہ بن گیا۔ یہ اندوہناک خبر پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور قصبے کے اطراف واکناف نیز ضلع کے مختلف مقامات کے علاوہ دور دراز سے بھی آپؒ کے متعلقین، احباب ومعاصرین اور تلامذہ کی آمد شروع ہوگئی ۱۴؍ رجون ۱۹۹۳ء بروز پیر علی الصبح مولانا مرحوم کا جسدِ خاکی اپنے چند غم زدہ شاگردوں و اقرباء کے ساتھ شیرکوٹ پہنچ گیا

احقر آج صبح ہی سے منتظر تھا کہ حضرت مولانا کی آمد کا علم ہو تو شیرکوٹ جاؤں، دوسرا گھنٹہ (جلالین شریف جلد ثانی) شروع ہی ہوا تھا اور چند آیات ہی پڑھا سکا تھا کہ بھائی شبیر احمد صاحب شیشگر کے صاحبزادہ محترم میرے پاس پہونچے۔ میں نے ان سے معلوم کیا کہ کیا مولانا تشریف لے آئے؟ تو انھوں نے نہایت درد بھرے لہجے میں بتایا کہ "تشریف تو لے آئے مگر جسم وروح کے افتراق کے ساتھ" بس میرے دل پر بجلی سی گر پڑی، میں ہکا بکا سا رہ گیا، خود کو سنبھالنا میرے لئے مشکل ہو گیا مگر صبر وضبط کا دامن تھامے ہوئے مدرسہ کی تعلیمی چھٹی کر کے ان کے ہمراہ شیرکوٹ پہونچ گیا۔

تقریباً ۱۲ بجے میت کو غسل دلایا گیا۔ غسلِ میت حضرتؒ کے ماموں زاد بھائی صلاح الدین صاحب نے دیا، ان کے معاونین میں مولوی عبید الرحمٰن صاحب، مولوی بدر الدین، مولوی ڈاکٹر علاء الدین مولوی ڈاکٹر رئیس احمد صاحب، مولانا عبدالغفار صاحب، مولوی محمد عرفان صاحب، مولوی ڈاکٹر محمد صدیق صاحب کرتپوری کے ساتھ احقر بھی شامل تھا، غسل وتجہیز وتکفین کے بعد بعد از ظہر آپ کا جنازہ نہایت مختصر راستے سے مدرسہ رحمانیہ تک لے جایا گیا۔ نماز جنازہ آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا شریف الحسن صاحب

(باقی ص ۴۲)

آزادئ نسواں کا غلط مفہوم

از محمد ہاشم ضیا صاحب



آزادئ نسواں کا غلط مفہوم آج کل کی روشن خیال عورتوں اور مغرب نواز مردوں کے دل و دماغ میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اب ان پر کسی حقیقت کا انکشاف ممکن ہی نہیں بلکہ محال ہوگیا ہے جو شخص بزعم خود دانشور اور روشن خیال ہو بھلا وہ کس کی سنے کہ یہ خوبصورت بول دشمنان اسلام کے مذہب اسلام پر رقیق حملے ہیں جسے ظاہر کی آنکھیں شناخت نہیں کرسکتیں بلکہ اس کے لئے تو باطن کی آنکھیں درکار ہیں۔

اسلام نے دنیا کو ایک مکمل قانون اور مکمل ضابطہ حیات دیا ہے، جس میں قیامت تک ادنیٰ ترمیم کی گنجائش نہیں، جس کا ایک ایک حکم اپنے اندر سینکڑوں حکمتوں اور مصلحتوں کو لئے ہوئے ہے، سرمایہ داری کے مخالف امیر و غریب میں مساوات پیدا کرنے کی جتنی کوشش کرتے ہیں اس کو اخبار بیں حضرات بخوبی جانتے ہیں اور یہ بھی ساتھ ہی معلوم ہے کہ کوئی صورت بھی آج تک کامیاب نہیں ہوسکی، اسلام کا ہر حکم نماز، روزہ، حج، زکوۃ اس مصلحت کو نہایت آسان اور کامیاب طریقہ سے پورا کرتا ہے، اسلامی اصول سے بہتر چیز نہ آج تک پیدا ہوسکی نہ آئندہ ہوسکے گی بشرطیکہ ان احکام کو اسلام کی صحیح تعلیم کے ماتحت ادا کیا جائے، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہب اسلام نے عورت کو جو مقام عطا کیا وہ دنیا کے کسی مذہب نے عطا نہیں کیا، اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے عورت کو ذلت کی پستی سے نکال کر عزت کے اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کیا، اس کی حیثیت کو دنیا کے سامنے واضح کیا اپنے مال و اسباب میں خود مختاری دی، وراثت میں مستقل فریق قرار دیا، سماج کی کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا، آزادی دی، مردوں کی طرح حقوق دیا۔

عورت کو عورت اس لئے کہا ہی جاتا ہے چونکہ اس کے معنی ہی پردہ ہے اس لئے عورت کی عظمت اس کی خوبی اور اس کا کمال یہ ہے کہ وہ پردہ اختیار کرے، چنانچہ اسلام تعلیم دیتا ہے کہ عورت پردہ کی چیز ہے، لہذا عورت محفل کی زینت نہیں بنائی جاسکتی اور نہ دفتروں کے خوبصورت ٹیبل کرسیوں میں سجا کر تفریح کا ذریعہ بنائی جاسکتی ہے، نہ سڑکوں اور بازاروں میں بے محابا گھومنے کی اجازت

(باقی بر ص ۴۷)

جناب کاوش شوکتی
جامعۃ الہدایۃ، جے پور

(روحِ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ)

غم و تاثیر میں ڈوبی ہر اک آواز ہے، ساقی
مسلماں کی خرابی کا بتا کیا راز ہے، ساقی

زباں، تہذیب و مسجد لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس جمہوریت کی جلوہ گاہِ ناز ہے، ساقی

کوئی محمود[1] پھر کیوں مدرسہ پیدا نہیں کرتا
وہی ظلم و تشدد ہے، وہی انداز ہے، ساقی

تری ذلت پہ ہر اک دل ہی دل میں مسکراتا ہے
صفوں میں تیری کیا اب بھی کوئی جانباز ہے ساقی

کوئی دن میں برہمن راج قائم ہونے والا ہے
نہیں کہتا ہے کاوش، وقت خود غماز ہے ساقی

---

[1] شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب تحریک ریشمی رومال۔

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد نمبر ۷۷ شمارہ نمبر ۹

ماہ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۳ء

فی شمارہ =/۶ سالانہ =/۶۰

نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ	=/۲۵۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم	=/۱۰۰ 〃
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم	=/۸۰ 〃

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی، پی میں صرف زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ کمیل گاؤں ڈھاکہ ۱۲۱۹ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

منیجر



گذشتہ شمارہ میں تین طلاقوں کے تین واقع ہونے پر عہد فاروقی میں حضرات صحابہ کے اجماع کا ثبوت پیش کیا گیا تھا آج کی صحبت میں مسئلہ زیر بحث میں قرآن حکیم سے دلائل پیش کئے جارہے ہیں

ایک مجلس کی تین طلاقیں

(۱) آیت طلاق :- مسئلہ زیر بحث میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے قرآن حکیم کی "آیت طلاق" پر غور کر لیا جائے، کیونکہ مسئلہ طلاق میں اس کی حیثیت ایک بنیادی ضابطہ اور قانون کی ہے، اس آیت کی تفسیر و تاویل معلوم ہو جانے سے انشاء اللہ مسئلہ کی بہت ساری گتھیاں از خود سلجھ جائیں گی۔

عہد جاہلیت میں طلاقیں دینے اور پھر عدت میں رجوع کر لینے کی کوئی حد نہیں تھی، سینکڑوں طلاقیں دی جاسکتی تھیں اور پھر عدت کے اندر رجوع کیا جاسکتا تھا، بعض وہ لوگ جنھیں اپنی بیویوں سے کسی بناء پر کد ہو جاتی اور وہ انھیں ستانا اور پریشان کرنا چاہتے تو طلاقیں دے دے کر عدت میں رجوع کرتے رہتے تھے، نہ خود ان کے ازدواجی حقوق ادا کرتے اور نہ انھیں آزاد کرتے اس طرح وہ مجبور محض اور بے بس ہو کر رہ جاتی تھیں، جب تک طلاق سے متعلق اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا مسلمانوں میں بھی طلاق کا یہی طریقہ جاری رہا، امام قرطبی لکھتے ہیں وکان ھذا فی اول اسلام برھۃ[1] ابتدائے اسلام میں ایک عرصہ تک یہی طریقہ رائج رہا۔

[2] ، اخرج البیھقی بسندہ من ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت کان الرجل طلق امرأتہ ما شاء ان یطلقھا وان طلقھا مائۃ او اکثر اذا ارتجعھا

۱۔ جامع احکام القرآن ج ۳ ص ۱۲۶

قبل ان تنقضی عدتها حتی قال الرجل لامرأته لا اطلقك فتبینی ولا اٰویك الیّ قالت وکیف ذالك؟ قال اطلقك فكلما همت عدتك ان تنقضی ارتجعتك وافعل هكذا! فشكت المرأة ذالك الی عائشة رضی الله عنها فذكرت عائشة ذالك رسول الله صلی الله علیه وسلم فسكت فلم یقل شیئًا حتی نزل القرآن (الطلاق مرتان فامساك بمعروف اوتسریح باحسان) الآیة فاستانف الناس الطلاق فمن شاء طلق ومن شاء لم یطلق ، ورواه ایضا قتیبة بن سعید والحمیدی عن یعلی بن شبیب وكذالك قال محمد بن اسحاق بن یسار بمعناه وروی نزول آیة فیه عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة رضی الله عنها[۲]

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مرد اپنی بیوی کو جتنی طلاقیں دینا چاہتا دے سکتا تھا اگرچہ وہ طلاقیں سیکڑوں تک پہونچ جائیں بشرطیکہ عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کرلے، یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تجھے اس طرح طلاق نہ دوں گا کہ تو مجھ سے الگ ہوجائے اور نہ میں تجھے اپنے پناہ ہی میں رکھوں گا ، اس عورت نے پوچھا کہ یہ معاملہ تم کس طرح کروگے ، اس نے جواب دیا میں تجھے طلاق دوں گا اور جب عدت پوری ہونے کے قریب ہوگی تو رجوع کرلوں گا ، طلاق اور رجعت کا یہ سلسلہ جاری رکھوں گا ، اس عورت نے اپنے شوہر کی اس دھمکی کی شکایت حضرت عائشہ رض سے کی ، حضرت عائشہ رض نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خاموش رہے اس پر کچھ فرمایا نہیں ، تا آنکہ قرآن حکیم کی آیت (الطلاق مرتان الخ) نازل ہوگئی ، تو اس وقت سے لوگوں نے آیت کے مطابق طلاق کی ابتدا کی اور جس نے چاہا اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور جس نے چاہا نہ دی ، امام بیہقی کہتے ہیں کہ اس روایت کو قتیبہ بن سعید اور حمیدی نے بھی یعلی بن شبیب کے واسطے سے نقل کیا ہے ، اسی طرح محمد ابن اسحٰق امام المغازی نے ہشام کے واسطہ سے حضرت عائشہ سے الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ اسے بیان کیا ہے

واخرج ابن مردویة والبیهقی عن عائشة قالت لم یكن للطلاق وقت یطلق

۲۔ سنن الکبریٰ للبیہقی مع الجواہر النقی ج ۷ ، ص ۳۳۳ مطبوعہ حیدآباد

الرجل امرأته ثم یراجعها مالم تنقض العدة فوقت لهم الطلاق ثلاثا یراجعها فی الواحدة والثنتین ولیس فی الثالثة رجعة حتی تنکح زوجا غیرہ۔[1]

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے ورواہ الحاکم فی مستدرکہ وقال صحیح الاسناد[2] اس روایت کو امام حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔

عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ طلاق کی کوئی حد نہیں تھی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر عدت کے اندر رجوع کر لیا کرتا تھا تو ان کے لئے تین طلاق کی حد مقرر کر دی گئی ایک اور دو طلاقوں تک رجعت کر سکتا ہے تیسری کے بعد رجعت نہیں تاوقتیکہ مطلقہ کسی اور سے نکاح نہ کرے۔

اخرج ابوداؤد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ "والمطلقت یتربصن بانفسهن ثلاثة قروء ولا یحل لهن ان یکتمن ماخلق اللہ فی ارحامهن" الآیة وذالك ان الرجل کان اذا طلق امراتہ فهو احق برجعتها وان طلقها ثلاثا فنسخ ذالك فقال۔ الطلاق مرتان،[3]

مطلقہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور انھیں حلال نہیں اس چیز کا چھپانا جو اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا، اور دستور یہ تھا کہ مرد جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو رجعت کا حق رکھتا تھا اگرچہ تین طلاقیں دی ہوں پھر اس طریقہ کو منسوخ کر دیا گیا، اور اللہ جل شانہ نے فرمایا، الطلاق مرتان، یعنی طلاق رجعی دو ہیں۔

الفاظ کے فرق کے ساتھ سبب نزول سے متعلق اسی طرح کی روایتیں، موطا امام مالک اور جامع ترمذی اور تفسیر طبری وغیرہ میں بھی ہیں، ان تمام روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ آیت کریمۃ الطلاق مرتان" کے ذریعہ قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے طلاق اور رجعت کی حد دونوں باتیں متعین کر دی گئیں کہ طلاق کی تعداد تین ہے اور رجعت دو طلاقوں تک کی جا سکتی ہے اس کے بعد رجعت کا اختیار ختم ہو جائے گا فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ دو کے بعد اگر طلاق دیدی تو بیوی حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ کسی اور مرد سے نکاح کر لے، حدیث میں تنکح زوجا غیرہ، کی تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ دوسرا شوہر لطف اندوز صحبت بھی ہو۔

---

[1] درمنثور ج ۱ ص ۲۷۷۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۷۲۔ [3] بذل المجہود شرح سنن ابوداؤد باب فی نسخ المراجعة بعد التطلیقات الثلاث ج ۳ ص ۶۱۔

قدوۃ المفسرین امام جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ سبب نزول کی روایت متعدد سندوں سے ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں فتاویل الاٰیۃ علی ھذا الخبر الذی ذکرنا عدد الطلاق الذی لکم ایھا الناس فیہ علی ازواجکم الرجعۃ اذا کن مدخولا بھن تطلیقتان ثم الواجب بعد التطلیقتین امساک بمعروف او تسریح باحسان لانہ لا رجعۃ لہ بعد التطلیقتین ان سرحھا فطلقھا الثالثۃ۔ آیت کی تفسیر ان روایتوں کے پیش نظر جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں یہ ہے کہ طلاق کی وہ تعداد جس میں تمھیں اے مردو اپنی مطلقہ بیویوں سے رجعت کا حق ہے جبکہ ان سے ہم بستری ہو چکی ہو دو طلاقیں ہیں ان دو طلاقوں کے بعد خوش اسلوبی کے ساتھ نکاح میں روک لینا ہے۔ یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اس لئے کہ دو طلاقوں کے بعد رجعت نہیں ہے، اگر چھوڑنا چاہے تو تیسری طلاق دیدے۔

اس کے بعد آیت سے متعلق دوسرا قول ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں وقال اٰخرون انما انزلت ھذہ الاٰیۃ علی نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تعریفا من اللہ تعالیٰ ذکرہ عبادہ سنۃ طلاقھم نساءھم اذا ارادوا طلاقھن لا دلالۃ علی القدر الذی تبین بہ المرأۃ من زوجھا وتاویل الاٰیۃ علی قول ھٰؤلاء سنۃ الطلاق التی سنتھا وابحتھا لکم ان اردتم طلاق نسائکم ان تطلقوھن ثنتین فی کل طھر واحدۃ ثم الواجب بعد ذالک علیکم اما ان تمسکوھن بمعروف او تسرحوھن باحسان۔

اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت منجانب اللہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اللہ کی طرف سے بندوں کو اپنی بیویوں کو طریقۂ طلاق سکھانے کے لئے، اس آیت کا مقصد طلاق بائن کی تعداد بیان کرنا نہیں ہے، ان حضرات کے اس قول کے تحت آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ طلاق کا طریقہ جس نے جاری اور تمھارے لئے مباح کیا یہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہو تو انھیں دو طلاق ایک طہر میں دو، ان دو طلاقوں کے بعد تم پر واجب ہوگا کہ انھیں دستور شرعی کے مطابق روک لو یا خوبصورتی کے ساتھ چھوڑ دو۔

شان نزول سے متعلق ان دونوں روایتوں اور ان کے تحت آیت کی تفسیر کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

والذی اولی بظاهر التنزیل ما قاله عروة وقتادة ومن قال مثل قولهما من ان الآیة انما هی دلیل علی عدد الطلاق الذی یکون به التحریم وبطول الرجعة فیه، والذی یکون فیه الرجعة منه وذالك ان الله تعالیٰ ذکرهٗ قال فی الآیة التی تتلوها۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔ فعرف عباده القدر الذی به تحرم المرأة علی زوجها الا بعد زوج ولم یبین فیها الوقت الذی یجوز الطلاق فیه والوقت الذی لا یجوز فیه اھ[1]

ظاہر قرآن سے زیادہ قریب وہی بات ہے جو عروہ، قتادہ وغیرہ نے کہی ہے یعنی آیت دلیل ہے تعداد طلاق کی جس سے عورت حرام اور رجعت کرنی باطل ہوجائے گی، اور جس طلاق کے بعد رجعت ہوسکتی ہے اور اس کی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد فان طلقھا فلا تحل لہ الآیۃ کا ذکر کرکے بندوں کو طلاق کی اس تعداد کو بتایا ہے جس سے عورت اپنے شوہر پر حرام ہوجائے گی مگر یہ کہ دوسرے شوہر سے رشتۂ نکاح قائم کرلے، اس موقع پر ان اوقات کا ذکر نہیں فرمایا ہے جن میں طلاق جائز اور ناجائز ہوتی ہے۔

امام ابن جریر طبری رح کے علاوہ حافظ ابن کثیر رح اور امام رازی رح نے بھی اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے نیز علامہ سید آلوسی حنفی نے اسی کو "الیق بالنظم واوفق بسبب النزول (یعنی نظم قرآن سے زیادہ مناسب اور سبب نزول سے خوب چسپاں ہے) بتایا ہے[2]

آیت پاک۔ "الطلاق مرتان" کی اس تفسیر کا جسے امام طبری وغیرہ نے اولیٰ اور راجح قرار دیا ہے سبب نزول سے موافق ہونا تو ظاہر ہے، رہی بات نظم قرآن کے ساتھ اس تفسیر کی مناسبت ومطابقت کی تو اس کو سمجھنے کے لئے آیت کے سیاق وسباق پر نظر ڈالیے، آیت زیر بحث سے پہلے۔ "وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ" طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں تین حیض تک۔ بعد ازاں اس مدت انتظار میں شوہر کے حق رجعت کا حکم بیان فرمایا گیا وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا۔ اور ان کے شوہر حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں اگر چاہیں سلوک سے رہنا

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۲ ص ۲۵۹۔ [2] روح المعانی ج ۲ ص ۱۳۵۔

اس آیت کے نزول کے وقت قدیم رواج کے مطابق حق رجعت بغیر کسی قید کے بحالہ باقی تھا چاہے سینکڑوں طلاقیں کیوں نہ دی جا چکی ہوں[1] اور اس بے قید حق رجعت سے عورتیں جن ناقابل برداشت مصیبت میں مبتلا ہو جاتی تھیں اس کا اندازہ سبب نزول سے متعلق اوپر مذکور روایت سے ہو چکا ہے، چنانچہ اس کے بعد آیت "الطلاق مرتان اھ" نازل ہوئی، جس کے ذریعہ قدیم طریقہ کو ختم کر کے ایک جدید قانون نافذ کر دیا گیا کہ رجعت کا حق صرف دو طلاقوں تک ہوگا، اس کے بعد طلاق کی آخری حد بیان کرنے کے لئے ارشاد ہوا۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ اور اگر تین طلاقیں دیدیں تو اب عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تا وقتیکہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے (اور دوسرا شوہر اس کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہولے الحدیث) اسکے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کرنا جائز نہ ہوگا۔

کلام کا یہ نظم مُظہر ہے کہ آیت "الطلاق مرتان" کا مقصد نزول طلاق رجعی کی حد اور طلاقوں کی انتہائی تعداد بیان کرنا ہے، قطع نظر اسکے کہ یہ طلاق بلفظ واحد دی گئی ہو یا بالفاظ مکررہ ایک مجلس میں دی گئی ہو یا الگ الگ مختلف مجلسوں میں، بس یہی دو باتیں بہ نص صریح اس آیت سے ثابت ہوتی ہیں، تفریق مجلس کے لئے اس آیت میں ادنی اشارہ بھی نہیں ہے، لفظ "مرتان" کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو طلاقیں بیک کلمہ نہ دی جائیں بلکہ الگ الگ الفاظ سے دی جائیں، پھر "مرتان" کا لفظ "مرة بعد اخرىٰ" یعنی یکے بعد دیگرے، ایک کے بعد دوسرا کے معنی میں قطعی بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ لفظ جس طرح یکے بعد دیگرے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح عددان یعنی دو چند اور ڈبل کے معنی میں بھی قرآن و حدیث میں استعمال کیا گیا ہے، جس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

الف:۔ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ "یہ لوگ (یعنی مومنین اہل کتاب) دیئے جائیں گے اپنا اجر و ثواب دوگنا۔

ب:۔ اسی طرح ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔ وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ۔ اور جو کوئی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۷۱۔

تم میں اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے اچھے تو ہم دیں گے اس کو اس کا ثواب دوگنا، ان دونوں قرآنی آیتوں میں "مرتین" عددین یعنی دوچند اور دوہرے ہی کے معنی میں ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو الگ الگ دو مرتبہ ثواب دیا جائیگا

اب حدیث سے دو مثالیں بھی ملاحظہ کیجئے۔

(ج) بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ العبد اذا نصح لسیدہ واحسن عبادۃ ربہ کان لہ اجرہ مرتین[1] غلام جب اپنے آقا کا خیر خواہ ہوگا اور اپنے رب کی عبادت میں مخلص تو اسے دوہرا حصہ ملے گا، یہاں مرتین مضاعفین یعنی دو گنے اور دوہرے ہی کے معنی میں ہے۔

(د) صحیح مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ان اهل مكة سألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يريهم آية فأراهم انشقاق القمر مرتين[2] مکہ والوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا تو آپ نے چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ دکھایا، اس حدیث میں مرتین فلقتین یعنی دو ٹکڑے کے معنی میں ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے انھیں "مرۃ بعد اخری" یکے بعد دیگرے شق القمر کا معجزہ دکھایا کیونکہ سیرت رسول سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ شق القمر چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ صرف ایک بار ظاہر ہوا ہے، چنانچہ خود حافظ ابن القیمؒ نے اپنی مشہور کتاب "اغاثۃ اللہفان"[3] میں حدیث مذکورہ کو نقل کرکے مرتین کا معنی شقتین و فلقتین ہی بیان کیا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے

وما خفي هذا على من لم يحط به علما زعم ان الانشقاق وقع مرة بعد مرة فى زمانين وهذا مما يعلم اهل الحديث ومن له خبرة باحوال الرسول وسيرته انه غلط وانه لم يقع الانشقاق الامرة واحدة، "مرتین کا یہ معنی جن لوگوں پر ان کی کم علمی کی بناء پر مخفی رہا انھوں نے سمجھ لیا کہ شق القمر کا معجزہ مختلف زمانوں میں متعدد بار ظاہر ہوا ہے، علمائے حدیث اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال اور سیرت سے واقف اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مرتین کا یہ معنی اس جگہ غلط ہے، کیونکہ شق القمر کا معجزہ صرف ایک ہی بار ظہور میں آیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ج ص ۔ [2] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۷۳۔ [3] اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۱۷۹۔

حافظ ابن القیمؒ نے "مرتین" کی مراد سے متعلق اس موقع پر جو اصول ذکر کیا ہے کہ اگر مرتان سے افعال کا بیان ہوگا تو اس وقت تعدد زمانی یعنی یکے بعد دیگرے کے معنی میں ہوگا، کیونکہ دو کاموں کا ایک وقت میں اجتماع ممکن نہیں ہے مثلاً جب کوئی یہ کہے کہ "اکلت مرتین" تو اس کا لازمی طور پر معنی یہی ہوگا کہ میں نے دوبار کھایا اس لئے کہ دو اکل یعنی کھانے کا دو عمل ایک وقت میں نہیں ہوسکتا، اور جب مرتین سے اعیان یعنی ذات کا بیان ہوگا تو اس وقت یہ "عددین" دوچند اور ڈبل کے معنی میں ہوگا، کیونکہ دو ذاتوں کا ایک وقت میں اکٹھا ہونا ممکن ہے۔

موصوف کے اس اصول کے اعتبار سے بھی آیت پاک "الطلاق مرتان" "مرتین، عددین" کے معنی میں ہوگا کیونکہ اوپر کی تفصیل سے یہ بات منقح ہوچکی ہے کہ اس آیت میں طلاق رجعی کی تعداد بیان کی گئی ہے، تطلیق یعنی طلاق دینے کی کیفیت کا بیان نہیں ہے اور طلاق ذات اور اسم ہے فعل نہیں ہے۔

البتہ امام مجاہد وغیرہ کے قول پر (جن کی رائے میں آیت مذکورہ طریقۂ طلاق بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے) "الطلاق" تطلیق یعنی طلاق دینے کے معنی میں ہوگا اور طلاق دینا ایک فعل ہے تو اس وقت "مرتین" کا معنی مرۃ بعد اخریٰ اور یکے بعد دیگرے ہوگا، اس معنی کی صورت میں بھی "الطلاق مرتان" سے صرف اتنی بات ثابت ہوگی کہ دو طلاقیں الگ الگ آگے پیچھے دی جائیں بیک کلمہ نہ دی جائیں، اس سے زیادہ کوئی اور قید مثلاً تفریق مجلس وغیرہ کی تو اس آیت میں اس کا معمولی اشارہ بھی نہیں ہے، اس لئے اگر ایک مجلس یا ایک طہر میں انت طالق انت طالق، تجھ پر طلاق ہے، تجھ پر طلاق ہے، الگ الگ تلفظ کے ذریعہ طلاق دی جائے تو یہ صورت "الطلاق مرتان" طلاق یکے بعد دیگرے ہے۔ کے عین مطابق ہوگی، لہٰذا اس آیت کے مطابق یہ دونوں طلاقیں ایک مجلس یا ایک طہر میں ہونے کے باوجود واقع ہوجائیں گی، اور جب اس آیت کی رو سے ایک مجلس یا ایک طہر کی متعدد تلفظ سے دی گئی طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، تو ایک تلفظ سے دی گئی طلاقیں بھی واقع ہوجائیں گی، کیونکہ ایک مجلس میں دی گئی دونوں طلاقوں (یعنی ایک تلفظ سے اور متعدد تلفظ سے) کا حکم بغیر کسی اختلاف کے سب کے نزدیک یکساں ہے[1]

---

[1] دیکھئے احکام القرآن امام جصاص رازی ج ۱ ص ۳۸۸، المطبعۃ السلفیۃ مصر۔

اسی بنا پر جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ آیت "الطلاق مرتان" میں طلاق دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور "مرتین" "مرۃ بعد اخریٰ یکے بعد دیگرے" کے معنی میں ہے وہ حضرات بھی اسی کے قائل ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، اگرچہ طلاق دینے کا یہ طریقہ غلط ہے لیکن غلط طریقہ اختیار کرنے سے طلاق کے وقوع پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، ہاں اس طرح طلاق دینے والا غلط طریقہ اختیار کرنے کا مجرم ہوگا۔

آیت طلاق سے متعلق اس تفصیلی بحث سے یہ بات کھل کر معلوم ہوگئی کہ آیت پاک میں واقع لفظ "مرتین" کا معنی مرۃ بعد اخریٰ یعنی یکے بعد دیگرے بھی صحیح ہے اور ثنتین یعنی دو کا معنی بھی درست ہے، نیز دونوں معنی کے اعتبار سے ایک مجلس یا ایک تلفظ میں دی گئی تین طلاقیں اس آیت کی رو سے واقع ہوجائیں گی، اور اس کے بعد بحکم قرآن فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ حق رجعت ختم ہوجائے گا، اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کے بعد بھی حق رجعت باقی رہتا ہے وہ قانونِ الٰہی کی مقررہ حد کو توڑ رہے ہیں اور ایک مشہور دانشور کے الفاظ میں ایک چور دروازہ نکال رہے ہیں تاکہ ظالم شوہروں کو مزید ظلم کا موقع ہاتھ آجائے، یا کم از کم قانون کے دائرہ اثر کو محدود اور تنگ کر رہے ہیں، جب کہ اس تحدید کا کوئی ثبوت نہ آیت کریمہ میں ہے اور نہ اس کا کوئی اشارہ ان روایتوں میں ہے جو اس آیت کے سبب نزول سے متعلق ہیں، علاوہ ازیں قانون بحیثیتِ قانون کے اس طرح کی حد بندیوں کو برداشت بھی نہیں کرتا وہ تو اپنے جملہ متعلقات کو حاوی ہوتا ہے نیز اس تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جو لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک بتلاتے ہوئے بطور استدلال کے اس آیت کو پیش کرتے ہیں، ان کا یہ طرز عمل خالص مغالطہ پر مبنی ہے، استدلال سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

(۲) حضرت امام شافعیؒ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے وقوع پر آیت کریمہ فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ" سے استدلال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں فالقرآن واللہ اعلم یدل علی ان من طلق زوجة له دخل بها اولم یدخل بها ثلثة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ[1]۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ قرآن حکیم کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ

---

[1] کتاب الام جلد ۵ ص ۱۶۵ و سنن الکبریٰ ج ۷ ص ۳۳۳

جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں خواہ اس نے اس سے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے۔

امام شافعیؒ کا استدلال فان طلقہا کے عموم سے ہے کیونکہ "فان طلق" فعل شرط ہے جو عموم کے صیغوں میں سے ہے جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مصرح ہے، لہذا اس کے عموم میں ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی داخل ہوں گی۔

یہی بات علامہ ابن حزم ظاہری بھی کہتے ہیں، چنانچہ "فان طلقہا فلا تحل لہ الآیۃ" کے تحت لکھتے ہیں فہذا یقع علی الثلاث مجموعۃ و مفرقۃ ولا یجوز ان یخص بہذہ الآیۃ بعض ذالک دون بعض بغیر نص[1] یعنی فان طلقہا کا لفظ ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتا ہے جو اکٹھی دی گئی ہوں اور ان پر بھی جو الگ الگ دی گئی ہوں اور بغیر کسی نص کے اس آیت کو خاص کسی ایک قسم کی طلاق پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔

اس صحیح استدلال کی تردید میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت کے عموم سے اکٹھی طلاقیں خارج ہیں کیونکہ شریعت اسلامی میں اس طرح مجموعی طلاقیں دینی ممنوع ہیں، اب اگر ان ممنوع طلاقوں کو آیت کے عموم میں داخل مان کر ان کے نفاذ کو تسلیم کرلیا جائے تو شریعت کی ممانعت کا کوئی معنی ہی نہ ہوگا اور یہ رائیگاں ہوجائے گی۔

بظاہر ان لوگوں کی یہ بات بڑی وقیع اور چست نظر آتی ہے، لیکن اصول وضوابط اور شرعی نظائر میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک بے بنیاد مفروضہ سے زیادہ کی نہیں ہے، اس لئے کہ اس جواب میں سبب اور اس کے اثر وحکم کو گڈمڈ کرکے یہ غلط نتیجہ برآمد کرلیا گیا ہے جبکہ اسباب اور ان پر مرتب ہونے والے احکام وآثار الگ الگ دو حقیقتیں ہیں اسباب کے استعمال کا مکلف بندہ ہے اور ان اسباب پر احکام کا مرتب کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، لہذا جب شریعت کی جانب سے یہ معلوم ہوجائے کہ فلاں کام کا فلاں حکم ہے تو بندۂ مکلف سے جب بھی وہ فعل وجود میں آئے گا لامحالہ اس کا اثر اور حکم بھی ظہور پذیر ہوگا، البتہ اگر وہ فعل غیر مشروع طور پر اللہ تعالیٰ کی اذن واجازت کے خلاف صادر ہوگا تو اس کا کرنے والا عنداللہ معصیت کار ہوگا اور اس عصیان پر اس سے مواخذہ ہوسکتا ہے، رہا معاملہ اس

[1] المحلی، ج ۱۰ ص ۲۰۷

فعل پر اس کے حکم واثر کے مرتب ہونے کا تو فعل کے جائز و ناجائز ہونے کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا،
اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے، اللہ عزشانہ نے فعل مباشرت یعنی عورت کے ساتھ ہمبستری کو وجوب
غسل کے لئے سبب بنایا ہے، اب اگر کوئی شخص جائز طور پر اپنی بیوی سے مباشرت کرے جب بھی
اس پر شریعت کی رو سے غسل فرض ہو جائے گا، اسی طرح اگر کوئی بدکار کسی اجنبی عورت کے ساتھ
یہی کام کرے تو اس فعل کے حرام وممنوع ہونے کے باوجود اس پر بھی شرعاً غسل فرض ہو جائے گا،
افعال شرعی میں اس کے نظائر بہت ہیں اس موقع پر ان نظائر کا جمع کرنا مقصود نہیں ہے
بلکہ مسئلہ کی وضاحت پیش نظر ہے اس لئے اسی ایک نظیر پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

بعینہ یہی صورت طلاق کی بھی ہے، اللہ رب العزت نے فعل طلاق کو قید نکاح سے
رہائی کا سبب اور ذریعہ قرار دیا ہے لہذا جب شخص مکلف سے اصل فعل کا صدور ہوگا تو لازمی طور پر اس کے
اثر وحکم کا بھی ثبوت ہوگا چاہے طلاق کا یہ عمل شریعت کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق وقوع
میں آیا ہو یا غیر مشروع طور پر، البتہ غیر مشروع اور ممنوع طریقہ اختیار کرنے کی بنا پر وہ شریعت
کی نگاہ میں قصوروار ہوگا اور اس کی بندگی واطاعت شعاری کا تقاضا ہوگا کہ ممکن حد تک
اس غلطی کو درست کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے
اپنی زوجہ کو بحالت حیض ایک طلاق دیدی تھی، جس کا ناجائز اور ممنوع ہونا شرعاً مسلّم ہے
اس کے باوجود اس طلاق کو نافذ مانا گیا، پھر چونکہ یہ ایک طلاق تھی، جس کے بعد رجعت کا حق باقی
رہتا ہے اس لئے اس طلاق سے رجعت کرکے اس غلطی کو دور کرنے کا موقع حاصل تھا، اسی لئے
ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں رجعت کی ہدایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ رجعت
کر لینے کے بعد اگر طلاق دینے ہی کی مرضی ہو تو طہر یعنی پاکی کے زمانہ میں جو مجامعت اور
ہمبستری سے خالی ہو طلاق دینا، حضرت عبداللہ بن عمر کے اس طلاق کا واقعہ صحیح بخاری
صحیح مسلم، نسائی، سنن الکبریٰ، دارقطنی وغیرہ کتب حدیث میں دیکھا جاسکتا ہے، حضرت ابن
عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ ممنوع اور ناجائز طور پر طلاق دینے سے
بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس صریح وصحیح نص کے مقابلہ میں اس قیاسی مفروضہ کی کیا حیثیت
ہے یہ ارباب علم ودانش پر مخفی نہیں، عیاں راچہ بیاں"

پھر یہ بات بھی کس قدر دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز ہے کہ جو لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو اس کے ممنوع وغیر مشروع ہونے کی بنا پر آیت کے عموم سے خارج اور غیر نافذ کہہ کر اسے ایک طلاق قرار دیتے ہیں وہی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تین طلاقوں کی ایک طلاق بھی ممنوع غیر مشروع اور طلاق بدعی ہے پھر بھی یہ ممنوع طلاق نافذ ہو جائے گی جب کہ ان کے مفروضہ کے مطابق وہ نافذ نہیں ہونا چاہئے، ملاحظہ ہو گروہ اہل حدیث (غیر مقلدین) کے رئیس اعظم جناب نواب صدیق حسن خاں قنوجی مرحوم کے فرزند ارجمند جناب نواب میر نور الحسن خاں المتوفی ۱۳۳۶ھ کی حسب ذیل عبارت۔

"وازا دلہ متقدمہ ظاہر است کہ سہ طلاق بیک لفظ یا در یک مجلس بدون تخلل رجعت یک طلاق باشد اگرچہ بدعی بود دایں صورت منجملہ صور طلاق بدعی واقع است باآنکہ فاعلش آثم باشد نہ سائر صور بدعی کہ در آنہا طلاق واقع نمی شود۔[1]

اوپر بیان کردہ دلیلوں سے ظاہر ہے کہ ایک لفظ کی تین طلاقیں یا ایک مجلس کی تین طلاقیں جب کہ درمیان میں رجعت نہ ہو ایک طلاق ہوگی اگرچہ یہ بھی بدعی ہوگی طلاق بدعی کی یہ قسم دیگر بدعی طلاقوں کے برخلاف نافذ ہوگی اور اس کا مرتکب گنہ گار بھی ہوگا اور طلاق بدعی کی بقیہ ساری قسمیں واقع نہیں ہوں گی۔

سوال یہ ہے کہ ممنوع اور غیر مشروع ہونے میں ایک مجلس کی تین طلاقیں، اور تین طلاقوں کی یہ ایک طلاق دونوں برابر اور یکساں ہیں یا دونوں کی ممنوعیت وغیر مشروعیت میں تفاوت ہے اگر دونوں میں تفاوت اور کمی بیشی ہے تو اس تفاوت پر شرعی نص درکار ہے بالخصوص جو لوگ دوسروں سے ہر بات پر کتاب وسنت کی نص کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں، ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ پر قرآن وحدیث سے کوئی واضح دلیل پیش کریں اور اگر دونوں کی ممنوعیت یکساں ہے اور یہی بات جناب میر نور الحسن خاں مرحوم کی عبارت سے ظاہر ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ مفروضہ خود ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلّم اور قابل عمل نہیں ہے بلکہ مغالطہ اندازی کے لئے ایک ایسی بات چلتا کر دی گئی ہے

---

[1] عرف الجادی من جنان ہدی الہادی ص ۱۰۱: المطبع الصدیقی بھوپال ۱۳۰۱ھ۔

جو واقعیت سے یکسر بے بہرہ اور محروم رہے۔

(۳) "تلك حدود الله ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لاتدری لعل الله یحدث بعد ذالك امرا" الآیة۔

یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں جو کوئی اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اسکو کیا خبر کہ شاید اللہ پیدا کردے اس طلاق کے بعد کوئی نئی صورت۔

اس آیت پاک کا ظاہر یہی بتارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین طلاقوں کا جو حق مرد کو دیا ہے اگر وہ اس کو بیک دفعہ استعمال کرلے تو تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی، البتہ ایسا کرنا خود اس کی اپنی مصلحت کے خلاف ہوگا، کیونکہ اگر تین طلاقوں کو ایک شمار کرکے حق رجعت دیدیا جائے تو پھر اس کہنے کا کیا معنی ہوگا کہ "لاتدری لعل الله یحدث بعد ذلك امرا"۔ اسے کیا معلوم کہ شاید اللہ تم اس کے بعد کوئی نئی صورت پیدا فرمادے، اس لئے کہ تین کو ایک شمار کرنے کی صورت میں تو رجعت کا حق اور موافقت کی صورت باقی ہی ہے۔

چنانچہ شارح صحیح مسلم امام نووی لکھتے ہیں۔

" احتج الجمهور بقوله تعالیٰ۔ ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه الخ الآية قالوا معناه ان المطلق قد يحدث له ندم فلا يمكنه تداركه لوقوع البينونة فلو كانت الثلاث لا تقع ولم يقع طلاقه هذا الارجعيا فلا يندم"[1]

جمہور نے تین طلاقوں کے تین واقع ہونے پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد "ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه الخ" سے استدلال کیا ہے، یہ کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ طلاق دینے والے کو لبسا اوقات اپنی حرکت پر ندامت ہوتی ہے تو بیک دفعہ تینوں طلاقیں دیدینے کی صورت میں زوجین کے درمیان جدائی واقع ہوجانے سے اس ندامت کا تدارک اور ازالہ نہ ہوسکے گا، اگر بیک دفعہ کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوئیں تو ندامت کس بات پر ہوئی۔

اسی بات کو امام جصاص رازی اپنے انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں

ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه، يدل على انه اذا طلق لغير السنة

---

[1] صحیح مسلم مع الشرح، ج ۱، ص ۴۷۸۔

وقع طلاقه وكان ظالما لنفسه بتعدية حدود الله لانه ذكر عقيب طلاق العدة فابان ان من طلق لغير العدة فطلاقه واقع لانه لولم يقع طلاقه لم يكن ظالما لنفسه ويدل على انه اراد وقوع طلاقه مع ظلم نفسه قوله تعالىٰ عقيبه "لاتدری لعل الله يحدث بعد ذالك امرا" يعنى يحدث له ندم فلا ينفعه لانه قد طلق ثلاثا"[1]

آیت پاک ومن یتعد حدود اللہ اھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب مرد طلاق بدعی دیگا تو وہ واقع ہوجائے گی اور وہ اللہ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کرنے کی بناء پر اپنی ذات پر ظلم کرنیوالا ہوگا یہ دلالت اس طور پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ طلاق دو انھیں ان کی عدت پرؔ کے بعد اس آیت کو ذکر فرمایا ہے تو اس سے ظاہر ہوا کہ جو غیر عدت یعنی طلاق بدعی دیگا اس کی طلاق واقع ہوجائیگی ورنہ اپنی ذات پر ظلم کرنیوالا کیوں ہوگا اور اس بات پر دلالت کہ من یتعد حدود اللہ کی مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے کے باوجود اس کی طلاق کا واقع ہوجانا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کر رہا ہے جو اسکے بعد آرہا ہے یعنی لاتدری لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا، یعنی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکے دل میں طلاق پر ندامت پیدا کردے اور یہ ندامت اس کے واسطے مفید نہ ہوگی کیونکہ وہ تین طلاقیں دے چکا ہے۔

علامہ علاء الدین ماردینی نے اس آیت کی یہی تفسیر قاضی اسمٰعیل کی کتاب احکام القرآن کے حوالے سے امام شعبی، ضحاک، عطاء، قتادہ اور متعدد صحابہ سے نقل کی ہے[2] نیز امام قرطبی، علامہ جاراللہ زمخشری، اور امام فخرالدین رازیؒ نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں یہی لکھا ہے کہ اس آیت سے ایک مجلس کی تین طلاقوں کے وقوع کا ثبوت فراہم ہوتا ہے[3]

ان تینوں آیاتِ قرآنیہ سے جن پر ائمہ تفسیر کی تشریحات کی روشنی میں گذشتہ صفحات میں بحث کی گئی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک لفظ سے دی گئی تین طلاقیں تینوں واقع ہوجائیں گی اس کے برعکس کسی آیت سے اشارۃً بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ بیک مجلس یا بیک کلمہ دی ہوئی تین طلاقیں ایک شمار ہوں گی۔

اب انشاء اللہ آئندہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دلائل پیش کئے جائیں گے۔

(جاری)

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۴۵۴ مطبوعہ مصر۔ [2] الجوہر النقی مع سنن الکبریٰ للبیہقی ج ۷، ص ۳۲۸۔

[3] دیکھئے الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۱۸ ص ۱۵۶، ۱۵۷، والکشاف للزمخشری ج ۴ ص ۱۰۹، اور مفاتیح الغیب المشتہر بالتفسیر الکبیر [illegible] ۱۵۹ -



اخباروں میں آج کل اس مسئلہ کی بہت زیادہ تشہیر کی جارہی ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو ایک طہر میں، یا ایک مجلس میں یا ایک ساتھ تین طلاقیں دیں تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ اور اس کو اس انداز سے پیش کیا جارہا ہے گویا یہی قرآن وحدیث کا حتمی فیصلہ ہے، اور یہی اکثر صحابہ کرام اور جمہور علماء کا مسلک ہے، مگر حقیقت میں یہ صرف غیر مقلدین حضرات کی رائے ہے آیات قرآنی، احادیث مبارکہ، صحابہ کرام کے اجماع اور جمہور علماء کے مسلک سے اس کی ہرگز تائید نہیں ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف تمام صحابہ کرام، تابعین عظام، اور ائمہ اربعہ، امام ابو حنیفہ، امام شافعی امام مالک اور امام احمد بن حنبل نیز جمہور فقہاء اور علماء سلف وخلف کا مسلک یہ ہے کہ:

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیں، مثلاً یہ کہا کہ میں نے تجھے تین طلاق دیں تو بالاتفاق تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اور وہ عورت تا نکاح ثانی اسکے لئے حرام ہوجائے گی چاہے عورت کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ـــــ اسی طرح اگر کسی نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں الگ الگ تین طلاقیں دیں مثلاً اس طرح کہا کہ تجھے طلاق دی، تجھے طلاق دی، تجھے طلاق دی۔ اور اس عورت سے خلوت ہوچکی ہے تب بھی بالاتفاق تین طلاقیں واقع ہوں گی اور وہ عورت تا نکاح ثانی اس کے لئے حرام ہوجائے گی، اور عورت سے اگر خلوت نہیں ہوئی ہے تو ایک طلاق سے عورت بائنہ ہوجائے گی یعنی نکاح سے نکل جائیگی

دوسری اور تیسری طلاق لغو ہوگی (اس لئے کہ یہ دونوں طلاقیں نکاح ختم ہونے کے بعد دی گئی ہیں) اور اس پر عدت بھی واجب نہیں ہوگی، وہ فوراً دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، اور پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ نیز کسی نے اپنی بیوی کو ایک ہی طہر میں تین طلاقیں الگ الگ دیں۔ اس طرح کہ ایک طلاق حیض سے پاک ہونے کے بعد دی، پھر ایک دودن کے وقفہ سے دوسری طلاق دی، پھر ایک دودن کے وقفہ سے تیسری طلاق دی — اور بیوی سے خلوت ہوچکی ہے تو بالاتفاق تینوں طلاقیں واقع ہوں گی، اور وہ عورت تانکاحِ ثانی اس کے لئے حرام ہو جائے گی۔ اور بیوی سے اگر خلوت نہیں ہوئی ہے تو پہلی طلاق دیتے ہی نکاح ختم ہو جائے گا، دوسری اور تیسری طلاق لغو ہوگی، اور اس عورت پر عدت بھی واجب نہیں ہوگی، وہ فوراً دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، نیز پہلے شوہر سے جس نے اس کو طلاق دی ہے اس سے بھی دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جہاں ہم نے یہ کہا کہ "وہ عورت تانکاحِ ثانی شوہر اول کے لئے حرام ہو جائے گی"، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مُطلّقہ عورت شوہر اول کے لئے بدستور حرام رہے گی یہاں تک کہ وہ عدت گذار کر (جن صورتوں میں عدت واجب ہے) دوسرے شخص سے شرعی طریقہ پر نکاح کرے، پھر دوسرا شوہر اس سے ہم بستری کرے، پھر دوسرا شوہر طلاق دے دے یا مرجائے، اور اس کی عدت پوری ہو جائے تب شوہر اول سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو کرسکتی ہے، اس سے پہلے شوہر اول سے نکاح کرنا، یا نکاح کے بغیر شوہر اول کے ساتھ رہنا ہرگز ہرگز جائز نہ ہوگا۔

اس کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ طلاق دینے کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایسے طہر میں جس میں اس سے ہم بستری نہیں کی ہے صرف ایک طلاق دے، پھر اس کو چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کی عدت پوری ہو جائے — اور اس طرح طلاق دینا بھی سنت ہے کہ شوہر بیوی کو مذکورہ طہر میں ایک طلاق دے، پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق دے، پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے، مگر اس طرح طلاق صرف اس بیوی کو دیجاسکتی

ہے جس سے خلوت ہو چکی ہے ـــــ اور ایک طہر میں یا ایک مجلس میں، یا ایک ساتھ تین طلاقیں دینا خلافِ سنت اور بدعت ہے، اس میں ہمارا، غیر مقلدین اور روافض سب کا اتفاق ہے، نہ یہ مسئلہ زیر بحث ہے اس لئے اس کے دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، لیکن اخباروں میں شائع شدہ فتوٰی میں زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے۔

زیر بحث مسئلہ جس میں ہمارا اور غیر مقلدین و روافض کا اختلاف ہے یہ ہے کہ جس شخص نے سنت طریقہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ جس شخص نے سنت طریقہ کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں ان کو تین ہی شمار کیا جائے گا، اس کے برخلاف غیر مقلدین کی رائے یہ ہے کہ ان کو مسنون طریقہ کی طرف پھیرتے ہوئے ایک طلاق رجعی شمار کی جائے گی، جیسا کہ شائع شدہ فتوے سے واضح ہوتا ہے، اور روافض کہتے ہیں کہ اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، بعض غیر مقلدین کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی گئی ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے مؤطا امام مالک کی شرح اوجز المسالک صـ۳۳ جلد چہارم۔

مسئلہ کی تفصیل اور مسلک کی وضاحت کے بعد نہایت اختصار کے ساتھ دلائل پیش کئے جارہے ہیں، غور سے پڑھئے! اور انصاف کیجئے کہ کس کا مسلک قرآن و حدیث اور اجماعِ صحابہ کے مطابق ہے؟

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (طلاق رجعی دو بار تک ہے) اس آیت میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں، اولاً یہ بیان کیا گیا ہے کہ طلاق رجعی (جس کے بعد شوہر رجعت کر سکتا ہے) کل دو ہیں، اور ثانیاً یہ ہدایت دی گئی ہے کہ یہ دونوں طلاقیں یکے بعد دیگرے دینی چاہئے، یکبارگی نہیں دینی چاہئے، اسی بات کو واضح کرنے کے لئے اَلطَّلَاقُ اِثْنَانِ (طلاق رجعی دو ہیں) کے بجائے اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (طلاق رجعی دو بار تک ہے) فرمایا ہے اگر الطلاق اثنان کہا جاتا تو صرف پہلی بات معلوم ہوتی، دوسری بات معلوم نہ ہوتی، یہی قرآن پاک کا اعجاز ہے کہ ایک جملہ میں کتنی خوبی کے ساتھ دو باتیں بیان کر دیں، اس کو کوئی ظاہر پرست نہ سمجھے تو ہم کیا کریں؟

ان دونوں باتوں کے پیشِ نظر آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ طلاق رجعی (جس کے بعد شوہر رجعت کر سکتا ہے) کل دو ہیں۔ چاہے یکے بعد دیگرے دے یا ایک ساتھ دے مگر یہ یاد رہے کہ یکے بعد دیگرے دینا سنت ہے، اور ایک ساتھ دینا خلاف سنت اور بدعت ہے۔ یہ ہے آیت کا صحیح مطلب جس پر جمہور کے مسلک کا مدار ہے، اور قرآن پاک کی دیگر آیات اور احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی ہے، مگر غیر مقلدین اس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ طلاق یکبارگی نہیں دے سکتے، یکے بعد دیگرے دینا ضروری ہے ـــ یہ مطلب کہاں تک صحیح ہے؟ اس پر ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے، صرف غیر مقلدین کے امام علامہ ابن حزم ظاہریؒ کے تبصرہ کو نقل کرنا کافی ہے، آپ فرماتے ہیں: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کا یہ مطلب بیان کرنا بالکل غلط ہے کہ طلاق یکبارگی نہیں دے سکتے، یکے بعد دیگرے دینا ضروری ہے وَاَمّا قولہم معنی قولہ تعالیٰ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ان معناہ مَرَّۃً بعد مَرَّۃٍ فخطأٌ، بل ھذہ الاٰیۃ کقولہ تعالیٰ نُؤْتِہَا اَجْرَھَا مَرَّتَیْنِ ای مضاعفا معا (محلّٰی ابن حزم ص ۱۶۸/۱۰ج)

علاوہ ازیں اس مطلب کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی غیر مقلدین کا مسلک ثابت نہیں ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر کسی نے ایک طہر میں یا ایک مجلس میں الگ الگ تین طلاقیں دیں تو اس مطلب کے پیشِ نظر تین طلاقیں واقع ہونی چاہئیں، کیونکہ تینوں طلاقیں یکے بعد دیگرے دی گئی ہیں، لیکن غیر مقلدین کہتے ہیں کہ اس صورت میں بھی تین طلاقیں واقع نہیں ہونگی، بلکہ ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کا استدلال فقط مغالطہ ہے، جسے وہ فریقِ مقابل کے خلاف بطور حربہ استعمال کر رہے ہیں۔

نیز سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: یَآاَیُّہَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِہِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ الآیۃ ۔۔۔۔۔ وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللہِ۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ۔ لَاتَدْرِیْ لَعَلَّ اللہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا (آیت)

اس آیت میں پہلے طلاق دینے کا مسنون طریقہ بیان کیا گیا ہے، اور اخیر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کے مقرر کردہ احکام ہیں، جو اللہ کے مقرر کردہ احکام سے تجاوز کرے گا وہ اپنا ہی

نقصان کرے گا، اس لئے کہ اسے کیا خبر؟ شاید اللہ تعالیٰ طلاق کے بعد صلح کی کوئی صورت پیدا فرمادیں۔ تو مسنون طریقہ پر طلاق دینے کی صورت میں تدارک ممکن ہوگا۔

اس آیت کے انداز بیان سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص مسنون طریقہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تین طلاقیں دے گا تو تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اگر تینوں طلاقیں واقع نہ ہوں بلکہ ایک طلاق رجعی واقع ہو تو بتائیے طلاق دینے والے کا کیا نقصان ہوا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسنون طریقہ کی مخالفت کرنے والا اپنا ہی نقصان کررہا ہے۔

وفی فحوی ہذہ الآیۃ دلالۃ علی وقوع الطلاق لغیر العدۃ اذ لو لم یقع لم یکن ظالما لنفسہ بایقاعہ لغیر العدۃ .... ولا خلاف فی ان من لم یطلق للعدۃ بأن طلق ثلاثاً مثلاً فقد ظلم نفسہ، فعلی القول بأنہ اذا طلق ثلاثا فلا یقع من طلاقہ الا واحدۃ فما ھی عقوبۃ ھذا الظالم نفسہ المتعدی لحدود اللہ حیث طلق لغیر العدۃ (حکم الطلاق الثلاث بلفظ واحد ص۱۴۲ و ص۱۴۳، اس کتاب کا تعارف مقالہ کے اخیر میں آرہا ہے)۔

اسی طرح اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا۔ جو اللہ سے ڈرے گا (یعنی احکام خداوندی پر عمل کرتے ہوئے مسنون طریقہ پر طلاق دے گا) اس کے لئے اللہ تعالیٰ چھٹکارے (یعنی رجعت) کی کوئی صورت پیدا فرمادیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص احکام خداوندی کی پابندی کرتے ہوئے مسنون طریقہ پر طلاق دے گا وہ رجعت کرسکتا ہے، اور جو شخص خلافِ سنت طریقہ پر طلاق دے گا وہ رجعت نہیں کرسکتا، اس آیت کا یہی مطلب ابن عباسؓ نے بیان فرمایا ہے:

چنانچہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں: میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو تین طلاق دے آیا ہے، ابن عباسؓ چپ رہے، یہانتک کہ میں نے گمان کیا کہ آپؓ رجعت کا حکم دے دیں گے، پھر فرمایا: لوگ پہلے حماقت کر بیٹھتے ہیں پھر کہتے ہیں: ابن عباس! ابن عباس! بیشک خدا نے فرمایا ہے کہ جو خدا سے ڈرے اس کے لئے چھٹکارے کی صورت ہوتی ہے، اور تو خدا سے نہیں ڈرا اس لئے تیرے لئے چھٹکارے

کی کوئی سبیل نہیں ہے، تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری عورت تجھ سے جدا ہوگئی۔

(ابوداؤد شریف ص ۳۰۶ ج ۱)

یہ ہے قرآن پاک کا واضح ترین حکم مفسر قرآن ابن عباسؓ کے نزدیک جس پر جمہور کے مسلک کا مدار ہے ـــ مگر اخباروں میں شائع شدہ فتویٰ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد صاحب کی نظر صرف فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ پر ہے، جس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ طلاق مسنون طریقہ پر دینی چاہئے، چنانچہ مجتہد صاحب نے اگلی آیت کو دیکھے بغیر اور اپنے مذہب کو بالائے طاق رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ "معاملات ہوں یا عبادات انسان کے اسی عمل کا اعتبار شریعت میں ہوگا جو کتاب وسنت کے مطابق بروئے کار لایا جائے" ـــ غور کیجئے! اس سے غیر مقلدین کا مسلک ثابت ہوتا ہے؟ یا مجتہد صاحب نادانی میں اپنے مسلک کی بیخ کنی کر رہے ہیں؟ اس لئے کہ مجتہد صاحب نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس سے تو صراحۃً یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص خلاف سنت طریقہ پر طلاق دے گا شریعت میں اس کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا، تو پھر غیر مقلدین حضرات اس فعل کا اعتبار کرتے ہوئے ایک طلاق رجعی کے واقع ہونے کا فتویٰ کیوں دیتے ہیں؟ مجتہد صاحب کے اخذ کردہ نتیجہ سے ان کا مسلک ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ روافض کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ جو خلاف شرع عمل کا اعتبار نہ کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں کوئی طلاق واقع نہ ہوگی، ہاں مجتہد صاحب یہ فرماتے کہ انسان کا جو عمل کتاب وسنت کے خلاف ہو اس کو سنت کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے گی تو کچھ بات بنتی، مگر اس صورت میں شاید کوئی یہ کہتا کہ مجتہد صاحب کی یہ کوشش شریعت سے کھلواڑ کے مترادف ہے۔

نیز مجتہد صاحب اسبات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا شریعت سے کھلواڑ کے مترادف ہے، پھر بھی ایک طلاق رجعی کا فتویٰ دے کر مزید کھلواڑ کا موقع فراہم کر رہے ہیں، ذرا سوچ کر بتائیے اس مزید کھلواڑ کا وبال کس کے حصہ میں آئے گا؟

اس کے بعد چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ جو حضرات اہل حدیث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان پر حجت تمام ہوجائے۔

۱ - امام بخاریؒ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرد نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، پھر اس عورت نے (عدت گذار کر) دوسرے مرد سے نکاح کرلیا، دوسرے خاوند نے (صحبت کئے بغیر) طلاق دے دی، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ پہلے خاوند کے لئے یہ عورت حلال ہو ئی؟ آپؐ نے فرمایا نہیں جب تک دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح لطف اندوز نہ ہو (بخاری شریف ص ۷۹۱ ج ۲ باب مَنْ اجاز الثلاثَ) یہ حدیث تین طلاقوں کے بیک وقت نافذ ہونے میں ظاہر ہے۔ اسی لئے امام بخاری نے اس حدیث کو باب من اجاز الثلاث کے تحت ذکر کیا ہے۔

۲ - اسی طرح بخاری شریف، مسلم شریف، نسائی شریف میں حضرت عُوَیمر عجلانیؓ کے واقعہ میں ہے کہ جب حضرت عُوَیمرؓ اور ان کی بیوی لعان سے فارغ ہو گئے تو حضرت عُوَیمرؓ نے فرمایا: اگر اب بھی میں اس کو رکھوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی، پھر انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں (بخاری شریف ص ۷۹۱ ج ۲، نیز ص ۸۰۰ ج ۲ مسلم شریف ص ۴۸۹ ج ۱، نسائی شریف ص ۸۱ ج ۲)

حضرت عُوَیمرؓ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینا اور حضور اکرمؐ کا اس پر سکوت فرمانا تینوں طلاقوں کے بیک وقت واقع ہونے کی بیّن دلیل ہے، چنانچہ ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو ذکر کیا ہے، اور اس کے علاوہ ایک دوسری روایت ذکر کی ہے جو حضرت عویمرؓ کے واقعہ ہی سے متعلق ہے اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت عویمرؓ نے اپنی بیوی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نافذ فرمادیا (ابوداؤد ص ۳۱۲ ج ۱)

۳ - نیز بخاری شریف اور مسلم شریف میں ہے کہ حضرت نافع فرماتے ہیں: جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس شخص کے بارے میں فتویٰ دریافت کیا جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوں، تو فرماتے: کاش اس نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوتیں! (تو رجعت کر سکتا) اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس (رجعت) کا حکم دیا تھا، مگر جب اس نے تین طلاقیں دے دیں تو عورت حرام ہو گئی یہانتک کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے۔

۴۔ حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؓ نے اپنی اہلیہ کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دے دی، پھر ارادہ کیا کہ دو طہروں میں بقیہ دو طلاقیں دے دیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: ابن عمر! اس طرح اللہ نے تم کو حکم نہیں دیا ہے، تم نے سنت طریقہ کے خلاف کیا (کہ حالتِ حیض میں طلاق دے دی) سنت طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کیا جائے۔ اور ہر طہر میں ایک طلاق دی جائے، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے رجعت کا حکم دیا چنانچہ میں نے رجعت کر لی۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب وہ پاک ہو جائے تو تم کو اختیار ہے، چاہو تو طلاق دے دینا، یا روک لینا۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں پھر میں نے حضور اکرمؐ سے دریافت کیا: یارسول اللہ! اگر میں نے تین طلاقیں دی ہوتیں تو کیا میرے لئے رجعت کرنا جائز ہوتا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں اس صورت میں بیوی تم سے جدا ہو جاتی، اور تمہارا یہ فعل (ایک ساتھ تین طلاقیں دینا) گناہ ہوتا (سنن دارقطنی ج۴ ص۴۳۸)

۵۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان فرماتے ہیں کہ ان کے والد نے اپنی بیوی کو ایک ہزار[1] طلاقیں دے دیں۔ حضرت عبادہؓ نے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ دریافت کیا تو رسول اکرمؐ نے فرمایا: اس کی بیوی تین طلاقوں سے بائنہ ہو گئی، اور نو سو ستانوے[997] ظلم و زیادتی کے قبیل سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہیں تو اس ظلم کی سزا دیں، اور چاہیں تو معاف فرما دیں۔ (مصنّف عبدالرزاق ج۶ ص۳۹۳، سنن دارقطنی ج۲ ص۴۲۳، زاد المعاد ج۲ ص۲۳)

الغرض یہ چند حدیثیں جمہور کے مسلک کی تائید میں ہم نے پیش کر دیں۔ مزید کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ ان احادیث کا مطلب جان لینا ضروری ہے جن سے مجتہد صاحب نے مغالطہ دیا ہے، تاکہ حقیقت مزید واضح ہو جائے۔

مجتہد صاحب کو حدیثِ رُکانہؓ پر بڑا ناز ہے۔ چنانچہ شائع شدہ فتویٰ میں مجتہد صاحب نے اس حدیث کو قرآن پاک کی آیتوں سے پہلے ذکر کیا ہے۔ مگر خود حضرت رُکانہؓ سے روایت ہے کہ آپؓ نے اپنی بیوی کو لفظ اَلْبَتَّۃَ سے طلاق دی تھی (جس میں ایک سے تین طلاقوں کی گنجائش ہے، ایک طلاق کی نیت ہو تو ایک اور تین کی نیت ہو تو تین واقع ہوں گی) پھر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کو صورتِ حال سے آگاہ فرمایا۔ تو آپؐ نے حضرت رُکانہؓ سے دریافت فرمایا کہ

تم نے لفظ اَلْبَتَّۃَ سے کتنی طلاقوں کا ارادہ کیا تھا؟ حضرت رُکانہ نے کہا: ایک طلاق کا، آپ نے فرمایا: خدا کی قسم! تم نے ایک ہی طلاق کی نیت کی تھی؟ حضرت رُکانہ رضؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم! میں نے ایک ہی طلاق کی نیت کی تھی۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے کہ جو تم نے نیت کی ہے اسی کا اعتبار ہے۔ ان کی بیوی انہیں واپس کردی (ترمذی شریف صـ۱۴۰ـ ج ۱، ابوداؤد شریف صـ۳۰ـ ج ۱، ابن ماجہ شریف صـ۱۴۹ـ ج ۱)

غور کیجئے! صورتِ مذکورہ میں اگر ایک ہی طلاق واقع ہوتی تو پھر قسم دے کر ایک طلاق کی نیت متعین کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیتے ایک کی نیت ہو یا تین کی ایک ہی طلاق شمار ہوگی۔ سوال وجواب اور قسم لینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر تین کی نیت ہوتی تو تین واقع ہوجاتیں۔

نیز شائع شدہ فتویٰ میں حضرت محمود بن لبید رضؓ کی حدیث کو ذکر کیا ہے کہ حضور اکرمؐ کو خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں اکٹھی دے دیں۔ آپؐ غضبناک ہوکر کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھیل کیا جارہا ہے۔ حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟ حضور اکرمؐ کا یہ غصہ دیکھ کر ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اُسے قتل نہ کردوں؟ (نسائی صـ۳۶ـ ج ۲)

اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک ساتھ تین طلاق دینا خلافِ سنت ہے، مگر اس کا کون منکر ہے؟ اس کو تو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ الغرض اس حدیث سے مجتہد صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوتا ہے، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غضبناک ہوکر کھڑا ہوجانا تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ ایک ساتھ دی گئی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، اگر ایک طلاق رجعی واقع ہوتی تو ناراض ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ حضورِ اکرمؐ مجتہد صاحب کی طرح فرمادیتے: "وہ شخص مُطلّقہ رجعیہ کو فوراً اپنی زوجیت میں رکھنے کا مجاز ہے"۔

یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ مجتہد صاحب کے فتوی کا مدار درحقیقت مجتہد صاحب کے اخذ کردہ اِس نتیجہ پر ہے "معلوم ہوا کہ معاملات ہوں یا عبادات انسان کے اسی عمل کا اعتبار شریعت میں ہوگا جو کتاب وسنت کے مطابق بروئے کار لایا جائے"۔ ــــــ مجتہد صاحب کے

اس اخذ کردہ نتیجہ کی حقیقت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مجتہد صاحب کے مسلک کی تائید ہوتی ہے یا تردید؟ اس لئے اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ ایک حدیث پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، تاکہ اس اخذ کردہ نتیجہ کی شرعی حیثیت مزید واضح ہو جائے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اکرمؐ کو فرماتے ہوئے سنا: معاذ! جو شخص بدعت اور ناجائز طریقہ پر ایک یا دو یا تین طلاقیں دے گا ہم اس کو لازم کردینگے

قال معاذ بن جبل سمعتُ رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: یا معاذ! مَنْ طلّق للبدعة واحدةً او اثنتین او ثلاثًا الزمناه (سنن دار قطنی ۲۴۳-۲۴۴/۲)

غور کیجئے! رسول اکرمؐ کے فرمان اور مجتہد صاحب کے فارمولہ میں کس قدر تضاد ہے؟

مجتہد صاحب کے فتویٰ کا جائزہ لینے کے بعد ریاض العلوم کے ناظم اعلیٰ اور ماہنامہ "الاسلام" کے ایڈیٹر عبدالرشید صاحب بستوی کے تبصرہ کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، بستوی صاحب فرماتے ہیں کہ: "یہ کوئی نیا فتویٰ نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہی اس طرح کے فتویٰ کی نظیر موجود ہے، اور خلیفۂ اول کے عہد میں بھی مجلس واحد کی متعدد طلاقوں کو ایک ہی طلاق پر محمول کیا جاتا رہا ہے، ایک مجلس کی تین طلاقوں کو پہلی بار خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں نافذ کیا گیا"

(ماخوذ از قومی آواز نئی دہلی مورخہ ۳۰/۵/۱۹۹۳ء)

بستوی صاحب نے اپنے تبصرہ میں ابن عباسؓ کی اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو مسلم شریف میں ہے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنا حضرت عمرؓ کی ایجاد ہے۔ حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا جاتا رہا ہے، لہٰذا پہلے ابن عباسؓ کی حدیث پھر اس کا مطلب خوب غور سے سنیئے! تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔ مسلم شریف میں ہے ابوالصہبار نے ابن عباسؓ سے پوچھا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی میں اور عہدِ فاروقی کے ابتدا میں تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ہاں لیکن جب لوگوں نے ایسے کام میں جس میں تاخیر بہتر تھی جلد بازی شروع کی تو حضرت عمرؓ

نے تینوں کو نافذ کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرمؐ، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ میں لوگوں کا یہ معمول تھا کہ جب انتِ طالق (تجھے طلاق ہے) انت طالق، انت طالق کہہ کر طلاق دیتے تھے تو دوسرے اور تیسرے جملہ سے دوسری اور تیسری طلاق دینا مقصود نہیں ہوتا تھا، بلکہ پہلے جملہ کی تاکید مقصود ہوتی تھی، اس لئے ایک ہی طلاق شمار کی جاتی تھی، لیکن بعد میں عرف بدل گیا، لوگ تاکید کے بجائے استیناف (نئی طلاق دینے) کی نیت کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے تمام صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کر کے یہ بات طے فرما دی کہ اب چونکہ عرف بدل گیا ہے اس لئے ایک کے بجائے تین طلاقیں شمار کی جائیں گی۔ مسلم شریف کے شارح علامہ نوویؒ نے اس حدیث کا بھی مطلب بیان کیا ہے

اَنّ معناه انه کان فی الامر الاول اذا قال لها انتِ طالق انت طالق انت طالق ولم ینو تاکیداً ولا استینافاً یُحکَمُ بطلقةٍ لقلّة ارادتهم الاستیناف بذلك فحُمِلَ علی الغالب الذی هو ارادة التاکید۔ فلما کان فی زمن عمرؓ وکثر استعمالُ الناس بهذه الصیغة وغُلب منهم ارادة الاستیناف بها حُمِلَتْ عند الإطلاق علی الثلاث عملاً بالغالب السابق الی الفهم (نووی ص۴۷۸ ج۱)

الغرض ابن عباسؓ کے ارشاد کا صحیح مطلب یہی ہے۔ بستوی صاحب نے جو مطلب سمجھا ہے وہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ خود ابن عباسؓ تین طلاقوں کے نفاذ کا فتویٰ دیا کرتے تھے جیسا کہ ابوداؤد شریف کے حوالہ سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

یہاں یہ بات جان لینی چاہئے کہ یہ صرف حضرت عمرؓ کا فیصلہ نہیں ہے کہ آپ اس کو سنتِ عمری یا بدعتِ عمری کہہ کر رد کر دیں۔ بلکہ یہ تمام صحابۂ کرام کا قطعی اور یقینی اجماع ہے، جس کو تسلیم کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا قرآن و حدیث کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

چنانچہ امام طحاویؒ حضرت عمرؓ کے مذکورہ فیصلہ کے بارے میں فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں سب لوگوں سے خطاب فرمایا، جن میں وہ صحابہ کرام بھی تھے جو اس بات سے واقف تھے کہ مطلقہ ثلاثہ کا عہد نبوی میں کیا حکم تھا۔ پھر بھی ان میں سے کسی نے نہ انکار کیا، نہ

حضرت عمرؓ کے ارشاد کو رد کیا (طحاوی شریف ص ۳۲/۲)

نیز ابن رجبؒ نے فرمایا ہے کہ: صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف میں سے کسی سے صراحۃً یہ منقول نہیں ہے کہ خلوت کے بعد جس نے ایک ساتھ تین طلاقیں دیں ان کو ایک طلاق شمار کیا جائے گا۔ اعلم أنه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم فى الفتاوىٰ فى الحلال والحرام شيئ صريح فى ان الطلاق الثلاث بعد الدخول يُحسَبُ واحدة اذا سبق بلفظ واحد (حکم الطلاق الثلاث ص۱۳)

اسی طرح شیخ الاسلام ابن القیمؒ نے تہذیب السنن میں ابن العربی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آخر زمانہ میں کچھ لوگ پھسلے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینے سے تین واقع نہیں ہوتیں، بلکہ ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے، اور اس کو سلفِ اول یعنی صحابۂ کرام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس کی نسبت کی ہے، حالانکہ انہوں نے صحابۂ کرام کی طرف جس بات کی نسبت کی ہے وہ صریح جھوٹ ہے۔ نہ کسی کتاب میں اس کی کوئی اصل ہے، نہ کسی صحابی کی اس سلسلہ میں کوئی روایت ہے۔ وقال ابن العربى فى كتابه الناسخ والمنسوخ ونقله عنه ابن القيم فى تهذيب السنن: زلّ قوم فى اخر الزمان فقالوا: إنّ الطلاقَ الثلاثَ فى كلمة واحدة لا يلزم، وجعلوه واحدةً ونسبوه الى السلف الاول فحكوه عن على والزبير وعبد الرحمٰن بن عوف وابن مسعود وابن عباس...... وما نسبوه الى الصحابة كذب بحت لا اصل له فى كتابٍ ولا روايه له عن احد (بحوالہ حکم الطلاق الثلاث بلفظ واحد ص۱۲۵)

غیر مقلدین اکثر و بیشتر ابن تیمیہ اور ابن قیم کے موقف کو اور علماء حرمین اور حکومت سعودیہ کے عمل کو بطور حجت پیش کرتے ہیں اس لئے اخیر میں دو حوالے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ان پر حجت تام ہو جائے۔

۱۔ غیر مقلدین کے پیشوا شیخ محمد بن عبدالوہاب کے صاحبزادے شیخ عبداللہ الہدیۃ السنیۃ میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کے متعلق اپنے اور اپنے والد کے مسلک کی وضاحت کرتے

ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "ہمارے نزدیک شیخ الاسلام ابن القیم اور ان کے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اہل حق میں سے اہل سنت کے امام و پیشوا ہیں، اور ان دونوں بزرگوں کی کتابیں ہمیں نہایت عزیز ہیں، لیکن ہر مسئلہ میں ہم ان کے بھی مقلد اور پیرو نہیں ہیں، متعدد مسائل میں ان سے ہمارا اختلاف معلوم و معروف ہے، منجملہ ان کے ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے، اس میں ہم (ان دونوں بزرگوں کی تحقیق کے خلاف) ائمۂ اربعہ کے متفقہ مسلک کا اتباع کرتے ہیں" (بحوالہ دعایاتِ مکتوبہ ص۸۵ مصنفہ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ)

۲۔ ۱۳۹۱ھ سے حکومت سعودیہ نے اپنے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ علماء حرمین اور ملک کے دوسرے نامور ترین علماء کرام پر مشتمل ایک تحقیقاتی مجلس قائم کر رکھی ہے، جس کا فیصلہ تمام ملکی عدالتوں میں نافذ ہے۔ بلکہ خود بادشاہ بھی اس کا پابند ہے۔ اس مجلس میں لفظِ واحد سے تین طلاق دینے کا مسئلہ پیش ہوا، مجلس نے اس مسئلہ سے متعلق قرآن و حدیث کی نصوص کے علاوہ تفسیر و حدیث کی سینتالیس ۴۷ کتابیں کھنگالنے اور سیر حاصل بحث کے بعد واضح الفاظ میں یہ فیصلہ دیا ہے:

ایک لفظ سے دی گئی تین طلاقیں تین ہی واقع ہوں گی

قرارداد کی عبارت یہ ہے: وبعد دراسةِ المسألة وتداولِ الرأی واستعراضِ الاقوال التی قیلت فیہا ومناقشةِ ما علی کل قول من ایراد توصّلَ المجلس باکثریته الیٰ اختیار القول بِوُقُوْعِ الطَّلَاقِ الثَّلَاثِ بِلَفْظٍ واحدٍ ثَلاثًا۔

یہ پوری بحث اور مجلس کا فیصلہ "حکم الطلاق الثلاث بلفظ واحد" کے عنوان سے حکومت سعودیہ نے مجلة البحوث الاسلامیہ کی جلد اول کے تیسرے شمارے میں ۱۳۹۶ ہجری میں شائع کیا ہے، جو ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور احسن الفتاویٰ (جو مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے اور کراچی سے شائع ہوا ہے، اس) کی پانچویں جلد میں، یہ پورا رسالہ بعینہٖ عربی میں موجود ہے۔

نوٹ: عام قارئین اور اختصار کے پیشِ نظر اکثر جگہ عربی عبارتوں کو حذف کر کے صرف حوالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔



تین طلاق اسلام میں

اسلام میں طلاق ایک بامقصد عمل ہے، اس کے کچھ اصول وضوابط ایسے ہیں جو معاشرہ کو معتدل رکھنے میں معاون ہیں، مثلاً زوجین میں اختلاف کے وقت مصالحت کی ہر ممکن کوشش کرنا اور آخری حربہ کے بطور طلاق استعمال کرنا، حالت ناپاکی میں طلاق نہ دینا، اور بیک وقت ایک ہی طلاق دینا وغیرہ۔ اور کچھ احکام ایسے ہیں جن کا تعلق طلاق کی قانونی اور اصولی حیثیت سے ہے جیسے دو طلاق تک رجعت کا حق رہنا (سورہ بقرہ ۲۲۹) اور تین طلاق کے بعد رجوع کا اختیار ختم ہوجانا (سورہ بقرہ ۲۳۰)

اول الذکر اصول وضوابط کو سامنے رکھ کر فقہاء نے طلاق کی تین قسمیں کی ہیں (۱) طلاق احسن، ایسے زمانہ پاکی میں طلاق جو جماع سے خالی ہو (۲) طلاق حسن: تین طہر میں تین طلاقیں (وغیرہ) (۳) طلاق بدعت: ایک طہر میں تین طلاقیں، حالتِ حیض، جماع کے بعد طہر میں طلاق (درمختار ۳/ ۲۳۱-۲۳۳)

لیکن واضح رہے کہ ان تقسیمات سے طلاق کی اصولی اور قانونی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس معاملہ میں تین طلاق کا مسئلہ، ظہار "یعنی اپنی بیوی کو ماں کی پیٹھ سے مشابہت دینے کے مسئلہ سے بہت زیادہ مشابہ ہے جس کا ذکر سورہ مجادلہ کی ابتدائی آیتوں میں کیا گیا ہے، مشابہت کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح تین طلاقیں بیک وقت دینا شرعاً مبغوض ہے، اسی طرح اپنی بیوی سے ظہار کرنا بھی قرآن کی نظر میں سراسر جھوٹ اور بُرا قول ہے۔ (مجادلہ-۲) لیکن اس برائی کے باوجود ظہار کر لینے سے حکم ظہار (غلام آزاد کرنا)، ۶۰ دن کے متواتر روزے رکھنا، ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلانا) مرتب ہوتا ہے، بعینہ یہی صورت مسئلہ

طلاق میں ہے کہ ممانعت کے باوجود طلاق دینے پر اس کا حکم جاری ہوتا ہے، امام طحاوی رح نے شرح معانی الآثار میں اس کو واضح کیا ہے۔ (شرح معانی الآثار ۲/۳۲)

(۲)۔ طلاق کی قانونی حیثیت کے بارے میں بھرپور رہنمائی ہمیں ایک روایت سے ملتی ہے جسے امام ابوداؤد سجستانی (المتوفی ۲۷۵ھ) نے حضرت عبداللہ ابن عباس رض کے حوالہ سے اپنی "سنن" میں بایں الفاظ ذکر کیا ہے۔

"عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رض نے آیت والمطلقٰت یتربصن الخ کے تحت ارشاد فرمایا: کہ ابتدا میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اگرچہ تین طلاق دیدیتا پھر بھی اسے رجعت کا حق رہتا تھا تاآنکہ یہ حکم منسوخ ہوگیا، پھر آپؐ نے الطلاق مرتان الخ آیت تلاوت کی (ابوداؤد شریف ۱/۲۹۷)

معلوم ہوا کہ اب اسلام کا یہ قانون بنا دیا گیا کہ وہ طلاق جس کے بعد رجعت کا حق ہے وہ صرف دو ہے، اس کے بعد اگر ایک بھی طلاق دی جائے گی (چاہے یہ سب ایک ساتھ ہوں یا الگ الگ اسلئے کہ آیات قرآنیہ میں کہیں اس تفریق کی دلیل نہیں ہے (قرطبی بحوالہ فتح الباری ۹/۳۶۵) تو وہ عورت اپنے شوہر کے لئے حلال نہ رہے گی۔ حضرت ابن عباسؓ کے مذکورہ قول کے مطابق جس پس منظر میں اس قانون کی تشکیل ہوئی ہے وہ صاف طور پر اس کا متقاضی ہے کہ تین کے وقوع کے بعد شوہر کو رجعت کا حق حاصل نہ ہو، کیونکہ تین کے بعد بھی اگر ہم رجعت کا حق باقی رکھیں گے تو نسخ سے پہلے اور بعد کے حکم میں کوئی زیادہ فرق نہ رہے گا، جو صراحۃ آیت قرآنی کے منشاء کے خلاف ہے

(۳)، یہی وجہ ہے کہ زمانہ نبوی میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آپ نے علی الاطلاق تین طلاقوں کو نافذ فرمایا ہے، امیرالمومنین فی الحدیث امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الجامع الصحیح" میں ایک باب قائم فرمایا ہے "تین طلاق کو نافذ کرنے کا بیان"، اور اس کے تحت میں مشہور صحابی حضرت عویمر عجلانی رض کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ جب اپنی بیوی کے ساتھ لعان کرکے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا۔

"میں اگر اب بھی اس عورت کو ساتھ رکھوں تو جھوٹا کہلاؤں گا، پھر انھوں نے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم فرمانے سے قبل ہی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔ (بخاری شریف ۲/۸۰۱)

ابوداؤد شریف میں اس روایت کی مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

"پس انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دیدیں جنھیں آپ نے نافذ فرمایا اور جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا جائے وہ سنت ہوتا ہے (سنن ابوداؤد ۱/۳۰۶)

اس روایت سے پتہ چلا کہ (الف) حضرات صحابہؓ زمانہ نبوی میں تین طلاقیں دیتے تھے، "ب" اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کو نافذ فرمایا، جبکہ واقعہ یک وقت تین طلاق دینے کا تھا۔

(۴)۔ امام بخاریؒ نے اسی باب میں ایک دوسرا واقعہ بھی لکھا ہے۔

"ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، عورت نے دوسرا نکاح کرلیا، دوسرے شوہر نے (جماع سے قبل) طلاق دیدی، اس نے پوچھا کہ وہ عورت کیا پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی؟ آپ نے جواب دیا: نہیں (بخاری شریف ۲/۷۹۱)

یہ حدیث بھی تین طلاق کو تین ماننے پر صریح ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کے بعد بلا حلالہ رجعت سے منع فرمایا ہے۔

(۵)۔ اسکے علاوہ بھی کئی واقعات ذخیرہ حدیث میں ملتے ہیں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقوں کو بائنہ قرار دیا ہے، مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی روایت ہے کہ ان کے والد نے اپنی اہلیہ کو ہزار طلاقیں دیدیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے تین کو نافذ فرمایا اور بقیہ ۹ سو ستانوے کو لغو اور ظلم قرار دیا (مصنف عبدالرزاق ۶/۳۹۳)

امام دارقطنی نے حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق رہتا؟ اس پر آپ نے جواب دیا: نہیں، اس وقت تمھاری بیوی بائنہ ہوجاتی اور یہ گناہ کا کام ہوتا (دارقطنی ۴/۴۳۸)

اسی طرح امام حسنؓ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اپنی ایک بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں

بعد میں ایسے احوال پیش آئے کہ عورت نے رجعت کی خواہش کی تو حضرت حسن رض نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ اگر مجھے اپنے نانا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث نہ پہنچی ہوتی کہ تین طلاق کے بعد بیوی حلال نہیں رہتی تو میں اس سے رجوع کر لیتا (ملخصاً) (دارقطنی ۴/۳۰، ۴۴)

حاصل یہ ہے کہ تین طلاق کے واقعات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آئے اور آپ نے انھیں تین ہی قرار دیا، اور آپ کے بعد اکابر صحابہ و تابعین یہی فتویٰ دیتے رہے ابن عباس رض جن کی رائے پہلے اس بارے میں مختلف تھی بعد میں شدت کے ساتھ تین طلاق کو تین ماننے کا فتویٰ دیتے تھے۔ (سنن ابوداؤد ۱/۲۹۶)

کچھ مغالطے

(۶) یہاں ایک دوسرا پہلو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، جس کے بغیر بحث بالکل ناتمام رہے گی، وہ یہ کہ اس مسئلہ میں باقاعدہ بلکہ منصوبہ بند طریقہ پر ایسے مغالطوں کو فروغ دیا گیا ہے جنھیں دیکھ کر خالی الذہن شخص مبتلائے فریب ہو جاتا ہے۔ ان مغالطوں کی بنیادی وجہ احادیث کے متعدد طرق پر نظر نہ رکھنا ہے جو ہر زمانہ میں جدت پسندوں کی ضلالت کی بنیاد رہی ہے (شرح معانی الآثار ۱/۶)

اس سلسلہ کا سب سے اہم مغالطہ حضرت رکانہ ابن عبد یزید رض کی روایت ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدیں اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صرف ایک طلاق رجعی قرار دیا، یہ روایت ایک رہنما حدیث کے عنوان سے مولانا وحید الدین خاں (جو اس وقت بین التجزیہ مغالطہ دینے والوں میں امتیازی مقام پر فائز ہیں) نے اپنے مضمون "طلاق اسلام میں" (قومی آواز ۸ راگست ۱۹۹۳ء) اس انداز سے تحریر کی ہے گویا پورے دور نبوی میں تین طلاق کو ایک ہی قرار دیا جاتا رہا ہو اور خاں صاحب نے خاص مقصد کے تحت روایت کا حوالہ ابوداؤد اور دیگر محدثین "کا دیا ہے اور ترجمہ نقل کیا ہے حافظ ابن حجر کی کتاب "فتح الباری" سے۔ کیونکہ وہ اگر امام ابوداؤد کی راجح روایت ذکر کرتے تو مغالطہ کی کوشش کبھی کامیاب نہ ہوتی، امام ابوداؤد نے اس روایت کے متعدد طرق اور اسناد کو سامنے رکھ کر جس طریق کی تصحیح و ترجیح دی وہ یہ ہے۔

رکانہ کے پڑپوتے عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہ رض نے اپنی زوجہ کو۔ البتہ۔ کے لفظ سے طلاق دی تھی (جس میں ایک اور تین دونوں مراد لینے کا احتمال تھا) پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے پوچھا تمھاری مراد اس سے کیا تھی؟ رکانہ نے جواب دیا "ایک" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکانہ کو قسم دلائی اور جب انھوں نے قسم کھالی تو آپ نے فرمایا۔ وہی مراد ہے جو تم نے ارادہ کیا"

اس روایت پر امام ابوداؤد نے درج ذیل محدثانہ تبصرہ کیا ہے۔

یہ روایت ابن جریج کی اس روایت کے مقابلہ میں اصح ہے جس میں ابورکانہ کے تین طلاق دینے کا ذکر ہے، کیونکہ اس روایت کے نقل کرنے والے رکانہ کے اہل خانہ ہیں، جو حقیقتِ حال کو زیادہ جاننے والے ہیں (ابوداؤد ۱/۳۰۰، ۳۰۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اصل واقعہ "البتہ" سے طلاق دینے کا ہے، بعض راویوں نے غلطی سے تین طلاق نقل کردی ہے، اسی بناپر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے:

اس نکتہ سے ابن عباس رض کی حدیث (رکانہ) سے استدلال کا موقع ختم ہوجاتا ہے۔

(فتح الباری ۹/۳۶۳)

اور صحیح اور راجح روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رکانہ کو قسم دلانا اس پر شاہد ہے کہ اگر رکانہ کی مراد تین کی ہوتی تو تین ہی واقع کی جاتیں، اور اس اعتبار سے یہ حدیث تین کو ایک ماننے کی نہیں بلکہ بیک وقت تین طلاق کے وقوع کی کھلی دلیل ہے، مولانا وحیدالدین خانصاحب کا قصداً اس نکتہ سے صرف نظر کرنا حق وانصاف سے بعید اور مغالطہ دینے کی خوبصورت کوشش ہے اس بارے میں وہ اپنے تقلید سے آزاد دوستوں کی پیروی کر رہے ہیں۔

(۷)۔ مسئلہ زیر بحث میں دوسرا بڑا مغالطہ فیصلہ فاروقی کے بارے میں دیا جاتا ہے، کہ خلیفۂ دوم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا تین طلاقوں کو تین قرار دینے کا فیصلہ محض وقتی استثناء اور انتظامی حکم (ایگزیکٹیو آرڈر) تھا، اسی حیثیت سے حضرات صحابہ رض نے اس سے اتفاق کیا تھا، اس کی حیثیت شرعی حکم کی نہ تھی کہ اسے بہرحالت مانا جائے (ملاحظہ ہو قومی آواز ۲۰ راگست مضمون مولانا وحیدالدین خان)

اس اہم مسئلہ میں (جو اپنے اندر حلت وحرمت کے معنی رکھتا ہے) حضرت عمرؓ کے فیصلہ اور صحابہؓ کے اجماع کو محض انتظامی اور سیاسی تدبیر وتعزیر قرار دینا بہت بڑی جسارت اور نئے زمانہ کے جدت پسندوں کی دماغی ایجاد ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔ کیونکہ۔

الف :- علماء سلف میں سے کسی نے اس فیصلہ کو وقتی استثناء کے درجہ میں نہیں رکھا۔

ب :- حلت وحرمت کے مسئلہ میں صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو اپنی طرف سے رائے قائم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے خواہ وہ وقتی استثناء ہو یا انتظامی حکم۔

ج : جو واقعات خود دور نبوی میں پیش آچکے ہوں اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کے نفاذ کا حکم دیا ہو انھی جیسے واقعات میں حضرت عمرؓ کا تین قرار دینے کا فیصلہ حکم شرعی سے کیسے خارج ہو سکتا ہے۔

(۸) :- فیصلۂ فاروقی کے انتظامی ہونے پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ تین طلاق دینے والے کو کوڑے سے سزا دیتے تھے، خاں صاحب موصوف نے بھی نہایت شاطرانہ انداز سے یہ دلیل پیش کی ہے (قومی آواز، ۸ راگست ۹۳ء) مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ استدلال ناواقفیت پر مبنی ہے۔

احقر کے علم میں کم از کم دو اور واقعات حضرت فاروق اعظمؓ کے دور حکومت میں اس طرح کے پیش آتے ہیں کہ آپ نے تحقیق کر کے کوئی اعلان کیا ہے اور اس پر صحابہ کا اجماع ہو گیا ہے پھر آپ نے فرمان جاری کیا ہے کہ جو اس کے خلاف کرے گا وہ سزایاب ہوگا۔

الف :- ان میں ایک واقعہ متعہ کی حرمت کا ہے، امام مسلم نے حضرت جابرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ دور نبوی، دور صدیقی اور ابتدائی دور فاروقی میں متعہ کیا جاتا رہا، پھر ہمیں حضرت عمرؓ نے روک دیا، بس ہم رک گئے (مسلم بشرح النووی ۱/۴۵۱)

یہ بعینہ اسی طرح کے الفاظ ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے تین طلاق کو ایک ماننے کے متعلق نقل کئے جاتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کا متعہ کی حرمت کے متعلق فیصلہ سبھی اہل سنت (بشمول اہلحدیث) کے نزدیک مسلم ہے، کسی نے اسے وقتی استثناء یا انتظامی حکم قرار نہیں دیا، کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتے جو نصوص (قرآن وحدیث) کے خلاف ہو۔ واقعہ میں یہ متعہ کی منسوخی کے حکم کا اظہار تھا جو دور نبوی ہی میں طے ہو چکا تھا، مگر بعض صحابہؓ کو اس کی منسوخی

کا علم نہ تھا، حضرت عمرؓ نے سب کو باخبر کر دیا۔

ب :- اسی سے ملتا جلتا دوسرا مسئلہ بلا انزال جماع (التقاء ختانین) سے غسل واجب ہونے کا ہے، صحابہؓ اس بارے میں مختلف تھے، حضرت عمرؓ نے تحقیق حال کے بعد یہ حکم جاری کیا۔

"اگر آئندہ مجھے پتہ چلا کہ کسی نے جماع (بلا انزال) کے بعد غسل نہیں کیا تو میں اسے سخت ترین سزا دوں گا (شرح معانی الآثار ۱/۳۶)

حضرت عمرؓ کے اس حکم کو سب صحابہ نے حکم شرعی کے بطور قبول کر لیا، کسی نے اسے وقتی استثنار نہیں قرار دیا، اس لئے کہ یہ حکم فاروقی نہ تھا بلکہ حکم سابق (عدم وجوب غسل) کی منسوخی کا اظہار تھا۔

ج :- تقریباً یہی نوعیت تین طلاق کے مسئلہ میں پیش آئی۔ تین طلاق کے بعد رجعت کا حکم منسوخ ہو چکا تھا جیسا کہ سنن ابی داؤد میں مذکور حدیث ابن عباسؓ سے معلوم ہوتا ہے، بعض صحابہؓ کو اس کی منسوخی کا علم نہ تھا تا آنکہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے اس حکم کا باقاعدہ اعلان فرمایا، ان کا یہ اعلان اپنی طرف سے وقتی مصلحت یا استثنار کے بطور نہیں تھا بلکہ قرآن و حدیث سے ماخوذ تھا اور صحابہؓ نے اسی حیثیت سے اس سے اتفاق کیا تھا، وہ صحابہؓ جو حضرت عمرؓ کو "مہر" کی زیادتی پر پابندی کے ارادہ پر سختی سے ٹوکنے کی جرأت رکھتے تھے ان کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ انھیں نعوذ باللہ خصوصی انتظام کی آڑ میں حضرت عمرؓ کے ایک غیر شرعی فیصلہ کی موافقت کا ملزم گردانا جائے۔

خود مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (م ۱۳۷۵ھ) نے فیصلہ فاروقی کو سیاسی ماننے کی سختی سے تردید کی ہے (اخبار اہل حدیث ۵ ر نومبر ۱۹۲۹ء بحوالہ عمدۃ الاثاث ص ۹۷)

(۹) :- فاروقی فیصلہ کے حکم شرعی ہونے کی تائید ابوداؤد کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں صراحت ہے کہ حضرت عمرؓ کا فیصلہ غیر مدخولہ کے بارے میں تھا جو متعدد الفاظ سے طلاق کے وقت پہلے ہی لفظ سے بائنہ ہو جاتی ہے (ابوداؤد شریف ۳۰۹) ایسی صورت میں مدخولہ و غیر مدخولہ کے درمیان حکم کی تفریق بلاشبہ شرعی حکم کے اعتبار سے ہوگی، کیونکہ انتظامی حیثیت سے مدخولہ و غیر مدخولہ کے معاملات یکساں ہیں۔

(۱۰) :- مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت سے بھی اس فیصلہ کے خالص شرعی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ابوالصہبار نے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جو اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے تو حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ ۔ لوگ انھیں ایک کہتے تھے عہد نبوی، عہد صدیقی اور ابتدائی عہد فاروقی میں، حتی کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا؛ کہ اے لوگو تم نے طلاق پر بہت کثرت کردی اب آئندہ جو شخص جیسا لفظ بولے گا وہی سمجھا جائیگا، فمن قال شیئاً فہو علی ماتکلم بہ

(مصنف عبدالرزاق ۶/۳۹۳)

اس روایت نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کردیا، کہ واقعہ یہ تھا کہ پہلے لوگ طلاق کا لفظ کئی مرتبہ بول کر تاکیداً ایک ہی مراد لیتے تھے اور چونکہ صدق وصلاح کا زمانہ تھا اس لئے نیت تاکید کی بنا پر طلاق بھی ایک ہی شمار ہوتی تھی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں لوگ اس کا بکثرت استعمال کرنے لگے اور پوچھنے پر کہدیتے کہ ہماری مراد تو تاکید کی تھی، تو حضرت عمرؓ نے صاف اعلان کردیا کہ دلی مراد چونکہ معلوم نہیں، اور صدق وصلاح کا پہلا سا معیار باقی نہیں رہا لہذا اب آئندہ محض ظاہری الفاظ کا اعتبار ہوگا نیت کا اعتبار نہ ہوگا، یہ حکم قضار کے اصول شرعیہ کے مطابق تھا کیونکہ قضار میں ظاہر پر فیصلہ کیاجاتا ہے، حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ متعدد الفاظ طلاق استعمال کرتے وقت قضاءً تاکید کی نیت معتبر نہیں ہوتی، دیانت کا معاملہ دوسرا ہے (درمختار ۳/۲۹۳)

الغرض کوئی ایسی معتبر دلیل نہیں ہے کہ فیصلہ فاروقی کو وقتی استثنار یا انتظامی حکم پر محمول کیاجائے۔

(۱۱)؛۔ جب یہ حکم شرعی ہے تو اس پر عمل کیلئے یا فتویٰ دینے کے لئے کسی بااختیار حاکم کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر اس کی پابندی لازم ہے، جیساکہ "مسئلہ متعہ" اور "مسئلہ جماع بلا انزال" میں یہی حکم ہے۔

کیا حضرت علیؓ اجماع کے خلاف تھے:۔

(۱۲)؛۔ امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے اجماع فاروقی سے اختلاف کرنے والا بتایا ہے، یہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے، سلیمان اعمش کے نقل کردہ ایک واقعہ سے اس کی قلعی کھل جاتی ہے جسے حافظ ابن رجب حنبلی نے اپنی کتاب "شرح مشکل الاحادیث الواردۃ" میں لکھا ہے۔

اعمش کہتے ہیں کہ کوفہ میں ایک بوڑھا شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سماعاً یہ روایت نقل کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاق دیدے تو وہ ایک ہی شمار ہوگی؛ اور لوگوں کا تانتا اس کے پاس بندھا ہوا تھا، لوگ آتے تھے اور یہ حدیث اس سے بغور سنتے تھے (اعمش کہتے ہیں) میں بھی اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا آپ نے حضرت علی رضہ سے حدیث سنی ہے، اس نے مجھے بھی مذکورہ بالا حدیث سنا دی، تو میں نے دریافت کیا کہ کہاں سنی؟ تو اس نے کہا کہ میں آپ کو اپنی کاپی دکھاتا ہوں چنانچہ وہ کاپی نکال کر لایا، کاپی میں نے دیکھی تو اس میں یہ لکھا تھا: "میں نے حضرت علی رضہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے تو وہ اس سے بائنہ ہوجائے گی، اور دوسرے شوہر سے نکاح کئے بغیر اسکے لئے حلال نہ ہوگی۔ اس پر میں نے سوال کیا کہ تعجب ہے، یہ روایت تمھاری زبانی روایت کے خلاف ہے، اس نے کہا صحیح یہی (کاپی کی) ہے، لیکن لوگ مجھ سے وہی کہلوانا چاہتے ہیں۔ (بحوالہ النجاۃ الکاملۃ ص۱۱)

روایت سے معلوم ہوگیا حضرت علی رضہ کا مسلک کیا تھا؟ دراصل ان کی طرف اجماع سے اختلاف کی نسبت روافض کے پروپیگنڈے کا جزء ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے،

قابل ذکر شہادت

(۱۳) :- اخیر میں ہم اس بحث سے متعلق مشہور غیر مقلد مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی کی منصفانہ شہادت نقل کرتے ہیں جس سے مسئلہ کی حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے ملاحظہ کریں "یہ (تین طلاق کو ایک ماننے کا) مسلک صحابہ، تابعین وتبع تابعین وغیرہ ائمہ محدثین ومتقدمین کا نہیں ہے، یہ مسلک سات سو سال بعد کے محدثین کا ہے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاوی کے پابند، اور ان کے معتقد ہیں، یہ فتوی شیخ الاسلام نے ساتویں صدی کے آخر یا اوائل آٹھویں میں دیا تھا تو اس وقت کے علماء نے ان کی سخت مخالفت کی تھی نواب صدیق حسن خاں صاحب نے "اتحاف النبلاء" میں جہاں شیخ الاسلام کے متفردات مسائل لکھے ہیں اس فہرست میں طلاق ثلث کا مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جب شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے تین

طلاق کے ایک مجلس میں ایک طلاق ہونے کا فتویٰ دیا تو بہت شور ہوا، شیخ الاسلام اور ان کے شاگرد ابن قیم پر مصائب برپا ہوئے، ان کو اونٹ پر سوار کرکے درّے مار مار کر شہر میں پھرا کر توہین کی گئی، قید کئے گئے اس لئے کہ اس وقت یہ مسئلہ علامت روافض کی تھی۔ اتحاف ص۳۱۸۔

(فتاوی بحوالہ عمدۃ الاثاث ۱۰۳)

اس حوالہ سے معلوم ہوا کہ امت میں متواتر سات سو سال اس مسئلہ کو صرف روافضین وشیعہ کا شعار سمجھا جاتا رہا اور تین کو تین ماننے کا اجماعی فیصلہ ہی حکم شرعی کے بطور معمول بہا رہا اب اچانک اس پر وقتی استثنار کی تلوار کیسے چلائی جاسکتی ہے؟

فائدہ کیا ہے؟

(۱۴)۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے وہ یہ کہ تین طلاق کو ایک قرار دینے کے نظریہ کو اہم اصلاحی عمل کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے جبکہ یہ نری خام خیالی ہے، غور کیا جائے تو یہ نظریہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی کا سبب ہے کیونکہ۔

الف:۔ اس کا سارا فائدہ اس مرد کو پہونچتا ہے جو انجام کا لحاظ کئے بغیر تین طلاقیں دیدے اور بعد میں پشیمان ہو۔

ب:۔ یہ نظریہ عورت کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پھر اسی ناقدرے شوہر کے ساتھ کڑوی زندگی گذارے۔

ج:۔ اس نظریہ کی وجہ سے مرد طلاق دینے پر جری ہوجاتے ہیں

د:۔ جو عورتیں شوہر کی زیادتیوں سے تنگ رہتی ہیں ان کی گلوخلاصی مشکل تر ہوجاتی ہے۔

ہ:۔ تین طلاق کے بعد رجعت کرنے والا شخص جمہور کے نزدیک حرام کار قرار پاتا ہے۔

و:۔ اجماع امت کو چھوڑنے کے رجحان سے غیروں اور دشمنوں کو دیگر دینی مسائل میں دخل اندازی کا موقع مہیا ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف تین طلاق کو تین ماننے سے مذکورہ کوئی خرابی لازم نہیں آتی، زیادہ سے زیادہ دو باتیں کہی جاسکتی ہیں، اوّل یہ کہ مطلقہ عورت کی کفالت کا نظم کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مشکل صرف تین کو تین ماننے کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ تین کو ایک ماننے کی صورت میں بھی پیش آسکتی ہے جب کہ رجعت نہ ہو یا تین طہروں میں الگ الگ طلاق ہو۔ اصل میں

یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے، اس کا حل صرف یہ ہے کہ عورت کا دوسرا نکاح ہو یا اہل خاندان اس کی کفالت کریں۔ دوسری مشکل یہ بتائی جاتی ہے کہ تین کو تین ماننے سے حلالہ کا حکم دینا لازم آتا ہے (جو بقول معترض بڑی بے شرمی کی بات ہے!) تو یہ اعتراض حلالہ کی شرعی کیفیت اور صورت سے ناواقفیت پر مبنی ہے، شریعت اسلامی میں حلالہ کوئی منصوبہ بند عمل نہیں بلکہ منصوبہ کے ساتھ حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت وارد ہوئی ہے (ترمذی شریف ۱/۱۳۳) حلالہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ مطلقہ اس وقت تک دوبارہ طالق کے نکاح میں نہ آئے جب تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے پھر (اتفاقاً) اس سے جدائی ہو جائے، یہ حکم تین طلاق دینے والے کے لئے بڑی اہم نفسیاتی سزا ہے، حلالہ عورت کے لئے باعث عیب نہیں کیونکہ وہ اس کا دوسرا شرعی نکاح ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا دوسرا رفیق حیات پہلے سے اچھا ہو، البتہ باغیرت مرد کے لئے یہ شرم کی بات ہے کہ اس کی بیوی دوسرے کے نکاح میں جائے، جو شخص اس حکم کو ذہن میں رکھیگا وہ کبھی بھی تین طلاق کی جرأت نہ کرے گا۔

کرنے کا کام

(۱۵): بحث اس لئے لمبی ہوگئی کہ بزعم خود مفکرین و مجتہدین کے مغالطوں کی توضیح ضروری تھی، ورنہ کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اس وقت جبکہ ملی اتحاد اور معاشرتی اصلاح کی سخت ضرورت ہے ہمارے لئے طلاق کے مسئلے میں الجھنا چنداں مفید نہیں ہے، ہمیں اسلامی طریقہ طلاق میں تبدیلی کی بحث میں پڑنے کے بجائے اپنی صلاحیتیں اور وسائل عوام کو سمجھانے اور انھیں صحیح راہ دکھانے پر صرف کرنے چاہئیں، بیک وقت ایک طلاق دینا بالاتفاق مستحسن ہے اسی نکتہ پر سب زور دیں اور اسی کو رائج کریں، اس طرح کثرت طلاق کی وبا بھی کم ہوگی اور ہمارا مقصود بھی حاصل ہوگا، اب بھی وقت ہے ہم اپنے آپ کو سنبھالیں ورنہ یہ ہماری کج بحثی ایسے نت نئے مسائل کھڑے کرے گی کہ ہمیں ان سے نمٹنا مشکل ہو جائے گا۔

وما علینا الا البلاغ المبین





استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری علیہ الرحمہ

(مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور اعظم گڈھ)

ایک حادثہ جو ہر اس شخص کے لئے یقینی ہے جس نے اس دنیائے ناپائیدار میں قدم رکھا ہے اور جس نے زندگی کی آنکھ کھولی ہے، بہر حال اسے اس حادثہ سے دوچار ہونا ہے، ہر شخص اللہ کے پاس سے ایک لکھی لکھائی عمر لے کر آیا ہے لیکن نہ اسے خبر کہ وہ کتنی ہے؟ اور نہ دوسروں کو پتہ کہ وہ ہمارے درمیان کتنے دن رہے گا؟ لیکن اس کے باوجود آدمی صحت و تندرستی دیکھ کر، جوانی و نوعمری دیکھ کر، قوت و طاقت دیکھ کر ایک اندازہ کرتا ہے کہ ابھی حیات دراز ہے، ابھی اور جینا ہے، ابھی مرنے والی نہ عمر ہے اور نہ صحت، اور اسی اندازہ سے وہ مطمئن رہتا ہے، اور ایسا مطمئن رہتا ہے جیسے وہ اس "حادثۂ ناگزیر" کو ٹالنے میں کامیاب ہو چکا ہو، مگر پھر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی عمر کی گنتی پوری کر کے چلدیتا ہے تو وہ اپنا اعمالنامہ لے کر خدا کے حضور پہونچ جاتا ہے، لیکن اسے دیکھنے والے اس سے تعلق رکھنے والے اور اس کی محبت میں جینے والے ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ کیا ہوا؟ ابھی تو بالکل صحت مند تھے، ابھی عمر ہی کیا تھی؟ ابھی تو جوان تھے، ابھی تو جوانی ڈھلی ہی تھی، بڑھاپا کہاں آیا تھا؟ ارے اس کا تو وہم بھی نہ تھا، لیکن اب تو ہو گیا جو ہونا تھا،

آج قلم ایسا ہی ایک حادثہ لکھنے پر مجبور ہو رہا ہے، کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہمارے محبوب استاذ، بہترین مشیر، ہمہ تن شفقت و محبت رہبر و رہنما حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری اس طرح اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلدیں گے، کتنے صحت مند تھے؟ کیسے توانا تھے؟ صرف بال ہی تو سفید ہوئے تھے، بڑھاپے کا! اور تو کوئی نام و نشان بھی نہ تھا، کیا بیماری تھی انھیں؟ بیماری تو انھیں محض چھو کر گذر جاتی تھی، ابھی کئے دن ہوئے مدرسہ شیخ الاسلام کی شوریٰ کی میٹنگ میں آئے تھے، کتنے ہشاش بشاش تھے، رات میں دیر تک مجلس شوریٰ کا اجلاس چلتا رہا، انھیں کی

صدارت میں اجلاس ہورہا تھا، ان کی رائے سب کے لئے قابل تسلیم ہوتی تھی، صبح انھیں واپسی کی جلدی تھی لیکن مدرسہ کا ایک ضروری کام انھیں پر موقوف تھا، نماز فجر پڑھ کر اس طرح یکسو ہوکر اس کے لئے بیٹھے، جیسے انھیں اور کوئی کام ہی نہیں، پورے انشراح وانبساط کے ساتھ اس معاملہ کو طے کیا اور پھر یوں اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے جانے کے لئے دیر سے تیار رہے ہوں، کون جانتا تھا کہ حالت صحت کا یہ آخری دیدار ہے۔

۲۳ محرم الحرام ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۹۳ء کو اچانک اطلاع ملی کہ کل مولانا پر فالج کا حملہ ہوا، غسل کرنے کے لئے حمام میں تشریف لے گئے تھے، وہیں یہ حملہ ہوا، کسی کو خبر نہ تھی، کئی گھنٹے کے بعد لوگوں کو احساس ہوا تو دروازہ توڑ کر اندر گئے تو گرے ہوئے تھے، ہوش قائم تھا، پوچھنے پر جواب بھی دیا مگر آہستہ آہستہ ہوش کم ہوتا گیا، معلوم ہوا کہ اعظم گڈھ کے ایک شفاخانہ میں داخل ہیں، دل دھک سے ہوکر رہ گیا، بھاگم بھاگ اعظم گڈھ پہونچا، آہ کردہ شفقت وکرم کا پیکر مجسم، جس کے چہرے پر اپنے عزیزوں کو دیکھتے ہی خوشی ومسرت کا نور دمک اٹھتا تھا آج اس طرح بے سدھ پڑا ہے کہ اپنے تن بدن کا ہوش نہیں، بایاں حصہ بالکل مفلوج ہے، آنکھیں بند ہیں، دایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں حرکت کر رہا ہے، میرا مولانا سے شاگردانہ تعلق اٹھائیس، انتیس سال سے ہے، لیکن میں نے کبھی انھیں ننگے بدن نہیں دیکھا تھا، آج صرف ایک لنگی بندھی ہوئی جو نظر آئی تو طبیعت بے قابو ہوگئی، قریب جاکر دھڑکتے دل سے سلام کیا، تو سلام کا جواب دیا، نام بتایا تو اچھا کہا مگر آنکھیں نہیں کھول سکے، چند گھنٹے ان کی خدمت میں رہا، پھر واپس چلا آیا کہ کل پھر آؤں گا، کل پہونچا تو معلوم ہوا کہ حالت نازک ہوتی جارہی تھی، اسلئے ڈاکٹروں کے مشورے سے لوگ رات ہی میں لکھنؤ لے گئے، پھر لکھنؤ سے کبھی امید کی خبر آتی اور کبھی یاس کی بات آتی۔

آخر ۲۹ محرم ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۹۳ء کو بعد نماز مغرب اطلاع آئی کہ مولانا کا وصال ہوگیا، سنتے ہی سر چکرا گیا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، دل صدمے سے چور چور ہوگیا، رات کس طرح گذری بس کچھ نہ پوچھئے، نیند آتی تھی اور مولانا کا شاداب چہرہ سامنے آجاتا تھا، بس آنکھ کھل جاتی تھی، صبح سویرے بمہور پہونچا، سوگواروں کا ہجوم تھا، اکثر آنکھیں سرخ تھیں ہاجرائ

گرامی قدر مولانا محمد راشد صاحب سلمہٗ کو دیکھا تو آنکھیں برس پڑیں، ایک جملہ بھی تو تسلی کا ادا نہ ہوسکا سب صورت سوال بنے ہوئے تھے کہ یہ اچانک کیا ہوگیا؟ ہر ایک چہرہ اداس تھا، عوام بھی تھے، خواص بھی تھے، علماء بھی تھے، طلبہ بھی تھے، لیکن سب کے چہروں پر رنج واندوہ کی گہری پرچھائیاں تھیں، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور جس کے وہ علاً سرپرست تھے، کے اساتذہ وطلبہ آگئے تھے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے طلبہ واساتذہ بھی تھے، ان کے علاوہ مدرسہ منبع العلوم خیرآباد، جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج، مدرسہ عین الاسلام نوادہ کے اساتذہ ومنتظمین پہونچ گئے، جامعہ رشیدیہ بمہور کے تو سبھی حضرات تصویر غم بنے ہوئے تھے۔

مولانا کو غسل دیا گیا، کفن پہنایا گیا، کتنا نرم اور گداز بدن تھا، موت نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی تھی، بدن جیسا زندگی میں تھا پس مرگ بھی ویسا ہی رہا، کیا مرے ہوئے آدمی کا چہرہ ایسا ہی ہوتا ہے؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرام کی نیند سو رہے ہوں، چہرے پر تازگی وشادابی تھی، نماز جنازہ ان کے استاذ مکرم حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مدظلہٗ نے پڑھائی اور ساڑھے دس بجے دن میں یہ گنج گراں مایہ تہ خاک چھپا دیا گیا، ان سارے مراحل میں یہ خادم وشاگرد شریک رہا، اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کی روح کو سکون واطمینان بخشے اور انھیں جنت میں جگہ دے۔

دفن کرکے آیا تو ذہن میں ماضی کے دریچے کھل گئے، پچھلی یادیں ایک ایک کرکے آنے لگیں دل شکستہ اور زخم خوردہ ہے، قلم تھرتھرا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود تقاضا ہے کہ ان یادوں کو کاغذ کے حوالے کردوں، شاید دل محزوں کو کچھ تسلی ہو۔

شوال کے مہینے سے عربی مدارس اپنا نیا تعلیمی سال شروع کرتے ہیں، داخلہ کے خواہش مند طلبہ ابتداء ماہ شوال میں ان مدارس کا رخ کرتے ہیں۔ ہجری سن غالباً ۱۳۸۴ھ تھا اور عیسوی ۱۹۶۴ء رہا ہوگا، ایک ڈرا سہما طالب علم اپنے ایک رفیق اور رہنما کو لے کر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ کے لئے پہونچا، ناظم مدرسہ نے حکم دیا کہ مولانا محمد مسلم صاحب کو جاکر امتحان داخلہ دو، وہ مولانا کی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ ایک صاحب ہنڈپائپ سے پانی نکال رہے ہیں، کسی نے بتایا کہ یہی

مولانا محمد مسلم صاحب ہیں، متوسط قد، تندرست گٹھا ہوا جسم، گہرا سانولا رنگ، پورے چہرے پر خوبصورت بھری ہوئی سیاہ ڈاڑھی، آنکھیں مخموری سی، چہرہ بارعب، لمبا کرتا، تنگ مہری کا پاجامہ ٹخنوں سے اونچا سر پر دو پلی خوبصورت ٹوپی، کندھے پر بڑا سا رومال، بہت ہی جامہ زیب نظر آتے انھوں نے کھڑے ہی کھڑے امتحان لیا، صرف تین سوال کئے، پہلے دو سوال کا جواب دے دیا مگر تیسرے کا جواب نہ بن پڑا، کیونکہ جس کتاب کا سوال انھوں نے کیا تھا وہ اس کی پڑھی ہوئی نہ تھی اسے عربی دوم میں داخلہ لینا تھا لیکن تعلیمی لحاظ سے اس لائق نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ رعایتاً عربی دوم میں تمھارا داخلہ کرلیا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ فلاں کتاب پڑھ ڈالو۔

یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی، ایک ہفتہ کے بعد تعلیم شروع ہوئی تو میرے درجے کی ایک کتاب علم الصیغہ کا سبق ان کے پاس تھا، مولانا نہایت اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، بڑے بارعب و باوقار! پڑھاتے ایسا تھے کہ جیسے گھول کر پلا دینا چاہتے ہوں، ان کا انداز تدریس نمونہ کا انداز تھا مشکل سے مشکل بات کو اس طرح سمجھاتے تھے کہ اس کے مشکل ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا، طالب علم کے ذہن میں وہ بات اس طرح بیٹھ جاتی جیسے اسے پہلے سے معلوم رہی ہو، میں نے مولانا سے چار سال تعلیم حاصل کی ہے، پڑھانے کا انداز انھیں سے سیکھا خود مقرر و خطیب نہ تھے، لیکن بہتوں کو خطیب بنا دیا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا کا تدریسی اور تربیتی کمال ظاہر ہوا، باوقار و بارعب بھی بہت تھے، مہربان و با اخلاق بھی بہت تھے، ہر طالب علم ان سے ڈرتا بھی تھا اور ان سے محبت بھی کرتا تھا، طلبہ فجر سے پہلے سوتے ہوتے، ان کی ایک آواز مُردوں میں جان ڈال دیتی اور ہر طرف بیداری کی ہلچل پیدا کر دیتی، پڑھنے کے لئے طالب علموں کی ہمت افزائی ایسے ایسے طریقوں سے کرتے کہ وہ دیوانہ وار تعلیمی محنت میں مشغول ہوجاتے، طلبہ سے رات رات بھر پڑھوا دینا ان کے لئے معمولی بات تھی

مولانا مدرسہ کی مدرسی کے ساتھ ملّی مسائل کا بھی پورا شعور رکھتے تھے، اور ابتدار سے ہی مسلمانوں کے ملکی اور بین الاقوامی احوال و معاملات میں دلچسپی لیتے تھے اور اس باب میں انھیں جمعیۃ علمائے ہند کی رہنمائی پر یقین کامل تھا، انھوں نے ہمیشہ جمعیۃ علمائے ہند کے جھنڈے کے نیچے کام کیا اور پورے شرح صدر کے ساتھ کیا، انھوں نے یہی روح مدرسہ کے تمام

طلبہ میں بھی پھونک رکھی تھی۔

جن دنوں صدر ناصر نے اسرائیل سے شکست کھائی تھی اور قبلۂ اول (حفظہا اللہ واعادہا الی المسلمین) پر یہودیوں کا قبضہ ہوگیا تھا، تو ساری دنیا کے مسلمان بلبلا اٹھے تھے، ہر مسلمان غمزدہ تھا، ہندوستان میں جمعیۃ علماء نے اس صدمے کی چوٹ کو سب سے زیادہ محسوس کیا، اسرائیل نے فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد کو ان کے گھروں سے نکال کر بے گھر کردیا تھا، یہ خانماں برباد لوگ کیمپوں میں آسمان کے نیچے دھوپ میں بے سایہ کے پڑے ہوئے تھے، قبلۂ اول کی بازیافت کا مسئلہ تو تھا ہی، فوری طور پر ان پناہ گزیں بے پناہوں کی امداد واعانت کا مسئلہ سب سے اہم تھا، دنیا کے تمام مسلم ممالک اس کارِ خیر میں لگے ہوئے تھے، ہندوستان کا مسلمان گوکر مفلوک الحال ہے مگر بہت حوصلہ مند ہے اس نے اس امداد و تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس وقت کے ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند اور اب کے صدر گرامی قدر حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی کی اپیل پر مسلمانوں نے اپنی بساط بھر بلکہ کچھ زیادہ ہی تعاون کیا۔

استاذِ محترم نے مظلومین کی اعانت کے لئے طالب علموں میں وہ ولولہ پیدا کیا کہ بیشتر طلبہ اس کے لئے مستعد و سرگرم کار ہوگئے، مولانا نے ایک مختصر سی مگر نہایت پرجوش تقریر لکھ کر طلبہ کو دیدی، انھوں نے اسی کی روشنی میں آس پاس کے قریہ جات اور گاؤں میں ایک آگ سی لگادی، طلبہ کی کوششوں سے کافی سرمایہ جمع ہوگیا، جو دفتر جمعیۃ علماء میں بھیج دیا گیا اور وہاں سے مستحقین کو پہونچا دیا گیا۔

مولانا کو جمعیۃ علمائے ہند سے، جمعیۃ کے اکابر سے، بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ سے اور ان کے خانوادہ سے جو خلوص اور قلبی لگاؤ تھا، اور جیسی فدائیت اور فنائیت تھی اس کو عشق کے علاوہ اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، میں نے اٹھائیس انتیس سال کے اس عرصے میں کبھی نہیں دیکھا کہ مولانا کا یہ جذبۂ عقیدت و محبت، کسی سرد و گرم سے متاثر ہوا ہو یا اس میں کبھی کسی طرح کا تغیر ہوا ہو، مولانا طبیعت کے اور قلب کے نہایت پختہ اور مضبوط انسان تھے، فیصلہ کرتے تو بہت سوچ کر اطمینان کے بعد کرتے، اور جو فیصلہ کرلیتے اس سے پیچھے ہٹنے کا تصور تک نہ کرتے، قلبی لگاؤ سبھی بزرگوں سے تھا، عقیدت کیش سب کے تھے مگر جب

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا نام آتا تو سر سے پاؤں تک ان پر ایک کیف اور سرور چھا جاتا ایسا کیف اور ایسا سرور جو دوسروں کو بھی متأثر کر دیتا، خاکسار جب مولانا کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوا تو حضرت کا نام ان کی زبان سے بکثرت سنا، میں اس وقت تک حضرت مدنی پر جو کچھ لکھا گیا تھا تقریباً سب پڑھ چکا تھا لیکن مولانا کی زبان سے جب حضرت مدنی کا نام اور تذکرہ سنتا تو کچھ اور ہی لطف آتا، ایک دن فرمانے لگے کہ تم لوگوں نے حضرت مدنی کو دیکھا نہیں، انھیں دیکھ کر صحابۂ کرام یاد آتے تھے، ایسا محسوس ہوتا کہ حضرت مدنی صحابہ کی شان ہوں۔

اسی طرح حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے بھی والہانہ شیفتگی کا معاملہ تھا، ایک دن بہت دیر تک ان کا ذکر عقیدت و محبت سے کرتے رہے۔ یاد رہے کہ یہ میری طالب علمی کے دور کی بات ہے تو میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ مولانا کے شاگرد ہیں؟ فرمایا کہ میں نے ان سے کچھ پڑھا نہیں ہے لیکن میرا تعلق شاگردانہ ہی ہے، پھر میں نے پوچھا کہ آپ ان سے بیعت ہیں؟ فرمایا کہ میں بیعت نہیں ہوں، لیکن عقیدت مریدوں سے بڑھ کر رکھتا ہوں، بعد میں حضرت مولانا سے بیعت ہو گئے تھے۔

مدرسہ میں جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ جلسہ ہونے والا تھا، یہ بات زیر بحث تھی کہ جلسہ کی صدارت کے لئے کس کو دعوت دی جائے، حضرت مولانا اسعد مدنی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی کا نام منتخب ہوا، مولانا قاسمی اس وقت تک جمعیۃ سے الگ نہیں ہوئے تھے، غالباً یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے، جلسہ دو دن کا تھا، پہلے دن استاذ محترم کے خلوص اور ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے تینوں صاحبزادگان تشریف لائے، مولانا ارشد مدنی اس وقت جامعہ قاسمیہ گیا میں مدرس تھے ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی اسجد میاں بھی آئے، مولانا ارشد میاں جوان رعنا تھے اور اسجد میاں بچے تھے، اس دن مولانا محمد مسلم صاحب کی مسرت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا، انھیں گویا زندگی کی عظیم ترین مسرت حاصل ہو گئی تھی۔

پھر حضرت مولانا اسعد مدنی کی جانب سے انگریزی پریس فنڈ کی تحریک چلی، مولانا محمد مسلم صاحب حسب معمول اس تحریک کی کامیابی کے لئے پورے انہماک کے ساتھ لگ گئے، پھر دیہاتوں اور گاؤں میں طلبہ کے وفود بھیجنے لگے، اس موقع پر استاذ محترم نے حضرت مولانا اسعد مدنی کا کئی روز کا پروگرام

لیا، مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں شاندار جلسہ ہوا، اور ایک بڑے معرکہ کا جلسہ بلریا گنج میں جماعت اسلامی کے عین مرکز کے سامنے ہوا۔ اس وقت جماعت اسلامی کے حلقے سے مولانا اسعد صاحب کی مخالفت خوب جم کر ہو رہی تھی، اندیشہ تھا کہ یہاں بھی کچھ ناخوشگواری پیش آئے گی مگر استاذ محترم کا حسن انتظام حضرت مولانا اسعد صاحب کی فطری شجاعت و بسالت، اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب چشتی علیہ الرحمہ کی روحانیت! کہ جلسہ ہوا اور بہت کامیاب ہوا، اور کسی طرح کی کوئی آواز نہیں آئی، جس وقت جلسہ گاہ میں مولانا اسعد صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب ایک کار سے تشریف لائے، اور دونوں بزرگ گاڑی سے نکلے تو ایسا لگا جیسے دو نور کے پیکر بشکل بشر زمین پر اُتر آئے ہوں، مولانا اسعد صاحب تو سیدھے اسٹیج پر چلے گئے اور جاکر تقریر شروع کردی، اور مولانا عبدالحی صاحبؒ اسٹیج کے پیچھے سر جھکائے مسلسل ٹہلتے رہے، مولانا نے بہت مؤثر تقریر کی اور جلسہ نہایت امن وسکون کے ساتھ ختم ہوا۔

حضرت الاستاذ کو جمعیۃ علماء کے ساتھ والہانہ وابستگی تھی، اس کے ہر پروگرام میں نہایت انشراح کے ساتھ شریک ہوتے، ان کا یہ تعلق انتہائی مخلصانہ تھا، انھوں نے نہ کبھی عہدے کی خواہش کی اور نہ خود کو کبھی نمایاں کرنے کا قصد کیا، وہ ہمیشہ خادمانہ کام کرتے رہے، اور اسے اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے رہے، ان کا ضمیر مطمئن تھا، جب جمعیۃ کے کسی پروگرام میں شریک ہوتے تو ان کے چہرے پر وہی مسرت اور طمانینت جھلکتی، جو کوئی عبادت گذار اپنی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد محسوس کرتا ہے، جمعیۃ سے وابستگی میں ان کی کوئی ذاتی غرض کبھی نہیں رہی وہ واقعی ان کی عبادت تھی، جسے وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے، جمعیۃ کے سلسلے میں جتنے اسفار انھیں کرنے پڑتے، سب اپنے ذاتی مصارف سے کرتے تھے، جمعیۃ پر اس کا بار نہ ڈالتے۔

جمعیۃ علماء کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز جس سے انھیں گہری وابستگی تھی، بلکہ وہ ان کے لئے بمنزلہ روح اور جان کے تھی۔ وہ مدارس عربیہ ہیں، انھوں نے اپنی پوری زندگی مدارس میں ہی گزاری۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد وہ دارالعلوم مئو میں چند سال مدرس رہے وہاں سے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مدرس ہوئے، ان کی مدرسی کا سب سے تابناک دور یہی تھا

وہ بالکل یکسو ہوکر پڑھاتے تھے، اور طلبہ کی تربیت کرتے تھے، اس وقت تک فراہمی مالیات اور تعمیرات سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا، مبارک پور میں انھوں نے کم و بیش دس سال تک پڑھایا ہے، وہاں سے ان کی مدرسی مشہور ہوئی، پھر بعض ناموافق حالات کی وجہ سے مبارک پور سے جونپور وہاں کے ایک قدیم ادارہ میں جو نیم مردہ ہوچکا تھا، یعنی مدرسہ قرآنیہ بڑی مسجد جونپور تشریف لے گئے، مولانا تشریف لے گئے تو یہ نیم مردہ اچانک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا، طلبہ کی آمد دور دور سے شروع ہوگئی اور چند دنوں میں طلبہ کا ہجوم ہوگیا، مگر مدرسہ اور جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی کی کشمکش سے اندازہ ہوا کہ اس سے یکسو ہوکر کام کا کوئی دوسرا میدان تلاش کرنا چاہئے جو پہلے سے کسی کے تسلط میں نہ ہو، چنانچہ راجے بی بی کی بنوائی ہوئی نامکمل مسجد جو محلہ لال دروازہ میں صدیوں سے ویران پڑی ہوئی اپنی خاموش نگاہوں سے کسی مرد غیب کی منتظر تھی کہ آئے اور کارے بکند، آخر وہ مرد غیب مولانا محمد مسلم صاحب کی شکل میں اسے مل گیا، وہ مسجد جو صدیوں سے نمازیوں کو ترس رہی تھی، اور گھاس پھوس اور خودرو پودوں کی وجہ سے جنگل بنی ہوئی تھی، خدا کی قدرت دیکھئے کہ بہت قلیل عرصہ میں وہ علم دین کا لہلہاتا ہوا چمن زار بن گئی، اس کی گھاس صاف کی گئی اس کے جنوبی و شمالی اور مشرقی برآمدوں میں دیواریں کھڑی کرکے حجرے بنا دیئے گئے اور تعلیم شروع ہوگئی، قال اللہ و قال الرسول کی مسامعہ نواز صدائیں گونجنے لگیں، مسجد کی روح زندہ ہوگئی، پانچوں وقت اذان ہونے لگی، نمازیں پڑھی جانے لگیں، حضرت مولانا جان کی بازی لگا کر اس کی آبادکاری میں لگ گئے، اس سلسلے میں بڑے بڑے خطرات آئے مگر ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے، خود بھی لگے رہے، اپنے رفقاء کو بھی لگائے رکھا، دن رات ایک تڑپ تھی جو انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی، مدرسہ کے اوقات میں سبق پڑھاتے، دوسرے اوقات میں اہل خیر کے دروازوں کو کھٹکھٹاتے اور اس کار اہم کی جانب متوجہ کرتے، مولانا احیاء العلوم مبارک پور میں جب تھے تو بہت خوش لباس تھے، کرتے پاجامے اور ٹوپی کی ایک خاص تراش اور وضع تھی، جس کے نوک و پلک وہ خود درست کرتے تھے کپڑوں میں نہ کبھی شکن نظر آتی اور نہ میل کچیل، جوتا تو اتنا خوبصورت اور سبک پہنتے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل، اور پھر پالش ایسی چمکدار اور تازہ کہ کبھی اس میں فرق نہیں آسکتا تھا، مگر لال دروازہ میں جامعہ حسینیہ قائم کرنے کے بعد ان کا حال یہ ہوا کہ کپڑے میلے ہو رہے ہیں

کچھ التفات نہیں، بدن دھول اور غبار سے اٹ رہا ہے، نہانے کی فرصت نہیں، ایک ہی کپڑا کئی دن سے بدن پر ہے، پورا لباس شکن آلود ہے لیکن تبدیل کرنے کا خیال نہیں، جوتوں پر ہفتوں سے پالش نہیں ہوئی ہے، بدرنگ ہوئے جا رہے ہیں مگر پرواہ نہیں، دل میں ایک جوش تھا جو انھیں مسلسل حرکت میں رکھتا تھا، کئی بار ایسا ہوا کہ وہ مدرسہ دینیہ میں۔ جہاں میں پڑھاتا تھا۔ غبار آلود، پراگندہ بال گرد سے اَٹے ہوئے اور بدرنگ جوتے پہنے ہوئے تشریف لائے معلوم ہوا کہ چند گھنٹے رہیں گے پھر واپسی ہے، میں نے عرض کیا کہ کپڑے دیجئے دھلوادوں، آپ خود بھی غسل کر لیجئے، جوتوں پر پالش کرادوں، فرصت نہ ہونے کا عذر کیا، مگر میں نے گستاخی کرکے انھیں روکا، کپڑے دھلوائے، غسل کرایا، غسل کے بعد تازہ دم ہوئے تو فرمایا کہ تم نے اچھا کیا ورنہ ابھی نہ جانے کتنے دنوں تک مجھے موقع نہ ملتا۔

مسجد کے شمالی حصہ میں زمین خریدی، اس پر مدرسہ کی عمارت بنوائی، اس کی تعمیر میں لگے تو اس سے اتنا انہماک اور شغف ہوا کہ خود ایک بہترین مہندس اور انجینیر بن گئے تعمیر کے ایسے ایسے نقشے نکالتے کہ تجربہ کار ماہرین فن حیران رہ جاتے، وہ اپنے ذہنی نقشہ کے مطابق عمارت بنواتے، اور ہر وقت کاری گروں پر سوار رہتے، تھوڑے وقت اور تھوڑے خرچ میں انھیں بہترین عمارت بنوانے کا خوب سلیقہ آگیا تھا۔

لیکن ہم لوگوں کے لئے مولانا کی یہ دلچسپی سوہان روح تھی، اس کا اثر تعلیم وتدریس پر پڑ رہا تھا، مجھے تعمیرات کے کاموں سے نہایت وحشت ہے اسی وحشت کے باعث میں نے بار بار ان سے حد درجہ مرعوب ہونے کے باوجود کہا کہ یہ دلچسپی کم کر دیجئے اور تعلیمی مشغلہ برقرار رکھئے اس پر وہ مسکراتے اور فرماتے، بہت سے پڑھانے والے تیار کر چکا ہوں، اب دوسرا کام کر رہا ہوں، فرماتے تھے کہ تعمیر سے مجھے عشق ہو گیا ہے، ان کی یہ دلچسپی آخر تک برقرار رہی۔

جامعہ حسینیہ کی تعمیر کے ایک کافی حد تک مکمل ہو چکنے کے بعد بعض حالات کی وجہ سے حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی نے مولانا کو دفتر جمعیۃ علماء میں بلا لیا وہاں کچھ دنوں کام کیا مگر انھیں اس کی فکر تھی کہ اپنے آبائی وطن بمہور ضلع اعظم گڈھ میں ایک دینی درسگاہ قائم کریں

مکتب تو پہلے سے چل رہا تھا مگر باقاعدہ عربی درسگاہ نہ تھی، حضرت مولانا مدنی سے اجازت لے کر وہ بمہور آگئے اور ستمبر ۱۹۸۶ء کی کسی تاریخ میں ایک عظیم الشان جلسہ کرا کے محدث الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور دوسرے اکابر کے ہاتھوں جامعہ رشیدیہ بمہور کا سنگ بنیاد رکھوایا، اور اسی تاریخ میں شیخوپور میں انھیں اکابر کے ہاتھوں مولانا ہی کے اہتمام میں مدرسہ شیخ الاسلام کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا نے بمہور میں مدرسہ کی نہایت نفیس اور دیدہ زیب عمارت بنوائی اور ابھی دو سال قبل گاؤں کی پرانی مسجد کی تعمیر جدید کا منصوبہ بنا تو اس میں بھی دن رات ایک کر کے لگے رہے اور ایک حد تک اس کی تکمیل کرا دی۔

اور یہ سب اس طور پر کرتے کہ خود کسی جگہ کوئی عہدہ نہیں قبول کرتے تھے، جامعہ حسینیہ میں سب کچھ انھیں کا کیا ہوا ہے لیکن وہ مہتمم تھے، نہ صدر مدرس، جامعہ رشیدیہ بمہور میں بھی سب کچھ وہی کرتے تھے مگر کسی عہدہ کا نام یہاں کبھی نہ تھا، مسجد کا کام کرتے رہے مگر اصل ذمہ دار دوسرے لوگ تھے، درحقیقت یہ سارے کام وہ اپنے دلی تقاضے اور اللہ کے واسطے کرتے تھے اس سے ان کا دل اور ضمیر مطمئن ہوتا تھا۔

مولانا کو جیسی دلچسپی جامعہ رشیدیہ سے تھی ویسا ہی تعلق مدرسہ شیخ الاسلام سے بھی تھا وہ دونوں جگہوں کی نگرانی کرتے تھے، مدرسہ شیخ الاسلام میں مجھے لانے والے وہی تھے، انھیں کے حکم سے اس دیہات میں بیٹھا ہوا ہوں، مدرسہ میں جب ضرورت ہوتی وہ تشریف لاتے، مفید مشورے دیتے اور مدرسہ سے کرایہ کبھی نہ لیتے۔

مولانا کو جس طرح اپنے بڑوں سے عقیدت دگرویدگی تھی اسی طرح اپنے چھوٹوں سے بھی بہت محبت فرماتے تھے، مولانا کے سب شاگرد میری اس بات کی تائید کریں گے۔ میں ان کا ایک ادنی شاگرد ہوں، لیکن ہمیشہ ان کے الطاف و عنایات کا مورد بنا رہا، مدرسہ دینیہ میں مولانا تشریف لاتے اور کتنی مرتبہ صرف میری دلجوئی کے لئے تشریف لاتے، ان کی آمد پر اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں ان سے درخواست کرتا کہ تبرکاً ایک دو سبق پڑھا دیجئے، کبھی گذارش کرتا کہ طلبہ کو کچھ نصیحتیں کر دیجئے، مولانا اسے خوشی سے قبول فرماتے، سبق پڑھاتے، طلبہ کو نصیحتیں فرماتے

کبھی میں جامعہ حسینیہ پہونچتا، تو اس وقت چونکہ مولانا کا مدرسہ کی مالیات یا تعمیرات سے شغف بہت عروج پر تھا، میں آتا تو اپنے اسباق میرے حوالے کر دیتے اور مطمئن ہو کر چندے کی مہم پر نکل جاتے، میرا قیام ان کے حکم سے کئی کئی دن رہتا، اور ان کے اسباق پڑھاتا رہتا، طلبہ کے درمیان مجھ سے تقریریں کراتے، خود بھی سنتے اور خوش ہوتے، مدرسہ کا کوئی جلسہ، کوئی پروگرام ہوتا تو ضرور بلاتے اور حاضر ہوتا تو گہری سنجیدگی کے باوجود خوشی کے آثار چہرے پر دمکنے لگتے۔

جامعہ حسینیہ کو انھوں نے اپنے خون پسینے سے سینچا تھا، اسے پروان چڑھایا تھا مگر ایک وقت ایسا آیا کہ انھیں اپنے بڑوں کے حکم سے اسے چھوڑ دینا پڑا، آدمی اپنی اولاد سے جدا کر دیا جائے اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے محروم کر دیا جائے تو اس پر کیا گزرے گی، مگر مولانا نے غایت خلوص کی بنا پر یہ تکلیف دہ فیصلہ قبول کر لیا، اس وقت وہ بہت محزون خاطر اور دل شکستہ تھے، باوجود اپنی قلبی قوت کے، جو کسی وقت اضمحلال کو قبول نہیں کرتی تھی، ان پر افسردگی کا ایک عالم طاری تھا، اس وقت مدرسہ دینیہ تشریف لائے، اور تین دن تک آپنے اسی خادم کے پاس قیام فرمایا، اس وقت خلوت وجلوت کا ساتھی تنہا میں تھا، خوب کھل کر باتیں ہوتیں میں ان کے کرم وشفقت کی بنا پر باوجود مرعوبیت کے کچھ گستاخ ہو گیا تھا، میں انھیں کی غلطیاں گنواتا اور وہ کشادہ پیشانی سے سنتے، قبول کرتے اور اصلاح کا وعدہ کرتے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا کو اپنے اکابر سے بے حد لگاؤ تھا، ان کا تذکرہ چھڑ جاتا تو کسی طرح انھیں سیری نہ ہوتی، میرا طبعی ذوق بھی یہی ہے، کبھی مجلس میں میں بزرگوں کا تذکرہ چھیڑ دیتا، اور بے تکان ان کے احوال واقعات واقوال بیان کرتا، کبھی گھنٹوں یہ سلسلہ بیان جاری رہتا مگر مولانا پہلو نہ بدلتے، بلکہ یکساں دلچسپی اور انشراح کے ساتھ سنتے، میں رکتا تو مزید کوئی بات چھیڑ کر سلسلہ کو دراز کر دیتے، کبھی کبھی صراحۃً فرمائش کرتے کہ بزرگوں کے احوال وواقعات سناؤ، اور میرا یہ حال ہوتا کہ دیوانہ را ہوئے بس است ہیں شروع ہو جاتا۔

ایک مرتبہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں، وہیں کے ایک استاذ میرے محب ومحبوب دوست جناب قاری شبیر احمد صاحب۔ جو ازراہ ظرافت کبھی کبھی مجھے "تذکرۃ الاولیا" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے ۔۔ کے کمرے میں ہم لوگ موجود تھے، حضرت مولانا صدر مجلس تھے کسی تقریب

سے بزرگوں کا تذکرہ چھڑ گیا، اور میں دیر تک اسی مبارک ذکر میں محو و منہمک رہا مولانا بھی اسی انہماک سے سنتے رہے، مولانا پان کے عادی تھے مگر اس وقت گفتگو کی محویت میں کسی کو پان کا خیال نہ رہا، خود مولانا بھی بھولے ہی رہے، بہت دیر کے بعد میں خاموش ہوا تو فرمایا:

قاری صاحب: اتنی دیر تک اتنی اچھی باتیں سنی ہیں، اب تو پان کا استحقاق ہوگیا ہے، سب لوگ ہنس پڑے اور پان کا دور چل پڑا۔

جامعہ رشیدیہ میں دار القرآن کا افتتاح ہوا تو اپنے شاگرد کو اس کے لئے بلوایا، وعظ کہلوایا، مسجد کے سنگ بنیاد کی تقریب تھی تو سواری بھیج کر بلایا، افتتاحی وعظ کہلوایا، سنگ بنیاد رکھوایا، غرض اپنے اس حقیر شاگرد پر نوازش و کرم کی بارش برساتے رہے، اب مولانا اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر چل دیئے تو تنہائی محسوس ہونے لگی اور جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

مولانا کا آبائی وطن مبارک پور سے چار پانچ کیلو میٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں بھوررہے بھورا ہل علم کی بستی ہے، مولانا کے والد مولوی محمد الیاس صاحب اصلاحی مرحوم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے تعلیم یافتہ تھے، نہایت خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے، حضرت مولانا ان کے تیسرے صاحبزادے تھے، دو بھائی مولانا سے پہلے تھے، جناب محمد شمیم صاحب جن کی وفات ابھی عید کے بعد ہوئی، دوسرے محمد محسن صاحب جو ماشاء اللہ بقید حیات ہیں، تیسرے مولانا تھے، مولانا سے چھوٹے حافظ محمد عرفان صاحب ان کے بعد جناب محمد احسان صاحب اور سب سے چھوٹے بھائی میرے رفیق درس جناب مولانا محمد رضوان صاحب ہیں، اور ایک بہن ہیں۔

مولانا کی پیدائش غالباً ۱۹۳۶ء یا اس کے کچھ آگے پیچھے ہوئی ہے، ابتداءً اپنے نانیہال بلریا گنج میں مڈل تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد عربی کی طرف متوجہ ہوئے، ذکاوت و ذہانت سے خوب بہرہ ور تھے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، دورۂ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ سے پڑھنے کی نوبت نہ آسکی کیونکہ ایک سال قبل حضرت کا وصال ہوگیا تھا، اور انھوں نے اپنی جگہ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ کو مقرر فرمادیا تھا

چنانچہ دورۂ حدیث کی تکمیل حضرت شیخ فخرالدین صاحبؒ سے کی۔

مولانا کا نکاح ان کے ماموں کی صاحبزادی سے ہوا تھا، تین اولادیں ہوئیں (۱) جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب جو دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد عرصہ تک جامعہ حسینیہ جونپور میں بحیثیت مدرس ومفتی کام کرتے رہے، اور اب دارالعلوم دیوبند میں عربی کے استاذ ہیں، ذہانت وذکاوت میں اپنے والد کی یادگار ہیں، رد شیعیت کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں، جمعیۃ علماء اور خانوادۂ مدنی کے ساتھ عشق وشیفتگی میں اپنے والد محترم کے صحیح جانشین ووارث ہیں، اللہ تعالیٰ علم وعمل میں ترقی بخشیں۔ دوسرے فرزند محمد زاہد سلمہٗ بلریا گنج میں دکان کرتے ہیں اور تیسرے فرزند محمد مجاہد سلمہٗ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم ہیں۔

اہلیہ کا انتقال کئی سال قبل ہوگیا، دوسرے عقد کے لئے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے بہت زور دیا مگر قبول نہیں کیا۔

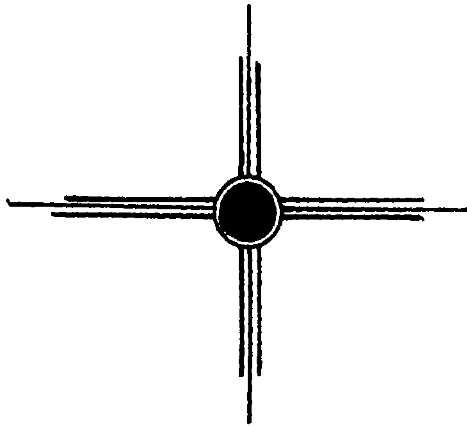
والد کے انتقال کے بعد بھائیوں میں جائیداد اور مکان کا بٹوارہ ہوا، تو مولانا نے مکان میں حصہ نہیں لیا بلکہ خالی زمین لی اور اپنے حصے کا کھیت فروخت کیا اور مکان اچھا سا بنوا لیا چھوٹے بھائی مولانا محمد رضوان نے بھی یہی کیا، مولانا نے اپنے مکان کے ساتھ ان کا مکان بھی بنوایا، دونوں بھائی اور بوڑھی والدہ ساتھ رہتی تھیں، والدہ بہت عمر رسیدہ تھیں، دونوں بھائیوں کو خدمت کا خوب موقع ملا، وہ ہر تھوڑی دیر پر مولانا کو پکارتیں اور مولانا دوڑے ہوئے ان کی خدمت میں جاتے، کام کچھ نہ ہوتا مگر مولانا اف نہ کرتے، اسی سال بقرعید کے بعد ان کا وصال ہوا اور ڈیڑھ پونے دو ماہ کے بعد مولانا بھی انھیں کی آغوش میں پہونچ گئے، شاید انھوں نے پکارا ہو، جیسے زندگی میں برابر پکارا کرتی تھیں۔

مولانا کی ساری زندگی دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا دوسروں کی فلاح وبہبود کے لئے کیا، خود اپنے لئے، اپنی دنیا کے لئے کچھ نہیں کیا، وہ دنیا سے اس طرح اٹھے ہیں جس طرح بط پانی سے پر جھاڑ کر نکل آتی ہے، ان کا ترکہ بھی بہت مختصر ہے، ان کے وارث بھی بہت کم ہیں صرف تین بیٹے، جنس ونقد کی قبیل سے شاید ان کے پاس کچھ نہ رہا ہو۔

جس دن ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے غالباً اسی روز مدرسہ کے ایک استاذ کو جنھیں مدرسہ کے حسابات لکھنے پر لگا رکھا تھا مدرسہ کا پورا حساب سمجھایا، اور ارشاد فرمایا کہ سب کچھ آپ سمجھ گئے، انھوں نے ہاں کہا، تو فرمایا کہ اگر خدانخواستہ میں بیمار پڑ جاؤں تو آپ لوگوں کو حساب سمجھائیں گے، انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا، مجھے سمجھائیے، انھوں نے حسب منشاء سمجھادیا تو مطمئن ہوئے اور غالباً اس سے ایک روز پہلے مسجد جو زیر تعمیر ہے اس کے تمام حسابات مسجد کے ایک ذمہ دار کو بتا کر ان کے حوالے کر دیا تھا۔

فالج کے حملے کے بعد دیکھا گیا تو ان کی جیب میں کل چودہ سو روپے تھے، معلوم ہوا کہ اس میں مدرسے کے سات سو روپے ہیں، اور مسجد کے دو سو اور باقی پانچ سو غالباً ترکہ ہے اس مرد خدا کی کل یہی دنیاوی کائنات تھی، مولانا کا شمار زمرۂ صوفیاء میں نہیں ہوتا، لیکن جس شان سے انھوں نے دنیا کو برتا ہے، بلکہ اسے ترک کیا ہے وہ زاہدان باصفا کی یادگار ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت کرے، ان کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے
عمل میں غلطی بہت ممکن ہے ہوئی ہو، لیکن نیت ان کی ہمیشہ دین اور
علم دین کے فروغ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی رہی ہے
اور خدا تعالیٰ کے یہاں نیتوں پر ہی مدار ہے، اللہ
تعالیٰ ان کی نیت کو قبول فرمائے اور روح
و رضوان سے نوازے۔ آمین



ایک مثالی خاتون

گذشتہ ماہ جناب مولانا بدرالدین اجملی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی والدہ محترمہ اللہ کو پیاری ہوگئیں، مرحومہ ایک عرصہ سے مختلف امراض میں گرفتار تھیں اور بہتر سے بہتر علاج کے وجود امراض کی شدت بڑھتی ہی رہی تاآنکہ فرشتۂ اجل پیغام رحلت لے کر آگیا، مرحومہ بڑی خوش قسمت اور نیک بخت خاتون تھیں، فیاض ازل نے انھیں مادی دولت و ثروت کے ساتھ حسن اخلاق اور صفات حمیدہ سے بھرپور نوازا تھا، آسام کے ان علاقوں میں جہاں پینے کے پانی کی قلت ہے سالانہ سو ڈیڑھ سو ہینڈ پائپ نصب کرانے کا معمول بنا لیا تھا، جس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا تھا، بچیوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لئے سیکڑوں خانگی مکاتب جاری کئے تھے، جن کے مصارف کا تکفل اپنی جیب خاص سے کرتی تھیں، سال میں ایک بار عیدالاضحیٰ کے موقع پر آسام جانے کا معمول تھا، اور جب تک وہاں قیام رہتا تھا ان کا گھر یتیموں بیواؤں اور ضرورت مندوں کا مرجع بنا رہتا تھا اور وہ ہر ایک کی حسب ضرورت امداد و اعانت نہایت فراخ دلی سے کرتی تھیں، اس طرح کے بہت سارے کار خیر وہ خاموشی کے ساتھ کرتی رہتی تھیں، اور دوسروں کو اس کی خبر تک نہ ہوتی تھی واقعہ یہ ہے کہ مرحومہ کی وفات سے صرف ان کے لڑکے اور پوتے وغیرہ ہی ماں کی ممتا اور ایک مشفق مربی و سرپرست سے محروم ہو گئے بلکہ نہ جانے کتنے بے سہاروں کا ظاہری سہارا ختم ہو گیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی رحمت و مغفرت سے ہم کنار کرے، اور انکے درجات کو بلند تر فرمائے۔ آمین۔

(حبیب الرحمٰن)

مسجد جدید، دارالعلوم دیوبند

جو اپنی تکمیل کیلئے اہل خیر حضرات کی توجہات کی منتظر ہے

دارالعلوم دیوبند کے ہمدردان ومعاونین حضرات کو جیسا کہ معلوم ہے کہ تقریباً ۸ سال ہوئے طلبہ کی کثرت تعداد کی بنا پر دارالعلوم میں ایک بڑی جدید مسجد کا کام اللہ تعالیٰ کے فضل پر توکل کرتے ہوئے دارالعلوم سے متصل ایک آراضی خرید کر شروع کر دیا تھا۔

الحمدللہ مسجد کا تعمیری کام بہت آگے بڑھ گیا ہے اور اس وقت فضل خداوندی اور اہل خیر حضرات کی توجہ سے تیسری منزل پر تعمیری کام جاری ہے اس مسجد سے طلبۂ دارالعلوم اور دیگر مسلمانوں کیلئے ایک وقت میں مسقف (چھت والے) حصہ میں جہاں چار ہزار نمازیوں کیلئے جگہ ہو جائیگی وہیں اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی طرف سے ایک صدقۂ جاریہ ہوگا اور وہ انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہونگے — حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کیلئے مسجد تعمیر کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں گھر عطا فرمائیں گے۔

تعمیری کام جاری رکھنے کیلئے اسوقت سرمایہ کی شدید ضرورت ہے

اس لئے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس مسجد کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ یہ مسجد دارالعلوم کے شایان شان جلد تعمیر ہو سکے۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کے لئے } "دارالعلوم دیوبند" اکاؤنٹ نمبر **30076** اسٹیٹ بینک آف انڈیا، دیوبند

منی آرڈر کیلئے } حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پن ۲۴۷۵۵۴

دار العلوم دیوبند کا ترجمان



دار العلوم

ماہ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۹۳ء

شمارہ نمبر ۱۰

جلد نمبر ۷۸

فی شمارہ ۶/=

سالانہ ۶۰/=

نگران: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دار العلوم دیوبند

مدیر: مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دار العلوم دیوبند

یہاں اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے۔

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ ۲۵۰/= روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم ۱۰۰/= روپے
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ۸۰/= روپے

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس اختر سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ کھیل گاؤں ڈھاکہ ۱۲۱۹ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے (منیجر)



یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام کے نام لیوا اور اس کے شیدائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے مخالفین ومعاندین کی تعداد ہر دور اور ہر زمانہ میں زیادہ رہی ہے اور اسلام کو اپنے ابتدائے قیام سے آج تک نہ جانے کتنے فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

لیکن اس تاریخی شہادت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ علمائے اسلام اور صلحائے امت نے ان تمام فتنوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا ہے اور اسلام کے حریفوں کو ہر محاذ پر شکست دے کر اسلام کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔

چنانچہ اسلام پر اوّل ترین حملہ مادیت کی راہ سے ہوا، موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت وثروت کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں تعیش اور راحت پسندی کا عمومی رجحان پیدا ہوگیا تھا جس سے یہ خطرہ ہو چلا تھا کہ خدانخواستہ ملت اسلامیہ بھی اگلی امتوں کی طرح تعیش کی نذر نہ ہو جائے اس فتنہ کے مقابلہ کیلئے حضرات تابعین کی جماعت میدان میں نکل پڑی اور اپنے وعظ ونصیحت، دعوت وتبلیغ اور حرارت ایمانی کے ذریعہ مادیت کے اس سیلاب بلاخیز کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور امت کو اس طوفان سے بچا لیا۔

اس کے بعد اسلام پر دوسرا حملہ عقلیت کی راہ سے ہوا، یونانی فلسفہ نے سطحی ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے کر اسلامی عقائد واعمال کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جس سے متأثر ہو کر امت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ایک کی قیادت فقہاء اور محدثین کر رہے تھے اور دوسرے کی عقلیت زدہ معتزلہ، یہ فتنہ چونکہ علمی انداز میں برپا کیا گیا تھا اور بدقسمتی سے حکومتِ وقت کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی تھی اس لئے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ اسلامی علوم و عقائد یونانی افکار ونظریات کے مقابلہ میں اپنی توانائی اور سربلندی قائم نہ رکھ سکیں گے، ان سنگین حالات میں علماء ہی کی صف سے ایک بزرگ سر سے کفن باندھ کر میدان میں کود پڑے اور اس جرأت واستقامت کے ساتھ کہ خلیفۂ وقت مامون الرشید کے تہدیدی فرامین اور معتصم باللہ کے طوق وسلاسل اور تازیانے ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کرسکے، بالآخر اس مردِ جلیل کی ثابت قدمی کی برکت سے یہ فتنہ سرد پڑگیا اور امت ایک عظیم وتباہ کن خطرہ سے مامون ومحفوظ ہوگئی۔

تیسری صدی میں معتزلہ نے اپنی عقلیت پسندی اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کے سہارے اس سوئے ہوئے فتنہ کو پھر سے جگانا چاہا، لیکن امام ابوالحسن اشعری جو پہلے انھیں کے کیمپ کے ایک فرد تھے اور ان کے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھے ان کے مقابلہ میں آگئے اور بحث ومناظرہ اور زبانی تفہیم وتقریر کے ذریعہ ان کے حوصلوں کو پست کردیا اور آئندہ ان کے مقابلہ کے لئے ایک سو سے زائد نہایت اہم اور وقیع کتابیں بھی تصنیف کردیں اور ساتھ ہی اپنے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی تیار کردی جس نے ہر علمی محاذ پر معتزلہ کا تعاقب کیا اور انھیں میدان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

معتزلہ کی اس شکست کے بعد اسی فلسفۂ یونان کی کوکھ سے ایک نئے فتنہ نے جنم لیا جو اسلام کے حق میں اعتزال سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ تھا باطنیت کا فتنہ، اس فتنہ کے بانیوں نے اپنی ذہانت اور یونانی فلسفے کی مدد سے دین اسلام کے اصول ونصوص اور قطعیات میں تحریف وتنسیخ کا دروازہ کھول دیا اور اسی کے ساتھ اسلام واہل اسلام کے خلاف قوت وطاقت کا مظاہرہ بھی کیا، جس کی بنا پر اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں اور اسلام کی بہت سی منتخب شخصیتیں اس تشدد آمیز فتنہ کا شکار ہوگئیں۔

اس عظیم فتنہ کی سرکوبی کے لئے بھی صف علماء ہی سے ایک مرد کامل آگے بڑھے جنھیں ہم امام غزالی کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں، انھوں نے براہ راست باطنیوں سے مقابلہ آرائی کے بجائے فلسفۂ یونان کو نشانہ بنایا جو اکثر فرق باطلہ کا ماخذ و مصدر تھا اور اپنے علمی تبحر و قوت استدلال سے اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں اور ان فتنوں کے چشموں کو ہمیشہ کیلئے بند کردیا، امام غزالی کے ساتھ اس اہم خدمت میں امام رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی بھلائے نہیں جاسکتے

خیر یہ سارے واقعات تو زمان و مکان کے اعتبار سے آپ سے دور تر ہیں، خود اپنے ملک ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالئے، عہد اکبری میں "دین الٰہیہ" کے عنوان سے اسلام کے خلاف جو عظیم فتنہ رونما ہوا تھا، جس کی پشت پر اکبر جیسے مطلق العنان فرماں روا کی جبروتی طاقت بھی تھی، لیکن حضرت مجدد الف ثانی رح اور شیخ عبدالحق دہلوی اور ان کے ہمنوا علماء نے اپنے پایۂ استقامت سے اس فتنہ کے سر کو ہمیشہ کیلئے کچل دیا۔

اور اس آخری دور میں سلطنت برطانیہ کے جلو میں الحاد و زندقہ کا فتنہ نمودار ہوا تھا اس کے مقابلہ میں بھی اگر کوئی جماعت نبرد آزما نظر آتی ہے تو وہ علماء ہی کی جماعت ہے، جنھوں نے سفید فام انسان نما وحشی درندوں کے ہر جور و ستم کو برداشت کرکے اسلام اور آئین اسلام کی حفاظت کی اور شہر شہر، قصبہ قصبہ، اور قریہ قریہ مدارس کی شکل میں ان کی چھاؤنیاں قائم کرکے پورے ملک میں اسلام کے سپاہیوں کا ایک جال بچھا دیا۔

اور خدا کا شکر ہے کہ اسلام کے یہ سپاہی آج بھی اسلام کے عقائد و اعمال کی حفاظت و اشاعت میں پورے طور پر مصروف ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام کی جڑیں دیگر بلاد اسلامیہ کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں زیادہ مضبوط ہیں اور ہم بحمد اللہ اس پوزیشن میں ہیں کہ معاندین اسلام کی آنکھوں سے آنکھیں ملاکر کہہ سکتے ہیں ؎

ادھر آ اے ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

اس لئے آج کے نام نہاد اسلام کے ہمدردوں کو علمائے اسلام پر اعتراض کرنے سے پہلے ان کے کارناموں پر غور کرنا چاہئے، مجھے یقین ہے کہ جو لوگ جماعت علماء پر قوم کے

استحصال کا الزام لگاتے ہیں اگر انھیں اسلامی علوم و عقائد اور دینی اخلاق و کردار کے تحفظ و بقا اور اس کے استحکام و اشاعت کے سلسلے میں علمائے اسلام کی خدمات سے ادنیٰ واقفیت بھی ہوتی تو وہ انھیں مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے ان کے شکر گذار ہوتے

تاریخ اور تجربہ کی بنیاد پر بلا خوف تردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ دور میں اور آئندہ بھی علمائے دین ہی کی جماعت اسلام اور مسلمانوں کی پشتیبان بن سکتی ہے، بلند بانگ دعوؤں خوش کن تجویزوں اور جذباتی تقریروں سے کچھ دیر کیلئے گرمیٔ محفل کا سامان فراہم کیا جاسکتا ہے اور ہوش سے عاری پرجوش نوجوانوں سے زندہ باد کا نعرہ بھی لگوایا جاسکتا ہے، لیکن ان خالی دعوؤں سے کسی سنجیدہ، مستحکم، اور ٹھوس نتائج کی توقع نہیں کی جاسکتی، کیونکہ بقول امام مالکؒ ماضی سے مضبوط رشتہ کے بغیر امت کی صلاح و فلاح کا تصور ایک فریب ہے اور آج جو بھی ملت کے درد سے بے چین ہو کر اٹھتا ہے وہ سب سے پہلے ملت کے ماضی ہی پر تیشہ چلاتا ہے، آج کل کے نوخیز متجددین کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ماضی کے آئینہ کو داغدار بنا کر تابندہ حال اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنا سراب کو آب زلال سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہونا ہے، اسلاف کے نقش قدم سے ہٹ کر جو کارواں بھی زندگی کی راہوں کی تلاش میں نکلے گا وہ مقبروں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جائے گا



ایک مجلس کی تین طلاقیں

از
مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

قسط ۲

(۲) سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے ایک بڑے مجمع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا تو اس کے بعد عرض کیا کذبت علیہا یا رسول اللہ ان امسکتہا فطلقہا ثلاثا قبل ان یامرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری شریف باب من اجاز طلاق الثلاث ج ۲، ص ۷۹۱، ومسلم شریف ج ۱، ص ۴۸۹)

"یا رسول اللہ اگر میں اسے اپنے پاس روک رکھوں تو میں نے اس پر جھوٹ باندھا اس کے بعد اسے تین طلاقیں دیدیں قبل اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں حکم دیتے۔

امام نووی رح نے بحوالہ امام جریر طبری لکھا ہے کہ لعان کا یہ واقعہ ۹ھ کا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آیت پاک " الطلاق مرتان " کے ایک عرصہ بعد یہ پیش آیا ہے، حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کی غیرت متقاضی تھی کہ اس بیوی سے فی الفور مفارقت ہو جائے اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ نفس لعان سے تفریق نہیں ہو گی نہ ایک یا دو طلاقوں سے قطعی جدائی ہو گی، اس لئے انھوں نے یہ کہتے ہوئے کہ اے رسول اللہ اگر لعان کے بعد بھی اسے اپنے نکاح میں باقی رکھوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس پر بہتان تراشی کی اسی مجلس میں تین طلاقیں دیدیں۔

اس حدیث کو امام مسلم نے متعدد طرق سے روایت کیا ہے، دیگر ائمہ حدیث نے بھی

اس کی تخریج کی ہے، مگر کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک مجلس دی گئی اس طلاق کو کالعدم یا ایک قرار دیا ہو بلکہ اس کے برعکس اسی واقعہ سے متعلق ابوداؤد کی روایت میں تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طلاقوں کو نافذ فرمادیا، روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

فطلقها ثلاث تطليقات عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فانفذه رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان ما صنع عند رسول الله صلى الله عليه وسلم سنة (ابوداؤد ج ۱ ص ۳۰۶)

۔ عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تین طلاقیں دیدیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نافذ فرمادیا، اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کیا وہی لعان میں طریقہ عمل قرار پایا: اس روایت پر امام ابوداؤد اور محدث منذری نے کسی قسم کا کوئی کلام نہیں کیا ہے، اور سنن ابی داؤد کی کسی روایت پر دونوں کا سکوت محدثین کے نزدیک اس کے قابل احتجاج ہونے کی علامت ہے، مزید برآں شوکانی نے "نیل الاوطار" میں اس حدیث کے بارے میں تصریح کی ہے کہ "رجاله رجال الصحيح" اس حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں، اصول محدثین کے اعتبار سے اس ثابت شدہ روایت میں صحابی رسول حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تصریح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ کی ایک مجلس میں دی ہوئی تینوں طلاقوں کو نافذ فرمادیا، اس کی روشن دلیل ہے کہ بیک مجلس دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، امام المحدثین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم ابواب کی نکتہ آفرینیوں سے واقف اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے "باب من اجاز (جوز) طلاق الثلاث" کے تحت حضرت سہل بن سعد کی روایت لاکر ابوداؤد کی روایت میں آئی ہوئی اسی زیادتی کی جانب اشارہ کیا ہے، ابوداؤد کی یہ روایت چونکہ ان کی شرائط کے مطابق نہیں تھی اس لئے متن میں اسے نہ لاکر ترجمۃ الباب سے اس کی طرف اشارہ کردیا، امام نسائی جیسا جلیل القدر امام حدیث بھی حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کے تین طلاقوں کو تین ہی بتا رہا ہے۔

۔ باب من الرخصة فی ذلك" (ایک مجلس میں تین طلاقوں کی رخصت کا باب) کے ذیل میں ان کا اس حدیث کا ذکر کرنا اس کا کھلا ثبوت ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں یہ ایسی پختہ اور بے غبار دلیل ہے کہ اگر اس کے علاوہ اور دلیل نہ ہوتی تو تنہا یہی کافی تھی، اس حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں یہ کہنا کہ خود لعان ہی سے عویمر رض اور ان کی بیوی کے درمیان فرقت ہوگئی تھی اور ان کی بیوی اجنبیہ ہوجانے کی بنا پر محل طلاق تھیں ہی نہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس طرح طلاق دینے پر سکوت فرمایا، اور ابو داؤد کی روایت " فانفذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کا یہ مفہوم بتانا کہ لعان سے جو تفریق ہوگئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تنفیذ کے ذریعہ اس فرقت کو واضح اور لازم کردیا علم وتحقیق کی نظر میں مجادلہ ومشاغبہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا اس لئے اس تاویل کی تمام تر بنیاد اس بات پر ہے کہ نفس لعان ہی سے زوجین کے درمیان مفارقت ہوجاتی ہے اور یہ بات خود محل نظر ہے کیونکہ لعان سے زوجین کی فرقت پر نہ لعان کا لفظ دلالت کرتا ہے اور نہ ہی کسی آیت یا کسی صریح حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، عربی زبان وادب سے واقف کون نہیں جانتا کہ " لعان " کے لغوی معنی ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے کے ہیں اور قرآن حکیم نے فعل لعان کو " شہادت " کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ارشاد خداوندی ہے

والذین یرمون ازواجھم ولم یکن لھم شھداء الا انفسھم فشھادۃ احدھم اربع شھادات باللہ " اور جو لوگ زنا کی تہمت لگائیں اپنی بیویوں پر اور ان کے پاس بجز اپنی ذات کے کوئی گواہ نہ ہو تو ایسے شخص کی گواہی کی صورت یہ ہے کہ چار بار گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر، اور حدیث میں اسے یمین (قسم) کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اور شہادۃ یمین میں سے کوئی بھی مفارقت کے معنی کو نہیں چاہتا، خود حافظ ابن القیم لکھتے ہیں۔

ولفظ اللعان لا یقتضی فرقۃ فانہ اما یمان علی زنا واما شھادۃ وکلاھما لا یقتضی فرقۃ (زاد المعاد ج ۲، ص ۲۰۶) اور لعان کا لفظ فرقت کو نہیں چاہتا، کیونکہ لعان یا تو زنا پر قسمیں کھانے کے معنی میں ہے اور یا تو گواہی دینے کے معنی میں، اور قسم وگواہی دونوں فرقت کو نہیں چاہتیں۔

قرآن حکیم کی کسی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صریح حدیث سے بھی ثابت نہیں ہے کہ نفس لعان ہی سے زوجین کے درمیان فرقت ہوجائے گی، بلکہ درحقیقت ایک ضروری مصلحت کے تحت لعان کی بنا پر فرقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رشتۂ ازدواج

کو زوجین کے مابین رحمت و محبت کا وسیلہ بنایا ہے اور اسی رشتہ کی بنا پر زوجین ایک دوسرے سے سکون و چین حاصل کرتے ہیں، لیکن شوہر کی جانب سے بیوی پر زنا کا الزام عائد کرنے کے بعد باہمی رحمت و محبت کا یہ تعلق باقی نہیں رہ پاتا اور ایک دوسرے سے باہمی مخلصانہ ربط و ضبط نفرت و عار سے بدل جاتا ہے، ایسی صورت میں زوجین کی ظاہری مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ان میں فرقت اور جدائی ہو جائے، اس تفصیل سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ لعان سے فرقت کوئی امر قطعی نہیں بلکہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے، اسی لئے فقہاء مجتہدین اس میں مختلف الرائے ہیں، چنانچہ امام ابو عبید کے نزدیک لعان کے بجائے "قذف" یعنی بیوی پر زنا کا الزام لگانے ہی سے فرقت ہو جائے گی، امام جابر بن زید (تلمیذ حضرت ابن عباس رضؓ و یکے از فقہائے تابعین) عثمان البتی، محمد بن صفرہ اور فقہائے بصرہ کی ایک جماعت کے نزدیک لعان سے فرقت ہوگی ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی شوہر کو اختیار ہے کہ بیوی کو بیوی بنائے رکھے، فقہائے احناف کا مسلک یہ ہے کہ لعان سے فرقت نہیں ہوگی بلکہ شوہر کو لعان کے بعد طلاق دینے، ظہار و ایلاء کرنے کی شرعاً گنجائش ہے، البتہ لعان کے بعد اسی مذکورہ مصلحت کے پیش نظر شوہر پر ضروری ہے کہ طلاق دیکر عورت کو اپنے سے الگ کردے، اور لعان کے برقرار رہتے ہوئے اگر شوہر طلاق نہ دیگا تو قاضی شرعی دونوں کے درمیان تفریق کردیگا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ زوجین کے لعان سے فراغت کے بعد اسی لعان سے فرقت واقع ہو جائے گی، ایک روایت میں یہی مذہب امام احمد بن حنبل کا بھی ہے اور ان کا دوسرا قول احناف کے مسلک کے مطابق ہے اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ صرف شوہر کے لعان ہی سے (عورت کے لعان سے پہلے) فرقت ہو جائے گی (زاد المعاد ج ۲ ص ۳۰۷، و فتح الملہم ج ۳، ص ۵۰۷)

فقہائے مجتہدین کے مذاہب کی اس تفصیل سے واضح ہے کہ لعان سے تفریق ایک امر اجتہادی ہے اور حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کا لعان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین طلاق دینا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر سکوت اور بروایت ابوداؤد آپ کا تینوں طلاقوں کو نافذ کردینا ایک امر منصوص ہے، اور ظاہر ہے کہ مسئلہ اجتہادی کے مقابلہ میں ترجیح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل ہی کو ہوگی، یہی تمام محدثین و فقہاء کا مسلک

ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر اور عمل کو نظر انداز کر کے یہ کہنا کہ لعان کی وجہ سے فرقت ہو گئی تھی اور حضرت عویمر رضی اللہ عنہ کی طلاق بے موقع تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور " فانفذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " کے صریح اور حقیقی معنی کو چھوڑ کر اسے زبردستی مجازی معنی پہنانا صحیح نہیں ہے بالخصوص جو لوگ اپنے آپ کو اہل حدیث کہلاتے ہیں اور دوسروں کو اہل الرائے ہونے کا طعنہ دیتے ہیں ان کے لئے تو یہ رویہ قطعی زیب نہیں دیتا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دلالت تقریر یا عمل کے مقابلے میں ایک مسئلہ اجتہادی کو فوقیت دیں اس لئے اس صریح و متفق علیہ روایت کے مقابلہ میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ محض مجادلہ و مشاغبہ ہی ہے جس کی اہل انصاف کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

(۲) وعن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان رجلا طلق امرأته ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا حتی یذوق عسیلتها کما ذاق الاول ،

(بخاری ج ۲ ص ۷۹۱ ، ومسلم ج ۱ ، ص ۴۶۳)

: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں، عورت نے دوسرا نکاح کر لیا، اس شوہر نے طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، کیا یہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہو گئی، آپ نے فرمایا نہیں تاوقتیکہ دوسرا شوہر پہلے کی طرح لطف اندوز صحبت نہ ہو پہلے کے لئے حلال نہیں ہو گی "

اس حدیث کو امام بخاری نے " باب من اجاز (او جوز) طلاق الثلاث " کے تحت ذکر کیا ہے اور اس حدیث سے پہلے حضرت رفاعہ قرظی کے طلاق کے واقعہ کو ذکر کیا ہے، لہذا حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی حضرت رفاعہ کے قصہ پر محمول کیا جائے تو یہ تکرار بے فائدہ ہو گی جو امام بخاری کی عادت کے خلاف ہے، علاوہ ازیں جب دو حدیثیں مختلف سند اور مختلف سیاق سے وارد ہوں تو اصل یہی ہے کہ وہ دونوں دو الگ الگ حدیثیں ہیں اس لئے بلا وجہ اصل کو چھوڑ کر غیر اصل پر محمول کرنا یکسر تحکم ہے جو بحث و تحقیق کی دنیا میں لائق التفات نہیں ہے ۔

(۳) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسئلہ دریافت کیا گیا :

"عن الرجل یتزوج المرأۃ فیطلقها ثلاثا فقالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تحل للاول حتی یذوق الاخر عسیلتها وتذوق عسیلته (مسلم ج ۱ ص ۴۶۳۔ سنن الکبریٰ مع الجوہر النقی ج ۷، ص ۳۷۴، ۳۷۵ واللفظ لہ) دار قطنی ج ۲، ص ۴۳۸، پر بھی یہ حدیث ہے البتہ دار قطنی کے الفاظ یہ ہیں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا طلق الرجل امرأته ثلاثا لم تحل لہ الخ)

کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرتا ہے پھر اسے تین طلاق دیتا ہے تو کیا اب پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ عورت پہلے شخص کے حلال نہیں ہوگی تا وقتیکہ دوسرا شوہر اس کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہو جائے اور یہ عورت اس سے لطف اندوز نہ ہوجائے"

(۴) وعن انس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن رجل کانت تحته امرأۃ فطلقها ثلاثا فتزوجها بعدہ رجل فطلقها قبل ان یدخل بها اتحل لزوجها الاول فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا حتی یذوق الاخر ماذاق الاول من عسیلتها وذاقت عسیلته، رواہ احمد والبزار وابویعلی الا انہ قال، فمات عنها قبل ان یدخل بها" والطبرانی فی الاوسط ورجاله رجال الصحیح خلا محمد بن دینار الطاحی وقد وثقه ابوحاتم وابو زرعة وابن حبان وفیہ کلام لایضر (مجمع الزوائد، ج ۴، ص ۳۴۰)

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی تھیں اور اس نے کسی اور مرد سے نکاح کر لیا تھا اور اس دوسرے شوہر نے خلوت سے پہلے ہی اسے طلاق دیدی تھی، کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک یہ دوسرا شوہر اس کی صحبت سے لطف نہ اٹھالے اور عورت اس کی صحبت کا مزہ نہ چکھ لے پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی، اس حدیث کی امام احمد، امام بزار، اور امام ابویعلی نے اپنے اپنے مسانید میں تخریج کی ہے، البتہ ابویعلی کی روایت میں "فطلقها قبل ان یدخل بها" کی بجائے "فمات عنها قبل ان یدخل بها" ہے اور امام طبرانی

نے معجم اوسط میں اس کا ذکر کیا ہے، محمد بن دینار الطاحی کے علاوہ اس کی سند کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں اور محمد بن دینار کی امام ابو حاتم، امام ابوزرعہ اور ابن حبان نے توثیق کی ہے اور بعض ائمہ جرح نے ان کے بارے میں جو کلام کیا ہے وہ ان کی ثقاہت کے لئے مضر نہیں ہے"۔

چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"صدوق سیٔ الحفظ ورمی بالقدر وتغیر قبل موتہ (مجمع الزوائد ج ۴، ص ۲۲۰) سیٔ الحفظ کی روایت حسن کے درجہ سے کم نہیں ہوتی اور حسن سب کے نزدیک قابل احتجاج ہے، علاوہ ازیں اس روایت کی تائید اوپر مذکور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دونوں روایتوں سے ہوتی ہے اس لئے اس کی تائید سے یہ صحیح لغیرہ کے درجہ میں پہنچ جائے گی اسی بناء پر امام ہیثمیؒ نے لکھا ہے " وفیہ کلام لایضر"

ان تینوں حدیثوں میں طلق ثلاثا کا ظاہر یہی ہے کہ تینوں طلاقیں ایک ساتھ دی گئی تھیں چنانچہ حافظ ابن حجر حضرت عائشہ صدیقہ رضی کی حدیث بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں " فالتمسك بظاهر قوله طلقها ثلاثا فانه ظاهر في كونها مجموعة " یعنی امام بخاری کا استدلال طلقہا ثلاثا کے ظاہر سے ہے، کیونکہ اس کا ظاہر تین مجموعی طلاقوں کو ہی بتا رہا ہے، اور نص کا مدلول ظاہر بلا اختلاف سب کے نزدیک قابل استدلال اور واجب العمل ہوتا ہے، جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مصرح ہے، علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سائل سے بغیر یہ تفصیل معلوم کئے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں دی گئی ہیں یا الگ الگ تین طہروں میں یہ جواب دینا کہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے شوہر کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہولے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ تین طلاقیں جس طرح سے بھی دی جائیں گی تین ہی ہونگی

پھر "انت طالق ثلاثا" کا جملہ یا " طلق ثلاثا " تین طلاقیں دیدیں سے بیک تلفظ تین طلاقوں کا مراد لینا زبان وادب کے لحاظ سے بغیر کسی شک وشبہ کے درست ہے، چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ جلیل امام ابو یوسف نے نحو کے عظیم المرتبت استاذ امام کسائی سے عربی شاعر کے درج ذیل شعر ؎

فانت طالق والطلاق عزيمة ثلاثا يخرق اعق واظلم

کے بارے میں سوال کیا کہ اس شعر میں عزیمۃ ثلاث وثلاثا کو مرفوع ومنصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے، لہٰذا بتائیے کہ رفع کی صورت میں کتنی اور نصب کی صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی، امام کسائی نے جواب دیا جس نے "عزیمۃ ثلاث" رفع کے ساتھ پڑھا اس نے صرف ایک طلاق دی اور اپنی بیوی کو بتادیا کہ طلاق قطعی تو تین ہیں، اور جس نے ثلاثا نصب کے ساتھ پڑھا تو اس نے اکٹھی تینوں طلاقیں واقع کردیں اور بیوی کو اپنے سے علیحدہ کردیا کیونکہ اس صورت میں یہ" انت طالق ثلاثا" کے معنی میں ہے یعنی تجھ پر تین طلاقیں ہیں اور یہ طلاق قطعی ہے

(الاشباہ والنظائر از امام سیوطی ج ۳، ص ۲۴۲،۲۴۳)

امام النحو الکسائی کے اس جواب سے بصراحت یہ بات معلوم ہوگئی کہ " انت طالق ثلاثا" کا جملہ نحو اور محاورہ کے اعتبار سے صحیح ہے اور اس طرح طلاق دینے سے تینوں طلاقیں بیک وقت پڑجائیں گی۔

علاوہ ازیں سنن الکبریٰ میں صحیح سندوں کے ساتھ روایتیں موجود ہیں جن میں مذکور ہے "طلق رجل امرأته عدد النجوم" کسی نے اپنی بیوی کو بقدر ستاروں کی تعداد کے طلاق دیدی، بعض روایتوں میں ہے " طلقت امرأتي مائة" میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدیں بعض میں یہ الفاظ ہیں" طلق امرأته الفا" فلاں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدیں (سنن الکبریٰ مع الجواہر النقی ج ۷، ص ۳۳۷ - ۳۳۸) مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، دار قطنی وغیرہ کتب حدیث میں اس طرح کی مزید مثالیں مل سکتی ہیں، یہ روایتیں اس باب میں گویا صریح ہیں کہ مذکورہ طلاقیں بیک تلفظ دی گئی ہیں، کیونکہ اگر یہ طلاقیں الگ الگ مختلف مجلسوں میں مانی جائیں تو لازم آئے گا کہ عہد تابعین میں جو اسلامی علوم وفنون کا عہد زریں کہلاتا ہے لوگ طلاق کی آخری حد سے بھی واقف نہیں تھے کہ تین طلاقوں کے بعد بھی مزید طلاقیں دے دیا کرتے تھے اور اس دور کے بارے میں یہ خیال بلاشبہ درست نہیں ہے، اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انت طالق ثلاثا یا طلق ثلاثا سے اکٹھی تین طلاقیں مراد لینا صحیح نہیں خود ان کا یہ دعویٰ ہی صحیح نہیں ہے اور اپنے اس دعوی کے ثبوت میں وہ کوئی صحیح دلیل پیش نہیں کرسکتے۔

(۵) عن الحسن قال حدثنا عبد اللہ بن عمر انہ طلق امرأتہ تطلیقۃ وھی حائض ثم اراد ان یتبعھا تطلیقتین اخراوین عند القرئین الباقیین فبلغ ذالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا ابن عمر ما ھکذا امرک اللہ انک قد اخطات السنۃ والسنۃ ان تستقبل الطھر فتطلق لکل قرء قال فامرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فراجعتھا ثم قال اذا طھرت فطلق عند ذالک او امسک فقلت یا رسول اللہ افرأیت لو انی طلقتھا ثلاثا کان یحل لی ان اراجعھا قال کانت تبین منک وتکون معصیۃ قلت (الھیثمی) لابن عمر حدیث فی الصحاح بغیر ھذا السیاق، رواہ الطبرانی وفیہ علی ابن سعید الرازی قال الدارقطنی "لیس بذالک، وعظمہ غیرہ وبقیۃ رجالہ ثقاۃ (مجمع الزوائد، ج ۴، ص ۳۳۶، وسنن الکبریٰ مع الجواہر النقی ج ۷، ص ۳۳۰، ودارقطنی ج ۲، ص ۴۳۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو بحالت حیض ایک طلاق دیدی پھر ارادہ کیا کہ بقیہ دو طلاقیں "قرء" کے وقت دیدیں یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچی تو آپ نے فرمایا اے ابن عمرؓ اس طرح اللہ نے تم کو طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے تونے طریقۂ شرعی میں غلطی کی، طریقہ یہ ہے کہ توطہر کا انتظار کرے پھر طلاق دے ہر طہر میں، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے رجعت کا حکم دیا تو میں نے رجعت کرلی، پھر فرمایا کہ جب پاک ہوجائے تو ہر پاکی میں ایک طلاق دو یا روک لو، تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتائیں اگر میں اسے تین طلاقیں دیدیتا تو کیا میرے لئے رجعت حلال ہوتی، آپ نے فرمایا نہیں وہ تم سے جدا ہوجاتی، اور تمھاری یہ کارروائی معصیت ہوتی۔

علامہ ہیثمی کہتے ہیں کہ صحاح میں ابن عمرؓ کی حدیث اس سیاق کے بغیر ہے، اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے، اس کے سب راوی ثقہ ہیں، بجز علی بن سعید رازی کے انھیں دارقطنی نے "لیس بذاک" کہا ہے اور باقی علمائے جرح وتعدیل ان کی عظمت کے معترف ہیں، انتہی کلامہ۔

چنانچہ حافظ ابن حجر انھیں "الحافظ رحّال" کہتے ہیں، امام ابن یونس کہتے ہیں کہ یہ صاحب فہم وحفظ تھے اور مسلمہ بن قاسم ان کو ثقہ وعالم بالحدیث کہتے ہیں (لسان المیزان ج ۴ ص ۲۳۱)

سنن دارقطنی میں اس حدیث کی سند کے رجال یہ ہیں "علی بن محمد بن عبید الحافظ نا محمد بن شاذان الجوہری نا معلی بن منصور نا شعیب بن زریق ان عطاء الخراسانی حدثہم عن الحسن قال نا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ" اور سنن الکبری کی سند یوں ہے "اخبرنا ابو عبداللہ الحافظ (المعروف بالحاکم صاحب المستدرک) وابوبکر احمد بن الحسن القاضی قالا انا ابو العباس محمد بن یعقوب نا ابوامیہ الطرسوسی نا معلی بن منصور الرازی نا شعیب بن زریق ان عطاء الخراسانی حدثہ عن الحسن قال حدثنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ۔

حافظ ابن القیم نے سند کے ایک راوی شعیب بن زریق کو ضعیف کہا ہے اور انھیں کی وجہ سے اس حدیث کی تضعیف کی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ حافظ ابن القیم کا شعیب کو ضعیف قرار دینا بالکل بیجا ہے، اس لئے ائمہ جرح وتعدیل میں سے کسی نے ان تضعیف نہیں کی ہے ہاں ابوالفتح ازدی نے بیشک ان کو لین کہا ہے اور یہ نہایت کمزور جرح ہے علاوہ بریں ابوالفتح ازدی کی جرحیں محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں، اس لئے وہ خود ضعیف وصاحب مناکیر اور غیر مرضی ہیں، پھر وہ بے سند وبے وجہ جرح کیا کرتے ہیں، اسی طرح اس سند کے دوسرے راوی عطاء خراسانی کے بارے میں بعض حضرات نے کلام کیا ہے، لیکن یہ کلام بھی اصول محدثین کے اعتبار سے غیر مضر ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر حدیث و ماہرین رجال وائمہ مسلمین نے ان سے روایت کی ہے بلکہ ان کے شاگردوں میں ایسے حضرات بھی ہیں جن کا کسی سے روایت کرلینا اس کی ثقاہت کی کافی سند ہے جیسے امام شعبہ، امام مالک اور امام ابوحنیفہ، معمر، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ، پھر امام بخاری کے علاوہ جملہ اصحاب صحاح نے ان کی روایتیں لی ہیں اور امام مسلم نے تو احتجاج بھی کیا ہے جو ان کی ثقاہت کی بین دلیل ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے الاعلام المرفوعہ از محدث اعظمی ص ۴ تا ۸) علاوہ ازیں عطاء خراسانی اس روایت میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ ان کے متابع شعیب بن زریق ہیں کیونکہ اس روایت کو شعیب بلاواسطہ امام حسن بصری سے روایت کرتے ہیں اور عطاء کے واسطے سے بھی، چنانچہ امام طبرانی کہتے ہیں "حدثنا علی بن سعید الرازی حدثنا یحیی بن عثمان بن سعید بن کثیر الحمصی، حدثنا شعیب بن زریق قال حدثنا الحسن حدثنا عبداللہ بن عمر الحدیث (براہین الکتاب والسنۃ للشیخ سلامۃ القضاعی، ص ۴۴) اس لئے

عطاء الخراسانی کے تفرد کی بنا پر اگر کچھ ضعف تھا تو وہ بھی ختم ہوگیا، محدثین کا یہ بھی اصول ہے کہ مرسل روایت یا ایسی مسند روایت جس میں کچھ ضعف ہو اور جمہور ائمہ کا اس پر تعامل ہو تو اس تعامل سے وہ ضعف ختم ہوجاتا ہے۔

" واذا ورد حدیث مرسل او فی احدنا وعلیہ ضعف بوجدنا ذالک الحدیث مجمعا علی اخذ، والقول بہ علمنا یقینا انہ حدیث صحیح لاشک فیہ

(توجیہ النظر الی اصول الاثر، ص ۵۰)

جب کوئی حدیث مرسل ہو یا اس کے کسی راوی میں ضعف ہو اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس پر عمل کرنے میں ائمہ مجتمع ہیں تو ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہوجائے گا کہ اس حدیث کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔

اس لئے بلاشبہ یہ حدیث لائق احتجاج اور قابل استدلال ہے اور اس مسئلہ میں نص صریح ہے کہ اکٹھی تین طلاقوں سے عورت نکاح سے بالکلیہ خارج ہوجائے گی اور رجعت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی، البتہ اس طرح طلاقیں دینا خلاف شرع ہے اس لئے ایسا کرنا معصیت شمار ہوگا۔　　(جاری)

بقیہ نصاب زکوٰۃ

۵۔ زکوٰۃ فنڈ کے توازن معاشیاتی اور انفع للفقراء کے اصول کے تحت بھی چاندی ہی کو معیار نصاب زکوٰۃ بنانا مناسب ہے۔

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں اور خود اسلاف میں بھی اس رائے کا وجود کہ صرف چاندی ہی کو معیار نصاب تسلیم کیا جائے، اور اگر سونا ۔ ۵ اوقیہ چاندی کی قیمت کے بقدر موجود ہو اور خواہ وہ بیس مثقال یعنی ۷½ تولہ سے کم ہی ہو پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جائے یہی فیصلہ مناسب ہے کہ معیار نصاب صرف چاندی ہے سونا نہیں اس فیصلہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ آج بھی زکوٰۃ سکہ رائج الوقت سے حساب لگا کر دیا جاتا ہے، اور مال مختلف النوع ہوتا ہے جس میں فقہاء چاندی ہی کو معیار بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

جناب حکیم ظل الرحمٰن صاحب، سنہری مسجد، چاندنی چوک دہلی

نصابِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کے کسی بھی ضمنی عنوان کو سمجھنے کے لئے وجوبِ زکوٰۃ کا پس منظر سمجھنا بھی ضروری ہے اسلام نے بندہ کو خدا کی طرف سے عطا شدہ مال کا امین بنایا ہے، البتہ اسے مخصوص حالات میں اپنی جائز ضروریات کے لئے خرچ کرنے کا بھی مجاز بنایا ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کا مقصود اسلامی معاشرہ میں ایک اقتصادی نظام کا توازن قائم کرنا ہے تاکہ وہ معاشرہ حرصِ دولت، بخل اور خود غرضی جیسے معاملات سے پاک رہے اور صاحب ثروت اور غربا میں مودۃ اور احسان فراخدلی اور باہمی تعاون کے جذبات پیدا ہوں، نہ غریب کو امیر کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑے اور نہ امراء غریبوں کو مجبور و بیکس چھوڑ کر اپنے عیش و عشرت میں پڑے رہیں، قرآن کریم کی نگاہ میں مسلمان کے لئے صحیح تر روش یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے متعلقین جس میں بلا امتیاز مذہب پڑوسی بھی آتے ہیں پر جائز حدود میں اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ خرچ کرے اور جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ راہ خدا میں خرچ کردے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دولتمند لوگ غربار کے ہمدرد بن کر رہیں، اور انھیں دستِ سوال دراز کرنے سے پہلے ہی معاشی طور پر خودکفیل بنادیں، تاکہ وہ عزت اور خودداری کی زندگی بسر کرسکیں، اس کے درج ذیل فوائد ہیں۔

۱:۔ معاشرہ میں ایک اجتماعیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

۲:۔ دولتمند حضرات حرص، بخل اور حسد جیسی برائیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور اس بات کو خدا کا احسان مانتے ہیں کہ ان کو کسی غریب کی کفالت کی سعادت بخشی گئی اور رب العزت نے انھیں اس کا اہل سمجھا اور مغفرت کا ایک موقعہ عطا کیا۔

۳:۔ غربار جب امیروں کو اپنا ہمدرد پائیں گے تو یقیناً ان کے دلوں میں اپنے محسنوں کے لئے

جذبہ محبت و احترام اور تعاون پیدا ہوگا، اور معاشرہ طبقاتی کشمکش سے محفوظ رہے گا، اس طرح چوری، ڈکیتی اور دوسرے معاشی جرائم سے بہت حد تک پاک رہ سکے گا۔

(۴) زکوٰۃ کی ادائیگی کے طریقۂ کار میں فقراء و مساکین کو ضرورتوں کی مکمل کفالت اور انھیں حد نصاب تک پہونچانے کو اپنا لیا جائیگا تو زکوٰۃ لینے والے کم ہوتے چلے جائیں گے اور دینے والے بڑھتے چلے جائیں گے۔

اس پس منظر کے بعد ہم نصاب زکوٰۃ کے موضوع پر اپنے خیالات نذر ناظرین کریں گے سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ نصاب کیا چیز ہے۔

نصاب :- کسی اقتصادی وصولیابی کے لئے صاحب مال کی کم سے کم حیثیت کا تعین ضروری ہوتا ہے، اسی اصول کے تحت زکوٰۃ صرف صاحب نصاب پر فرض ہے ہر کسی پر نہیں، اور صاحب نصاب کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص اپنی تمام ضروریات زندگی کے بقدر مال کے ہونے کے بعد بھی ایک مخصوص تعداد مال کا مالک ہو یعنی یہ Minimum Standard of Capability to pay ہے اس سے کم حیثیت کے شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

مروجہ طور پر یہ نصاب مال، ضروریات زندگی سے فاضل ۵۲½ تولہ چاندی یا ۷½ تولہ سونا یا ان میں سے کسی کے بقدر مالیت کا مالک و قابض ہونا ہے

اس موضوع پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ۵۲½ تولہ چاندی اور ۷½ تولہ سونے کی قدر و قیمت میں بہت فرق ہے، ایسی صورت میں کس کی قیمت کو معیاری نصاب قرار دیا جائے۔ بیشتر علماء کرام اس میں چاندی کی قیمت کے نصاب کا مشورہ دیتے ہیں، جس کی بنیاد انفع للفقراء یعنی غرباء کے لئے زیادہ نفع بخشی ہوتا ہے، نصاب زکوٰۃ کے سلسلے میں احادیث کی تفصیل درج ذیل ہے

۱ :- حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

• پانچ اوقیہ سے کم چاندی میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی،، (مشکوٰۃ شریف بحوالہ بخاری و مسلم شریف)

بخاری شریف میں بین السطور حدیث ابوخدری رض میں تحریر ہے کہ ایک اوقیہ چاندی ۴۰ درہم کے برابر ہوتی ہے۔

۲ :- حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

۰ اداکرو تم زکوٰۃ چاندی کی چالیس درہم پر ایک درہم اگر وہ دوسو درہم سے زیادہ ہوں اور ایک سو نوے درہم میں زکوٰۃ نہیں ہے، جب وہ پورے دوسو ہوجائیں تو ان میں پانچ درہم واجب ہیں (مشکوٰۃ شریف بحوالہ ترمذی، وابو داؤد شریف)

۳ :۔ حدیث جناب ابونعیم النخعی میں بھی دوسو درہم اور بیس مثقال سونا بطور نصاب فرمایا گیا ہے (نصب الرایہ ج ۲)

۴ :۔ دارقطنی کی حدیث سے بھی صرف سونے کے ½ حصے زکوٰۃ کے ادا ہونے کی تصدیق ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ؐ نے ۲۰ مثقال سونے میں سے ½ مثقال سونا بطور زکوٰۃ لے لیا۔

۵ :۔ جناب عبداللہ بن موسیٰ رض کی حدیث میں بیس دینار کا نصاب مذکور ہے۔

۶ :۔ جناب مولانا رفیق المنان صاحب نے اپنے فقہ اکیڈمی کے پانچویں سیمینار کے مقالے میں بیس مثقال سونے کے نصاب ہونے کی ایک حدیث کتاب المغنی ۶/۲ کے حوالہ سے نقل کی ہے جو مجھے دیکھنے کو نہیں مل سکی، لیکن انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بعض علماء سلف نے صرف چاندی ہی کو نصاب زکوٰۃ قرار دیا ہے اور اسی کو سونے کیلئے بھی اصل قرار دیا ہے، ان کے نزدیک سونا اگر بیس مثقال سے کم بھی ہو لیکن اس کی قیمت دوسو درہم چاندی کے برابر ہوجائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس قول کے لوگ عطاء، طاؤس، الزہری، سلیمان بن حرب، ایوب سختیانی ہیں

صاحب مشکوٰۃ نے حاشیہ پر اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ارکانِ اربعہ میں یہ وضاحت کی ہے کہ رسول کریم کے دور مبارک میں ایک اوقیہ چاندی ۴۰ درہم کے برابر اور ایک مثقال سونا دس درہم کے برابر ہوتا تھا اسی وجہ سے حسابی تطبیق کے مطابق دوسو درہم اور بیس مثقال سونا بھی بقدر نصاب قرار پایا، اس طرح احادیث پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل معیار نصاب صرف ۵ راوقیہ چاندی ہے

صاحبِ ہدایہ نے بھی سونے کا نصاب ۲۰ رمثقال ۵ راوقیہ چاندی کے حوالہ سے متعین کیا ہے، دوسو درہم نصاب کی احادیث موجود ہیں، لیکن درہم چاندی کا سکہ ہوتا تھا جس کا وزن ½۳ ماشہ ہوتا تھا اس طرح دوسو درہم دراصل ۵ راوقیہ چاندی ہی ہے (ج ۱ ص۱۷۵)

جناب عبداللہ قاسمی صاحب جامعہ بنارس نے درمختار ج ۲ ص۹۵ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے

"وہ نصاب شرعی جس کا مالک شرعاً غنی کہلائیگا اور زکوۃ کا مال اسے حرام ہوگا اس کا تعین حدیث پاک کی رو سے چاندی کے نصاب سے کیا جائے گا"
انھوں نے انفع للفقراء کے اصول کے تحت چاندی کے نصاب کو تسلیم کرنے کی رائے کا اظہار کیا ہے
جناب محمد صدر الحسن صاحب ندوی جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد مہاراشٹر نے اپنے مقالہ میں تحریر کیا ہے۔

فقہ الزکوۃ میں علامہ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں کہ اکثر علماء معاصرین کی رائے یہ ہے کہ چاندی کو اصل نصاب تسلیم کرلیا جائے، ایک تو اس بنا پر کہ چاندی کے نصاب پر اجماع ہے اور صحیح اور مشہور حدیث سے چاندی کا ۵ اوقیہ نصاب ثابت ہے، دوسرا اس وجہ سے کہ چاندی کا نصاب غریبوں کے مفاد میں ہے۔

یہاں تک تو احادیث اور اسلاف کے اقوال کی بات تھی، اب ہم اس مسئلہ کو درایت کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں گے، نصاب زکوۃ کے سلسلے میں کچھ بنیادی باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) سونے چاندی اور دیگر واجب الزکوۃ مال پر فی نفسہ زکوۃ واجب نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کی ملکیت میں ہونے پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بیت المال، مدارس عربیہ اور دیگر ایسے ادارے جو مستحقین زکوۃ کے وکیل ہوں ان پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔

(۲) نصاب زکوۃ دراصل کسی شخص کی کم سے کم مالیت کا مالک ہونا ہے یعنی یہ Minimum Standard of wealth of a person ہے جس سے کم کے مالک پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی

(۳) عملاً معاشرہ میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی شخص کے پاس صرف سونا یا صرف چاندی ہی ہو اور مزید کچھ مالیت واجب الزکوۃ نہ ہو بلکہ مختلف النوع مال ہوتا ہے جس کی مالیت اس ملک کے مروجہ سکوں میں متعین کی جاتی ہے۔

(۴) ایسی حالت میں Minimum Standard of wealth صرف ایک ہوسکتا ہے، کئی نہیں (یہاں پر جانوروں کی زکوۃ پر بحث مقصود نہیں ہے) اگر ہم سونے کا نصاب علیحدہ اور چاندی کا نصاب علیحدہ اور مستقل شمار کریں گے تو پھر تیسر النصاب سکہ رائج الوقت کا بھی متعین کرنا ہوگا ــــ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان دو میں سے جس کی مالیت کم ہو اسے سکہ رائج الوقت

کانصاب مقرر کر دیا جائے، یہ طریقۂ کار کسی تقویٰ کے مشورے کے لئے تو مناسب ہو سکتا ہے لیکن صاحب افتار اور ضابطہ بنانے والے حضرات ایسی کمزور بات جس کے پس پشت کوئی نص قرآنی یا حدیث نبوی دلیل نہ ہو نہیں کہہ سکتے، فقہار کی آرار حسب حالات زمانہ درست قرار دی جا سکتی ہیں

⑤ اس موضوع پر اگر درایۃً سوچا جائے تو وجوب زکوٰۃ کے لئے ایک متعین ذخیرہ مال زائد از حاجات اصلیہ کی ملکیت ہونا ضروری ہے اب اگر اس کی مقدار کم ہوگی تو دینے والے زائد ہونگے اور لینے والے کم، اور زکوٰۃ فنڈ کا مالیاتی توازن برقرار رہے گا اور اگر مقدار نصاب زیادہ ہوگی تو دینے والے کم اور لینے والے زیادہ ہوں گے اس حالت میں زکوٰۃ فنڈ کا مالیاتی توازن بگڑ جائے گا، اور بیت المال خالی ہو جانے پر بھی بہت سے حاجت مند محروم رہ جائینگے اسلام کسی عدم توازن کی بات نہیں سوچتا ہے۔

⑥ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک مثقال سونا یا بیس دینار (سونے کا سکہ) دو سو درہم کے برابر ہوتے تھے، دو سو درہم اکثر علمار ہندوستان کی تحقیق کے مطابق ساڑھے باون تولہ چاندی کے مساوی ہوتے تھے (سیر کے حساب سے یہ وزن ۵۸ تولہ ۴ ماشہ ہوتا ہے، ایک درہم ۳ ۱/۲ ماشہ چاندی کا ہوتا تھا، اس اعتبار سے دو سو درہم ۷۰۰ ماشہ کے برابر ہوئے جس کے اعتبار سے ۵۸ تولہ ۴ ماشہ ہوتے ہیں) بحوالہ ارکان اربعہ ص ۱۳۷ مصنفہ مولانا علی میاں

⑦ قیمتوں میں غیر معمولی تغیر و تبدل گذشتہ سو سال کی پیداوار ہے، جب سے نوٹوں کی کرنسی کا چلن ہوا اور اس کے برابر سونا محفوظ رکھنے کا سسٹم ختم ہو گیا، پہلے چیزوں کی قیمتوں کا تعین اشیار کی مقدار موجود اور مقدار طلب کے تناسب سے سونے چاندی کو اصل مالیت مان کر ہوتا تھا، اور اس کا اظہار سکۂ رائج الوقت میں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج سے ستر سال قبل سونے کا بھاؤ بیس روپیہ تولہ ہوتا تھا اور آج ساڑھے چار ہزار روپیہ تولہ ہے

اس کے مقابلے میں آج قیمتوں کا تعین درج ذیل طریقے پر ہوتا ہے۔ کل کرنسی، سرکاری نوٹ۔ بینکوں کے چیک اور دیگر تمسکات اور ہر کرنسی کی مقدار جاریہ، یعنی وہ اگر دس ہاتھوں سے گھوم کر بنک واپس پہونچی ہے تو اس کی مقدار کو دس سے ضرب دے دی جائے گی، ان سب کرنسیوں کی مالیت مجموعی اور اشیار کی مجموعی طلب کی مقدار میں جو تناسب

ہوگا وہ ہی عام قیمتوں کا شماریہ x ۱۰۰۰ ۱۰۰ x ۱۰۰ شمار ہوگا اور اسی کے مطابق موجود اشیاء کی قیمتیں متعین ہوں گی، آج انسان کی قوت خرید بھی ایک چیز ہے، ایک انسان کا خرچ دوسرے کی آمدنی بنتا ہے، جب ۱۹۳۹ء میں ایک روپیہ کا ۱۲ سیر پختہ گندم ملتا تھا اور ۱۵ ر۲۰ روپیہ تولہ سونا ملتا تھا تو انسان بھوکا مرتا تھا، قحط بنگال میں ہزار ہا انسان بھوک کی وجہ سے لقمہ اجل ہوگئے، لیکن آج ۵ روپیہ کلو آٹا، تیس روپیہ کلو چاول ملتا ہے تب بھی انسان بھوکا نہیں مرتا، کیونکہ آج اسکے پاس قوت خرید ہے اور یہ کثرت کرنسی کی وجہ ہے جس کی وجہ سے روزگار اور صنعتوں کو فروغ ملتا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے جو چیزیں مرتب ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ سونے کا کوئی متعینہ نصاب کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے جو احادیث ہیں وہ نصاب کے بجائے شرح زکوٰۃ کا ثبوت ہیں یعنی، مثقال میں ۱/۴ مثقال۔ بیس دینار میں نصف دینار وغیرہ

۲۔ عہد نبوی میں ایک اوقیہ چاندی کی قیمت ۴۰ درہم ہوتی تھی اور سونے کے سکہ دینار میں ۴ دینار ہوتی تھی۔ دینار ایک مثقال سونے کا سکہ ہوتا تھا جس کا وزن ۴½ ماشہ ہوتا تھا اس اعتبار سے ۵ر اوقیہ چاندی = ۲۰ مثقال سونا = دوسو درہم = بیس دینار، اسی لئے اس دور کی حسابی تطبیق کے لئے یہ سب مقداریں عامل نصاب قرار پائیں

۳۔ چاندی کا نصاب ۵ر اوقیہ ہے جو حدیث سے ثابت ہے، چاندی کا نصاب دوسو درہم حدیث سے ثابت ہے۔ ۵ر اوقیہ اور دوسو درہم میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ درہم چاندی ہی کا سکہ ہے جس کا وزن بعض اقوال کے مطابق ۳½ ماشہ اور بعض کے مطابق ۱/۲ ۲ ماشہ چاندی ہوتا تھا اور اس اعتبار سے دوسو درہم میں ۵ اوقیہ چاندی ہی ہوتی تھی

۴۔ مال واجب الزکوٰۃ میں صرف سونا یا صرف چاندی کا وجود بہت ہی شاذ ہے، بالعموم سونا چاندی اور دیگر مختلف النوع مال ملا کر ہی کل مالیت واجب الزکوٰۃ بنتی ہے اور مالیت کا تعین بالعموم سکۂ رائج الوقت میں کیا جاتا ہے اور ایسی حالت میں تمام فقہاء کرام متفق ہیں کہ نصاب کا تعین چاندی متعینہ کی قیمت سکہ رائج الوقت میں متعین کی جائے گی اور اسی مقدار ثمنی کو نصاب قرار دیا جائے گا۔ (باقی بر ص ۱۷)

عصر حاضر کے متجددین پر ایک نظر

(حافظ محمد اقبال رنگونی، مانچسٹر)

اس دور پرفتن میں اکابر ملت اور اساطین امت کے بارے میں زہر فشانی اور ان کے خلاف بدگمانی و بدزبانی نے ایک فیشن کی صورت اختیار کرلی ہے۔ نئی تحقیق کے مدعی اور نئی روشنی سے مرعوب رہنما اور مفکرین سارا زور اس پر صرف کر رہے ہیں کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کو جس طرح بھی ہو پائے اپنے اسلاف سے بدگمان کردیا جائے ہر نیا محقق اور مفکر یہی صدا لگا رہا ہے کہ اکابر سلف نے وقت کے تقاضوں کو نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی، بس وہ اسی بات پر اپنی محنت اور صلاحیتیں خرچ کرتے رہے کہ دین کا تحفظ کس طرح کیا جائے اور نقل و روایات اور عقائد و نظریات کے گرد کس طرح پہرہ بٹھایا جائے۔ اس کے سوا ان حضرات نے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا نہ انہوں نے موجودہ دور کی بدلتی ہوئی صورت حال پر نظر کی اور نہ اس کی کوئی فکر کی۔ یہ بات کون کہہ رہے ہیں؟ وہی جو خود کسی مثبت کردار میں قوم کی کوئی خدمت نہیں کرسکے۔ اکابر سلف کے خلاف یہ گندلاوا کہاں سے آرہا ہے؟ یہ ان لوگوں کا غیظ و غصہ ہے۔ جو نہ علماء کی دینی قیادت برداشت کرسکے اور نہ اس کے مقابل قوم کو کوئی اور دینی قیادت دے سکے۔ پھر یہ کہ اسلاف نے دین کا جو تحفظاتی کام کیا افسوس کہ وہ بھی انہیں گوارا نہ ہو سکا۔ اور اس اہم خدمت کو معمولی بنانے اور بے فائدہ قرار دینے کی جو ممکن اور ناممکن راہ انہیں مل سکی وہ اسے کھولنا قوم کی بہت بڑی خدمت سمجھتے رہے۔

موجودہ دور کے ایک مفکر مولانا وحید الدین خان جنہیں دینی راہنمائی کرتے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر رہا ہے اور اس دوران وہ ایک فکری کام کے سوا اسلام کا

کوئی تعمیری کام نہیں کر پائے وہ اپنے عمر بھر کے افکار کا ملبہ امام الہند حضرت مولانا الشاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ پر جس بھونڈے انداز میں پھینک رہے ہیں وہ قابل افسوس ہی نہیں قابل صد مذمت بھی ہے۔ موصوف اپنے "الرسالہ" کے خصوصی شمارے میں لکھتے ہیں:

> آخری نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ واقعہ شاہ ولی اللہ کے کارنامہ کے خانہ میں درج کرنے کے بجائے اس قابل نظر آئے گا کہ اس کو ان کی بے بصیرتی کے خانہ میں لکھا جائے (جولائی ۹۳ء ص۱۷)

اس سے قبل آپ یہ بھی لکھ آئے ہیں کہ:

> اس قسم کے مختلف کام (قرآن کا فارسی میں ترجمہ کرنا۔ مدرسہ قائم کرنا اور دوسری خدمات دینیہ وغیرہ) جو شاہ ولی اللہ نے انجام دیئے وہ سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحفظاتی کام ہیں نہ کہ قائدانہ کام ——— ان کی تصنیف ——— حجۃ اللہ البالغہ قائدانہ نوعیت کی ایک خدمت قرار دی جا سکتی بشرطیکہ وہ اسم با مسمی ہوتی۔ شاہ صاحب کی یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے دین الٰہی کی طرف تقلیدی تبیین ہے وہ دین الٰہی کی عقلی تبیین نہیں (ایضاً ص۱۴)

مولانا وحید الدین خان حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے اس لئے ناراض ہیں کہ آپ نے اسلام کی وہ تشریح کیوں نہ کی جو جدید ذہنوں کے معیار پر پوری اترے اس کے بجائے آپ تقلیدی تشریح ہی کیوں کرتے رہے۔ آپ کا اسلام کی تقلیدی تشریح کرنا بتلاتا ہے کہ آپ ان عالمی تبدیلیوں سے یکسر بے خبر تھے (دیکھئے ص۱۶) پھر آپ کا سلطنت کے سامنے جہاد بالسیف کی تقریر ایسا ہی ہے جیسے مردہ لاشوں کے سامنے رجز پڑھنا (ص۱۷)۔

مولانا وحید الدین خان نے الرسالہ کے انہی صفحات میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ، حضرت شیخ سید احمد بریلویؒ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور آزادی ہند کی تحریک کے رہنماؤں کو بھی اپنے طنز و تبصرہ کا نشانہ بنایا ہے کہ یہ حضرات انگریزی اقتدار کے کیوں مخالف رہے؟ اور کیوں ان کے خلاف میدان عمل میں اتر آئے تھے۔ اور انہوں نے

کیوں ان کے خلاف قائدانہ کردار ادا کیا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک موصوف کے نزدیک باغیانہ تحریک تھی اور ان کے قائدین علماء کو موصوف باغی سمجھتے ہیں آپ لکھتے ہیں:

اس وقت کے علماء جو اس بغاوت میں قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے (ص۲)

باغی کون ہوتا ہے؟ جو دوسرے کی سلطنت دبائے اپنے ملک کو واپس لینے کی جدوجہد کو بغاوت کہنا جدید ذہن کی ہی ہمت ہوسکتی ہے علمی دنیا میں اسے کہیں تائید نہیں مل سکتی۔

کیا یہی وہ آواز نہیں جو متحدہ ہندوستان میں انگریز لگا رہے تھے۔ اور کیا یہ وہ انداز نہیں جو سرسید احمد خان صاحب اور مولوی چراغ علی صاحب نے اپنایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود انہیں کوئی کامیابی نہ ہوسکی تھی۔

علماء نے قائدانہ کردار ادا کیا اور انگریز سامراج کے خلاف وہ نفرت پھیلائی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریز بین الاقوامی دباؤ کے تحت اپنے کل نوآبادیات کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے یہ ایسا قائدانہ کردار تھا کہ انگریزی اقتدار بالآخر ختم ہو کر رہا۔ جو ہونا تھا ہو گیا، جانے والے چلے بھی گئے۔ معلوم نہیں اب مولانا وحید الدین خان صاحب اس جہاد کو بغاوت اور مجاہدین کو باغی کہہ کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور دیگر اکابر نے اپنے اپنے وقت میں قائدانہ کردار ادا کیا یا نہیں ہم اس بحث میں الجھے بغیر یہ پوچھنا چاہیں گے کہ دین کا تحفظ اور عقائد و نظریات کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کرنا کیا یہ کوئی کم خدمت ہے؟

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کوشش تھی کہ دین الٰہی کا تحفظ اور اس کی تبیین اس طرح ہونی چاہیے جو اپنے اسلاف سے چلی آرہی ہے۔ حضرات خلفائے راشدین۔ ائمہ مجتہدین اور اساطین دین نے دین کی جو تشریح و تبیین کی۔ ظاہر ہے کہ وہی دراصل منشاء الٰہی ہے اس لئے کہ قرآن و حدیث کے مفاہیم و معانی انہوں نے براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کئے تھے اور بعد والوں نے اصحاب رسول سے دین الٰہی کی تشریح معلوم کی اور خلف نے سلف سے جو کچھ لیا وہی بغیر کسی کمی بیشی تغیر و تبدل کے آگے پہنچا دیا

عقل و فلسفہ کی روشنی میں دین الٰہی کی تبیین کا دعویٰ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی نہیں فرمایا۔ آپ کے نزدیک دین کی وہی تعبیر و تفسیر حق تھی جو حضرات خلفائے راشدین اور ائمہ مجتہدین سے مروی ہو اور جو شخص اس اصل سے ہٹ کر محض عقل و فلسفہ کی روشنی میں دین الٰہی کی تبیین کرے گا وہ مرادات الٰہی پانے کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ ہرگز قابل تسلیم نہ ہوگا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے اس کی کوشش کی کہ خلافتِ راشدہ کی صحت کو ہی مشکوک بنا دیا جائے اور دین الٰہی کی تبیین و تشریح میں صحابہ کرام کی ذوات مقدسہ کو حجت نہ سمجھا جائے تاکہ دین کی تشریح و تبیین من مانی انداز میں کی جا سکے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر سخت گرفت فرمائی اور بتلایا کہ جو لوگ اس اصل کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے اسلاف سے بیگانہ ہو رہے ہیں ان کی ان سے بدگمانی کی فضا پیدا کرنا درحقیقت تمام فنون دینیہ کو منہدم کرنا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

ہر کہ شکستن ایں اصل سعی می کند بحقیقت ہدم جمیع فنون دینیہ می خواہد (ازالۃ الخفاء جلد ۱ ص)

(ترجمہ) جو شخص بھی اس اصل کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں تمام فنون دینیہ کو گرانا چاہتا ہے۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ دین کی تبیین و تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے۔ صحابہ کرام فرقِ باطلہ کے مقابلے پر اسی تبیین کو لے کر گئے تھے۔ سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ نے خوارج سے مناظرہ کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھیجا تو آپ نے صاف فرما دیا تھا کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال نہ کرنا سنت سے استدلال کرنا، یہ وہ راہ ہے جس سے وہ بھاگ نہ سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ دور بھی کسی نہ کسی درجے میں جدید ہی تھا۔ مگر ان اکابر نے دین کی محض عقلی تبیین نہیں کی نقل و روایات کو ہمیشہ اولیت دی۔ اور جن لوگوں نے نقل و روایات کے بجائے محض اور محض عقل و فلسفہ کا دامن تھاما تھا انہوں نے اسلام کی کئی ایسی بنیادوں کا انکار کر دیا جو ان کے خیال میں عقل و فلسفہ کے ترازو پر نہ تل سکتی تھیں۔ سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی اور اس قسم کے جدید مفکروں نے مرادات الٰہی کی جو غلط تاویلات کیں

اور قرآن و حدیث میں تاویل و تحریف کی جو روش اپنائی اس پر آج مسلمانوں کی گردنیں ندامت سے جھک جاتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی دور رس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ دین الٰہی کا تحفظ اگر تقلیدی تشریح کے طور پر نہ کیا گیا تو وقت آنے پر اسلام کی بنیادوں میں تاویل و تشکیک کے زہریلے کانٹے بری طرح بکھیر دیئے جائیں گے سو آپ نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ہندوستان میں دین الٰہی کے تحفظ کی سعادت حاصل کی۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے دور سے کون ناواقف ہوگا۔ یہ وہ وقت ہے جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت رو بہ زوال تھی۔ داخلی و خارجی دائروں میں اسلامی عقائد و نظریات کے خلاف سازشیں عروج پر تھیں۔ اسلامی ممالک کی حالت خستہ تھی اور یورپ کا مرد بیمار انگریزوں کے حملے کی زد میں تھا۔ خود ہندوستان میں مسلم معاشرہ شرک و بدعات غلط خیالات و توہمات کی آماجگاہ بن چکا تھا اور ہندوؤں کے بہت سے رسوم و عادات نے جگہ پالی تھی۔ قرآن و سنت سے بے رغبتی اور اس کی عدم اشاعت عام تھی، عام علماء غفلت کا شکار تھے اور اسلامی حکومت آرام طلب شہزادوں کی آرام گاہ تھی۔ ابوالفضل اور فیضی کے جانشین علماء علوم حکمت میں مصروف و مشغول تھے اور مسلم معاشرہ کی اس زبوں حالی کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کئے ہوئے تھے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ حالت مسلم معاشرہ کو آخر کہاں لاکر کھڑا کرے گی۔ عقل و فلسفہ کے پرستار انہیں اپنے اسلاف سے وابستہ رکھنے کے بجائے جدید انداز کو اپنانے کی دعوت دے رہے تھے اور امت مسلمہ اسلامی عقائد و نظریات سے بالکل خالی ہوتی جارہی تھی۔ اس اہم اور نازک موڑ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے دین الٰہی کا جس طرح تحفظ کیا اور اس کی اشاعت میں جو خدمت کی اور اہل اسلام کو اپنے اسلاف سے وابستہ کرنے کی جو کامیاب محنت کی کوئی صاحب علم اس کا انکار نہیں کرسکتا یہاں تک کہ انہیں بارہویں صدی کا مجدد تسلیم کیا گیا اور جن لوگوں نے اس سے اتفاق نہ کیا وہ بے چارے اب تک بطور مجدد کوئی دوسرا امام سامنے نہ لاسکے۔ مولانا حالیؒ نے سچ کہا ہے ؎

آج جس دولت کا بازار جہاں میں کال ہے نیز اقبرستان اس دولت سے مالامال ہے

استاد محترم مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی تحریر فرماتے ہیں کہ :

ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد مسلمانوں کی سلطنت زوال کی طرف جارہی تھی اور جو مسلم حکمراں خود مختار ہو گئے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ انحطاط کا شکار ہو رہے تھے مغل تاج برائے نام رہ گیا تھا اور انگریز ہر سمت پھیل رہے تھے۔ بہت سے والیان ریاست نے محض اس لئے کہ ان کے اسباب عیش وعشرت باقی رہیں۔ اقتدار کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا تھا اور مسلمان اپنی روایات سے بہت دور چلے گئے تھے۔ جن مسلم قوتوں نے اس بجھتے ہوئے چراغ میں اپنا خون جلایا ان میں سلطان ٹیپو امید کی آخری کرن تھے۔ ان کے بعد کوئی مسلم سلطنت ایسی نہ رہی تھی جس میں قوم کی عظمت رفتہ کی کوئی جھلک باقی ہو۔ مسلمانوں پر یاس طاری تھا اور غیر مسلموں کا اقتدار سیلاب کی طرح بڑھ رہا تھا۔ پنجاب سکھوں کو مل گیا تھا اور وسط ہند میں مرہٹے اپنا کام کر رہے تھے۔

مسلم زوال کے انہی کھنڈرات میں ایک عظیم شخصیت ابھری جس نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا قوموں کے عروج و زوال پر عبرت خیز بحث کی اور قوم کو اس حجت خداوندی کا درس دیا جو پوری ہو کر رہتی ہے۔ یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) حجۃ اللہ البالغہ کے مصنف تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے علوم ومعارف کی تجدید وتدوین سے مسلمانوں کے تن مردہ میں زندگی کی روح پھونکی۔ سیاسی تنزل کے دور میں علم وفکر کا تحفظ کیا اور ظلمت کدۂ ہند میں علم وفضل کے وہ چراغ روشن کئے جن کی تابانی آج بھی قوم کو روشنی بخش رہی ہے۔ سیاسی زوال کے دور میں اسلامی عقائد اور مسلم روایات کا تحفظ ایک ایسی زمین تھی جس پر آئندہ قصر آزادی کی بنیاد رکھی جاسکتی تھی۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی فکر تھی جو پہلے بالاکوٹ میں عمل بن کر ابھری اور یہی وہ روح عمل تھی جس نے ۱۸۵۷ء کے تاریک خاکے میں رنگ بھرا۔ کبھی یہ روح عمل تحریک خلافت میں تڑپی اور جو چراغ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جلائے تھے وہ آئندہ آنے والی آزادی کی ہر تحریک میں اپنے خون کا رنگ بھرتے رہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(شاہ اسماعیل شہیدؒ ص ۱۲)

مولانا وحید الدین خاں صاحب اگر مذکورہ تحریر سے متفق نہ ہوں تو انہیں کم از کم اپنے سابق امیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی اس تحریر سے تو ضرور اتفاق کرنا چاہئے تھا کہ :

> مجدد کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سامنے تعمیر نو کا ایک نقشہ واضح صورت میں پیش کرے تاکہ حالت موجودہ کو جس حالت سے بدلنا مطلوب ہے اسی پر وہ اپنی نظر جما سکیں اور اپنی تمام سعی وعمل کو اسی سمت میں مرکوز کر دیں ۔ یہ تعمیری کام بھی شاہ صاحب (یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ) نے اسی خوبی اور جامعیت کے ساتھ انجام دے دیا ہے (الفرقان لکھنؤ شاہ ولی اللہ نمبر صـ۱۰۲ـ)

اس تفصیل کی روشنی میں یہ کہنا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے صرف تحفظاتی کام کیا کوئی قائدانہ کردار ادا نہیں کیا یہ خود انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جن کے اپنے قدم قیادت میں آتے لڑکھڑاتے ہوں ۔ معرکہ بالاکوٹ ہو یا تحریک ریشمی رومال یا تحریک خلافت ۔ ان تاریخی معرکوں کی اساس وہی تحفظاتی کام ہے جس کی بنیادیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے پہلے مہیا کر دیں تھیں ۔ اور ان تاریخی معرکوں کے رہنماؤں نے اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے ۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے قائدانہ کردار کو خراج تحسین بھی پیش کیا ہے ۔ تحریک آزادی ہند کے عظیم رہنما اور اس تحریک کے ممتاز قافلہ سالار حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں ۔

> سرزمین ہند میں اگر صرف وہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لئے یہی فخر کافی تھا ۔
> (الفرقان نمبر صـ۳۶ـ)

امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے نظریات اور آپ کے انداز سے کسی کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو لیکن اس بات سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ آپ ایک جدید پیرا اور انداز فکر رکھتے تھے اور یہ بات بھی ہر خاص و عام جانتا ہے کہ مولانا سندھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے حد درجہ متاثر تھے اور انہی کے بنائے ہوئے خاکوں میں رنگ بھرتے بعد میں آنے والے جملہ قائدین انہی کے خطوط پر اپنی تحریک استوار کرتے رہے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قائدانہ کردار ادا نہ کیا تھا اور مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بقول آپ اگر اس قدر بے بصیرت

تھے تو ان تاریخی اہمیت کے حامل رہنماؤں نے ان عظیم معرکوں میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خطوط پر کیوں کام کیا؟

تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے اپنی ساری علمی اور فکری۔ دینی و سیاسی محنتوں کا مرکز حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو ہی ٹھہرایا ہے۔ آپ کے یہ الفاظ جس گہری عقیدت و محبت کے مظہر ہیں اسے دیکھئے:

ونقول بما قال بہ شیخ شیوخنا ومقدم جماعتنا مولانا الامام الشاہ ولی اللہ الدہلوی قدس اللہ روحہ (فتح الملہم شرح مسلم جلد ا صـ۱۰۸)

ہم مولانا وحیدالدین خان صاحب سے درخواست کریں گے کہ اپنے اسلاف کے خلاف اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے اجتناب کریں تو یہ ان کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔ آسمان پر تھوکا جائے تو تھوک آسمان پر نہیں خود اپنے منھ پر ہی آتا ہے۔

اس امت کی فلاح و صلاح اسی میں ہے کہ اپنے اکابرین سے وابستہ رہے اور ان کے نقش عمل پر قیادت و سیادت کا رخ موڑا جائے نہ یہ کہ اپنے اسلاف سے بدگمان کرنے کی تحریکیں چلائی جائیں۔ حضرت امام مالکؒ کیسی پر حکمت بات کہہ گئے ہیں:

لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولہا۔

اس امت کے آخری لوگوں کی اصلاح صرف اس طریق میں ہے جس سے پہلوں کی اصلاح ہوئی تھی۔

سو آخری دور میں مسلمانوں کی بہتری کے لئے جدید طریقوں کی تلاش کوئی پرانا دین نہیں ایک نیا دین ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نوٹ: ہمارے اس مضمون کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم عہد حاضر کی جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کے خلاف ہیں نہیں۔ ہم صرف قوم کو جدید فکر مہیا کرنے کے خلاف ہیں قوم کی فکر وہی ہونی چاہئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی تراث اور ما انا علیہ واصحابی کی آواز ہے۔ اسی نظر و فکر کو غالب رکھتے ہوئے ہم عہد حاضر کی ایجادات اور سائنسی ترقیات سے جتنا فائدہ اٹھائیں وہ بالکل جائز اور درست ہے۔ پرانے دین کو قائم رکھتے ہوئے اسے جو جدید سواری مہیا کریں ہمیں اس سے انکار نہ ہوگا لیکن اس پر ضرور نظر رہے کہ کہیں سواری سوار۔ اور سوار سواری نہ بن جائے۔

علمائے ہندوستان کی خدمت میں

بیس سوالات

از مولانا محمد بلال (بری) یو، کے

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مندرجہ ذیل سوالات کے جواب میں ۔

۱ ۔ جو لوگ علمی طور پر مجتہد نہ ہوں اور کسی مجتہد کے مقلد بھی نہ ہوں اور وہ کتب حدیث کے اردو تراجم کے مطالعہ کو تحقیق سمجھتے ہوں کیا انہیں اپنی ناقص تحقیق پر عمل کرنا جائز ہے یا ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حدیث کے کسی پختہ علم رکھنے والے عالم کی پیروی کریں اور اس پر اعتماد کریں کہ یہ دلیل کے مطابق بنا رہا ہوگا۔ ان کے لئے یہ پیروی بہتر ہے یا بلا علم وفن دعوے تحقیق ؟

۲ ۔ جو لوگ کتب حدیث وتفسیر کے اردو تراجم کے مطالعہ سے مرزائی ہو چکے ہیں یا کسی اور بدمذہبی کا شکار، انہیں اپنی اس ناقص تحقیق پر قیامت کے دن کوئی رعایت ملے گی یا نہیں؟ کیا انہیں اپنی اس درجہ کی تحقیق پر بھروسہ کر کے اپنا عقیدہ بنانا جائز تھا یا نہیں؟ یا انہیں کسی پختہ عالم کی پیروی کرنی چاہئے تھی آزادروی سے بچنا چاہئے تھا۔

۳ ۔ اگر کوئی شخص پختہ علم نہیں رکھتا اور اپنے کمزور علم پر بھروسہ بھی نہیں کرتا کسی پختہ علم والے کی پیروی کر لیتا ہے۔ عالم دلیل دے تو اس دلیل کی پڑتال اور تحقیق کرنے کی اس میں قابلیت نہیں اب اس شخص کے لئے کیا اہل علم کی تقلید کرنا جائز ہے کہ بدوں مطالبہ دلیل ان سے مسئلہ پوچھ کر اس پر عمل کر لیا کرے ۔

۴ ۔ آج کل جو عوام اہل حدیث کہلاتے ہیں اور وہ کسی حدیث کی تحقیق اور پڑتال کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے ۔ محض اپنے مولویوں کے کہنے پر وہ کسی حدیث کو قبول یا رد کرتے ہیں تو وہ اگر

کہتے ہیں کہ ہم اپنے مولویوں کی پیروی نہیں کرتے قرآن و حدیث پر تحقیق کے ساتھ عمل کرتے ہیں تو کیا وہ جھوٹ نہیں بول رہے ہوتے؟ کیا انہیں اپنے اس جھوٹ بولنے پر قیامت کے دن کوئی مواخذہ تو نہ ہوگا؟ یا جھوٹ، جھوٹ ہے گو وہ کسی درجے میں ہو۔

۵۔ آج کل کے اہل حدیث عوام جو نہ محقق ہیں نہ مقلد۔ ان کے لئے بہتر راہ اپنے موجودہ دور کے مولویوں کی پیروی ہے یا علماء سلف صالحین کی پیروی؟ بہتر راہ کونسی ہے۔ اگر موجودہ دور کے مولویوں کی پیروی کرنی ہو تو برطانیہ میں اہل حدیث عوام اپنے کس مولوی کی پیروی کریں تاکہ اسے امام اہل حدیث کہا جا سکے۔

۶۔ کیا قرون ثلثہ جن کے خیر ہونے کی حدیث میں خبر دی گئی ہے ان میں مسلمانوں کا کوئی ایسا گروہ موجود رہا ہے جو نہ علماء ہوں نہ مقلدین اور وہ اہل حدیث کہلاتے ہوں. اگر ہوں تو ان کے دو حوالے دیجئے۔ اگر اس دور میں کوئی ایسے مسلمان نہ تھے جو نہ مجتہد ہوں نہ مقلد اور اہل حدیث کے نام سے پوری قلمرو اسلامی میں کہیں کوئی اس نام کا فرقہ پایا نہیں گیا. تو آج جو فرقہ اس تعارف سے موجود ہے وہ مسلمانوں میں ایک نیا اور بدعتی فرقہ شمار ہوگا یا نہیں؟

۷۔ موجودہ دور کے غیر مقلدوں سے ہم اہل سنت کا اختلاف اصولی اختلاف ہے یا فروعی؟ اور دیگر مذاہب کے مقلدین کا آپس میں اختلاف اصولی ہے یا فروعی۔ اور دونوں میں کیا فرق ہوگا؟ مجتہد کی خطاء میں اور عامی کی غلطی میں کیا فرق ہے عامی اپنی مرضی سے کوئی مسئلہ اختیار کرے اس پر کیا اسے معافی مل سکے گی؟

۸۔ صحابہ کرام میں کیا کوئی ایسے حضرات تھے جو رکوع کے وقت کبھی رفع یدین نہ کرتے رہے؟ جو صحابہ ہمیشہ رفع یدین کرتے تھے کیا وہ ان پہلوں (۱) گمراہ سمجھتے تھے یا (۲) محروم الثواب سمجھتے رہے یا (۳) ان کے اس ترکِ رفع کو وسعت عمل پر محمول کرتے تھے؟ حقیقت جو بھی ہو اس پر حوالہ پیش کر کے سائل کو مطمئن فرمائیں۔

۹۔ جو صحابہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کو فرض نہ جانتے تھے کیا وہ صحابہ جو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے تھے ان پہلے صحابہ کو گمراہ سمجھتے تھے یا اسے ایک اجتہادی مسئلہ سمجھتے تھے۔

۱۰۔ جن مسائل میں صحابہ میں عملی اختلاف رہا ہے ان میں سے کسی جانب کو ہم گمراہی قرار دے سکتے ہیں؟ یا سب کو اجتہاداً حق پر ماننا ضروری ہے۔ اجتہاد کی دونوں راہیں صواب اور خطا کیا حق نہ سمجھی جائیں گی؟ جن میں سے کوئی فریق مستوجب سزا نہ ہوگا۔

۱۱۔ صحابہ کا اگر کسی مسئلے پر اجماع ہو جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے دور میں طلاق ثلثہ پر ہوا تو اس اجماع کا ماننا امت کے لئے ضروری ہے یا نہ؟ اگر نہیں تو جمیع صحابہ کے خلاف جو راہ عمل اختیار کی جائے وہ یتبع غیر سبیل المومنین میں شمار ہوگی یا نہ؟ اگر اس پر تمام صحابہ کا اجماع نہ ہوا تھا تو جس صحابی نے اس سے اختلاف کیا ہو اس کا نام مع حوالہ بتلادیں بہت مہربانی ہوگی۔

۱۲۔ سعودی عرب کے جو مشائخ مسائل غیر منصوصہ میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی کو واجب قرار دیتے ہیں وہ اپنے اس فیصلے میں حق پر ہیں یا گمراہ ہیں؟ اگر حق پر نہیں تو پاکستان ہندوستان کی جماعت اہل حدیث نے سعودی عرب کے علماء کو ان کی اس گمراہی پر کہیں ٹوکا اور رد کا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو محض مالی امداد حاصل کرنے کے لئے کیا یہ عمل مداہنت شمار نہیں ہوگا؟

۱۳۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں رمضان میں بیس رکعات تراویح کی جماعت کب سے چلی آرہی ہے اس سن کی نشاندہی کر دیں؟ نیز بتائیں کہ ائمہ حرمین کا یہ عمل غلط ہے یا صحیح؟ اسلام کی چودہ صدیوں میں ان دونوں مسجدوں میں کیا کبھی صرف آٹھ رکعت تراویح کی جماعت ہوئی؟ اس سن کی بھی نشاندہی فرمائیں اور حوالہ دے دیں کرم فرمائی ہوگی۔

۱۴۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں کیا صرف احادیث نبویہ ہیں یا صحابہ کی احادیث اور تابعین کے اقوال بھی ان میں دیئے گئے ہیں؟ اب اگر کوئی اہل حدیث یہ کہتا ہے کہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو اور کسی کی نہیں تو کیا وہ ان محدثین کے طریقے کے خلاف نہیں چلا جو صحابہ کی احادیث ساتھ لے کر چلے ہیں۔

۱۵۔ صحاح ستہ میں کیا کوئی ایسی کتاب ہے جو صرف احادیث رسالتمآب پر مشتمل ہو اور اس میں کسی اور کی کوئی بات نہ دی گئی ہو۔ صحاح ستہ کے علاوہ اور جو کتب حدیث پہلی چار صدیوں میں لکھی گئیں ان میں کوئی ایسی کتاب لکھی گئی ہو جو صرف احادیث رسالتمآب پر محدود

ہو تو اس کا نام ہی لکھدیں۔

۱۶۔ ضعیف احادیث اور موضوع احادیث میں کیا فرق ہے؟ ضعیف حدیث اگر کسی درجے میں معتبر نہیں تو صحاح ستہ کے مولفین نے ضعیف حدیثوں کو کیوں جگہ دی ہے؟ آج اگر کوئی فرقہ یا شخص ان حدیثوں کو نئے سرے سے مرتب کرتا ہے اور ترمذی دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ صحیح ترمذی۔ اور ضعیف ترمذی۔ تو کیا وہ محدثین کے اس مسلک کے خلاف نہیں چلا کہ صحیح وضعیف سب ایک جگہ جمع ہونی چاہیے تاکہ ضعیف حدیث میں تبین اور دوسرے قرائن سے درجہ اعتبار میں آسکتی ہے۔

۱۷۔ تاریخ اسلام میں علم فقہ پہلے مرتب ہوا یا حدیث؟ ائمہ اربعہ پہلے ہوئے ہیں یا صحاح ستہ کے مصنفین؟ امت کو پہلے فقہ کی ضرورت پڑی یا حدیث کی۔ جس طرح دین کا عملی نقشہ فقہ میں ملتا ہے کیا اس طرز پر حدیث کی کسی کتاب میں نماز کا عملی نقشہ موجود ہے۔

۱۸۔ صحاح ستہ کے راویوں کے حالات جو ہمیں علامہ ذہبی یا حافظ ابن حجر کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ حافظ ابن حجر سے لیکر ان رواۃ حدیث تک متصل روایت سے پہنچے ہیں یا انہیں محض محدثین کے اعتماد پر قبول کر لیا گیا ہے۔ یہاں اسناد کو ضروری نہ سمجھنا اور اعتماد پر عمل کرنا کس حدیث کی رو سے جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لئے حوالہ درکار ہے۔

۱۹۔ کیا فروعی مسائل پر جماعت بندی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ صحابہ میں رفع یدین کرنیوالوں اور نہ کرنے والوں۔ اور آمین اونچا کہنے والوں اور آہستہ کہنے والوں نے ان مسائل پہ کوئی جماعت بندی کی تھی؟ اگر نہیں تو ان مسائل پہ تنظیمیں بنانا اور جماعت بندی کرنا کیا بدعت نہیں؟

۲۰۔ دنیا میں کہیں حنفیوں، مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں کی ان فقہی اختلافات پر مبنی تنظیمیں ہیں۔ اگر نہیں تو غیر مقلدوں کی یہ اہل حدیث تنظیم کیوں قائم کی گئی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ گروہ ان فروعی مسائل کو اصولی قرار دیتا ہو اور فروعات پر فرقہ بندی کو جائز سمجھتا ہے۔

ان سوالات کے جوابات نہایت اختصار اور ایجاز سے تحریر فرمائیں، ان مقامات کے سوا جہاں

(باقی ص ۴۳)

سپریم کورٹ کا فیصلہ بسلسلۂ ائمۂ مساجد

گذشتہ دنوں سپریم کورٹ کی جسٹس راما سوامی اور آر ایم سہائے پر مشتمل ڈویژن بنچ نے صیغۂ دیوانی کی رٹ پٹیشن نمبر ۱۵، سال ۱۹۹۰ء کل ہند تنظیم ائمہ وغیرہ بنام مرکزی حکومت ہند و دیگراں میں ۱۳ مئی ۱۹۹۳ء کو ائمہ مساجد کے معاوضہ کے سلسلے میں انھیں صوبائی وقف بورڈ یا متولیوں کی جانب سے براہ ادا کیا جاتا ہے اپنا فیصلہ سنایا ہے جس سے ملک کے تقریباً تین لاکھ ائمہ متاثر ہوں گے۔ ہم اس کا اردو ترجمہ اپنے قارئین کی دلچسپی کیلئے پیش کر رہے ہیں (مرتبہ: از عبدالسمیع انصاری انبالہ چھاؤنی)

مسجد کے مذہبی امور کے ذمہ داران نے (۱) آئین کی دفعہ ۳۲ کے تحت برائے لاگو کرنے بنیادی حقوق وقف بورڈوں کے ذریعہ ان کا استیصال کئے جانے کے خلاف بذریعہ نمائندگی و درخواست اس عدالت سے رجوع کیا ہے۔ مدد جو طلب کی گئی ہے وہ مرکزی و صوبائی وقف بورڈوں کو ہدایت کرنے کے لئے ہے کہ درخواست دہندگان کو ملازم تسلیم کریں اور انھیں گذر بسر کے لئے بنیادی معاوضہ ادا کریں، مطالبہ کی بنیاد، کام کی نوعیت اور معاوضہ جو ادا کیا جاتا ہے اس کا نمایاں فرق ہے، ڈگری ہولڈروں کیلئے تنخواہوں کے زیادہ اسکیل کا مطالبہ کیا گیا ہے

ائمہ مساجد میں باجماعت نماز پڑھانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں یقیناً مسجد عوامی عبادت کا مرکز ہے جہاں مسلمان (اپنے) عقائد کے مطابق عبادت کرتے ہیں اور جہاں تاریخی اعتبار سے وہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی تقریبات کیلئے جمع ہوتے ہیں (۲) تیرہویں صدی کے قانون داں (علامہ) ابن تیمیہ کے مطابق مسجد کے مقاصد کا اختصار "اجتماع کا (وہ) مقام جہاں عبادت کی جاتی ہو اور جہاں عوامی معاملات میں رہنمائی کی جاتی ہو (۳) تمام مساجد جہاں مسلمان مرد بلا امتیاز غریب و مالدار، اعلیٰ و ادنیٰ قطار در قطار امام کے پیچھے نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہوں (۴) ائمہ سے

مسجد کی دیکھ بھال، صفائی، مسجد کے میناروں سے تمام نمازوں کے اذان کی ادائیگی اور اسلامی عقائد کی تبلیغ کی توقع کی جاتی ہے، ان سے شریعت، قرآنِ مقدس، حدیث، اخلاقیات، فلسفہ، سماجی معاشی اور مذہبی امور کی کما حقہ واقفیت کی بھی توقع ہوتی ہے، امام یا نماز کے رہبر کی تقرری نہایت اہم ہوتی ہے، ابتدائی دور میں بادشاہ یہ خدمت خود انجام دیتا تھا، وہ جنگ کے زمانے میں اور عام نمازوں (حسبِ دستور نمازوں) کا امام ہوتا تھا، عہدِ عباس میں جب خلیفہ طویل عرصہ تک تواتر کے ساتھ امامت کا فریضہ انجام نہیں دے سکا اس وقت معاوضہ کی ادائیگی پر امام کا تقرر کیا گیا، جبھی کوئی معزز یا لائق مسلمان نمازوں کے پڑھانے کا اعزاز حاصل کرتا ہے تب ہی مسجد غیر معمولی طور سے ایسے شخص کو اپنا امام کرتی ہے جو دینی معاملات کی کما حقہ واقفیت رکھتا ہو، وہ مسجد کے مذہبی امور کا ذمہ دار ہوتا ہے اور مسجد کی محراب کے بالمقابل ایک دن میں پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی اس کی ذمہ داری ہے۔

(۵) ائمہ کے فرائض کی ادائیگی سے متعلق کوئی نزاع نہیں لیکن مرکزی حکومت اور بہت سے مختلف ریاستوں کے وقف بورڈ جو اس عدالت کے جاری کردہ نوٹس کے جواب میں یہاں حاضر ہوئے ان کے تقرر کے طریقے، کسی معاوضہ کی ادائیگی اور آقا و خادم کے کسی رشتہ کی غیر موجودگی میں زبردست اختلافات رکھتے ہیں، یہ بتلایا گیا ہے کہ ائمہ و مؤذنوں کا تقرر متولیوں کے ذریعے کیا جاتا ہے، ان کے بقول وقف بورڈوں کا ان کے کام اور تقرر سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلام کے مذہبی اصول کے مطابق بطور حق، امام کسی معاوضہ کا مستحق نہیں کیونکہ اسلامی قانون ائمہ کیلئے رضاکارانہ خدمت کا حکم دیتا ہے، یہ کہا گیا ہے کہ جو رقم مسجد کو چندہ میں حاصل ہوتی ہے اس میں سے کچھ یا بورڈ کے متولیوں کے ذریعہ انھیں (کچھ رقم) کی ادائیگی کی جاتی ہے، ان کا کام اعزازی ہے نہ کہ معاوضہ والا، اسلامی شریعت کے مطابق فرض کی نوعیت نمازوں کی ادائیگی کرانا (پڑھانا) ہے جو بغیر کسی مالی منفعت کے کوئی (بھی) اہل مسلمان انجام دے سکتا ہے، کچھ حلف ناموں میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ بستی کے لوگوں کے ذریعہ مقرر کئے جاتے ہیں، مرکزی حکومت نے واضح طور سے یہ بتلایا کہ دیگر مذاہب کی طرح اسلام پجاریوں کو تسلیم نہیں کرتا اور امام کا انتخاب مقامی لوگوں یا انتظامی کمیٹی اگر کوئی ہو تو اس کا خصوصی حق

ہے، کرناٹک وقف بورڈ کے مطابق —— امامت ملازمت تصور نہیں کی جاتی، درخواست دہندگان کا الزام کہ وہ برائے نام ادائیگی کی وجہ سے وہ سماج میں بے عزت اور شرمسار ہو جاتے ہیں (اس سے) انکار کیا گیا اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ معزز لوگ ہیں جو امامت کو ایک مذہبی فریضہ کے بطور انجام دیتے ہیں نہ کہ روزی روٹی کمانے کے لئے۔

دہلی وقف بورڈ نے یہ نکتہ اٹھایا کہ امام کو وظیفہ یہ سوچ کر دیا جاتا ہے کہ اس کی مسجد میں باقاعدہ وقت کی پابندی کے ساتھ پانچ وقت حاضری ہوتی ہے، بورڈ نے ایسی مساجد پر جہاں متولی یا انتظامیہ کمیٹی ائمہ یا مؤذنوں کا تقرر کرتی ہے اپنے کسی حاکمانہ حق کے استعمال سے انکار کیا ہے، یہ بتلایا گیا ہے کہ کسی شخص کو نماز پڑھانے کے لئے کسی تسلیم کردہ ادارے کی سند کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ از روئے شرع امام ہونے کے لئے قرآنی تعلیمات، طریقۂ عبادت، ضروری مسائل جو قرآن وسنت کے مطابق نماز پڑھانے کے لئے درکار ہیں ہو ان سے مکمل واقفیت ضروری ہے، حلف نامہ جو وقف بورڈ کی جانب سے داخل کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسجد کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اول وہ جو حکومت کے تحت اس کے براہِ راست انتظام میں ہیں جیسے مکہ کی مسجد اور وہ مسجد جو عام تفریح گاہوں میں ہیں جن کا نظام وقف بورڈ یا مسلمانوں کے ذریعہ نہیں چلایا جاتا، دوئم وہ مسجدیں، جو وقف بورڈ کے براہِ راست انتظام میں ہیں، سوئم مقررہ اوقاف کے تحت وہ مسجدیں جو واقف کی منشاء کے مطابق ہو اس وقف کو تشکیل دینے والا ہے، متولیوں کے زیرانتظام ہیں، چہارم وہ مسجدیں جن کا اندراج وقف بورڈ میں نہیں ہے اور جن کا انتظام مقامی لوگ کرتے ہیں، نیز عوام کے زیرانتظام ہیں اور پنجم وہ مسجدیں جن کا انتظام متولیوں یا مقامی مسلمانوں کے ذریعہ نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ باور کرایا گیا ہے کہ چہارم اور پنجم قسم (کی مساجد) کے ائمہ باقاعدہ نہیں ہیں اور کوئی بھی مسلمان نماز پڑھا سکتا ہے، جبکہ سوئم وچہارم کی مساجد مثلاً باقاعدہ امام ہیں ان کے مطالبات پورا کرنے کے سلسلے میں وقف بورڈ کی مالی دشواریوں کا بھی ذکر کیا گیا، پانڈیچری وقف بورڈ نے واضح کیا کہ اس کے یہاں بجز ایک چپراسی کے اور کوئی ملازم نہیں ہے اس لئے امام کے مطالبے کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ بھی دعویٰ کیا گیا

کہ بورڈ امام پر کسی طرح کا اختیار نہیں رکھتا کیونکہ) وہ سماج (کا) نہایت معزز فرد تصور کیا جاتا ہے تمام ملت اسلامیہ ان کا واجب احترام کرتی ہے، پنجاب وقف بورڈ کی طرف سے جو جوابی حلف نامہ داخل کیا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ پنجاب کی مساجد میں ائمہ کو ان کی اہلیت کی بنیاد پر معاوضہ کی ادائیگی کی جاتی ہے، امام ناظرہ (ابتدی گریڈ) ۳۸۰-۲۰-۵۸۰-۲۵-۸۳۰-۳۰-۹۸۰ کے اسکیل میں ہے جبکہ امام حافظ (وسطی گریڈ) کو بحساب ۴۴۵-۲۰-۶۴۵-۲۵-۸۹۵-۳۰-۱۰۴۵ ادا کیا جاتا ہے اور امام عالم (منتہی گریڈ) کو ۵۲۰-۲۰-۷۲۰-۲۵-۹۷۰-۳۰-۱۱۲۰ کے حساب سے ادا کیا جاتا ہے، ان کو تیس روپیہ ماہانہ میڈیکل الاؤنس بھی دیا جاتا ہے اور موذن کو ۳۱۰/- روپیہ ماہانہ ادا کیا جاتا ہے ۱۹۹۲ء میں ان اسکیلوں پر نظر ثانی کی گئی ہے اس کے بموجب ہریانہ پنجاب اور ہماچل کی مساجد کے ائمہ کو جو پنجاب وقف بورڈ کے تحت ہیں ان کو باقاعدگی کے ساتھ تنخواہیں دی جاتی ہیں اور وہ باقاعدہ ملازم تصور کئے جاتے ہیں، اترپردیش کے سنی سینٹرل وقف بورڈ نے صرف ایک تحریر پیش کرکے کہا کہ تمام سنی مساجد کا انتظام متولیان یا انتظامیہ کمیٹی کرتی ہیں نہ کہ وقف بورڈ۔

مساجد بہت سے معاملات میں گرجا گھر اور مندر سے مختلف ہوتی ہیں، تقریبات، شادیوں اور پیدائش سے متعلق خدماتی مجالس کبھی مسجد میں منعقد نہیں ہوتیں، وہ مذہبی تقریبات جو اہم ہیں اور بہت سے گرجا گھروں کا لازمی حصہ ہیں مثلاً اعترافِ گناہ، توبہ، گرجا گھر کے کامل رکن بننے کی تقریبات مسجدوں میں منعقد نہیں ہوتیں (۶) نہ ہی عام ہندو مندروں کی طرح یہاں کوئی چڑھاوا چڑھتا ہے، مسلم ممالک میں مساجد کی امداد ریاست کی جانب سے کی جاتی ہے اہل بستی سے چندہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، وزارت اوقاف (امداد کا مستقل ادارہ) ملازمین معلمین اور قرآن کے قاریوں کا تقرر کرتی ہے، غیر مسلم ممالک میں مسجدوں کی امداد افراد کرتے ہیں ان کا انتظام ان کے بنانے والوں کی طرف سے یا کسی خصوصی مد سے کیا جاتا ہے، کسی نگراں کا تقرر جگہ کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے، مؤذن مسجد کے میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اذان پکارتا ہے (۷) ہمارے ملک میں پارلیمنٹ نے اوقاف کی مناسب دیکھ بھال اور انتظام کے لئے ۱۹۵۴ء میں وقف ایکٹ منظور کیا، ایکٹ کے مقصد کو پورا کرنے کیلئے

دفعہ ۹ جو وقف بورڈ کے قیام کی اجازت دیتی ہے جس کی کارگذاریوں کی تفصیل دفعہ ۱۵ کے تحت دفعہ ۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

(۱) ایسے قوانین جو اس ایکٹ کے تحت ہوں (ریاست میں واقع تمام اوقاف کے کل معاملات کی عام نگرانی علاوہ اسکے جو اس ایکٹ کے تحت واضح طور سے وقف کمشنر کے ذریعہ انجام دیئے جاتے ہیں) بورڈ جو ریاست کے لئے قائم کیا گیا ہے اس کے دائرہ اختیار میں ہوں گے اور یہ بورڈ کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس ایکٹ کے تحت اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنائے کہ اسکے زیر نگرانی تمام اوقاف (کا رکھ رکھاؤ، نگرانی اور مناسب انتظام ہورہا ہے نیز ان کی آمدنی صحیح طور پر ان مقاصد پر خرچ کی جارہی ہے جن مقاصد کے لئے یہ اوقاف تشکیل دیئے گئے یا ان کا منشا ہے۔

علاوہ اسکے اس ایکٹ کے تحت کسی وقف کے لئے اپنے اختیارات کا استعمال کرنے میں بورڈ واقف کی منشار کی پابندی کرتے ہوئے کام کریگا یعنی وقف کا مقصد اس کا استعمال اور طریقہ جو اسلامی قانون میں تسلیم کیا گیا ہو"

شق (ب) اور تحت دفعہ (۲) بورڈ کو ذمہ دار بناتی ہے۔ یہ یقینی بنایا جائے کہ وقف کی آمدنی اور دوسری جائداد ان منشار و مقاصد پر خرچ کی جارہی ہے جن کے لئے وقف تشکیل کیا گیا یا جو اس کا مقصد ہے۔

بورڈ کو نہ صرف وقف کی دیکھ بھال اور انتظام سے متعلق اختیارات حاصل ہیں بلکہ مالی اختیارات بھی حاصل ہیں، اس کے بنیادی فریضوں میں ایک فریضہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ وقف کی آمدنی ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے خرچ کی جارہی ہے جن مقاصد کیلئے وہ تشکیل دیا گیا ہے۔

مساجد وقف ہیں اور اس ایکٹ کے تحت ان کا اندراج لازمی ہے جن پر بورڈ اپنا اختیار استعمال کرتا ہے ان کی تشکیل کا مقصد عام لوگوں کی عبادت کیلئے ہے، نماز یا صلوٰۃ خدائی احکام پر عمل کا نام ہے جو ہر مسجد میں ادا کی جاتی ہے، اسلام کے پانچ ارکان یا رکن) میں اس کا دوسرا اہم

درجہ ہے، جو عقیدے کے اعلان کے فوراً بعد آتا ہے (شہادت) (۸) اس فریضہ کی انجام دہی میں امام کا خصوصی درجہ ہے، مسجد کا مین مقصد و منشاء عام لوگوں کی عبادت گاہ ہونا اور ایکٹ کے تحت بورڈ کا فریضہ یہ یقینی بنانا کہ وقف کا منشاء پورا ہو رہا ہے (یہ کہہ کر) بورڈ کبھی مسجد کی مناسب مذہبی خدمات کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا، چنانچہ یہ کہنا کہ بورڈ امام یا مسجد پر اختیار نہیں رکھتا صحیح نہیں ہے، ایکٹ یا قوانین میں جو ائمہ کی تقرری کیلئے ہیں کا یا ان کی ملازمت کے ضابطہ میں کسی شرائط کا نہ ہونا شاید اس وجہ سے ہو کہ انھیں ملازم نہیں سمجھا گیا ہے، اس وقت اس بات سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ بوجہ تبدیلی سماجی و معاشی نظام ان کو بھی گذر اوقات کے لئے روزی درکار ہے، ان کے فریضہ کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ انھیں تمام دن تقریباً مسجد میں حاضر رہنا ضروری ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جو یہ ذمہ داری اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دے رہے ہوں، کچھ اور ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ علاقہ کے لوگ انھیں مذہبی خدمات کے لئے پسند کرلیں لیکن ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کا مشغلہ، پیشہ یا ملازمت ان کی روزی کے لئے امامت کے فرض کی انجام دہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، ان کا مقدر کیا ہوگا؟ کیا انھیں کوئی معاوضہ دینا چاہئے، اگر ایسا ہے تو کتنا اور کس کے ذریعے؟ بورڈ کے مطابق ان کا تقرر متولی کرتے ہیں (یہ کہکر) بورڈ اپنی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے کیونکہ ایکٹ کی زیر دفعہ ۳۶ متولی بورڈ کی نگرانی اور اس کے تحت آتے ہیں، ان فیصلوں کے تسلسل میں جو اس عدالت نے دیئے ہیں یہ طے کیا گیا ہے کہ زندہ رہنے کا حق جو آرٹیکل ۲۱ میں درج ہے اس کا مقصد انسانی وقار کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے اس لئے یہ دعویٰ کرنا یا کہنا کہ ائمہ چونکہ مذہبی فریضہ انجام دیتے ہیں اس لئے کسی معاوضہ کے مستحق نہیں، آج کے حالات میں صحیح نہیں ہے، پرانے وقتوں میں جو بھی دستور رہا ہو لیکن اس میں اب تبدیلی آچکی ہے یہاں تک کہ مسلم ممالک میں بھی مسجدوں کی (ریاست کی طرف سے) مدد کی جاتی ہے اور ائمہ کو ان کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے، اس لئے یہ دلیل ہم تسلیم نہیں کریں گے کہ ہمارے نظام اور وقف ایکٹ کے اندر کسی تحریری ضمانت کی غیر موجودگی میں ائمہ جو مسجد کے مذہبی امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں کسی معاوضہ کے حقدار نہیں، مرکزی حکومت اور وقف بورڈوں

کی طرف سے کافی دلائل دیئے جا چکے ہیں کہ ان کی مالی حالت ایسی نہیں کہ وہ ریاست پنجاب طرح ائمہ کی تنخواہوں کی ادائیگی کے فرض کو پورا کر سکیں، یہ بھی دلیل دی گئی کہ مساجد کی تعدا زیادہ ہے کہ ان پر بھاری صرفہ ہوگا جو کہ مختلف ریاستوں کے وقف بورڈ برداشت کرنے اہل نہ ہوں گے ہم ان دونوں (باتوں) میں کوئی باہمی رشتہ نہیں پاتے، کسی (ادارے) کی مالی دشوار کسی شہری کے بنیادی حقوق سے بالاتر نہیں ہو سکتیں، اگر بورڈوں کو اوقاف کی نگرانی او انتظام کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے تب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ ایسے افراد کے لئے جو سے اہم فریضہ یعنی مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھانے کا کام انجام دیتے ہیں جو اس کی تشکیل کا ہے ان کے معاوضہ کی ادائیگی کے لئے وسائل پیدا کریں۔

ان حالات میں ہم اس درخواست کو منظور کرتے ہیں اور حسب ذیل ہدایات جاری کرتے ہیں:

(۱) مرکزی حکومت اور مرکزی وقف بورڈ (کونسل) اندرون چھ ماہ مختلف مساجد کی جن کی کچھ تفصیل دہلی وقف بورڈ کی طرف سے داخل کردہ جوابی حلف نامہ میں مہیا کی گئی ہے ایک اسکیم تیار کریں گے۔

(۲) وہ مساجد جو حکومت کے زیر انتظام ہیں اس حکم میں داخل نہیں ہوں گی، لیکن اگر ان کے ائمہ کو کوئی تنخواہ نہیں دی جاتی یا ان کی کوئی خود آمدنی نہیں ہے حکومت ان کی تنخواہ اس بنیاد پر جو سینٹرل وقف بورڈ (کونسل) دوسری مساجد کے لئے مقرر کرتا ہے اس حکم کی تعمیل میں مقرر کرے گی۔

(۳) دوسری مساجد کیلئے علاوہ ان کے جو اپنے متعلقہ وقف بورڈ میں درج نہیں ہیں یا جن کا انتظام اسلامی عقائد کے افراد نہیں کرتے ایسے ائمہ کو تنخواہ کی ادائیگی ریاست پنجاب وہریانہ میں رائج اسکیم سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے کی جائے گی۔

(۴) ریاستی وقف بورڈ ہر مسجد کی آمدنی (ان کی) تعداد اور ائمہ کی قسم جو ان کے لئے درکار ہے یعنی جز وقتی یا کل وقتی کی چھان بین کریں گے۔

(۵) کل وقتی (امام) کے لئے پنجاب وقف بورڈ کا اصول رہنما تصور کیا جائے گا، یہی جز وقتی امام کے لئے رہنما اصول مہیا کرے گا۔

(۶) ان تمام مساجد میں جہاں کل وقتی ائمہ خدمات انجام دے رہے ہیں انھیں اس حکم کی تعمیل میں تعین کردہ معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

(۷) جزوقتی یا اعزازی امام کو اس اسکیم کے تحت تعین کردہ معاوضہ یا وظیفہ ادا کیا جائے گا

(۸) اس اسکیم کے تحت اِن مساجد کو بھی شمار کیا جائے گا جو چھوٹی ہیں یا دیہی علاقوں میں (واقع) ہیں یا جیسا کہ پانڈیچری وقف بورڈ کے حلف نامہ میں بیان کیا گیا ہے اوران کی کوئی آمدنی نہیں ہے (ان کی) آمدنی میں اضافہ کیلئے راستے اور وسائل تلاش کئے جائیں گے۔

(۹) یہ عمل مکمل کیا جائے اور اندرون چھ ماہ اسکیم لاگو کی جائے۔

(۱۰) ائمہ کی ادائیگی کیلئے ہمارا دیہ، حکم یکم دسمبر ۱۹۹۳ء سے لاگو ہوگا، ان حالات میں کہ اسکیم منظور شدہ مدت میں تیار نہیں ہوتی تب بھی یہ حکم یکم دسمبر ۱۹۹۳ء سے ہی لاگو ہوگا۔

(۱۱) سینٹرل وقف بورڈ (کونسل) جو اسکیم بنائیگا ہر ریاستی وقف بورڈ اس کو نافذ کریگا رٹ پٹیشن اس طرح سے فیصل کی جاتی ہے کہ فریقین اپنا خرچ خود برداشت کریں گے

بقیہ علمائے ہندوستان کی خدمت میں چند سوالات

حوالہ طلب کیا گیا ہے کہیں حوالہ دینے کی ضرورت نہیں، سوال کا اصولی جواب میسر آنے پر ہم علماء کی ایک میٹنگ بلائیں گے جس میں آج کل اہلحدیث کہلانے والوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات کہی جاسکے گی۔

ہم اپنے تمام اکابر علماء کرام اور مفتیان عظام سے درخواست کریں گے کہ مذکورہ بالا سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال فرمادیں۔

المستفتی محمد بلال۔

HAFIZ. M. BILAL

85 WALMERSLEY ROAD

BORY - LANCASHIRE

سود قرض نے بہا دی بنا دی چاندی

از:۔ ضمیر الدین قاسمی برنلے

ایک زمانہ تھا کہ برطانیہ کی حکومت زمین کے اکثر حصوں پر تھی، اس وقت حکمران برطانیہ نے بڑی چالاکی کے ساتھ ان تمام ملکوں خصوصًا برصغیر کا سونا چاندی، ہیرے جواہرات کو خوب بٹورا اور جہاز کا جہاز بھر کر برطانیہ پہنچایا، برطانیہ میں ابھی تک اس سونے اور جواہرات سے کئی بڑے بڑے مکانات بھرے پڑے ہیں اور اسی کی وجہ سے برطانیہ سب سے مالدار ملک شمار ہوتا ہے، ان ملکوں کو کنگال بنانے کے بعد آزاد کر دیا اور پوری عیاری سے دوستی برقرار رکھی ان کے حکمرانوں سے دوستانہ ماحول میں کہا کہ ہم سے سودی قرض لے لیں اور فیکٹریاں قائم کرلیں سڑکیں بنالیں اور دیگر تجارتی منڈیاں تعمیر کرلیں تو آپ کا ملک ترقی کر جائیگا، اس وقت کے حکمران ملک کی غربت کی وجہ سے کچھ مجبور بھی تھے اور کچھ ذاتی مفاد کے لئے بھی جھانسے میں آگئے اور بھاری رقم عالمی بنکوں سے قرض لے لیا، بعد میں کچھ روپئے تو عیش وعشرت میں نذر کر دیئے اور کچھ روپیوں سے فیکٹریاں قائم کیں، شروع شروع میں اس کا سامان بھی کافی فروخت ہوا، اور نفع ہوا جس سے حکمرانوں نے سمجھا کہ ہم اس قرضے میں سود مند رہے، لیکن بینک کے عیاروں نے یہی لالچ دوسرے ملکوں کو بھی دیا اور دوسرے ملکوں نے بھی سودی قرض لے کر بڑی بڑی فیکٹریاں قائم کرلیں نتیجہ یہ ہوا کہ منڈیوں میں سامانوں کی بہتات ہوگئی اور خریدنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا، جس کی وجہ سے کچھ سامان برسوں پڑے رہنے کی وجہ سے ضائع ہوگئے، کچھ کو سستا کرنا پڑا اور کچھ کا آرڈر منسوخ کر دیا گیا، کھپت کی کمی کی وجہ سے کچھ فیکٹریوں کی صنعت کم کر دی گئی اور کچھ کو بند کر دیا گیا اور اس کی فلک بوس عمارتوں اور مشینوں پر لگے ہوئے روپے بالکل ضائع ہوگئے

لیکن سودی قرض جوں کا توں رہا بلکہ شرح سود ادا نہ کرنے کی وجہ سے قرض بڑھتا رہا

پھر دوسرے ضروری کاموں کے لئے سودی قرض لینے کی ضرورت پڑی اور چونکہ حکمراں اپنے گھر سے سود ادا نہیں کرتے بلکہ عوام کی پسینے کی کمائی سے ادا کرتے ہیں اس لئے حکمراں ایسے قرض لینے میں بلا وجہ پیش رفت بھی کرتے ہیں، چنانچہ دوسرے امور انجام دینے کے لئے مزید سودی قرض لے لئے جاتے ہیں، اگلے پچھلے دونوں قرض ملاکر قرض لینے والے ملکوں پر قرض کا دباؤ بڑھتا جاتا ہے، ان کے نوٹوں کی قیمت بڑی تیزی سے گھٹتی رہتی ہے، چیزیں گراں سے گراں تر ہوتی جاتی ہیں اور عوام کی زندگی خورد ونوش کے لئے اجیرن بن گئی ہے، صرف ایک ملک پاکستان کو پچھلے سال تراسی ارب روپیہ صرف سود میں ادا کرنا تھا، اب تو وہ اس جال سے نکلنا بھی چاہے تو نہیں نکل سکتا بلکہ مزید پھنستا ہی چلا جارہا ہے، ابتدا میں حکمرانوں نے سوچا نہیں اور قرآن کریم کی صریح آیتوں کے خلاف سودی کاروبار میں پھنس گئے، حکومت کی حکومت اس آگ میں جل رہی ہے، اب تو بڑی مکاری کے ساتھ عرب ممالک کو بھی سودی قرضوں میں پھانس دیا ہے۔

غریب ملکوں کو سودی قرض میں پھانسنے کے بعد برطانیہ اپنے ملک کے عوام کی طرف متوجہ ہوا اور یہاں کے لوگوں کو فیکٹری تعمیر کرنے دکان بنانے اور مکان خریدنے کے لئے سودی قرض دیئے، ہر ایک کو یہی جھانسا دیا کہ تمھاری فیکٹری سے تم کو اتنے لاکھ کا سالانہ نفع ہوگا اور تم دکان سے اتنے مالدار ہوجاؤگے، اور آج مکان سستا ہے اس کو ابھی خرید لو اور سال بھر کے بعد بیچوگے تو دوگنا نفع ہوگا، حرص میں آکر لوگوں نے ایک ایک گلی میں تین تین دکانیں قائم کرلیں، ہزاروں کی تعداد میں فیکٹریاں بن گئیں اور چند سال میں ہر جگہ چمکتی ہوئی بلڈنگ ہی بلڈنگ نظر آنے لگیں، کل تک جو غریب تھے چند مہینوں میں خوشنما عمارت اور بڑی بڑی دکانوں کے مالک نظر آنے لگے، وضع قطع چال ڈھال سب امیرانہ ہوگیا ؎

ایسے ویسے کیسے کیسے بن گئے۔

اس ملک میں بینک سے سودی قرض لینے کے لئے کوئی مکان یا عمارت گروی رکھنا پڑتا ہے اس لئے اس مکان کا انشورنس کرنا پڑتا ہے اور ہر ماہ انشورنس کی قسط ادا کرنی پڑتی ہے، سودی قسط کے علاوہ بینک چارج کے نام سے بھی کچھ رقم بینک کو دینا پڑتا ہے، یہ دونوں

ملاکر ہر ماہ اچھی خاصی رقم سودی قرض کے علاوہ ادا کرنی پڑتی ہے، اس لئے اگر سود دس فیصد ہے تو سب کا مجموعہ بیس فیصد ہو جاتا ہے، سودی قرض لینے والے صرف سود کی شرح کو ہی گنتے ہیں اور بینک چارج اور انشورنس شمار نہیں کرتے، حالانکہ یہ بھی اسی کا فرد ہے اگر اس کو جوڑا جائے تو دس سال میں تین گنا اور پچیس سال میں چھ گنا سے زیادہ قرض ہو جاتا ہے بینک بھی گاہکوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا صرف شرح سود پر ہی بحث کرتا ہے اور اس طرح دو گنا خون چوستا رہتا ہے۔

سودی قرض کا خاصہ یہ ہے کہ جب تک چیزوں کی قیمت روز بروز بڑھتی رہے ایک روپیہ کی خرید ڈیڑھ روپیہ اور دو روپیہ میں بکتی رہے اور عوام کو مہنگی سے مہنگی چیزیں ملتی رہیں، پھر بکے بھی خوب اور ہر روز گاہکوں کا تانتا بندھا رہے تو سود کی قسط بھی ادا ہوتی ہے اور محنت و مزدوری کاٹ کر کچھ نفع بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر خرید کی خرید میں فروخت ہو یا سوا گنا میں فروخت ہو ڈیڑھ گنا میں نہ ہو، یا گاہکوں میں کمی ہو جائے تو مالک کو نفع تو کیا ہوگا، سود کی قسط بھی ادا کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ اگر دو چار ماہ مندی آجائے تو سودی قرض کا بوجھ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ بعد میں کچھ بکری ہو تب بھی پہلا بوجھ نہیں اترتا اور آئے دن قسط ادا نہ کرنے کی وجہ سے چند سال میں قرض کا بوجھ دو گنا تین گنا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ بینک کی دریا دلی کی وجہ سے ہر ہر گلی میں دو تین دکانیں قائم ہو گئی ہیں اس لئے قیمتوں کا اضافہ ہوتا یا گاہکوں کے زیادہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

اب جن لوگوں نے سودی قرض لے کر فیکٹریاں قائم کی تھیں یا بڑی بڑی دکانیں بنالی تھیں، قرض کا بوجھ بڑھنے کی وجہ سے ان میں سے اکثر کو فیکٹریوں اور دکانوں کو بند کرنا پڑا، اس تین ماہ میں کئی ہزار فیکٹریاں بند ہو گئیں اور لاکھوں آدمی بے روزگار ہو گئے اس وقت ہر شہر میں۔ بڑی بڑی پرشکوہ عمارتیں سینکڑوں کی تعداد میں بند نظر آئیں گی

بینک نے ان تمام فیکٹریوں اور دکانوں کو اپنی ملکیت میں لے لیا ہے اور قرض دینے کے لئے جو عمارت بطور رہن رکھی تھی اس پر بھی قبضہ کر لیا ہے، مالک جو چند مہینوں میں بہت

بڑا سیٹھ بن گیا تھا آج بینک کرافٹ ہو کر اس سے زیادہ فقیر ہو گیا ہے، مکان جائیداد جو کچھ اس نے کمایا تھا سب کچھ بینک کے حوالہ ہو گیا اور وہ کہیں کا نہ رہا ؎

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک

اے وائے بہارے اگر این ست بہارے

جو لوگ کام نہیں کرتے یا کھانے کے پیسے ان کے پاس نہیں ہیں انھیں یہاں کی حکومت ہر ہفتہ کھانے اور ضروری اخراجات کے پیسے دیتی ہے اس لئے ایسے بینک کرافٹ اور فقیر لوگوں کو تھوڑا سا سہارا مل جاتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو اس کی حالت کتنی خطرناک ہوتی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

پانچ سال پہلے برطانیہ میں عام مکانوں کی قیمت آٹھ ہزار پونڈ تھی، بینک والوں نے لوگوں کو سودی قرض دیکر دھڑا دھڑ مکان خریدوانا شروع کیا، چنانچہ صرف ایک سال میں اس مکان کی قیمت چار گنا بڑھ کر تینتیس ہزار پونڈ ہو گئی، بینک نے اشتہار دینا شروع کیا کہ جلد مکان خریدیں ورنہ اس کی قیمت بڑھ جائے گی اور جو ابھی خریدے گا وہ سال بھر کے بعد ساٹھ ہزار پونڈ میں فروخت کرے گا اور اس کو اٹھائیس ہزار پونڈ نفع ہوگا، لوگوں نے سودی قرض لے کر بڑی تیزی سے خریدنا شروع کیا، لیکن پانچ ماہ کے بعد ہی مندی آگئی، اور اس مکان کی قیمت گھٹ کر سولہ ہزار پر آگئی، اب جن لوگوں نے تینتیس ہزار پر مکان خریدا تھا دس سال میں تو اس کو ساٹھ ہزار تک صرف سود ادا کرنا ہوگا اور انشورنس اور بینک چارج اس کے علاوہ ہوگا، اب اگر دس سال کے بعد بھی اس مکان کی قیمت تیس ہزار تک ہی بڑھے تو بتائیے کہ مالک مکان کو کتنا بڑا گھاٹا ہوگا کہ زندگی بھر کی کمائی صرف ایک مکان کے بدلے بینک کو حوالہ کرتا رہا اور خود ہمیشہ فقیر و محتاج بنا رہا اور کیا معلوم کہ آگے چل کر اس کی قیمت تیس ہزار تک ہو گی بھی یا نہیں، چنانچہ لاکھوں آدمیوں نے خریدے ہوئے مکانوں کو بینک کے حوالہ کر دیا گروی میں رکھے ہوئے مکان بھی دے دیئے اور سودی قرضوں کی پچھلی قسطیں جو ادا کی تھیں وہ بھی ضائع گئیں، اب وہ لوگ انتہائی پریشان ہیں کہ بینک کے چکر میں پھنس کر پچھلا کمایا بھی برباد کیا اور امیر بننے کے بجائے فقیر اور مقروض ہو گئے۔



شیخ الحدیث مولانا نیاز محمد صاحبؒ

مجاز حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

—— از ڈاکٹر رشید الوحیدی جامعہ ملیہ اسلامیہ



۱۶ر جون ۱۹۹۳ء بروز بدھ مولانا نیاز محمد صاحبؒ کا انتقال ہوگیا، اس طرح علمی دنیا کا ایک اور زبردست نقصان ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ابھی تو محدث اعظم مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا معراج الحق صاحب، مولانا محمد حسین بہاری رحمہم اللہ کی جدائی کا غم دلوں پر تازہ تھا کہ یہ ایک اور صدمۂ جانکاہ دیکھنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو علم و روحانیت میں بلند مقام عطا فرمایا تھا اس کے باوجود آپ میں تواضع انکسار اور حسن اخلاق بھی بہت تھا۔ الورع حسنٌ ولکن فی العلماء احسن (حدیث) کی سچی تصویر تھے۔ اسی طرح فرمانِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مطابق۔ علیکم بحسن الخلق وطول الصمت اور علیکم بالقناعۃ کا بھرپور نقشہ آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو نظر آتا تھا۔ بڑی بڑی مجالس میں خاموش بیٹھے رہتے اور جب کسی علمی مسئلے میں رائے لی جاتی تو نہایت متواضع انداز میں ماقل ودلّ جامع بات فرمادیتے جو کتاب وسنت سے مدلل ہوتی تھی۔ قناعت کا یہ حال کہ میوات کے علاقۂ نوح میں بیٹھ کر علمی خدمت وتحقیق میں عمر بسر کردی اور وہیں سے سارے عالم میں علم وتحقیق کے سمندر بہادیئے۔

پیدائش وتعلیم

آپ کا نام نیاز محمد تھا۔ والد کا نام الحاج موج خاں۔ ضلع گڑگاواں کے تحصیل فروز پور جھرکہ، موضع رانیکا میں آپ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔

شروع میں چار جماعت تک اسکول میں پڑھا اس کے بعد مولانا عبدالسبحان صاحبؒ کے مدرسے میں ۱۳۵۲ھ میں داخل ہو گئے۔ عربی کے مشہور انشا پرداز اور شاعر مولانا عبدالمنان صاحبؒ ابن مولانا عبدالسبحان صاحب آپ کے رفیق درس تھے۔ فارسی، کافیہ، شرح جامی بحث فعل تک آپ نے اسی مدرسے میں پڑھا۔ ۱۳۵۶ھ میں مظاہرالعلوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔ اس وقت مظاہرالعلوم میں داخلے کے لئے یہ شرط تھی کہ قرآن پاک کے دو پارے حفظ ہوں۔ مولانا نیاز محمد صاحب کے لئے داخلے میں یہ رکاوٹ پیش آئی مگر آپ نے یہ رکاوٹ اس طرح دور کی کہ دو دن کی اجازت لے لی اور دو دن میں دو پارے یاد کر کے سنا دیئے۔ داخلہ تو ہو گیا مگر حفظِ قرآن کا ایسا چسکا لگا کہ اب پہلے پورے کلام پاک کے حفظ کی طرف لگ گئے۔ اتفاق سے سہارنپور کا پانی بھی موافق نہ آیا۔ ان دونوں وجوہ سے آپ سہارنپور سے فیروزپور جھرکہ آگئے۔ یہاں حضرت شیخ الہندؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد حسین صاحب کی خدمت میں پہنچے، اپنے شوق کا اظہار کیا۔ مولانا محمد حسن صاحب کے داماد حافظ مشتاق اسی مدرسے میں تھے چنانچہ ان کی خدمت میں پورے انہماک سے قرآن پاک یاد کرنا شروع کیا اور صرف تین ماہ کی قلیل مدت میں پورا کلام پاک حفظ کر لیا۔ حفظ کے بعد بعض درسیات کی کتب مولانا محمد حسن صاحب سے پڑھیں۔ ساتھ ہی قرآن پاک کا دور بھی جاری رہا۔ اس طرح مولانا کی توجہ اور شفقت سے تیار ہو کر ۱۳۵۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند میں

دارالعلوم میں آپ کا اساتذہ میں یہ حضرات تھے۔ قاری اصغر علی صاحبؒ، مولانا عبدالسمیع صاحبؒ، میاں جی مولانا اختر حسین صاحبؒ مولانا یحییٰ صاحب (متبنّٰی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)۔ مولانا نافع گل صاحبؒ۔ مولانا شیخ الادب محمد اعزاز علی صاحبؒ، مولانا ابراہیم بلیاویؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ، مفتی ریاض الدین صاحبؒ، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ بھی آپ کے اساتذہ میں شامل تھے۔ دورۂ حدیث کا سالانہ امتحان عربی زبان میں دیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد تعلیم و تبلیغ کے ایک دوسرے چشمے سے سیراب ہوئے۔ نظام الدین

میں مولانا الیاس صاحبؒ کی خدمت میں آگئے۔ آپ کی حیات میں اور وفات کے بعد تعلیم تدریس اور تبلیغ کے فرائض ۵ سال تک ادا کئے۔

۱۹۴۲ء میں نوح میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا الیاس صاحبؒ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ موجود تھے۔ ان اکابر نے مولانا نیاز محمد صاحب کو تقریر کا حکم دیا۔ آپ نے نہایت عالمانہ تفصیلی تقریر فرمائی۔ یہ تقریر بلاشبہ، ان اکابر کی طرف سے، آپ کی صلاحیت اور استعداد کے لئے ایک سند تھی۔

بیعت وخلافت

دارالعلوم میں مشکوٰۃ شریف کی تعلیم کے دوران رمضان المبارک میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ سے حصن حصین پڑھی اور اسی زمانہ میں مولانا الیاس صاحب امیر جماعت تبلیغ سے بیعت ہو گئے۔ ۶۳ھ میں مولانا الیاس صاحب کی وفات کے بعد حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ سے بیعت ہوئے اور چند ہی ماہ بعد حضرت مدنیؒ نے بیعت کرنے کی اجازت دے دی اور اس طرح دربارِ مدنی سے خلافت کی دولت سے سرفراز ہوئے۔

خود مولانا نیاز محمد صاحبؒ سے جن حضرات کو اجازت ملی ان کا سلسلہ دہلی و میوات کے علاوہ بہار و راجستھان تک پھیلا ہوا ہے۔

تعلیمی وتدریسی خدمات

تدریس کے ساتھ مدرسوں کا قیام اور اس کی ترقی مولاناؒ کا اہم کارنامہ ہے۔ بہت نمایاں خدمت یہ ہے کہ افراد کی تربیت بھی فرمائی اور کثیر اردو عربی تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں مدرسہ معین الاسلام میں بحیثیت صدر مدرس تقرر ہوا قیام معین الاسلام کے دوران مدرسہ معین الاسلام کو ابتدائی تعلیم سے بڑھاتے بڑھاتے مشکوٰۃ شریف جلالین شریف تک تعلیم کو ترقی دی اسی دوران ۱۳۷۴ھ میں درگاہ حضرت شیخ موسیٰ تحصیل نوح پر جو کہ عرصہ سے غیر آباد تھی، آباد کر کے مدرسہ قائم فرمایا ۱۹۶۵ء میں مدرسہ معین الاسلام سے علیحدگی اختیار کر لی اور شوال ۱۹۶۵ء میں مسجد بنگلہ والی قصبہ نوح میں مدرسہ قاسم العلوم قائم فرمایا۔ اس مدرسے میں ۱۹۹۰ء سے دورہ حدیث شروع فرمایا ۹۰ء میں بخاری شریف کا کچھ

حصہ حضرتؒ نے پڑھایا لیکن فالج کا حملہ ہو جانے کی وجہ سے سلسلہ موقوف ہوگیا ۔

مدرسہ میں دارالافتار ابتدا ہی سے قائم ہے جس میں میوات اور بیرون میوات سے استفتار آتے ہیں اور ان کا تسلی بخش تحریری جواب دیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا کا فتویٰ علاقہ میں حرفِ آخر تسلیم کیا جاتا ہے جس کو مخالف موافق سب تسلیم کرتے ہیں، فتاویٰ کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔

سیاسی زندگی

۹/ستمبر ۱۹۶۵ء ہی میں ڈی آئی آر کے تحت نظر بند ہوئے ۳ یوم گوڑگانوں جیل میں ۳ یوم حصار میں ایک ماہ کرنال جیل میں اور تقریباً ۵ ماہ مہندر گڑھ جیل میں رہے۔ ۱۱/مارچ ۱۹۶۶ء کو رہائی ملی۔ کرنال جیل میں بخاری شریف کا اور مہندر گڑھ جیل میں تفسیر قرآن کریم کا درس دیتے تھے۔ ماہ رمضان میں تراویح میں قرآن کریم سنایا۔ اسی طرح ۷۱ء میں بھی ڈی آئی آر کے تحت گوڑگانوہ جیل میں ایک ماہ نظر بند رہے۔ ۲۶/ستمبر ۷۶ء بروز ہفتہ عید الفطر میں فیملی پلاننگ کے خلاف تقریر فرمائی جس کے نتیجہ میں ۲۰/ستمبر ۷۶ء بروز بدھ کو گرفتار کئے گئے۔ ایک ماہ سنٹرل جیل گوڑگانوہ میں ۳½ ماہ سینٹرل جیل انبالہ میں میسا کے تحت نظر بند رہے۔ ۷ فروری ۱۹۷۷ء کو انبالہ جیل سے رہا ہوئے۔ واپسی پر علاقہ میں زبردست پرجوش استقبال کیا گیا۔

زیارت حرمین شریفین

پہلا حج ۱۹۵۹ء حضرت مدنیؒ کے ہمراہ۔ دوسرا حج ۱۹۶۱ء تیسرا حج ۱۹۶۷ء چوتھا حج ۱۹۸۳ء۔

وفات حسرت آیات ۱۶/جون ۱۹۹۳ء بروز بدھ مطابق ۲۴/ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ بوقت صبح بجے تدفین شام چھ بجے۔

نماز جنازہ حضرت مولانا سید مشہود حسن صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ خلیفہ حضرت مولانا مرحوم نے پڑھائی۔ اطلاعات نہ ہونے کے باوجود ۳۰/۴۰ ہزار افراد نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔

مولاناؒ کے پسماندگان میں۔ بیوہ صابرہ خاتون جو حقیقت میں اسم بامسمیٰ میں نہایت عابدہ زاہدہ۔ ۲ لڑکے۔ محمد خالد قاسمی ایک عرصہ تک ناظم مدرسہ قاسم العلوم رہے کافی عرصہ نیابت اہتمام کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلم شریف کا درس بھی موصوف

سے متعلق ہے ۔ مولانا مفتی زبیر احمد صاحب قاسمی نہایت ذی استعداد و باصلاحیت حضرتؒ ہی کے زیر تربیت ابتداء سے بخاری شریف تک تمام فنون کی کتابیں پڑھا چکے ہیں ۔ وہی حال میں ۳ سال سے مدرسہ قاسم العلوم کے شیخ الحدیث ہیں وہی فتاویٰ کا کام بھی سنبھالے ہوئے ہیں

۴ لڑکیاں :

فاطمہ جن کی شادی مولانا نور محمد صاحب امینی خطیب جامع مسجد فرید آباد سے ہوئی ۔
حافظہ آمنہ " مولانا قاری دین محمد صاحب قاسمی خطیب جامع مسجد حوض رانی ۔
عائشہ " مولانا شبیر محمد صاحب مفتاجی " " شہر بلول مہتمم مدرسہ نصرۃ الاسلام
شاکرہ " حافظ سعید الرحمٰن صاحب بن مولانا محمد الیاس صاحب

تصانیف

جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا نیاز محمد صاحبؒ نے صرف افراد اور سیرت ہی کی تعمیر نہیں فرمائی بلکہ کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ مختلف موضوعات پر عربی و اردو میں محققانہ تصانیف چھوڑی ہیں ، افسوس یہ ہے کہ زیادہ تر سرمایہ ابھی غیر مطبوعہ ہے ۔ اللہ پاک زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھے ، جلد شائع ہو کر شائقین علم کو سیراب کر سکے ۔

۱ ۔ الدر المنضد فی توضیح الادب المفرد الامام بخاریؒ ۔ عربی زیر طبع فی مصر
۲ ۔ عمدۃ اللبیب فی شرح شیم الحبیب عربی مطبوعہ
۳ ۔ النجاۃ الکاملہ ۳ حصے متعلقہ طلاق ثلثہ اردو "
۴ ۔ تذکرہ حضرت شیخ موسیٰؒ " "
۵ ۔ اظہار الحقائق بذکر الوثائق ۔ مولانا اسمٰعیل شہید و تقویۃ الایمان کا جواب " زیر طبع
۶ ۔ عبد اللہ بن سبا یہودی اور اس کی ذریت کے کارنامے " غیر مطبوعہ
۷ ۔ علماء حقانی اور علماء سوء کی پہچان " "
۸ ۔ التحفۃ السنیۃ شرح خلاصۃ البہتیہ فی مذہب الحنفیہ " "
۹ ۔ ابو حنیفہ اور ان کے حاسدین و معاندین " "
۱۰ ۔ حاشیہ النصیحہ فی الادعیۃ الصحیحہ للحافظ المقدس " "

۱۱ - حاشیہ مختصر المنار زین الدین حلبی الحنفی
۱۲ - توضیح المدخل المنیر مقدمۃ فی علم التفسیر
۱۳ - ہدیۃ الدعالی الی من درس بدر الامالی شیخ ابوالحسن
۱۴ - اسلامی لیل ونہار یعنی دن رات صبح شام کے وظائف

۱۵ - شرح اربعین مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ	عربی	غیر مطبوعہ
۱۶ - شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	"	"
۱۷ - فتوحات الباری شرح اربعین ملا علی قاریؒ	"	"
۱۸ - مولانا قطب الدین خاں صاحب مہاجر مکیؒ	"	"
۱۹ - مفتی عنایت احمد صاحبؒ	"	"
۲۰ - مولانا محمد حسین الملخص بالفقیر دہلی	"	"
۲۱ - الشیخ یحییٰ بن شرف الدین النووی	"	"
۲۲ - مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی ۔ فی فضائل الحج والعمرہ	"	
۲۳ - ردمودودیت	اردو	
۲۴ - شرح ملتقط الزواجر فی معرفۃ الکبائر نامکمل	عربی	

۲۵ - امارت شرعیہ حصہ اول
۲۶ - " " دوئم
۲۷ - " " سوئم
۲۸ - " " چہارم
۲۹ - " " پنجم

ان کے علاوہ بھی دسیوں مسودات ہیں۔ سردست آپ کی قیمتی تصنیف النجاۃ الکاملہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ یہ کتاب جلد اول و دوم اور جلد سوم مولاناؒ کی تحقیقی تصنیف ہے جلد دوم میں اتبعوا السواد الاعظم حدیث کی روشنی میں ائمہ اربعہ کی تقلید پر محدثانہ بحث فرمائی ہے۔ اصلاً یہ حصہ مولانا اسرائیل صاحب سلفی کی تصنیف کا جواب ہے اور پہلے حصے میں طلاق ثلثہ

اور فنارِ جہنم کی بحث ہے۔ تین طلاق بیک وقت ایک مجلس میں دینے سے طلاق مغلظہ و
ہوتی ہے اور جہنم کی ابدیت جمہورِ امت کا متفق علیہ عقیدہ ہے یہ دونوں مسائل قرآن وحد
سے مدلّل کر کے ثابت کئے ہیں۔

فنارِ جہنم کے مسئلے میں آغازِ اسلام سے کم و بیش سات سو سال تک علمار و محدثین ر
کا عقیدہ فنار کے مقابلے میں ابدیت کا رہا ہے۔ حضرت امام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد امام ا
قیمؒ نے سب سے پہلے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے۔ مولانا نیاز محمد صاحبؒ نے پہلے فنار ـ
دلائل کا مستند جواب دیا ہے۔ ساتھ ہی ابدیت کا کتاب وسنت سے وقوع ثابت کیا ہے ا
فنار کے دلائل کی کمزوری کو واضح فرمایا ہے۔ کتاب لائق مطالعہ ہے۔

موجودہ صدی کے ایک عالم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی کے چوتھے حصّے
میں ابن تیمیہؒ کے اس مسئلے کو اردو زبان میں منتقل کر دیا ہے۔ عبارت اور سیاق وسبا
سے مولانا ندویؒ کا رجحان بھی فنارِ جہنم کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نیاز محمد صاحبؒ نے ایک
واقعہ لکھا ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے مولانا ندویؒ کو اس مسئلے کی غلطی کی طرف متو
فرمایا۔ تو مولانا ندوی مرحوم نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اس خیال سے رجوع کر لیا۔ یہ بھی وعد
فرمایا کہ سیرت النبی میں مذکورہ اس غلطی سے رجوع اور برأت کا اعلان فرما دیں گے۔
لیکن حضرت ندویؒ کے معتقدین اب بھی اس مسئلے کو ان کی طرف منسوب کر کے علمی
خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ابھی حال میں۔ ترجمان الاسلام بنارس کے ایک شمارے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے تاریخ کے ایک فاضل پروفیسر کا مضمون شائع ہوا ہے، مضمون میں اس اہم مسئلے پر بہت
گہری تحقیق تو نہیں ہے۔ ہاں یہ دعویٰ بے دلیل ضرور ہے کہ مولانا ندویؒ اس مسئلے میں
حق پر تھے۔ کیوں؟

کیونکہ ت سے صحابہ، علمار، محدثین اور فقہار کا یہ بھی مسلک رہا ہے اور کتاب وسنت
سے یہ ثابت ہے۔ مضمون میں پروفیسر صاحب کا یہ ایک دعویٰ ہے۔ بلا دلیل۔ اور سب سے
بڑی بات جو پروفیسر صاحب کا مستدل ہے وہ یہ کہ عقل یہی کہتی ہے۔ جذبات کا یہی تقاضا ہے

اور اللہ میاں کے کرم کا یہی فیصلہ قرین قیاس ہے کہ جہنم کو فنا کر دیا جائے۔ گویا عقیدے کے اس دعوے کو جو صرف دلیل قطعی سے ہی ثابت کیا جا سکتا ہے، اس طرح ظنی۔ عقلی۔ جذباتی دلیلوں کے حوالے کر دیا گیا ہے[1]۔ مولانا نیاز محمد صاحبؒ نے ان تمام پہلوؤں سے اپنی کتاب میں بحث کی ہے۔ مولاناؒ کی بہت سی تحریریں غیر مطبوعہ ہیں۔ اللہ پاک ذمہ دارانِ مدرسہ قاسم العلوم کو اور صاحب زادگان کو توفیق دے کہ اُن سب کو طبع کرا سکیں تاکہ اس کا فیض عام ہو۔

---

[1] یہاں تک یوں سمجھئے احقر مضمون نگار کی رائے ہے یا مولانا نیاز محمد صاحب کی کتاب پہ تبصرہ۔ قرآن پاک کی آیت "انما یامرکم بالسوء والفحشاء۔ الخ" کے فائدے میں مولانا شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں "بہت سے مواقع میں دیکھا جاتا ہے کہ مسائل جزئیہ سے گذر کر امورِ اعتقادیہ تک میں نصوصِ شرعیہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے احکام تراشے جاتے ہیں اور نصوصِ قطعیہ اور اقوالِ سلف کی تحریف اور تغلیط کرتے ہیں"۔
(آیت ۱۲۹، رکوع ۲۰، سورۂ بقرہ، ف نمبر ۱۰، ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ مطبوعہ مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف سعودی عربیہ ۱۴۰۹ھ)

بقیہ سودی قرضے نے برطانیہ میں تباہی مچادی

خداوند کریم نے اپنے ابدی قانون میں سچ فرمایا ہے کہ "یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات" (بقرہ آیت ۲۷۶) اللہ تعالیٰ سود (اور سودی کاروبار کرنے والوں) کو مٹا دیتا ہے اور صدقات کو آگے بڑھاتا ہے۔

انسانوں کو برطانیہ کی حالت زار سے عبرت پکڑنی چاہئے ؎

جبیں رکھنے سے پہلے رخ سمجھ لے آستانے کا
کہ دنیا پھر کبھی موقع نہ دے گی سر اٹھانے کا

مسجد جدید، دارالعلوم دیوبند

جو اپنی تکمیل کیلئے اہل خیر حضرات کی توجہات کی منتظر ہے

دارالعلوم دیوبند کے ہمدردان ومعاونین حضرات کو جیسا معلوم ہے کہ تقریباً ہر سال ہوئے طلبہ کی کثرت تعداد کی بنا پر دارالعلوم میں ایک بڑی جدید مسجد کا کام اللہ تعالیٰ کے فضل پر توکل کرتے ہوئے دارالعلوم سے متصل ایک آراضی خرید کر شروع کردیا تھا۔

الحمدللہ مسجد کا تعمیری کام بہت آگے بڑھ گیا ہے اور اس وقت فضل خداوندی اور اہل خیر حضرات کی توجہ سے تیسری منزل پر تعمیری کام جاری ہے اس مسجد سے طلبۂ دارالعلوم اور دیگر مسلمانوں کیلئے ایک وقت میں مسقف (چھت والے) حصہ میں جہاں چار ہزار نمازیوں کیلئے جگہ ہوجائیگی وہیں اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی طرف سے ایک صدقہ جاریہ ہوگا اور وہ انشاءاللہ اجر عظیم کے مستحق ہونگے ـــ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کیلئے مسجد تعمیر کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں گھر عطا فرمائیں گے۔

تعمیری کام جاری رکھنے کیلئے اسوقت سرمایہ کی شدید ضرورت ہے

اسلئے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس مسجد کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ مسجد دارالعلوم کے شایان شان جلد تعمیر ہوسکے۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کے لئے } "دارالعلوم دیوبند" اکاونٹ نمبر 30076 اسٹیٹ بینک آف انڈیا، دیوبند

منی آرڈر کیلئے: (حضرت مولانا) مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پن ۲۴۷۵۵۴

D-No. 0136
100-No. 2429
دارالعلوم دیوبند کا ترجمان
PIN-No-24755

ماہنامہ دارالعلوم

جلد نمبر ۷۸ شمارہ نمبر ۱۱

ماہ جمادی الاول ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۳ء

فی شمارہ ۶/=
سالانہ ۶۰/=

نگران
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ	۲۵۰/=	روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم	۱۰۰/=	"
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم	۸۰/=	"

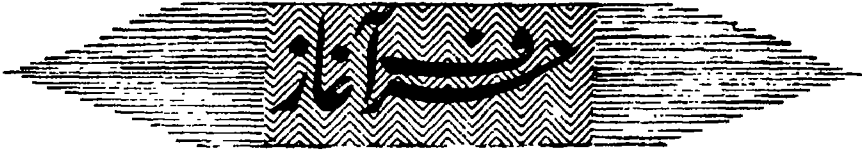
ترسیل زر کا پتہ :- دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند. سہارنپور یوپی

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس اختر سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ کمیل گاؤں ڈھاکہ ۱۲۱۷ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے (مدیر)





مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

قرآن کریم انسان کی ہدایت اور رہنمائی کیلئے خالق کائنات کی عطا کردہ وہ آخری کتاب ہے جس میں اصولی طور پر دنیا و آخرت میں خیر و فلاح کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی جامع ترین ہدایات بیان کردی گئیں ہیں جو ہر زمانہ اور ہر طبیعت کے بالکل مناسب ہیں، ان میں کسی ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ "ما فرطنا فی الکتاب من شیٔ" اور "الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا قیما" الخ الآیۃ میں قرآن عظیم کی اسی جامعیت اور ہمہ گیری کو بیان کیا گیا ہے، چنانچہ علامہ عثمانیؒ آخر الذکر آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"اس کتاب میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں، عبارت انتہائی سلیس و فصیح اسلوب نہایت مؤثر و شگفتہ تعلیم نہایت متوسط و معتدل جو ہر زمانہ اور ہر طبیعت کے مناسب اور عقل سلیم کے عین مطابق ہے" (فوائد عثمانی ۳۸۰)

یہ تغیر پذیر دنیا ہزار کروٹیں بدلے، تمدن و معاشرت اور انسانی مزاج و عادات میں لاکھ تبدیلیاں آجائیں، اقتصادیات و معاشیات کی قدریں گو یکسر مختلف ہوجائیں علم و تحقیق کے معیار خواہ کتنی بلندیوں پر پہنچ جائیں زندگی کے تقاضے اور ضروریات کوئی بھی صورت اختیار کرلیں قرآن حکیم اور کتاب مبین کی جامع اور ہمہ گیر ہدایات حیات انسانی کے ہر مسئلہ اور ہر ضرورت کا حل پیش کرتی رہیں گی۔

اسی بنا پر خداوند عالم نے اہل دانش کو قرآن مبین کی آیات میں غور و فکر اور تدبر کی بار بار دعوت دی ہے چنانچہ ایک موقعہ پر ارشاد ہے

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ (سورہ ص)

(یہ) ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے تیری طرف برکت کی تاکہ دھیان کریں لوگ اسکی آیتوں میں اور تاکہ سمجھیں عقل والے

لیکن تدبر کی اس عام دعوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ اسکے کلام میں کوئی شخص اپنے افکار و نظریات اور خیالات و رجحانات کو شامل کردے کیونکہ اس آزادی اور چھوٹ کا انجام یہ ہوگا کہ یہ دستور الٰہی اور کتاب ہدایت انسانی افکار و مزعومات کا ایک دفتر ہوکر رہ جائیگی اس لئے حق جل مجدہٗ نے اپنے کلام کی

تفسیر وتشریح کیلئے خود اپنے مرسل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو متعین فرمادیا۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ۔ — اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ تو کھولدے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے۔

یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو ایسی کتاب دیکر بھیجا جو تمام کتب سابقہ کا خلاصہ اور انبیاء سابقین کے علوم کی مکمل یادداشت ہے، آپ کا کام یہ ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کیلئے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کر بیان فرمائیں اور اس کی مشکلات کی شرح اور مجملات کی تفصیل کر دیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا مطلب وہی معتبر ہے جو روایتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے موافق ہو (فوائد عثمانی ص۳۵۱)

اسی بنا پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے سے قرآن حکیم کی تفسیر وتشریح کرنیوالے کو جہنم کی وعید سنائی ہے چنانچہ ترجمان قرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نبی پاکؐ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ:

قال من قال فی القرآن برأیه او بما لا یعلم فلیتبوء مقعده من النار (اخرجه الترمذی والنسائی وابو داؤد وقال ترمذی هذا حدیث حسن) — جس شخص نے قرآن حکیم میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی یا ایسی بات کہی جس کا علم اسے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) نہیں ہے تو اسے جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنالینا چاہیئے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں ائمہ مفسرین نے قرآن حکیم کی تفسیر کیلئے کچھ اصول وضوابط اور معیار مقرر کئے ہیں جو تفسیر اس ضابطے اور معیار کے مطابق ہوگی وہی معتبر اور مقبول ہوگی اور جو اس معیار واصول سے منحرف اور ہٹ کر ہوگی وہ غیر معتبر اور مردود سمجھی جائے گی، ائمہ تفسیر کے اس ضابطہ کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تفسیر کے مطابق یا کسی مرفوع حدیث یا اقوال صحابہ سے ماخوذ ومستنبط ہو۔

(۲) سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہو یعنی قرآن عظیم کی ان آیات سے مربوط ہو جو اس سے پہلے اور بعد میں ہیں

(۳) قواعد عربیہ اور اہل زبان کے استعمال کے موافق ہو۔

(۴) اصول شریعت اور دین کے ثابت شدہ ان بنیادی امور کے مطابق ہو جن پر ایمان واعتقاد لازم ہے۔

(۵) مقاصد قرآن کے ماتحت ہو۔

لیکن قرآن وحدیث اور علماء حق کی ان تمام پیش بندیوں کے باوجود ہر عہد اور ہر زمانہ کے علماء سوء اور اہل ہوا قرآن پاک کے تراجم وتفاسیر میں اپنے باطل عقائد اور کاسد نظریات کو ٹھونس کر کتاب مبین کی روشن تعلیمات وہدایات کو غبار آلود کرنے کی مذموم کوشش اور ناروا جسارت کرتے رہے ہیں خود ہمارے ملک ہندوستان میں بعض کم فہم مغرب زدوں اور اہل بدعت دین بیزار کے ہاتھوں ترجمہ اور تفسیریں تحریفات اور باطل تاویلات سے بھری ہوئی ہیں اور یہ ناروا ضلالت خیز رویہ آج بھی جاری ہے بلکہ کوشش کیجارہی ہے کہ اسلاف اور علمائے محققین کے علمی شہ پاروں کے مقابلے میں ان خذف ریزوں کو امت ترجیح دے عصر حاضر کے اس خطرناک فتنہ سے پورے طور پر ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاقیں

از
مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

(۳) آثار صحابہ

امت میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جو امتیازی شرف و مجد حاصل ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں، انھوں نے براہ راست فیضان نبوت سے استفادہ کیا ہے اور بغیر کسی واسطہ کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم و تربیت پائی ہے جو کچھ جس طرح آپ سے سنا یا کرتے دیکھا اسے اپنی زندگی میں ڈھال لیا تھا، اگر کسی امر میں کبھی کچھ تردد و اشتباہ پیش آگیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر تشفی حاصل کرلی تھی، اس لئے ان سے بڑھ کر مزاج شناس نبوت اور واقف شریعت کون ہوسکتا ہے؟ ان کے مجموعی عمل اور رائے کے مقابلہ میں کسی بڑے سے بڑے محقق و مجتہد کے قول و عمل کو اہمیت نہیں دی جاسکتی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابہ کی اس امتیازی شان کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

اولئك اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها علما واقلها تکلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم - رواه رزين

(مشکوۃ المصابیح ج ۱، ص ۳۲)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کی نیکی، علم کی گہرائی اور تکلف کی کمی میں امت میں افضل ترین ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین

کی اقامت کے لئے منتخب فرمایا ہے لہذا ان کے فضل کو پہچانو ان کے نقش قدم کی پیروی کرو، اور ان کے اخلاق وسیرت کو جہاں تک بس چلے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو، بلاشبہ یہ حضرات ہدایت پر مستقیم ہیں:

صحابہ کی زندگی پر خود انہی کے فاضل ترین معاصر کے اس وقیع وعمیق تبصرہ کے بعد کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں باقی رہتی، زندگی میں سادگی، دل کی پاکیزگی اور نیکی، علم میں گیرائی و گہرائی ایسے اعلیٰ ترین اور تاریخ ساز اوصاف ہیں جن سے قوموں کی حیات سنور جاتی ہے۔

خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے طریقہ پر چلنے کو مدار نجات قرار دیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة، قالوا من هی یارسول الله؟ قال ما انا علیه واصحابی، رواه الترمذی (مشکوة المصابیح، ص ۳۰، ج ۱)

اور میری امت ۷۳، فرقوں میں بٹ جائے گی، اور ایک کے علاوہ سب فرقے جہنم رسید ہوں گے، صحابہ رض نے عرض کیا یارسول اللہ نجات پانے والی کون سی جماعت ہے؟ آپ نے فرمایا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر ہے۔

ایک حدیث میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ خلفائے راشدین کے طریقہ پر چلنے کی امت کو ہدایت فرمائی ہے۔

فانه من یعیش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ (رواه احمد وابوداؤد والترمذی، وقال حدیث حسن صحیح، وابن ماجة (مشکوة المصابیح ج ۱ ص ۳۰)

پس تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلاف کثیر دیکھے گا، لہذا تم لوگ میری سنت اور خلفائے راشدین (ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ) کی سنت کو لازم پکڑو اور مضبوطی کے ساتھ اس پر جمے رہو، اور قوت کے ساتھ اسے تھامے رہو۔

انھیں جیسی نصوص کی بنا پر تعامل صحابہ کے بارے میں فقہائے امت کا مسلک ہے "یجب اجماعا فیما شاع فسکتوا مسلمین ولا یجب اجماعا فیما ثبت الخلاف بینهم (توضیح تلویح کی تعلیقات قمریہ)

جو بات عام طور پر صحابہؓ میں شائع ہوا اور انھوں نے سکوتاً اسے تسلیم کرلیا ہو اس کی اتباع باتفاق واجب ہے اور جس بات میں ان کا اختلاف ہو اس میں اتباع سب کے نزدیک واجب نہیں ہے

شریعت اسلامی میں حضرات صحابہ رضؓ کی اس خصوصی و امتیازی حیثیت پر ثبوت پیش کرتے ہوئے صاحب توضیح وتلویح کہتے ہیں لان اکثر اقوالھم مسموع بحضرۃ الرسالۃ وان اجتھد فرایھم اصوب لانھم شاھدوا موارد النصوص ولتقدمھم فی الدین وبرکۃ صحبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکونھم فی خیر القرون (توضیح وتلویح فی تقلید الصحابی)

اس لئے کہ ان کے اکثر اقوال زبان رسالتؐ سے سنے ہوتے ہیں اور اگر انھوں نے اجتہاد بھی کیا ہے تو ان کی رائے زیادہ صائب اور درست ہے کیونکہ انھوں نے نصوص (قرآن وحدیث) کے موقع ومحل کا براہ راست مشاہدہ کیا ہے، دین میں انھیں تقدم حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے فیضیاب ہیں اور زمانہ خیر القرون میں تھے بالخصوص حضرات خلفاء راشدین کی حیثیت تو اس معاملہ میں بہت ہی بلند اور اعلیٰ وارفع ہے چنانچہ مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آیت استخلاف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

دکلمہ "لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم دلالت میکند بر دو معنی یکے آنکہ ایں خلفاء کہ خلافت ایشاں موعود است چوں وعدہ منجز شود دین علی اکمل الوجوہ بہ ظہور آید، دوم آنکہ ازباب عقائد وعبادات ومعاملات ومناکحات واحکام خراج آنچہ در عصر مستخلفین ظاہر شود وایشاں باہتمام سعی درا قامت اں کنند دین مرتضی است پس اگر احکال قضا مستخلفین در مسئلہ یا فتوی ایشاں در حادثہ ظاہر شود آں دلیل شرعی باشد کہ مجتہد باآں تمسک نماید زیرا کہ آن دین مرتضیٰ است کہ تمکیں آں واقع شد (ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ص ۱۹)

جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی دین اسلام "رضیت لکم الاسلام دینا") اس کو ان کے واسطے جما دے گا، آیت استخلاف کا یہ جز دو معنی پر دلالت کرتا ہے ایک یہ کہ یہ خلفاء جن کی خلافت کا وعدہ ہے جس وقت اس وعدہ کا ظہور ہوگا دین الٰہی مکمل ترین صورت میں رائج ہوگا اور دوسرا معنی یہ ہے کہ عقائد، عبادات، معاملات، مناکحات، اور احکام خراج جو خلفاء کے زمانے میں ان کی سعی واہتمام سے رائج ہوئے وہ سب پسندیدۂ الٰہی ہیں، لہٰذا اس

عہد کا جو فیصلہ یا فتویٰ ان امور سے متعلق آج دستیاب ہو وہ حجت اور دلیل شرعی ہوگا کیونکہ وہ دین پسندیدہ ہے جس کو تمکین و قوت حاصل ہوئی ہے۔

محدث دہلوی قدس سرہٗ کی اس تحقیق سے ان بیباکوں کی بے عقل پسندی بھی اظہر من الشمس ہوگئی جو بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کے تین شمار ہونے سے متعلق خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم کے اجماعی فتویٰ کو سرکاری آرڈی نینس کہہ کر اس کی شرعی حیثیت کو مجروح کرنے کے درپے ہیں

شریعت اسلامی میں حضرات صحابہؓ بالخصوص خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی امتیازی شان اور خصوصی حیثیت سے متعلق اس مختصر سی تمہید کے بعد مسئلہ زیر بحث کے بارے میں ان کے اقوال و آثار ملاحظہ کیجئے، اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حسب تحقیق حافظ ابن الہمام جماعت صحابہ میں فقہاء و مجتہدین کی تعداد تقریباً بیس بائیس سے اوپر نہ ہوگی مثلاً خلفائے اربعہ یعنی ۱۔ حضرت صدیق اکبرؓ۔ ۲۔ فاروق اعظمؓ۔ ۳) عثمان غنیؓ۔ ۴۔ حضرت علی مرتضیٰؓ ۵۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ۔ ۶۔ عبداللہ ابن عمرؓ ۷۔ عبداللہ ابن عباس ۔ ۸۔ عبداللہ ابن زبیرؓ ۔ ۹۔ زید بن ثابت ۱۰۔ معاذ بن جبل ۔ ۱۱۔ انس بن مالک ۔ ۱۲۔ ابو ہریرہ ۔ ۱۳۔ حضرت عائشہ صدیقہ ۔ ۱۴۔ حضرت ابی بن کعب ۔ ۱۵۔ ابوموسیٰ اشعری ۔ ۱۶۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص ۔ ۱۷۔ مغیرہ بن شعبہ ۔ ۱۸۔ ام المومنین ام سلمہ ۔ ۱۹۔ عمران بن حصین ۔ ۲۰۔ معاذ بن ابی سفیان وغیرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔ باقی حضرات صحابہ مسائل میں انھیں کی جانب رجوع کرتے تھے (فتح القدیر، ج ۳، ص ۳۳۰)۔

شیخ محمد خضری بک نے تاریخ التشریع الاسلامی میں پندرہ فقہائے صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مکثرین (کثرت سے فتویٰ دینے والوں) میں شمار کیا ہے (تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۳۰، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۶، ۱۶۰ اور ۱۶۳) ذیل میں انھیں فقہاء صحابہ میں سے اکثر کے فتاویٰ درج کئے جارہے ہیں

خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اثر

عن ابن عمران رجلا اتی عمر فقال انی طلقت امرأتی البتۃ وھی حائض فقال عمر عصیت ربك وفارقت امرأتك فقال الرجل فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر ابن

عمر حين فارق زوجته ان يراجعها فقال له عمر ان رسول الله صلى الله عليه وسلم امره ان يراجع بطلاق بقي وانه لم يبق لك ماترجع به امرأتك " رواه الطبراني في الاوسط ورجاله رجال الصحيح خلا اسمعيل بن ابراهيم الترجماني وهو ثقة (مجمع الزوائد، ج ۴، ص ۳۳۵ - سنن الكبرىٰ ج ۷، ص ۳۳۴)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو بحالت حیض طلاق بتہ یعنی بیک وقت تین طلاقیں دیدیں مولانا شمس الحق صاحب اہل حدیث (غیر مقلد) عالم نے لکھا ہے کہ اہل مدینہ تین طلاقوں کو "بتہ" کہتے ہیں (التعلیق المغنی ج ۲، ص ۴۵۰) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو چکی۔ اس نے کہا: حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجعت کرادی تھی؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو رجعت کا اختیار اس لئے ملا تھا کہ ان کی طلاق باقی رہ گئی تھی اور تمھارے لئے کچھ باقی ہی نہیں بچا کہ اپنی بیوی سے رجعت کرو۔

خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ

عن معاوية بن ابي يحيىٰ قال جاء رجل الى عثمان بن عفان فقال طلقت امرأتي الفا فقال بانت منك بثلاث۔ (فتح القدير، ج ۳، ص ۳۳۰ - وزاد المعاد، ج ۲، ص ۲۵۹)

معاویہ بن ابی یحیی سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دیدی ہیں؟ آپ نے فرمایا تیری بیوی تجھ سے تین طلاقوں سے جدا ہوگئی۔

خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر

عن حبيب بن ابي ثابت قال جاء رجل الى على بن ابي طالب فقال اني طلقت امرأتي الفا فقال له على بانت منك بثلاث واقسم سائرهن على نسائك -

(فتح القدير ج ۳، ص ۳۳۰، زاد المعاد ج ۲، ص ۲۰۹، سنن الكبرىٰ ج ۷، ص ۳۳۵)

حبیب بن ابی ثابت سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے ڈالی ہیں؟ تو حضرت علی رض نے ان کے جواب میں فرمایا کہ تین طلاقوں سے تیری عورت تجھ سے جدا ہو گئی اور بقیہ ساری طلاقوں کو اپنی عورتوں پر تقسیم کر دے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اثر

عن علقمة قال جاء ابن مسعود رجل فقال انی طلقت امرأتی تسعا وتسعين وانی سألت فقيل قد بانت منی فقال ابن مسعود قد احبوا ان يفرقوا بينك وبينها قال فما تقول رحمك الله فظن انه سيرخص له فقال ثلاث تبينها منك وسائرهن عدوان رواه الطبرانی ورجاله رجال الصحيح (مجمع الزوائد ج۴ ص ۳۳۸)

علقمہ سے روایت ہے ایک شخص عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دیدی ہیں اور میں نے پوچھا تو مجھ کو بتایا گیا کہ تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی؟ یہ سن کر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگ چاہتے ہیں کہ تجھ میں اور تیری بیوی میں جدائی کر دیں، اس نے کہا اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ کیا کہتے ہیں اس کو خیال ہوا کہ شاید ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے لئے رخصت کا حکم فرمائیں، حضرت عبداللہ ابن مسعود رض نے فرمایا کہ تین طلاقوں سے وہ تم سے جدا ہو گئی اور بقیہ طلاقیں عدوان و سرکشی ہیں۔

اثر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

عن مجاهد قال كنت عند ابن عباس رضی الله تعالی عنهما فجاءه رجل فقال انه طلق امرأته ثلاثا قال فسكت حتى ظننا انه رادها اليه ثم قال ينطلق احدكم فيركب الحموقة ثم يقول يا ابن عباس يا ابن عباس وان الله جل ثناءه قال ۔ ومن يتق الله يجعل له مخرجا ۔ وانك لم تتق الله فلا اجد لك مخرجا عصيت ربك وبانت منك امرأتك وان الله قال ۔ يا أيها النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن رواه البيهقی واللفظ له ورواه ايضا ابوداؤد وقال روی هذا الحديث حميد الاعرج وغيره

عن مجاهد عن ابن عباس ورواه شعبة عن عمرو بن مرة عن سعيد بن جبير عن ابن عباس وايوب وابن جريج جميعًا عن عكرمة بن خالد عن سعيد بن جبير عن ابن عباس وابن جريج عن عبد الحميد بن رافع عن عطاء عن ابن عباس ورواه الاعمش عن مالك بن الحارث عن ابن عباس وابن جريج عن عمرو بن دينار عن ابن عباس كلهم قالوا في الطلاق الثلث انه اجازها قال وقالوا وبانت منك نحو حديث اسماعيل عن ايوب عن عبد الله بن كثير (السنن الكبریٰ ج ۷، ص ۳۳۱ - وابوداؤد ج ۱ ص ۲۹۹)

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دیدی ہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما چپ رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ حضرت ابن عباس رضؓ اسے رجعت کا حکم دیں گے پھر فرمایا کہ پہلے تو لوگ حماقت کر بیٹھتے ہیں اور پھر اے ابن عباس اے ابن عباس چلاتے ہیں، اللہ جل شانہ کا فرمان ہے جو اللہ سے ڈرے گا اس کے واسطے اللہ گنجائش کی راہ پیدا کردیگا، تم نے اللہ کا خوف نہیں کیا، لہذا میں تیرے واسطے کوئی گنجائش کی راہ نہیں پاتا، تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہوگئی، خدا کا ارشاد ہے اے نبی تم اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو تو انھیں طلاق دو ان کی عدت کے وقت سے پہلے، امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ مجاہد کے علاوہ سعید بن جبیر، عطاء، مالک بن الحارث، اور عمرو بن دینار نے بھی اس حدیث کو حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت کیا ہے۔

کتب حدیث میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے متعدد فتاوے منقول ہیں بغرض اختصار صرف ایک پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

اثر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ

عن نافع كان ابن عمر اذا سئل عمن طلق ثلاثًا قال لو طلقت مرة او مرتين فان النبي صلى الله عليه وسلم امرني بهذا فان طلقتها ثلاثًا حرمت عليك حتى تنكح زوجًا غيرك۔ (رواہ البخاری تعلیقًا عن اللیث بن سعد، ج ۲، ص ۹۲، ومسلم شریف ج ۱، ص ۴۷۶)

نافع بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص تین طلاقیں دے کر حضرت ابن عمرؓ سے فتویٰ پوچھتا تو وہ فرماتے اگر تم نے ایک یا دو بار طلاق دی ہوتی تو رجعت کر سکتے تھے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اسی کا حکم دیا تھا، اور اگر تم نے تین طلاقیں دے دی ہیں تو وہ تم پر حرام ہو گئی تاوقتیکہ دوسرے سے نکاح نہ کرے۔

مسلم میں یہ الفاظ مزید ہیں وعصیت اللّٰہ فی ما امرك من طلاق امرأتك اور تم نے اللہ کی حکم عدولی کی اپنی عورت کے طلاق دینے میں جس سے ظاہر ہی ہے کہ یہ یک کلمہ تین طلاقوں کا حکم بیان کر رہے ہیں۔

اثر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ

عن محمد بن ایاس بن البکیر عن ابی ھریرۃؓ وابن عباسؓ وعائشۃؓ وعبد اللّٰہ بن عمرو ابن العاص سئلوا عن البکر یطلقھا زوجھا ثلاثا فکلھم قال لا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۵، ص ۲۳)

محمد ابن ایاسؒ سے روایت ہے کہ ابوہریرہؓ عبداللہ ابن عباسؓ، عائشہؓ، اور عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے اس عورت کے بارے میں جسے اس کے شوہر نے صحبت سے پہلے طلاق دیدی ہو پوچھا گیا تو ان چاروں حضرات نے فرمایا وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

فتویٰ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

ان عطاء بن یسارؒ قال جاء رجل یستفتی عبد اللّٰہ بن عمرو بن العاص عن رجل طلق امرأتہ ثلثا قبل ان یمسھا فقال عطا فقلت انما طلاق البکر واحدۃ فقال لی عبد اللّٰہ بن عمرو انما انت قاص الواحدۃ تبینھا والثلاث تحرمھا حتی تنکح زوجا غیرہ (السنن الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۵)

عطاء ابن یسارؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اس مرد کے بارے میں جس نے اپنی بیوی

کو صحبت سے پہلے طلاق دیدی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے فتوی معلوم کیا، عطا کہتے ہیں کہ میں نے کہا غیر مدخولہ کی تو ایک ہی طلاق ہے، تو حضرت عبداللہ ابن عمروؓ نے فرمایا تم صرف قصہ گو ہو، غیر مدخولہ ایک طلاق سے بائن اور تین طلاقوں سے حرام ہوجائے گی یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرے، یعنی ایک طلاق سے اس کا نکاح ختم ہوجائے گا، البتہ اگر عورت راضی ہو تو عدت کے بعد نکاح دوبارہ ہوسکتا ہے، اور تین طلاقوں کے بعد اس طرح جدا ہوگی کہ جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرے اور یہ دوسرا شوہر اس سے لطف اندوز نہ ہوئے پہلے کے لئے حلال نہ ہوگی

فتوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

عن معاویۃ بن ابی عیاش الانصاری انہ کان جالس مع عبد اللہ بن الزبیر و عاصم بن عمر رضی اللہ عنہما قال فجاء ہما محمد بن ایاس بن البکیر فقال ان رجلا من اہل البادیۃ طلق امرأتہ ثلاثا قبل ان یدخل بہا فماذا تریان فقال ابن الزبیر ہذا الامر ما لنا فیہ قول اذہب الی ابن عباس و ابی ہریرۃ فانی ترکتہما عند عائشۃ رضی اللہ عنہا ثم ائتنا فاخبرنا فذہب فسألہما قال ابن عباس لابی ہریرۃ افتہ یا ابا ہریرۃ فقد جاءتک معضلۃ فقال ابوہریرۃ الواحدۃ تبینہا والثلاث تحرمہا حتی تنکح زوجا غیرہ وقال ابن عباس مثل ذلک

(السنن الکبری ج ۷، ص ۳۳۵)

معاویہ بن ابی عیاش انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن الزبیر اور عاصم ابن عمرؓ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ محمد ابن ایاسؓ آگئے اور کہا کہ ایک دیہاتی نے اپنی بیوی کو خلوت سے پہلے تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ دونوں حضرات اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، عبداللہ ابن زبیرؓ نے فرمایا اس مسئلہ کا ہمیں علم نہیں ہے، تم عبداللہ ابن عباسؓ اور ابوہریرہؓ کے پاس جاؤ وہ دونوں حضرات حضرت عائشہؓ کے یہاں ہیں اور دونوں حضرات جو مسئلہ بتائیں اسے ہمیں بھی بتادینا، محمد بن ایاسؓ ان دونوں حضرات کے پاس گئے اور ان

سے معلوم کیا تو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ ایک مشکل مسئلہ پیش آگیا ہے آپ ہی اس کے بارے میں فتویٰ دیں تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک طلاق تو عورت کو بائن کردے گی اور تین طلاقیں اسے حرام کردیں گی یہاں تک کہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرلے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی فتویٰ دیا۔

اثر حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ

عن الحکم ان علیا وابن مسعود وزید بن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین قالوا اذا طلق البکر ثلاثا فجمعها لم تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ

(مصنف عبدالرزاق، ج ۶، ص ۳۳۶)

حکم سے روایت ہے کہ حضرت علی، عبداللہ ابن مسعود اور حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہم اجمعین نے فرمایا کہ غیر مدخولہ کو جب اکٹھی تین طلاقیں دی گئیں تو وہ شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرلے۔

اثر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

حدثنا سعید نا ابوعوانة عن شقیق عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ فی من طلق امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بھا قال لا تحل له حتی تنکح زوجا غیرہ وکان عمر رضی اللہ عنہ اذا اتی برجل طلق امرأته ثلاثا اوجع ظھرہ (سنن سعید ابن منصور القسم الاول من المجلد الثالث ص ۲۱ رقم الحدیث ۱۰۷۳ وقال المحدث الاعظمی واخرجه الطحاوی عن صالح بن عبدالرحمن عن المصنف، ج ۲، ص ۳۴)

شقیق روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اس شخص کے بارے میں جس نے اپنی بیوی کو صحبت سے پہلے طلاق دی فتویٰ دیتے تھے کہ وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے اور فرماتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب ایسا شخص لایا جاتا جس نے اکٹھی تین طلاقیں دی ہوں تو وہ اس کی پشت پر درّے مارتے تھے۔

اثر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

عن جابر قال سمعت ام سلمہ سئلت عن رجل طلق امرأته ثلاثا قبل ان یدخل بها فقالت لا تحل له یطاها زوجها (مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۵، ص ۲۲)

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اس شخص کے متعلق جس نے صحبت سے پہلے اپنی بیوی کو تین طلاق دے دی تھی میں نے حضرت ام سلمہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ اب اس کے شوہر کے لئے حلال نہیں کہ اسکے ساتھ ہم بستر ہو۔

اثر حضرت عمران بن حصینؓ وابوموسیٰ اشعریؓ

اخبرنا حمید بن واقع بن سحبان ان رجلا اتی عمران بن حصین وهو فی المسجد فقال رجل طلق امرأته ثلاثا وهو فی مجلس قال اثم بربه (یعنی اثم بمعصیة ربه) وحرمت علیه امرأته قال فانطلق الرجل فذکر ذالک لابی موسی اشعری یرید بذالک عیبه فقال الا تری ان عمران بن حصین قال کذا وکذا فقال ابو موسی اکثر الله فینا مثل ابی نجید (السنن الکبری ج ۷، ص ۳۳۲)۔

حمید ابن واقع نے خبر دی کہ ایک شخص حضرت عمران ابن حصینؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، جبکہ وہ مسجد میں تھے اور اس نے کہا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک مجلس تین طلاقیں دیدی ہیں حضرت عمران نے فرمایا وہ اپنے رب کی نافرمانی کی بنا پر گنہ گار ہوا اور اس کی عورت اس پر حرام ہوگئی، یہ شخص ان کے پاس سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی خدمت میں آیا اور بطور شکایت کے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عمران نے یہ کیسا فتویٰ دیا ہے یہ سن کر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے (حضرت عمران کی تصویب کرتے ہوئے) فرمایا ہمارے اندر ابو نجید عمران ابن حصینؓ جیسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ کثرت فرمائیں۔

اثر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ

عن طارق بن عبدالرحمن قال سمعت قیس بن ابی حازم قال سأل رجل المغیرة

حضرۃ مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ

مہتمم دار العلوم دیوبند

خطبۂ استقبالیہ

تحفظ شریعت کانفرنس

۳؍۴؍اکتوبر ۱۹۹۳ء بروز اتوار - پیر

بمقام ماؤلنکر ھال نئی دھلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و ستائش ہے خدائے علیم و بصیر کی جس نے ہمیں علم و فہم اور فکر و نظر کی دولت بخشی اور ہم بے نواؤں کے سر پر تاجِ امانت رکھ کر کائنات ارض و سما میں ہمیں سرفرازی و سربلندی عطا کی۔

درود و سلام ہو محسن انسانیت پر جن کی بدولت ہماری نارسا عقلوں کو کتاب مبین کا نور اور سنت بیضاء کی روشنی ملی اور دنیا و آخرت میں فیروزمندی کا ضامن دین اسلام جیسا کامل و مکمل نظام زندگی ہمیں نصیب ہوا۔

اور رضائے الٰہی کی بارش ہو اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جنھوں نے نخلستان اسلام کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی اور اپنا سب کچھ لٹا کر بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً کا فرمانِ حق گھر گھر پہونچایا۔

پھر ہزاروں رحمتیں نچھاور ہوں فقہاء، محدثین اور سلف صالحین پر جنھوں نے اپنے جہد و عمل سے اسلامی تعلیمات کو مبطلین اور غلو پسندوں کی تحریفات اور دراندازیوں سے بچائے رکھا، اور اپنی علمی سرگرمیوں سے ہر عہد اور ہر زمانے میں تعلیمات اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری عالم آشکارا کرتے رہے۔

مہمانان عالی قدر! آج کی اس متحرک اور دوڑتی بھاگتی دنیا میں سواریوں کی ہزار سہولتوں کے باوجود سفر کتنا کٹھن اور دشوار ہے اس کا تجربہ کسے نہیں ہے اس کے باوجود ملک کے طول و عرض سے طویل مسافتیں طے کر کے اتنی بڑی تعداد میں آپ کا اکٹھا ہو جانا آپ کے عزم

وحوصلہ اور شریعتِ اسلامی کے ساتھ آپ کی گرویدگی اور محبت وعقیدت کا ایک زندہ ثبوت ہے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمھارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

یقین جانیے آپ کے اس اجتماع کو دیکھ کر میرا رواں رواں فرحت وانبساط کی ٹھنڈک سے سرشار ہے، مجلس استقبالیہ کا ایک ایک فرد آپ کا پرتپاک خیر مقدم کرنے کے لئے خلوص دل سے چشم براہ ہے اور آپ کے عزم وحوصلہ پر مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہے، اس ضروری اور نہایت اہم اجتماع کو کامیاب اور مفید تر بنانے کی خدمت اور آپ جیسے عالی مرتبت وعلامۂ امت مہمانوں کے استقبال کی سعادت میرے نام لکھ دی گئی جس کا میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں، اللہ تعالیٰ عزاسمہٗ ہماری مساعی کو شرف قبولیت عطا فرمائے، آمین۔

علماء عظیم المرتبت! یہ تاریخی شہر جس میں آپ اس وقت جمع ہیں ہماری عظمت رفتہ کا امین ہے جس کے کھنڈرات کے مٹتے ہوئے نقوش میں آج بھی ہماری عہد عروج کی داستانیں پڑھی جا سکتی ہیں، لیکن اب ہمیں رفت بود گیا اور تھا کے سوا کچھ یاد نہیں۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

میرے دوستو! یہ شہر کبھی رشک بغداد، غیرت مصر، ہمسر قسطنطنیہ اور موازی اندلس تھا، یہاں قدم قدم پر اسلامی درسگاہیں اور چپہ چپہ پر روحانی خانقاہیں قائم تھیں جن کے علمی افادات اور روحانی برکات سے ایک عالم مستفید ہوتا ہے، اسی دلّی میں فقہ اسلامی کا وہ گرانمایہ مجموعہ مرتب ہوا تھا جو فتاوی ہندیہ اور فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور عالم ہوا اور آج بھی احکام فتاویٰ کا ایک اہم ماخذ شمار ہوتا ہے، اسی شہر کے ایک زاویہ میں بیٹھ کر مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے احیائے دین واصلاح امت کی تحریک کا آغاز کیا تھا اسی عظیم تحریک کا ایک مظہر جمیل "دارالعلوم دیوبند" ہے جو اگرچہ ایک تعلیمی ادارہ اور مذہبی درسگاہ ہے مگر اس نے قومی زندگی اور ملی مسائل سے کبھی صرف نظر نہیں کیا، ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد جب برصغیر پر برطانوی راج کا تسلط ہو گیا تو قانونِ فطرت کے مطابق فاتح قوم کا اثر ونفوذ جسموں سے گذر کر مفتوح رعایا کے دل ودماغ کو بھی مسخر کرنے لگا، دینی عقائد و

اعمال اور اسلامی تہذیب و اخلاق کی مضبوط بنیادیں متزلزل ہونے لگیں اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ "اندلس" کی طرح سرزمین ہند سے بھی اسلام ہمیشہ کیلئے رخت سفر باندھ لے، اس نازک ترین گھڑی اور انتہائی کس مپرسی کی حالت میں اسلام کی بقاء و تحفظ کا تاریخی کارنامہ "دارالعلوم دیوبند" ہی نے انجام دیا ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر اک کا یہ نصیب یہ بخت رسا کہاں

اسی ولی اللّٰہی تحریک نے اسلامیان ہند کو "جمعیۃ علماء ہند" جیسی اولوالعزم، باحوصلہ، مدبر اور باشعور جماعت فراہم کی جس نے سامراجی اقتدار کو اس وقت للکارا جبکہ اس کے قلمرو میں آفتاب غروب نہ ہوتا تھا، اس جانباز جمعیۃ نے وقت کی اس سب سے بڑی طاقت سے اس زمانہ میں اعلان جنگ کر دیا تھا جبکہ دوسرے لوگ اس نو وارد آقا کی خوشامد میں لگے تھے اور اپنے جہد و عمل اور جانبازی و جانسپاری کے سلسلہ کو برابر جاری رکھا، یہاں تک کہ وطن عزیز کا ایک ایک چپہ برطانوی پنجۂ استبداد سے آزاد ہو گیا، تجربہ گواہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے بعد قوم و ملت کی تعمیر و ترقی سے متعلق ایسی ایسی ٹھوس و نتیجہ خیز اور بے مثال خدمات انجام دی ہیں جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

"ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما"

اسی جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر ہم لوگ آج یہاں اکٹھا ہوئے تاکہ اسی نئی صورت حال پر جس سے شریعت اسلامی سے متعلق خدشات اور اندیشے پیدا ہو گئے ہیں ملکر غور و فکر اور فیصلے کریں۔

زعمائے ملت:۔ آپ حضرات راقم الحروف سے زیادہ باخبر ہیں کہ یہ دنیا حق و باطل اور نور و ظلمت کا میدان کارزار ہے اسی لئے خدا کے آخری دین کے نزول کے ساتھ ہی باطل پرستوں کی ریشہ دوانیاں تیز ہو گئی تھیں اور آج تک تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔

تاریخ کے ہر دور میں ایسی جماعتوں اور ایسے افراد کی نشاندہی کی جا سکتی ہے مگر عصر حاضر میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی ہے کہ باطل کے آقاؤں نے میدان بدل کر ایک ایسی جنگ شروع

کی ہے، جس کو نظریاتی جنگ کہنا زیادہ مناسب ہے، اس میں کبھی حقائق کو بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے جیسے تعدد ازدواج کا مسئلہ، کبھی نئی اصطلاح مقرر کرکے اس کی اپنی منشاء کے مطابق تشریح کی جاتی ہے جیسے بنیاد پرستی اور دہشت گردی وغیرہ اور کبھی اسلامی احکام میں سے کسی ایسے حکم کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کے محاسن کو چھپا کر اس کے بارے میں تشکیک وتضحیک کا ماحول پیدا کیا جائے، پھر تمام ذرائع ابلاغ اس کام کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، اور مسلمانوں میں سے کچھ مفاد پرست روحِ اسلامی سے بے خبر یا سادہ لوح حضرات ان کی ہمنوائی کرنے لگتے ہیں، باطل کے قائدین اپنا معاندانہ چہرہ چھپائے رکھتے ہیں اور خیر خواہی کے جذبات کا مظاہرہ کرکے اپنی مہم کو کامیاب کرنے کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں۔

ادھر تقریباً آٹھ مہینوں سے یک مجلس دی گئی تین طلاقوں کا مسئلہ اخبار وجرائد وغیرہ میں بحث ومباحثہ کا خاص موضوع بنا ہوا ہے اور عام طور پر پیش پیش ماڈرن سوسائٹی سے وابستہ وہ لوگ ہیں جو صحافتی دنیا میں دانشور اور روشن خیال کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، جن کی اکثریت عربی زبان وادب سے نابلد ہونے کی وجہ سے براہ راست قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہے، اس لئے دیگر اسلامی موضوعات کی طرح طلاق کے موضوع پر بھی یہ دانشور جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں وہ اسلام کی کم اور مغربی مستشرقین کی ترجمانی زیادہ کرتے ہیں، جن کے بالواسطہ یا بلاواسطہ زلہ ربا اور خوشہ چیں ہیں۔

تین طلاق کا یہ مسئلہ عورتوں کے ساتھ ہمدردی کے عنوان سے ابھارا جارہا ہے اور ہندوستان میں مختلف مصلحتوں کے سبب اس مسئلہ کی لہر اور تیز ہوگئی ہے، غور کرنے کا مقام ہے کہ جس ہندوستان میں ہزاروں مردوں کی مظلومانہ شہادت کے بعد، ہزاروں بیواؤں اور لاکھوں یتیموں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا، اسی ہندوستان میں معدودے چند تین طلاق کے واقعات سے پورا ہندوستان عورت کی مظلومیت کا نام لے کر ابلنے لگتا ہے اگر ان حضرات نے تین طلاق کے واقعات کے اعداد وشمار جمع کئے ہوتے اور ظلماً قتل

ہونے والے مردوں کے مقابل اس کی تعداد بالفرض زیادہ ہوتی تو اس شور و واویلا کے لئے انھیں ہمدرد سمجھنے کی گنجائش ہوتی مگر یہ اعداد وشمار کبھی سامنے نہیں آئیں گے کیونکہ ایسی طلاق کا تناسب مظلومانہ قتل کے مقابلہ میں صفر کے برابر ہے۔

اسی طرح غیر مسلم معاشرہ میں جہیز کے معاملہ میں عورتوں کے دلدوز قتل کے واقعات کی خبروں سے اخبارات کے کالم بھرے رہتے ہیں، لیکن کبھی یہ مسائل "تین طلاق" کے موضوع کی طرح اخبارات میں زیر بحث نہیں لائے گئے، پھر کیا یہ باتیں یہ سمجھنے کی کافی دلیل نہیں ہیں کہ "تین طلاق" کا مسئلہ ان سیاسی بازیگروں کا اچھالا ہوا ہے جو ہوتے کچھ ہیں اور نظر کچھ آتے ہیں۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

عورت کے بارے میں اسلام اور اہل مغرب کے نظریات یکسر متضاد ہیں مثلاً اسلام عورت کی عفت اور پاک دامنی کو انتہائی اہمیت دیتا ہے اسی لئے اس نے عورت کے لئے قانونِ عفت مرتب کیا ہے، اور اپنے ماننے والوں کو اس قانون کا پابند بنایا ہے، اسلام اپنے اس قانون کے تحت عورت کو فطری تقدس عطا کرتا ہے اور اس کے تحفظ کی ضمانت مہیا کرتا ہے، عورت کے متعلق اسلام کا یہ نظریہ فطری تقاضوں اور سماجی حالات کے عین مطابق ہے جب کہ اہل مغرب عورت کی عفت و پاک دامنی کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے، اس لئے وہ مرد و عورت کے بے باکانہ اختلاط اور آزادانہ میل ملاپ کو نہ صرف روا سمجھتے ہیں بلکہ اسے فطری حق کا نام دے کر خوشنما اور پسندیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بے مہار آزادی میں رکاوٹ کو وہ حق تلفی اور ظلم بتاتے ہیں، اہل مغرب کا عورت سے متعلق اس غیر فطری رویہ کا غیرت سوز اور عبرت ناک نتیجہ آج دنیا کے سامنے ہے کہ۔

- فرانس میں ہر سال اوسطاً ،، ہزار ناجائز بچے پیدا ہو رہے ہیں
- برطانیہ کے اندر سالانہ لاکھوں دوشیزائیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے سے پہلے ہی ماں بن جاتی ہیں۔
- امریکہ میں ہر سال ۱۵ فیصد مرد زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور پچاس فیصد لڑکیاں

شادی سے پہلے ہی اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتی ہیں۔

لیکن نفسیاتی کمزوری کو کیا کہا جائے کہ جھوٹ کو اگر بار بار دہرایا جائے تو سماج اسے حقیقت سمجھ کر اپنا لیتا ہے، اور سچ کہنے والے اس کی نظر میں جھوٹے معلوم ہونے لگتے ہیں، عورت کے بارے میں مغرب کا موقف بالکل اسی نوعیت کا ہے، اس نے قانون فطرت کے خلاف ہمیشہ کذب بیانی کی ہے مگر اپنے جھوٹ کو اس قدر کثرت سے دہراتے ہیں کہ سطحی ذہن وفکر کے لوگ انہیں سچ باور کر لیتے ہیں، یہ کس قدر حیرت ناک اور المناک فریب ہے کہ اسلام جو عورت کو گھر کی رانی اور خاندان کی ملکہ کا درجہ عطا کرتا ہے، اس پر تو عورت کی تحقیر اور آزادئ نسواں پر ظالمانہ قدغن لگانے کا الزام تھوپا جا رہا ہے، اور جو عورت کو آزادئ نسواں کے پُر فریب نام سے ماڈرن گرل، ڈانسر، اداکارہ وغیرہ بنا کر اس کے تقدس کا برسر بازار سودا کرتا ہے وہ اس کا نجات دہندہ اور عزت بخشنے والا ہو گیا۔

زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

اسی طرح طلاق کا معاملہ ہے، اسلام نے اس کے لئے کچھ ضابطے مقرر کئے ہیں جس کے تحت وہ مرد کو طلاق کا اختیار دیتا ہے اور بعض قیودات کے ساتھ فسخ نکاح وغیرہ کا اختیار عورت کو بھی حاصل ہے، جبکہ اہل مغرب نے نکاح وطلاق کے معاملہ کو مذہب کی گرفت سے آزاد کر لیا ہے اور اکثر حالات میں افتراق جسمانی ہی سے وہ طلاق کی ضرورت پوری کر لیتے ہیں اور بسا اوقات طلاق کا استعمال بھی ان کے یہاں ہوتا ہے، طلاق کی ان دونوں صورتوں میں مرد وعورت کا حق ان کے یہاں یکساں ہے اور دونوں اپنے حق کو استعمال کرنے میں مطلقاً آزاد ہیں اور اپنے اس غیر معقول اور خود اپنے مذہب کے خلاف طرز عمل کو شخصی آزادی کا دلفریب عنوان دیتے ہیں۔

اسلام نے طلاق سے متعلق جو نظام اور ضابطہ بنایا ہے، وہ مرد وعورت کی ساخت طبعی جذبات، صنفی صلاحیتوں اور معاشرتی تقاضوں کے عین مطابق ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنی حماقت، بے جا جذباتیت، ہوس پرستی، وغیرہ اسباب کے زیر اثر اسلامی ضابطہ

طلاق کو نظر انداز کردے اور من مانی کر بیٹھے جس کی بنا پر بعد میں پیچیدگی پیدا ہوجائے تو یہ بے ضابطگی کا نتیجہ ہوگا اصل ضابطہ پر اس سے کیونکر الزام آئے گا، لیکن دانشوروں کی اکثریت جنکے مضامین ومقالات اخبار وجرائد میں شائع ہورہے ہیں وہ آنکھ بند کرکے اپنے اساتذہ مغرب کی تقلید میں اسلامی ضابطہ طلاق پر غیر معقول جارحانہ حملے کررہے ہیں، کوئی عورتوں کو ابھار رہا ہے کہ وہ اس بات کی تحریک چلائیں کہ نکاح وطلاق کے معاملہ کو مذہب سے علیحدہ کرکے کورٹ اپنے ہاتھ میں لے لے، کوئی یہ مشورہ دے رہا ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی طلاق دینے کا حق دیا جائے، کوئی یکساں سول کوڈ بنانے کا حکومت کو مشورہ دے رہا ہے اور کوئی ہے کہ من گھڑت قصے کہانیوں کے ذریعہ اس اسلامی قانون کی تضحیک کررہا ہے۔

ملک کا قومی پریس جسے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود گوارہ نہیں وہ ان خرافات کو شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتا ہے، سیاسی پارٹیاں بھی درپردہ اور بعض کھل کر ان کی حمایت کررہی ہیں تاکہ مسلمانوں میں انتشار پھیلے اور وہ اپنے دیگر اہم مسائل کی جانب توجہ نہ کرسکیں، غرضیکہ ایک طوفان ہے جو ہر چہار سمت سے بڑھ رہا ہے، اس طوفان کو اگر آج روکا نہ گیا تو کل اس کی بلاخیزیوں کا مقابلہ دشوار ہوجائے گا، اگر "العلماء ورثۃ الانبیاء" ایک مقولہ ہی نہیں بلکہ نبی صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ ایک سچی حقیقت ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس وراثت کے صحیح مصداق ہم اسی وقت ہوسکتے ہیں کہ حضرات انبیاء صلوٰت اللہ علیہم کی جرأت مندانہ سعی وجہد ان کے غیر فانی عزم وارادہ، ان کا جوش عمل اور حق کی خاطر مرمٹنے کا جذبۂ صادق ہمارے رگ وریشہ میں موجزن رہنا چاہئے۔

"اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اذا لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا فمن کتم حدیثا فقد کتم ما انزل اللہ عزوجل (ابن ماجہ) اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے سکوت اور خاموشی کا کیا جواز ہے، آگے بڑھئے اور مستشرقین مغرب کے پروردوں اور سیاسی بازیگروں پر واضح کردیجئے کہ ہم اس شور وغوغا سے کسی طرح دبنے والے نہیں ہیں، ہم اپنے دین ومذہب میں کسی فرد، جماعت یا حکومت کی مداخلت کسی قیمت پر برداشت نہیں

کر سکتے اور اس قسم کی ہر بیجا کوشش کی ہم جان کی بازی لگا کر مزاحمت کریں گے۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

حاملین شریعت :- جہاں تک مسئلہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کے تین یا ایک شمار ہونے کا ہے تو اصول و ضوابط کے دائرہ میں رہتے ہوئے علمی بحث و تحقیق کے طور پر گفتگو کی جا سکتی ہے اور اس گفتگو کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اگرچہ اس باب میں بغیر کسی لچک کے ہمارا مسلک وہی ہے جو حضرات صحابہ جمہور تابعین، ائمہ محدثین، فقہائے مجتہدین اور امت کے سواد اعظم کا ہے، ہمارے اس مسلک کی دلیل "الطلاق مرتان" اور ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً، آیات قرآنیہ ہیں، ہمارے مسلک کی دلیل حدیث عویمر رضی اللہ عنہ ہے جسکے الفاظ یہ ہیں فلما فرغ قال عویمرؓ کذبت علیھا یارسول اللہ ان امسکتھا فطلقھا ثلاثا (بخاری باب من اجاز طلاق الثلاث ص ۷۹۱ ج ۲ ومسلم ص ۴۸۹ ج ۱ ونسائی ص ۸۱ ج ۲ باب الرخصۃ فی ذالک ای المجموعۃ) ابوداؤد میں یہ حدیث اس زیادتی کے ساتھ ہے عن سھل بن سعد فی ھذا الخبر فطلقھا ثلاث تطلیقات عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانفذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۲۱۳ ج ۲) ہمارا مستدل حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما ہے جس میں ابن عمر کا سوال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان الفاظ میں مذکور ہے: یارسول اللہ ارأیت لو انی طلقتھا ثلاثا أکان یحل لی ان أراجعھا قال لا کانت تبینُ منک وتکون معصیۃ (سنن دار قطنی ص ۴۳۷ ج ۲) اس حدیث کی سند اصول محدثین کے اعتبار سے بے غبار ہے، ہمارے مذہب کی تائید حدیث رکانہؓ سے ہوتی ہے، حضرت رکانہ رض روایت کرتے ہیں انہ طلق امرأتہ البتۃ فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ما اردت قال واحدۃ قال آللہ قال ھو علی ما اردت اس حدیث کے راوی امام شافعیؒ ہیں اور ان کے نزدیک یہ صحیح ہے علاوہ ازیں اس کی تصحیح امام ابوداؤد سے دار قطنی نے نقل کی ہے، اور امام ابن حبان، حاکم اور ابوداؤد سے حافظ ابن حجر نے تلخیص الحبیر ص ۳۱۹ پر نقل کی ہے، حدیث عائشہ صدیقہ بھی ہمارے مسلک کی مؤید ہے، جس کے

الفاظ یہ ہیں، ان رجلا طلق امراتہ ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم أتحل للاول قال لاحتی یذوق عسیلتہا کما ذاق الاول (بخاری باب من اجاز طلاق الثلاث ج۲ ص۷۹۱ ومسلم ج۱ ص۴۶۳) اسی مضمون کی ایک حدیث عائشہ صدیقہ رض ہی سے دارقطنی نے (ج۴ ص۴۳۸) نیز اسی مضمون کی حدیث حضرت انس رض سے طبرانی نے الاوسط میں نقل کی ہے جس کے بارے میں علامہ ہیثمی لکھتے ہیں ورجالہ رجال الصحیح خلا محمد بن دینار وقد وثقہ ابوحاتم وابوزرعۃ وابن حبان وفیہ کلام لایضر۔ (مجمع الزوائد ج۴ ص۳۴۰) ہمارے مسلک پر سبط رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حدیث بصراحت دلالت کرتی ہے حضرت حسن رض نے اپنی بیوی عائشہ خثعمیہ کو بایں الفاظ طلاق دیدی تھی اذھبی فانت طالق ثلاثا بعد میں حضرت حسن رض کو خبر ملی کہ عائشہ کو جدائی کا بڑا غم ہے تو حضرت حسن رض فرط رقت سے رودیئے اور فرمایا لولا انی سمعت جدی او حدثنی ابی انہ سمع جدی ایما رجل طلق امراتہ ثلاثا عند الاقراء او ثلاثا مبہما لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ لراجعتہا (السنن الکبریٰ مع الجواہر النقی ج۷ ص۳۳۶ والدارقطنی ج۲ ص۴۳۸) حافظ ابن رجب حنبلی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں، اسنادہ صحیح (الاشعناق ص۲۴) اور علامہ ہیثمی لکھتے ہیں رواہ الطبرانی وفی رجالہ ضعف وقد وثقوا۔

بہرصورت اصول محدثین کے اعتبار سے یہ حدیث قطعی طور پر لائق احتجاج واستدلال ہے اس وقت پیش کردہ احادیث سے متعلق نہ تفصیلی کلام کا موقع ہے اور نہ مسئلہ سے متعلق سارے دلائل جمع کرنے کا اس لئے انھی چند حدیثوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، علاوہ ازیں عہد فاروقی میں اس پر صحابہ کا اجماع بھی صحیح نقول سے ثابت ہے، اس اجماع میں تین خلفائے راشدین کی شرکت بغیر کسی شک وشبہ کے یقینی طور پر ثابت ہے اور خلفائے راشدین کے طریق عمل کے بارہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہدایت ہے علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔ خلفاء راشدین کی سنت کو دربار رسالت سے تشریعی سند حاصل ہوجانے کے باوجود اس اجماع کو حضرت فاروق اعظم کا ایک سیاسی فیصلہ کہہ کر رد کردینا بے جا جسارت ہے جو خود قابل رد ہے مزید برآں پندرہ حضرات صحابہ کے فتاویٰ سے بھی ہمارے مسلک کی تائید ہوتی ہے اور ان

فتوؤں کے خلاف کسی ایک صحابی سے بھی کوئی فتوی صحیح سند کے ساتھ منقول نہیں ہے، یہ فتاوی جن صحابہ سے کتب حدیث میں منقول ہیں ان میں فاروق اعظمؓ عثمان غنیؓ علی مرتضیٰؓ (خلفائے راشدین) عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو، زید بن ثابت، عائشہ صدیقہ، ام سلمہ (ازواج مطہرات) ابوہریرہ، عمران بن حصین وغیرہ فقہائے صحابہؓ شامل ہیں، عہد صحابہ میں یہی حضرات افتاء کے منصب پر فائز تھے، اور بقیہ سارے صحابہ ان کے فتوؤں پر عمل کرتے تھے، اس لئے قرآن وحدیث اجماع اور آثار صحابہ کی مستحکم بنیاد پر بغیر کسی تردد اور شک وشبہ کے ہم اسی بات کو حق وصواب سمجھتے ہیں کہ بیک مجلس یا بیک تلفظ دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی، ہمارا یہی مسلک ہے اور ہم اسی پر قائم رہنا ضروری سمجھتے ہیں۔

دھبرانِ قوم! آج ہمارا معاشرہ عجیب زبوں حالی کا شکار ہے، اسلامی قدریں اور مذہبی روایات تدریجاً ناپید ہوتی جارہی ہیں، اعمال واخلاق کا تو ذکر کیا اعتقادات کی مضبوط ومستحکم دیواریں لرزہ خیز ہیں، تن آسانی وراحت کوشی، فرائض وذمہ داریوں سے غفلت باہمی اختلاف ونزاع جیسی تباہ کن بیماریاں جڑ پکڑتی جارہی ہیں، گھر تباہ ہورہے ہیں، خاندان اجڑ رہے ہیں، معاشی اقتصادی حالت دن بدن ابتر ہورہی ہے اور اس بدحالی سے پیدا ہونے والی برائیوں سے ملی شیرازہ بکھر رہا ہے، قوم کا یہ اضمحلال، اقتصادی ومعاشی زوال اور اخلاقی ومعاشرتی فساد روز روشن کی طرح آشکارا ہے، پھر کیوں ہماری اسلامی عصبیت کو ٹھیس نہیں لگتی، کیوں ہماری مذہبی غیرت سورہی ہے، اور کیوں ہماری تبلیغی قوتیں بیدار نہیں ہوتیں آخر ہمارے جوشِ عمل اور جذبۂ جہاد کو کیا ہوگیا ہے۔

جب کی نہ دوائے دردِ جنون پھر چارہ گر و کہتے ہو یہ کیوں
ہر درد کا درماں ہوتا ہے ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے

بزرگانِ محترم:۔ ہماری زبوں حالی ہمارے دشمنوں کی مدد کررہی ہے، وہ مسلمانوں کی عملی زندگی کے نقائص کو اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے دوری کے لئے استعمال کررہے ہیں ہمارے دشمن تو ان چیزوں میں شاطر اور عیار ہیں مگر سادہ لوح انسان بھی اس لئے معذور ہیں کہ وہ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو مسلمانوں کی عملی زندگی سے ممتاز کرنے پر قادر نہیں، وہ ہماری

کوتاہیوں اور خرابیوں کی تصویر میں مذہب اسلام کو دیکھتے ہیں تو اسلامی تعلیمات سے گرویدگی اختیار کرنے کے بجائے ان سے دور بھاگتے ہیں، اس لئے ہماری سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے حالات کو درست کریں۔

عملی زندگی کی کوتاہیوں کو ختم کرنے کے بعد تواصیٔ حق اور تواصیٔ استقامت کی دعوت لے کر گھر گھر پہونچیں اور بچے بچے کے اندر دین و مذہب کی تڑپ پیدا کر دیں اور اسلامی زندگی کا انھیں پیکر بنا دیں، گاؤں گاؤں اصلاحی انجمنیں قائم کریں اور اپنی نگرانی میں ان انجمنوں کو فعال و متحرک رکھیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے سربراہوں سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ اصلاح معاشرہ کے موضوع پر چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع کر کے شہر شہر، قصبہ قصبہ تک پہونچائیں، نیز اصلاح معاشرہ کے عنوان سے جگہ جگہ اجتماعات اور شخصی ملاقات کر کے فضاء ہموار کی جائے اور یہ سلسلہ مسلسل قائم رکھا جائے، قوم آج بھی سننے ماننے اور عمل کیلئے تیار ہے، بس اسے جھنجوڑنے اور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز عورت اور مرد کی علیحدگی کی جن صورتوں میں اسلامی عدالت یا قاضی کی ضرورت پڑتی ہے اور عورت شرعی قاضی نہ ہونے کے سبب انصاف حاصل کرنے میں پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا حل یہ نہیں کہ اسلامی قانون میں تبدیلی کی جائے بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ حکومت قاضی بل کی منظوری دے، اور جمعیۃ علماء ہند اس سلسلہ میں پوری کوشش صرف کر کے اس دشواری کو ختم کرنے کے لئے حکومت کو آمادہ کرے۔

حضرات محترمین:- آپ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ میری باتیں سنیں، میں اس کرم فرمائی پر اظہار تشکر کرتے ہوئے سلسلۂ کلام کو ختم کر رہا ہوں، اور چونکہ تمدنی حقوق اور اجتماعی رسوم کے لحاظ سے رفقار کار کا شکریہ بھی ضروری ہے، اس لئے جذبۂ تشکر کی وہ لطیف اور پاکیزہ شیرینیاں جنھیں میرا قلب محسوس کر رہا ہے اگر نطق و کلام ان کی ترجمانی کر سکتے ہوں تو میں منت پذیری کے جذبات اپنے احباب اور بزرگوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، اور معذرت خواہ ہوں کہ اگرچہ ہم اپنی تمامتر کوششوں کے باوجود مہمانانِ گرامی قدر کے شایانِ شان استقبال کا حق ادا نہیں کر سکے ہیں، نیز

از: مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی
90.A HANLEY ROAD
LONDON N4 3DW



کچھ دانشور بہنوں و بھائیوں سے

ایک مجلس یا ایک سانس میں دی جانے والی تین طلاقوں کے مسئلے پر جس بحث کا آغاز گذشتہ جون سے ہمارے ملک میں ہوا تھا، اس سے متعلق جولائی کے بعض اخبارات کے کچھ تراشے گذشتہ ہفتے کی دلّی سے آنے والی ڈاک میں ملے ہیں، ان تراشوں کے مضامین اور خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے بہت سے دانشور بھائیوں اور بہنوں نے بہت زور شور سے اہل حدیث نقطۂ نظر کی حمایت کی ہے۔

یہ حمایت اگر اس بنیاد پر کی گئی ہو کر حمایت کرنے والوں اور والیوں کو اس نقطۂ نظر کے لئے کتاب وسنت سے پیش کئے گئے دلائل میں زیادہ وزن نظر آیا تو یہ ایک معقول اور سچ مچ دانشورانہ طرز عمل ہے اور اس کی تحسین کی جاسکتی ہے، خواہ نتیجے سے اتفاق نہ کیا جائے لیکن جہاں تک ان دانشور حضرات وخواتین کی تحریروں اور ان کے بیانات کی موصولہ رپورٹوں کا تعلق ہے ان سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے اہلحدیث نقطۂ نظر کی حمایت بس اس تاثر کے تحت کی گئی ہے کہ ایک مجلس اور ایک سانس کی تین طلاقوں کو تین ہی ماننا عورت پر ظلم ہے، چنانچہ ایک محترم خاتون نے تو تین کو تین ماننے والے مسلک کا سلسلۂ نسب ہی اپنے گمان کے مطابق اوّلاً دورِ جاہلیت سے اور پھر خلفائے بنوامیہ کے اس دور سے ملا ہوا دکھایا ہے جو اسلام میں ہر ناکردنی اور ظلم وستم کے لئے بدنام ہے اور وجہ انکے اس فعل کی یہ بتائی ہے کہ طلاق کا اصل اسلامی قانون ان بادشاہوں کا عتاشانہ ... ۔۔۔

کی راہ میں ایک سنگ گراں تھا، سو انھوں نے اس کا حل اپنے دور کے فقہاء کو ساتھ ملا کر اس مسئلے کے ذریعہ نکالا جس سے وہ ایک لمحے میں اپنی پرانی بیویوں سے چھٹکارا پالیں، فرماتی ہیں

"This seems to have been the customary form of divorce practised in pre-Islamic Arabia. Neither does the Quran mention this form nor does it seems to have been recognised or sanctioned by thr Prophet. It seems to have crept into Islamic jurisprudence at the instance of the Omeyyade monarchs who"finding that the checks imposed by the Prophet on the fcility of repudiation interfered with the indulgence of their caprice, endeavoured to find an escape from the strictness of the law, and found in the liability of the jurists a loophole."

(Zeenat Shaukat Ali: The Sunday Times of India, July 18 1993)

ایک دوسرے محترم اور ہمارے جانے پہچانے دانشور جناب سید حامد ہیں، انھوں نے اس ظالمانہ قانون کا آغاز نہ ہی کسی ظالم صفت سے منسوب کیا ہے اور نہ اس کا محرک کسی ظالمانہ خواہش اور ارادے کو بتایا ہے بلکہ سراپا عدل حضرت عمر فاروق رضہ کی طرف اس کے آغاز کی نسبت فرمائی اور ان کا ارادہ اور مقصد نہایت نیک بتایا۔ البتہ حضرت عمر رضہ کے بعد جن لوگوں نے اسے جاری رکھا ان کے متعلق ان کا بھی خیال ہے کہ یہ معاذ اللہ ان کی فطرت کی کجی اور چور دروازے نکالنے کی عادت تھی، جو اس کا محرک ہوئی۔ فرماتے ہیں

"انسانی فطرت کی کجی اور چور دروازے نکالنے کی عادت کو کیا کہئے کہ حضرت عمر رضہ کے اس ہنگامی فرمان کو رنگ دوام دیدیا گیا اور اس کے تحت شوہروں نے بیویوں پر شرمناک مظالم توڑے۔ (قومی آواز ۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء)

ان دونوں بیانات میں یوں تو کئی پہلو حیرت کے اور اس کے ماتحت گفتگو کے ہیں، لیکن سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو شوہر حق طلاق کو بیوی پر ظلم و ستم کیلئے استعمال کرنا چاہے کیا اس کے حق میں تین کو تین ماننے کے بجائے ایک ہی ماننے سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ دوسروں سے نہیں اہل حدیث علماء ہی سے پوچھ لیا جائے کہ اگر ایک شخص ایک ہی طلاق دیتا ہے اور پھر نہ عدت کے دوران رجوع کے لئے آمادہ ہے نہ عدت کے بعد نئے سرے سے

نکاح پر۔ توکیا کسی شرعی قانون کے حوالے سے اسے رجعت پر یا نکاح جدید پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟ ایسے کسی قانون کی دریافت میں اہل حدیث علماء بھی قطعاً کوئی مدد نہ فرماسکیں گے، تین طلاق اور ایک طلاق کا فرق تو صرف یہ ہے کہ تین کی صورت میں مرد کے ہاتھ سے رجعت کا حق بھی نکل جاتا ہے اور نئے سرے سے نکاح کا دروازہ بھی اس وقت تک کیلئے بند ہوجاتا ہے جب تک کہ وہ عورت کسی دوسرے کے نکاح میں جاکر اس دوسرے کی موت یا اس سے طلاق کی بناپر آزاد نہ ہوجائے

پس ایک کے بجائے تین کے ایک ساتھ یا الگ الگ استعمال سے اگر کوئی فرق پڑتا ہے اور کوئی نقصان پہونچتا ہے تو اس کا تعلق مرد کے حقوق سے ہے نہ کہ عورت کے کسی حق سے حتیٰ کہ حلالہ کی جو دفعہ اس ضمن میں عائد ہوتی ہے وہ بھی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں صرف مرد ہی کے حق کو متاثر کرتی ہے نہ کہ عورت کے کسی حق کو (اس معاملے کی کچھ اور زیادہ وضاحت انشاء اللہ آگے مل جائے گی) اور تین کو تین ہی ماننے کا سلسلہ جو کوئی عمر فاروق رض کے کسی ہنگامی حکم سے ملاتا ہے وہ اگر انھیں خلیفۂ عادل مانتا ہے تب تو یہ بات بھی اسکے سوچنے کی ہے کہ اگر اس مسئلے سے عورت پر کوئی مزید مصیبت پڑ رہی ہوتی تو کیا عمر فاروق مردوں کی نالائقی کی سزا اس صورت میں تجویز فرماسکتے تھے؟ اور وہ خدانخواستہ فیصلے کی غلطی سے ایسا کر بھی بیٹھتے تو کیا ان کے دور کی عورتیں خاموش ہو کر بیٹھ جانے والی تھیں؟ کیا یہ وہی عورتیں نہیں تھیں جنھوں نے انھی عمر فاروق کو مہر کم باندھنے کے اصرار پر برسر منبر ٹوک دیا تھا کہ تم کون ہوتے ہو؟ جبکہ اللہ نے یہ پابندی عائد نہیں کی ہے، الغرض تین کو تین ماننے کا اثر محض مرد کے حقوق پر پڑتا ہے نہ کہ عورت کے حقوق پر، اور اس لئے یہ محض قلت فکر ہے کہ ہمارے دانشور بھائی اور بہنیں اسے عورت کے ساتھ ظلم اور عدل کا مسئلہ بنانے لگیں البتہ سرے سے مرد کے حق طلاق ہی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس کو تمامتر مرد کے اختیار تمیزی پر چھوڑے جانے سے ظالم طبع مردوں کے ہاتھ میں یہ حق ظلم کا ایک ہتھیار بھی بن جاتا ہے، تو یہ تھوڑی دیر کیلئے سمجھ میں آنے والی بات ہے، اور جہاں تک سید حامد صاحب کے مضمون کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو راقم الحروف کا صاف تاثر یہ ہے کہ ممکن ہے غلط ہو

کہ وہ دراصل یہی کہنے کے لئے لکھا گیا ہے اور تین اور ایک کا قصہ محض اس کے لئے زمین ہموار کرتا ہے، لیکن یہ بس تھوڑی ہی دیر کے لئے سمجھ میں آنے والی بات ہے، ورنہ آدمی بالآخر اس نتیجے پر پہونچتا ہے جس کا اقرار ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے جدید انسان کو بھی کرنا پڑا ہے کہ ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

میاں بیوی کا رشتہ بنیادی طور پر دل کا اور اُنس و محبت کا رشتہ ہے، اور ایسے رشتوں کے حقوق و فرائض کی نگہداشت تمامتر دونوں کی شرافت، احتیاط اور احساس ذمہ داری پر منحصر ہے اگر اُنس و محبت کے شیشے میں بال آگیا ہے اور بدقسمتی سے شرافت اور احساس ذمہ داری کا بھی کچھ ایسا وافر سرمایہ نہیں ہے، تو سوائے اخلاقی انداز کی مداخلت کے کوئی بھی دوسری خارجی مداخلت معاملات کو سدھارنے کے بجائے شاید بگاڑنے کا کام زیادہ کرے گی، یہ کسی دفتر اور اور کارخانے یا اسکول کالج کے ایمپلائی اور ایمپلائر کا رشتہ نہیں ہے کہ قانون، کورٹ اور ٹریبونل کے ذریعہ کسی حق تلفی یا سرکشی کی روک تھام کی جا سکے، قرآن مجید نے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں جس قدر ہدایات اور آگاہیاں دی ہیں کوئی ناشکرا ہی ہوگا جو اس کا انکار کر سکے، لیکن کوئی بات ہی تو ہے جو میاں بیوی کے معاملات میں اصلاحی اور اخلاقی کوششوں سے زیادہ کسی بیرونی مداخلت کا کوئی خانہ نہیں رکھا گیا، اور طلاق جیسی مبغوض چیز کا ایک خانہ رکھدیا گیا! یہ بات وہی ہے کہ اِس عُقدۂ مشکل کی کشود ہے نہیں یعنی قانون کی راہ سے کوئی کشود نہیں ہے، معاشرے کے ذمہ دار اور فرض شناس لوگوں میں سے جو کوئی بھی اس صورت حال سے غمناک اور نمناک ہوتا ہے اس کے لئے جدو جہد کی ایک ہی راہ ہے جو کچھ مؤثر ہو سکتی ہے کہ اس رشتے کے مفہوم اور اس کے حقوق و فرائض اور ان کے بارے میں کوتاہیوں اور بے احتیاطوں کے نتائج کا علم و شعور معاشرے میں عام کیا جائے اور بچیوں کی تربیت میں ان کی زندگی کے اس مرحلے کے مسائل کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے، اور اس مرحلے میں جس کا جو رول کردار اور رد یہ فطرت اور قدرت نے متعین کر دیا اس لئے اسے ذہنی طور پر تیار کیا جائے

عورت کو بھی حقِ طلاق

مرد کے حقِ طلاق کے استعمال پر قانونی جکڑ بندیوں کی جو وکالت محترم سید صاحب نے فرمائی ہے اس کے جا ہے شرعی جواز میں کسی کو کلام ہو یا نتائج کے اعتبار سے کوئی اسے غیر مفید جانے تاہم سید صاحب کے مقصد سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ حقِ طلاق کو جو لوگ ناروا استعمال کرتے ہیں اس کی روک تھام کی کچھ سبیل ضرور ہونی چاہیئے، لیکن یہ عورت اور اس کے گھر کی سلامتی کی وکالت کرتے کرتے سید صاحب جو اپنے مضمون کا اختتام اس تجویز پر کرگئے ہیں کہ عورت کو بھی طلاق کے وہی اختیارات عقدِ نکاح کے وقت تفویض کرائے جائیں جو مرد کو حاصل ہیں تو سید صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض ہے کہ یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوجاتی ہے کہ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

جس حقِ طلاق کے ایک ہی ہاتھ میں ہونے کی فتنہ سامانیوں اور خانہ ویرانیوں کا دہ عالم سید صاحب کی نظر میں ہے کہ وہ اس مسئلے کے دینی پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بھی وہاں تک چلے گئے جہاں تک ان سے ان کی نارمل حالت میں جانے کی ان کی دانشمندی اور دانشوری کا کوئی بھی قدر دان توقع نہیں کرسکتا تھا، اسی حقِ طلاق کو وہی سید صاحب فریقِ ثانی کے ہاتھ میں بھی دلائے دیرہے ہیں پھر کون سا گھر رہ جائے گا جس پر ویرانی کا خطرہ نہ منڈلائے اور جس میں پیدا ہونے والے اور پرورش پانے والے معصوم ماں باپ کی جنگ وجدال کا زخم نہ کھائیں؟

پہلے کبھی کسی وقت یہ مسئلہ قابلِ بحث رہا ہو تو رہا ہو کہ آیا عورت کو بعینہٖ وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو مرد کے لئے مانے جاتے ہیں یا حقیقت پسندی کچھ اور کہتی ہے؟ لیکن یورپ میں مرد اور عورت کی بہر پہلو مساوات کی تحریک (FEMINISM) نے عورت کو جو کچھ بھی دیا ہو اس سے بحث نہیں مگر خاندان کا نظام تہس نہس کردیا ہے، شادی کا رواج ہی ختم ہورہا ہے اور دو رکنی خاندان کی جگہ ایک رکنی خاندان SINGLE PARENT FAMILY) کا سلسلہ لیتا جارہا ہے، جہاں بچے بن باپ کے پرورش پا رہے ہیں، اور باپ کی نگرانی کے بغیر جو حال بچوں کا ہونا چاہیئے وہی ہورہا ہے، اس سب سے تو یہی سبق ملتا ہے کہ قرآن پاک نے بحیثیت انسان عورت اور مرد کی مکمل برابری پر زور دینے کے ساتھ

ساتھ جو بحیثیت شوہر اور بیوی کے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (اور مردوں کا ان پر ایک درجہ زیادہ ہے ۲۲۸،۲) کا اعلان فرمایا اسے تسلیم کرنے میں اگر عورتیں اپنی ہتک سمجھیں گی یا ان کے زیادہ حامی و ہمدرد انھیں ایسا بتائیں گے اور اس طرح خاندانی نظام کا سلسلہ بالکل ہی ٹوٹ جائیگا تو پھر آگے ان عورتوں کی کوکھ سے کہیں بدتر مرد پیدا ہوں گے، بہرحال یہ مساوات والی بات عورت کے گھر کی سلامتی کی فکرمندی کے ساتھ تو بالکل جوڑ کھاتی نہیں دکھائی دیتی ویسے سید صاحب زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔

اور اب کچھ اصل مسئلے پر

مجھے ڈر ہے کہ مذکورہ بالا گذارشات اگر قابل قبول بھی قرار پائی ہوں تب بھی تین اور ایک کے اس جھگڑے میں حلالہ کا کانٹا اگر کسی کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوگا تو اس کی خلش شاید ابھی تک دور نہ ہو پائی ہو۔ اس لئے سب سے پہلے مسئلے کا یہی پہلو لیا جائے۔

حلالہ کے بارے میں اگر کسی کو نہیں معلوم ہے تو اولاً معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ خود قرآن پاک کا دیا ہوا قانون ہے، اور اگرچہ اس کے سوء استعمال نے اس کی اصلی شکل کو چھپا کر ایک نہایت نفرت انگیز اور شرمناک تصور اس کے بارے میں پیدا کر دیا ہے مگر اپنی اصلی شکل میں یہ بجائے خود ایک ثبوت ہے اس بات کا کہ شریعت اسلامی نے صنف نازک کی عزت و حرمت اور اس کے وقار کی کس درجہ پاسبانی کی ہے نہ کہ خاکم بدہن اُسے مردوں کی خواہشات پر قربان کیا ہے، حلالہ کا قانون قرآن پاک کے اس سلسلۂ کلام کا جزو ہے جس میں جاہلیت کے اس رواجی قانون کو کہ مرد جتنی دفعہ اپنی منکوحہ عورت کو طلاق دے کر واپس لینا چاہے واپس لے سکتا ہے (نتیجۃً اس کی زندگی کو اِدھر نہ اُدھر کے عذاب میں ڈالے رکھ سکتا ہے) کو ختم کرتے ہوئے اعلان فرمایا گیا کہ اب سے طلاق کو واپس لینے (رجعت کرنے) کا اختیار صرف دو دفعہ تک ہے الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ۔ تیسری کے بعد واپسی کا اختیار ختم اور وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، مگر یہ کہ .... یہی "مگر یہ کہ" والا جملہ پورا کرتے ہوئے جو بات فرمائی گئی ہے اسی کا نام حلالہ ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

"مگر یہ کہ وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرلے، پھر اگر وہ دوسرا شوہر

بھی اسے طلاق دے دیتا ہے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ پھر سے ایک دوسرے کی طرف لوٹ آئیں بشرطیکہ امید کریں کہ اللہ کی حدود قائم رکھیں گے (۲۳۰۔۲)

کوئی بھی پڑھا لکھا مسلمان اس بات سے ناآشنا نہیں ہوگا کہ نکاح اور طلاق اسلامی شریعت میں نہایت سنجیدہ معاملات ہیں۔ (اور شاید تمام ہی شرائع میں ان کی یہی نوعیت ہے) اسلام میں بہرحال ان کی سنجیدگی (اور SOLEMNITY) کی شان از روئے حدیث یہ ہے کہ کوئی شخص نکاح کرکے یا طلاق دے کر، اور اس طرح رجعت کرکے اپنے اس فعل کی ذمہ داریوں اور اسکے نتائج سے یہ کہہ کر بچ نہیں سکتا ہے کہ میں تو بس ڈرامہ کر رہا تھا، کچھ سنجیدہ نہیں تھا، پس قرآن اگر کسی دوسرے مرد سے نکاح کی شرط لگا رہا ہے تو وہ صرف ایک سنجیدہ نکاح ہی ہو سکتا ہے جو شریک زندگی بننے اور بنانے کے ارادہ سے کیا جاتا ہے نہ کہ اگلی صبح طلاق کے ارادہ سے، مزید برآں یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ یہاں کسی دوسرے مرد (رَجُل) سے نکاح کے الفاظ بھی استعمال کئے جا سکتے تھے مگر رجُل کے بجائے زوج (شوہر) کا لفظ استعمال کرکے نکاح کے واقعی اور سنجیدہ مفہوم کو مزید مؤکد کر دیا گیا ہے، لہذا اس قرآنی حلالہ کی صورت صرف یہ ہوگی کہ وہ عورت پہلے شوہر کی طرف سے بالکل فارغ الذہن ہوکر کسی دوسرے مرد کی زندگی میں داخل ہو اور پھر اتفاق سے یہاں بھی اُسے طلاق ہی کا سامنا ہو جائے، یا یہ دوسرا شوہر دنیا ہی سے گذر جائے تب اجازت ہے کہ پہلا شوہر اگر اُسے نئے سرے سے اپنی زوجیت میں لینا چاہتا ہے اور وہ عورت بھی راضی ہے تو پھر سے ٹوٹا ہوا رشتہ قائم کرلیں، حلالہ کے اصل قرآنی قانون کو اس بے غیرتی اور دیوثی کے عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے جو کچھ لوگ شریعت کا نام لے کر کرتے ہیں۔ اگر یہ کوئی قانون کی ظاہر طور سے مکمل خانہ پُری کرکے مولوی اور مفتی کے پاس آئے تو وہ مجبور ہوگا کہ اس "دیوثانہ" حلالہ کو بھی تسلیم کرکے نئے نکاح کی اجازت کا فتوی دیدے، لیکن اگر خدانخواستہ کرائے کے سانڈ کے فرائض ادا کرنے والا بھی خود یہ مولوی ہی تھا تو پھر اس پر لعنت ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی اور ان کے سب ماننے والوں کی۔

عورت کے ناموس کی نگہداری:۔ اچھی طرح دیکھ لیا جائے کہ قرآن کا یہ قانون یہ نہیں کہتا

کہ اس عورت سے کوئی دوسرا مرد نکاح کرے" یا "اس کا نکاح کسی دوسرے مرد سے کرادیا جائے"
- بلکہ نکاح کی تجویز اور اس کی کارروائی ہر چیز مکمل طور سے عورت پر چھوڑی گئی ہے" حتی کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرلے"۔ کیا ان باریک لفظی رعایتوں کا مقصد اس کے سوا کچھ اور ہے کہ عورت کی عزت و حرمت کے تحفظ پہ نگاہ رکھی جارہی ہے، اور خود اسے بھی اپنے ناموس کی نگہداشت کا اشارہ دیا جا رہا ہے کہ یہ کام وہ خود اپنی دیکھ ریکھ سے کرے، ایسا نہ ہو کہ کرائے کا کوئی مرد اسکے سابق شوہر کی سازش سے نکاح کا ڈرامہ اس کے ساتھ رچانے کو آگے بڑھ آئے، اور اگلی صبح وہ پھر ایک طلاق ہی کا نہیں، بلکہ بے آبرو ہونے کا بھی رنج اُٹھا رہی ہو۔

اس قانون کا مقصد مذکورہ بالا توضیحات کے بعد یہ بات تو بالکل صاف ہوجانی چاہیے کہ "حلالہ" کے اس قرآنی قانون کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ تیسری طلاق کے بعد ٹوٹے ہوئے رشتے کے ازسرنو جوڑنے کا راستہ بنایا جائے۔ جیسا کہ اس لفظ کے ساتھ خواہ مخواہ یہ تصور وابستہ ہوگیا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہاں تو ایسی شرط رکھ دی گئی ہے کہ اگر ایمانداری سے اس پر عمل کیا جائے اور چور دروازہ نکال کر اس کا نام بدنام نہ کیا جائے تو مشکل ہی سے کسی ایسے ٹوٹے رشتے کیلئے ازسرنو جوڑ کا موقع پیدا ہوگا، ٹھیک کہا ہے عبداللہ یوسف علی نے کہ "THIS IS TO SET AN ALMOST IMPOSSIBLE CONDITION"
اور نہ ہی اس قانون کا مقصد کسی کو سزا دینا ہے اس لئے کہ جب تین کا حق دیا گیا ہے اور استعمال بہرحال صاحب حق کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے تو سزا دینے کا بھی کوئی سوال نہیں (یہ الگ بات ہے کہ اس قانون کے اطلاق کے نتیجہ میں بعض وقت آدمی اپنے کئے پر پچھتائے اور ایک عذاب کی کیفیت اپنے لئے محسوس کرے) یہ قانون دراصل صرف منطقی نتیجہ ہے حق طلاق کی حد بندی کا۔ جب ایک آدمی نے وہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی جو ایک عورت کے سلسلے میں اس کا آخری اختیار تھا تو اب تین صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ دونوں کو پھر سے بہ نکاح جدید مل جانے کی اجازت دی جائے، مگر اب طلاق خارج از بحث ہو (ورنہ حد بندی بے معنی ہوجائیگی) تو ایسا نکاح اسلام میں خارج از بحث ہے، دوم یہ کہ کبھی بھی ازسرنو ملنے کی اجازت نہ ہو تو ایسی کوئی بات پیش نہیں آئی جو ابدی حرمت کا موجب بن جائے، طلاق تو صرف طلاق ہے، ایک

دمی اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ "تو میرے لئے اب ایسی ہے جیسی میری ماں کی پشت" (یہ عربوں کا یک محاورہ تھا جسے ظہار کہتے ہیں) یعنی بیوی کو اپنی ماں کی طرح اپنے اوپر حرام ٹھیرائے دیتا ہے ، دور جاہلیت میں اس کلمے کے اثر سے ابدی حرمت ہی مانی جاتی تھی، مگر اسلام نے اسے اس تاثر کے لحاظ سے بالکل لغو قرار دیا ، البتہ لغویت چونکہ بہت ہی ناروا اور جاہلانہ تھی اس لئے ایک کفارہ بطور تادیب مقرر کردیا گیا (ملاحظہ ہو قرآن مجید سورہ ۵۸ ابتدائی آیات) اب صرف تیسری صورت رہ جاتی ہے کہ جب تک کوئی ایسی چیز پیش نہ آجائے جو ان دونوں کے درمیان دوبارہ رشتے کی شکل میں حق طلاق کو بحال کردے سکتی ہو تب تک ان دونوں کا دوبارہ ملنا ممنوع اور اسکے جائز ہو سو تحریم و تحلیل کے مالک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت بالغہ میں ایسی وہ بات یہ قرار پائی کہ اس عورت کو اتفاق سے کسی دوسرے مرد کے حبالۂ عقد میں وقت گذارنے کا موقع مل گیا ہو اور یہ یقیناً ایک ایسی بات ہے کہ اس کے بعد ایک عورت اپنے سابق شوہر کے حق میں گویا ایک نئی عورت میں تبدیل ہو جاتی ہے، سو یہ ہے قانونِ حلالہ کی واقعی نوعیت۔

تین کو تین ماننے کا آغاز

اس سلسلے میں وہ جو ایک خاتون پروفیسر اسلامیات کے ایک انگریزی مضمون کا اقتباس اوپر گذرا ہے اسے تو بس ایک شاعری سے زیادہ کیا کہا جائے ، محترمہ خاتون نے بلا کسی تاریخی حوالے کے محض اپنے تخیل (IT SEEMS) کے زور پر ایک وقت کی تین طلاقوں کو تین ہی ماننے کے آغاز کا سرا خلفاء بنوامیہ سے ملا دیا ہے اور پھر ان کی اس ناکردنی کی وجہ بھی وہ بتائی جس سے ظاہر ہوا کہ تین اور ایک کے شرعی حکم میں جو واقعی فرق ہے وہ اس کو بھی نہیں جانتیں، بلکہ اس سے اور بڑھ کر یہ کہ وہ ایک مانس میں تین طلاق کے عمل اور اس کے اثر کو دور جاہلیت کا قانون بتاتی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جاہلیت والے طلاق سسٹم سے بھی واقف نہیں ہیں، اور سچی بات یہ ہے کہ محترمہ نے مسئلے کے جس پہلو پر بھی اپنے مضمون میں بات کی ہے یہی ثابت کیا ہے کہ وہ اُسے نہیں جانتیں، حد یہ کہ حلالہ جو اس بحث کا گویا سر عنوان بن گیا اس کے بارے میں بھی وہ نہیں جان سکی ہیں کہ کسی دوسرے سے اس عورت کی شادی ہو اور پھر طلاق ہو اسی کا نام حلالہ ہے بلکہ وہ حلالہ کو اس سے الگ کوئی شئے سمجھتی ہیں کہ ایک تدبیر یہ شادی اور طلاق والی ہے

اور دوسری حلال ہے۔ الغرض یوں کہئے کہ ؎

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

رہے ہمارے محترم سید حامد صاحب تو انھوں نے بے شک کسی ادّعا کے بغیر اپنے کو اس مسئلے میں محض ایک عامی کہہ کر اظہار خیال کیا ہے، مگر اظہار خیال کا سلسلہ جہاں سے شروع ہوا تو وہ بھی ہر قدم پر اپنی اس مبینہ حیثیت سے دور تر ہوتے چلے گئے ہیں، میرا خیال ہے کہ بعد میں ضرور سید صاحب قبلہ کو اس کا کچھ خیال ہوا ہوگا، بہرحال سید صاحب نے اہلحدیث حضرات ہی کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی ماننے کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک ہنگامی فیصلے سے بتایا ہے، راقم الحروف کی اس تحریر کا مقصد چونکہ اس بحث میں کسی فریق کی طرف سے حصہ لینا نہیں بلکہ صرف اس کے ایک قابل لحاظ پہلو کی طرف توجہ دلانا ہے اسلئے اپنی رائے اور اپنے موقف کا کوئی اظہار نہ کرتے ہوئے بس یہ گذارش ہے کہ یہ مسئلہ جس کا تعلق ایک مرد اور عورت کیلئے ایک دوسرے پر حرام اور حلال ہونے سے ہے بدیہی طور پر شریعت کے نہایت ہی احتیاط طلب مسائل میں سے ہے، اس لئے اس بارے میں کوئی بات کہتے ہوئے اور کسی بھی موقف کا اظہار کرتے ہوئے آخری درجے کی احتیاط اور ہر ہر پہلو سے سوچ بچار کی ضرورت ہے

اس نقطۂ نظر سے راقم کا خیال ہے کہ یہ بات بہت سوچ سمجھ کر کہی جانے کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قرآن وسنت کا وہ قانون ایک ہنگامی ضرورت کے ماتحت بدل دیا جس کی رو سے ایک عورت کا اپنے شوہر سے نکاح ابھی قائم تھا اور وہ کسی دوسرے پر حرام تھی اور اس تبدیلی کے نتیجے میں وہ اپنے شوہر پر حرام اور غیر پر حلال ہوگئی، اہلحدیث حضرات کے جس قول اور موقف کو سید صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب نے اپنایا ہے اس کا ترجمہ بلا کسی مبالغے کے حرف بحرف یہی ہوتا ہے۔

اہل حدیث حضرات اپنے موقف کی بنیاد ایک روایت پر رکھتے ہیں جو بظاہر یہ بتاتی ہے کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی بلکہ خود عہد فاروقی کے ابتدائی دو تین سال میں بھی مسئلہ یہ تھا کہ کوئی شخص اگر ایک ہی وقت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالتا تھا تو وہ ایک ہی شمار

ہوتی تھیں، لیکن حضرت عمر فاروق نے جب یہ دیکھا کہ یہ کام بہت کثرت سے ہونے لگا تو آپ نے تین کو تین ہی ماننے کا فیصلہ کر دیا، یعنی اسکے بعد یہ عورت و مرد ایک دوسرے پر حرام، اور عورت کے لئے حلال کہ کسی دوسرے کے نکاح میں چلی جائے، ہو سکتا ہے کہ اہل حدیث حضرات کے سامنے کچھ اور دلائل ہوں جو انھیں یہ ماننے پر مجبور کئے ہوئے ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تین طلاق بیک وقت کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ رہے ہوں کہ امت میں عام چلن اس کے برعکس اس فتوے کا ہے کہ تین بیک وقت اگرچہ حرام ہوں، معصیت اور بدعت ہوں یا مکروہ اور خلاف اولیٰ ہوں مگر وہ مانی تین ہی جائیں گی ایسے میں یہ روایت چونکہ اس معمے کا ایک حل پیش کرتی ہے اسلئے ان حضرات کو اس کا قبول کرنا قدرتی طور پر آسان ہونا ہی چاہئے، مگر سید حامد صاحب جیسے جن لوگوں کی یہ پوزیشن نہیں ہے، سخت تعجب ہے کہ وہ کیسے آسانی سے اس روایت کو قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، اس کی قباحت نہ کوئی معمولی قباحت ہے نہ ڈھکی چھپی، ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے جس چیز کو حرام ٹھیرایا کسی انسان کو اختیار نہیں کہ اسے حلال کر دے اور جس چیز کو انھوں نے حلال ٹھیرایا، کسی کے اختیار میں نہیں کہ اسے حرام کر دے، بالخصوص وہ حلت و حرمت جس کا تعلق عورتوں کے ناموس سے ہو۔ اور پھر یہ نادانی کرنے والا بھی۔ خدانخواستہ کون ہو؟ عمر فاروق، جو زبان نبوت سے الناطق بالحق والصواب ٹھہرایا گیا ہو۔

اس روایت کی اس کھلی قباحت ہی کا نتیجہ ہے اہل حدیث حضرات حضرت عمر کی طرف منسوب اس فعل کو ایک ہنگامی ضرورت کے ماتحت ان کا اجتہاد بتا کر قباحت کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اس توجیہ اور تاویل سے معاملہ کچھ بھی ہلکا نہیں ہوتا اس لئے کہ معاملہ ایک حضرت عمرؓ کا بھی نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ایک اکیلے آدمی سے بڑی سے بڑی غلطی کا بھی امکان مانا جا سکتا ہے، حضرت عمرؓ کے ساتھ یہ اس امت کے تمام صحابہ خصوصاً اکابر اور اہل علم صحابہ کا بھی معاملہ ہے کہ حضرت عمر بالفرض ایک ایسی موٹی اور ناقابل تصور اجتہادی غلطی کر بھی رہے تھے تو نہ تو یہ ماننا ممکن ہے کہ وہ سب کے سب بھی اس غلط کو صحیح سمجھنے میں شریک ہو گئے، اور نہ یہ کہ جانتے بوجھتے حضرت عمرؓ کی اس ہمالیہ جیسی عظیم

"غلطی" پر چپ رہے، حتیٰ کہ حضرت عمر کے بعد بھی (کم از کم بالعموم) یہی فتوے چلتے اور اسلامی عدالتوں میں یہی فیصلے ہوتے رہے۔

جن حضرات کو اہل حدیث حضرات کی طرح کی ایسی کوئی شرعی مجبوری درپیش نہیں ہے جیسی ایک مجبوری کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا، ان کی زبان پر تو اس روایت کے سنتے ہی قدرتی طور سے یہ سوال آنا چاہیئے کہ کیا واقعی یہ روایت کوئی صحیح روایت ہے؟ چنانچہ جمہور امت کے نمائندہ علماء کے سامنے جب یہ روایت آئی تو انھوں نے فنی معیار سے اس کی جانچ پڑتال کی اور اس نتیجے پر پہونچے کہ چند در چند وجوہ سے بہت کمزور روایت ہے اور مزید یہ کہ اگر فنی بحث سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو اس کا ایسا مفہوم بھی بآسانی لیا جا سکتا ہے جس کے بعد وہ قباحت دور ہو جاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے اس روایت کو سرے سے رد ہی کر دینا بہر حال اس قباحت کو قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے، کم از کم یہ کہنے میں تو کوئی بھی مضائقہ ایسی قباحت کی صورت میں نہیں ہے کہ راویوں کے سلسلے میں سے کسی راوی کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے، کیونکہ بحالت موجودہ یہ روایت ایک ایسی بات کہتی ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بعد میں جا کر اس سابق فیصلے پر پچھتائے تھے، لیکن یہ بات کچھ اس لیئے (وکیلانہ انداز کی پیروی مقدمہ سے جا ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے رجوع کا ذکر کہیں نہیں ملتا، جو ایسی صورت میں لازم تھا اور یقینی بھی، اور اس کے بعد یقیناً فتووں اور عدالتی فیصلوں کی پٹری بھی بدل جاتی بلکہ اگر پچھتاوے کی بات فی الواقع ہوئی ہوتی تو اسی روایت میں (جو کہ واضح طور پر حضرت عمر کے بعد ہی کے دور میں حضرت ابن عباسؓ سے پوچھے گئے ایک سوال کے مبینہ جواب کی روایت ہے) اس کا ذکر ہونا بھی لازم تھا ورنہ کہا جائے گا کہ حضرت ابن عباس نے آدھی سچائی بیان کی، حالانکہ وہ تو علمی اعتبار سے حضرت عمر کے قریب ترین لوگوں میں، بلکہ ان کے ساختہ پرداختہ تھے۔

الغرض یہ روایت کہ طلاق ثلثہ بیک وقت کا مسئلہ پہلے کچھ اور تھا جسے حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں بدل دیا، ایک عامی مسلمان کے معیار سے بھی ناقابل قبول ہے بہ جائیکہ دانشور حضرات وخواتین اسے سند قبول دینے لگیں۔

ایک اور پہلو بھی ہے

مزید برآں یہ بات بھی کہاں کچھ قرین دانش ہے کہ دین کے ایسے مسئلے میں جس سے ایک انتہائی نازک اور احتیاط طلب حرام وحلال کا سوال وابستہ ہے اور جس میں تقریباً پوری امت اور اس کے چاروں مسلّم اور جلیل القدر امام اپنے تمام دوسرے اختلافات کے باوجود یک رائے اور ایک زبان ہیں ہم باوجود اپنے اس شعور واعتراف کے کہ کتاب وسنت اور رموز فقہ تک ہماری دسترس نہیں ہے بہ بانگ دُہل رائے ظاہر کرنے لگیں کہ یہ سب کے سب غلط تھے اور ٹھیک وہ ہے جواب ہمارے علم میں اہل حدیث علماء کے ذریعہ آیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ خود اہل حدیث علماء بھی اگرچہ اس مسئلے پر اپنے خلاف اجماع اُمّت کا لفظ سننے کو تیار نہ ہوں مگر یہ پہلو ان کے بھی غور فرمانے کا ہے کہ کیا اس معاملے میں امت کے اہل علم وفتویٰ کے سواد اعظم کے بالکل برخلاف فتوے کی ذمہ داری اٹھانا ان کے لئے مناسب ہے؟ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رح جو مغربی پنجاب (پاکستان) کے مشہور اہل حدیث خاندان کے علماء میں گذرے ہیں ان کی جو رائے اس معاملے میں نظر سے گذری دراصل احتیاط کا تقاضا تو وہی نظر آتا ہے، فتاوی رشیدیہ (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے فتاویٰ) میں مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رح کا ایک فتویٰ اس مسئلے میں اہل حدیث مذہب کے مطابق درج ہوا ہے جس پر دو اور اہل حدیث علماء کی رائیں بھی درج ہیں انھیں میں سے ایک مولانا عبدالجبار صاحب کی ہے اور وہ یہ ہے

> "یہ فتویٰ موافق مذہب بعض اہل علم از صحابہ اور تابعین ومحدثین اور فقہاء کے ہے جمہور علماء از صحابۂ کرام وتابعین ومحدثین وفقہاء اس فتویٰ کے خلاف پر ہیں، جمہور کا مذہب اسلم ہے احتیاط کی رو سے، اور پہلا مذہب قوی ہے دلیل کی رو سے۔"
>
> (فتاویٰ رشیدیہ مطبوعہ سعید اینڈ کمپنی کراچی ص۴۷۶)

نیز معاملے کا ایک اور پہلو بھی بالخصوص اہل حدیث علماء ہی کے لئے قابل غور ہونا چاہئے کہ کتاب وسنت میں طلاق دینے کا جو صحیح طریقہ بتایا گیا ہے اور جس کے خلاف عمل کو (یعنی بیک وقت تین دے ڈالنے کو) کتاب اللہ سے کھلواڑ قرار دیا گیا ہے تو اس کھلواڑ سے لوگوں کی روک تھام اور صحیح ومسنون طریقے کا تحفظ کس فیصلے میں زیادہ ہے؟ آیا اس میں کہ تین دینے پر تین ہی پڑینگی یا اس میں کہ آدمی ایک دفعہ کے بجائے دو دفعہ بھی ایسا کھلواڑ کرے تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا؟

روایت کی تاویل

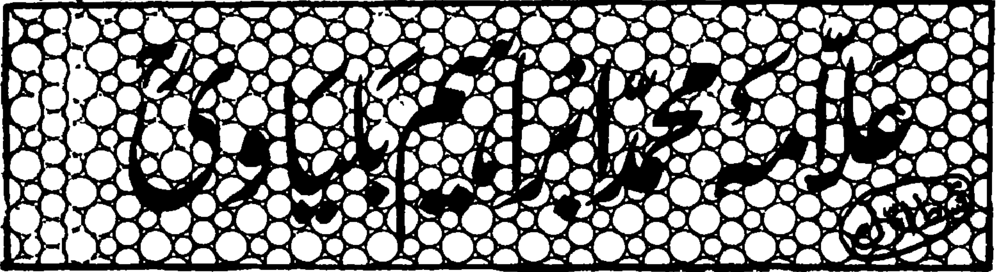
اوپر محض ایک اشارہ آکر رہ گیا وضاحت نہ ہو پائی کہ حضرت عمرؓ سے متعلق روایت کی وہ کیا تاویل اور وہ کیا اس کا دوسرا مفہوم ہے جس کے ساتھ یہ روایت قابل قبول بھی ہوسکتی ہے، اور وہ مفہوم ظاہر الفاظ سے کچھ ایسا دور بھی نہیں بخاری کے شارح علامہ ابن حجرؒ نے اس بارے میں کئی قول نقل کئے ہیں، شلاً اس میں سے ایک کو ہم قدرے وضاحت کے ساتھ اس طرح ادا کرسکتے ہیں کہ غالباً اس روایت نے جو واقعہ بیان کرنا چاہا ہے اس کی صورت یہ تھی کہ حضرت عمر کے ابتدائی دور خلافت تک مسلمانوں میں بیک وقت تین طلاقوں کا رواج نہیں تھا (شاذ و نادر ایسے واقعات ہوتے تھے اور اس لئے ان کا حکم بھی عام طور پر واضح نہ تھا) بعد میں یہ رواج بڑھ کر مسئلہ بن گیا تو حضرت عمرؓ نے صحابہ (اہل علم اور اہل شوریٰ) کے سامنے اس بارے میں ایک واضح اجماعی فیصلے کیلئے اپنی رائے (فلوامضیناہ) کے الفاظ میں رکھی، اور پھر سب کی تائید سے آپ نے اس بارے میں یہ قطعی حکم جاری کردیا کہ تین تین ہی کے حکم میں ہیں بالفاظ دیگر یہ گویا نئے احوال کے پیدا کردہ ایک نئے مسئلے کے حکم کا بیان تھا نہ کہ کسی پرانے حکم کی تبدیلی کا، اسی طرح ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ یہ تین طلاق بیک وقت کی ایک خاص صورت سے متعلق بیان ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ حاکم یا قاضی کی صواب دید پر ہے کہ وہ اس صورت میں تین مانے یا ایک، اور وہ صورت یہ تھی کہ ایک آدمی ایسے الفاظ سے تین طلاق دے کہ جس کے بعد چاہے تو یہ بھی کہہ سکے کہ میری نیت ایک ہی کی تھی، سو زمانے کی تبدیلی اور ایسی طلاقوں کی کثرت کی بنا پر یہی فیصلہ صحیح سمجھا گیا،

واللہ اعلم

بقیہ خطبۂ استقبالیہ

راحت رسانی اور میزبانی کے فرائض کی ادائیگی میں بھی یقیناً کوتاہی ہوسکتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ جس خلوص و جانفشانی کے ساتھ محترم ارکان استقبالیہ اور رجاعتی رفقاء نے اجلاس تحفظ شریعت کو کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے اس کے نقوش میرے ورقِ دل پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ وَاٰخرُ دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین



از ــــــــــ محمد عمران قاسمی بگیانوی، عربی لیکچرر جامعہ طبیہ دیوبند

تقدیم

- تاریخ دارالعلوم دیوبند اور کاروان شیخ الہند کی اس نامور، عہد ساز اور عظیم المرتبت شخصیت کی داستان حیات، اسلامی علوم میں جس کا تبحر اور حکمت آفرینی مسلم و بے مثال تھی۔
- ہندوستان میں احیاء اسلام کی اس عظیم تحریک (دار العلوم دیوبند) کے اس قابل رشک فرزند کے حالاتِ زندگی جس کا وجود حیات اور طرز زندگی سلف صالحین کے علمی، عملی اخلاقی، عرفانی خودداری اور جود و سخا کے کردار کا مظہر اور آئینہ دار تھی
- جو علوم و معارف اور حکمت قاسمیہ کا مسلم محافظ و امین اور کامیاب شارح نیز فکر ولی اللٰہی کا ترجمان تھا۔
- جو اپنے زمانے کا ابن سینا، ارسطو اور اپنے وقت کا رازی تھا۔
- علوم ظاہری میں کمال و رسوخ کے ساتھ ساتھ جس کو باطنی برکات کا مصلحین کاملین اور شیوخ وقت (شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ) سے استفادہ اور کسب فیض کا موقع نصیب ہوا۔
- ہزاروں علماء کا شرف استادیت، دار العلوم دیوبند کی صدارت تدریس نظامت تعلیمات اور رکنیت مجلس شوریٰ (دار العلوم دیوبند) کے علاوہ متعدد مدارس دینیہ کی تدریسی خدمات و سرپرستی بارگاہ ایزدی سے جس کا مقدر ہوئیں
- اپنے زمانے میں مقبولیت محمودہ اور علماء دین کا قابل رشک رجوع عام جس کو منجانب اللہ عطا ہوا

● جس کا تقویٰ و انابت الی اللہ، خوف وخشیۃ الٰہی، انتظامی وانصرامی صلاحیات، خداداد بصیرت، حلم ووقار، خوش اخلاقی، ضیافت ومہمان نوازی، تواضع وانکساری، عالمانہ شان واستغناء، اتباع شریعت، احیاء علوم، علمی تبحر، ذہانت وفطانت، حاضرجوابی ونکتہ آفرینی مسلّم اور ضرب المثل تھی۔

خاندانی حالات :-

اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع اول کی بات ہے کہ ضلع جھنگ (پاکستان) سے ایک قبیلہ جونپور میں آکر رہائش پذیر ہوا، یہاں قیام کو تقریباً ایک صدی گذری تھی، ایک دور ایسا آیا کہ عام طور پر فاقہ کشی اور بدحالی پورے ملک میں پھیل گئی، جونپور میں یہ صورتِ حال کچھ زیادہ ہی تھی چنانچہ یہ قبیلہ وہاں سے بھی عازم سفر ہوا۔

ظاہر ہے کہ جونپور میں سوسالہ قیام کے دوران اس قبیلہ کے افراد میں زیادتی ہونا ایک فطری امر تھا جس کے نتیجے میں وہ چھوٹا سا قبیلہ جو ایک صدی قبل جھنگ سے آیا تھا اب ایک اچھے خاصے خاندان کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، جن میں کچھ لوگ دولت علم سے مالا مال تھے تو کچھ دنیاوی اعتبار سے خوش حال اور صاحب حیثیت۔

بہرحال اس قبیلہ (خاندان) کے افراد نے جونپور کی قحط زدہ زندگی سے پریشان ہوکر ملک کی مختلف سمتوں کا رخ کیا، بعض افراد فرنگی محل (لکھنؤ) چلے گئے جن میں مولانا مظفرحسین اور مولانا عبدالحمید صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور بعض نے مونگیر (بہار) میں سکونت اختیار کرلی، اور کچھ لوگ جن کے پاس سرمایہ کم تھا بلیاوی میں جاکر مقیم ہوگئے، مؤخرالذکر جماعت میں حضرت العلامہؒ کے پردادا بھی تھے[1]

نسبی اصل :-

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے کہ

---

[1] بروایت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ (دارالعلوم مارچ ۱۹۶۸ء ص ۳۵)

"حضرت (علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہ) مرحوم کی اصل پنجاب ہے، ان کے پردادا آج سے تقریباً کئی سو برس پہلے ضلع جھنگ سے ہندوستان آئے اور جونپور میں آکر بس گئے ایک عرصہ بعد وہاں اسباب معیشت تنگ ہوجانے کے بعد ان کے خاندان کا کچھ حصہ بہار میں جاکر آباد ہوگیا اور مولانا کے دادا اپنے خاندان سمیت بلیا میں جاکر آباد ہو گئے، اس طرح مولانا کی اصل پنجاب ہے ...... حضرت مولانا کی یہ نسبی اصل ہے"[1]

اہل علم پر واضح ہے کہ نری شرافت نسبی چنداں کارآمد نہیں جب تک حسبی فضیلت حاصل نہ ہو، اعلیٰ نسبی قابل شرف تو ہے مگر لائق فخر نہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معیارِ فضیلت و مقبولیت اعمال صالحہ اور تقویٰ و پرہیزگاری ہے[2] چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں "مدار نجات نسب نہیں ہے عمل ہے اگر نسبی حیثیت سے کوئی اعلیٰ درجہ کا عالی نسب ہے مگر اعمال قبیح ہیں تو مثل پسر نوح علیہ السلام وہ راندہ درگاہِ خداوندی ہے اور اگر چمار زادہ یا بھنگی زادہ ہے مگر وہ مسلمان متقی ہے تو اس کی فوز و فلاح مثل بلال و صہیب رضوان اللہ تعالیٰ علیہما ہے"[3]

حضرت علامہ مرحوم کی نسبی اصل کی ایک جھلک دکھانے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ عام طور پر اور علماء کے ایک خاص طبقہ میں بھی (جو علم و تحقیق کے معاملے میں سہولت پسند اور تاریخ و حقائق سے زیادہ عرف عام کو مستدل بنانے کا عادی ہے) علامہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپ انصاری (پارچہ بافوں کی) برادری سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں تک کہ ایک نامور سوانح نگار (جن پر سوانح نگاری کی صلاحیتوں سے زیادہ شوقِ سوانح نگاری کا غلبہ معلوم ہوتا ہے جو بجائے خود بعض قلم کاروں کے انفرادی کمالات کا حصہ ہے) نے جرأت تحقیق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب[4] میں علامہ رحمہ کے نام کے ساتھ لفظ "انصاری" لکھ ہی ڈالا (جو ان کی شان تحقیق اور وسعت علم و اطلاع کا واضح ثبوت ہے) نہ معلوم

---

[1] علامہ کی یاد (دارالعلوم) مارچ ۱۹۶۸ء ص ۲۹ ۔ [2] چنانچہ قرآن حکیم میں ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ۔ [3] مکتوبات شیخ الاسلام رحمہ جلد اول ص ۵۸ ۔ [4] تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۱۷۵ ۔

اس کی وجہ عرف عام کو حجت اور مستدل بنانا اور تاریخ وحقائق سے چشم پوشی ہے یا عدم واقفیت، لیکن متعدد شخصیات کے سوانح نگار خود علامہ صاحب رح سے فیض یافتہ اور شرف تلمذ رکھنے والے شخص کی اتنی عدم واقفیت معنیٰ خیز اور نہایت قابل اصلاح ہے۔ ؎

ہمیں اپنے ہی یاروں نے کر دیا رسوا
کہ بات کچھ بھی نہ تھی اور وضاحتیں تھیں بہت

اس میں کلام نہیں کہ حضرت علامہ رح کی شہرت نسبی انصاری (برادری کے ایک فرد) کی حیثیت سے ہے مگر علامہ کے خاندانی حالات سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ یہ مخصوص حالات کی دین اور واقعہ کے خلاف ہے جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ علامہ کا خاندان ایک زمانے میں شدید معاشی تنگیوں اور اقتصادی بدحالیوں کا شکار رہا ہے ایسے میں یہ بالکل قرین قیاس ہی نہیں بلکہ واقعہ کے مطابق ہے کہ علامہ کے خاندان کے افراد نے مناکحت و تزوج میں نسلی برابری اور مساوات کے بارے میں وہ حزم واحتیاط اختیار نہیں کی جو ایک اعلیٰ خاندان کے نسلی امتیاز کو باقی رکھتی ہے، اور مکمل مساوات کا اہتمام بلیا میں آسان بھی نہ تھا چونکہ اطراف (بلیا) میں عام طور پر انصاری (پارچہ بافوں کی) برادری کی کثرت تھی، اور یہ خاندان بہرحال اقتصادی بدحالی اور مالی مشکلات کا شکار تھا ایسے میں یہ اپنے اس نسلی امتیاز کو باقی نہ رکھ سکا جو اس کی اصل ہے اور اپنی اس خستہ حالی کے سبب رشتوں میں عدم مساوات کو نظرانداز کر دیا گیا، اور انصاری برادری میں متعدد رشتہ داریاں ہوگئیں اور اس خاندان کے اسی پہلو کے سبب اس کو انصاری (پارچہ باف) خاندان کے طور پر شہرت حاصل ہوگئی اور یہ بالکل ایسا ہی ہوگیا جیسے خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رح کے سید و غیر سید ہونے کی بحث ہے [1]

---

[1] علامہ انور شاہ کشمیری رح کے غیر سید ہونے سے ان کی رفعت شان اور علو مرتبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا علمی دنیا میں علامہ کا جو مقام ہے وہ کسی نسلی برتری اور اعلیٰ نسبی کا محتاج نہیں (جبکہ علامہ اس سے بھی متصف ہیں کہ وہ کم از کم شیوخ و پیرزادگان سے تو ہیں ہی واللہ اعلم) شاہ صاحب سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی عقیدت کا یہ حال ہے فرماتے ہیں " جو شاہ صاحب کی اقتداء میں نماز پڑھے گا (باقی ہے)

علامہ انور شاہ صاحبؒ کشمیر کے مشہور بزرگ حضرت شیخ مسعود نردری کی اولاد سے ہیں، والد کی جانب سے آٹھویں اور والدہ کی جانب سے نویں واسطے پر آپ کا سلسلۂ نسب مذکورہ بالا بزرگ تک پہونچ جاتا ہے اور "الانور" کے مصنف جناب عبدالرحمٰن کوندو نے خود علامہ کشمیری" کے والد محترم (شیخ معظمؒ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اولاد نردری پیر صاحبان کا ادعائے سیادت (اگر کہیں ہو تو) بالکل غلط ہے" ص۱۱

حضرت شیخ مسعود نردریؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی، شاہ عبدالقدوس گنگوہی رہ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی طرح نسلاً امام ابو حنیفہؒ سے شرف نسب رکھتے ہیں۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نسب کے بارے میں واضح اختلاف کے باوجود (کہ آپ فارسی النسل تھے کابلی النسل یا عربی النسل) یہ تمام مورخین کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ آپ سید نہ تھے۔

جب امام صاحبؒ سید نہ تھے تو ظاہر ہے کہ ان سے نسلی شرف نسب رکھنے والے حضرات کیونکر سید ہو سکتے ہیں، واقعہ یہی ہے کہ سادات میں رشتوں کے سبب یہ خاندان سادات میں شمار ہونے لگا اور یہ روایت اس قدر شہرت پا گئی کہ "نگارستان کشمیر" کے مصنف بھی اس بنیادی غلطی کا شکار ہو گئے اور نہ صرف علامہ کشمیری کے ساتھ "لفظ سید" کا استعمال کیا بلکہ ان کے والد محترم کو بھی بجائے شیخ معظم کے سید معظم اور ان کے جداعلیٰ شیخ مسعود نردری کو بھی سید مسعود نردری لکھ دیا (ملخصاً از "الانور" ص۱۶)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) مجھے رحمتِ حق سے اس کی نجات کی توقع ہے" (نقش دوام ص۲۴۴) شاعر اسلام علامہ محمد اقبالؒ فرماتے ہیں کہ "اسلام کی ادھر پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے" (نقش دوام ص۲۸۷) حضرت تھانویؒ کی نظر میں علامہ کشمیری کے علم و تحقیق کا کیا مقام ہے اس روایت سے اندازہ لگائیے اور سر دھنیے، مرشد تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کے دلائل میں سے موجودہ وقت میں مولانا انور شاہ کا مسلمان ہونا ہے یہ اتنے بڑے عالم ہیں کہ اگر اسلام میں کہیں اور کسی جگہ بھی کجی ہوتی تو اسلام کو چھوڑ دیتے اور جب یہ اسلام پر ہیں تو یقیناً یہ اسلام کی صداقت کی ایک دلیل ہے (نقش دوام ص۲) اللہ اللہ، حضرت تھانویؒ جیسے محقق اور محتاط عالم کی زبان سے ایسے الفاظ، جو لوگ براہ راست دربار اشرفی کے حاضر باشوں میں شامل رہے یا جنھوں نے حضرت کی زندگی کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور آپ کی رفعت علمی، شان تحقیق، احتیاط پسندی، اظہار حق میں بے باکی و بے خوفی (واحساس ذمہ داری)، نظر تنقید، شان اجتہاد اور اصلاحی مزاج سے واقف ہیں ان سے پوچھئے کہ "لسان اشرف" سے نکلے ہوئے ان الفاظ کی کیا اہمیت ہے اور علامہ کشمیری کا مقام حضرت تھانویؒ کی نظر میں کتنا بلند و ارفع ہے

تاریخ میں غلط العوام اور خلاف حقیقت شہرت کی ایسی ہی اور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں
جیسے خواجہ معین الدین چشتی کا اصل وطن مالوف سجستان ہے اسی لئے آپ کی نسبت سجزی ہے
عرف عام میں سنجری غلط مشہور ہو گیا۔(۱)

اس طرح کے تسامحات سے اسلامی تاریخ کا باب بھی خالی نہیں، بعد مغرب جو نوافل پڑھے
جاتے ہیں ان کو صلوٰۃ اوابین کہا جاتا ہے اور یہ بات مسلمات وقطعیات کی طرح مشہور ومعروف ہے
مگر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رہ کی تحقیق اس بارے میں عرف عام کے خلاف
ہے چنانچہ آپ مولانا نجم الدین اصلاحی[۲] کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ مشہور یہی ہے کہ
نوافل بعد المغرب کو صلوۃ الاوابین کہا جاتا ہے اور ضحوۂ کبریٰ کے نوافل کو صلوۃ الضحیٰ اور چاشت
کہا جاتا ہے مگر صحاح میں ہے صلوۃ الاوابین حین ترمض الفصال اس لئے اقرار کرنا پڑے گا کہ
نوافل بعد المغرب کا تسمیہ غلط العوام میں سے ہے[۳]

عبارت بالا کے تحت مولانا اصلاحی رقم طراز ہیں کہ صلوۃ الاوابین اس وقت ہے کہ اونٹوں
کے بچے گرم ہوں یعنی ان کے قدم شدت آفتاب سے قریب دوپہر جلنے لگیں، مسلم شریف کی
اس روایت نے فیصلہ کر دیا کہ صلوۃ الاوابین کا وقت بعد مغرب یا رات کے کسی حصہ میں نہیں ہے
بلکہ وہ دن میں دوپہر کے قریب ہے چنانچہ شارحین حین ترمض الفصال کے تحت لکھتے ہیں
حین تحترق اخفافها من شدة حر النهار وهي عند مضي ربع النهار[۴]

ایک مثال اس ضمن میں اور ملاحظہ کرتے چلیں جس کو غلط العوام کے بجائے غلط الخواص
میں سے کہا جائیگا، قرآن حکیم کی آیت وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ کے ترجمہ میں تسامح کا ایک طویل اور
حیرت انگیز سلسلہ سامنے آتا ہے۔

جبین عربی میں کروٹ کو کہتے ہیں اور اس آیت کے مفہوم ومدلول کی تفہیم کیلئے آپ
کنپٹی کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں مگر بہت سے نامور اور معتبر علماء نے اس کا ترجمہ ماتھا (پیشانی)
سے کیا ہے، حالانکہ جبیں بمعنی پیشانی فارسی زبان میں ہے، عربی میں اس کے لئے جَبْهَةٌ کا لفظ
آتا ہے، یہ حقیقت کتنی حیرت انگیز ہے کہ بعض متقدمین کا یہ سہو متاخرین کی ایک بڑی اور معتبر

---

۱ دارالعلوم فروری ۱۹۹۱ء ص ۔ ۲ مرتب مکتوبات شیخ الاسلام ۳ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۔ ۴ حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۲۱۶ ۔

جماعت نے بھی بلا غور وفکر نقل وقبول کیا، چنانچہ جبین کا ترجمہ ماتھا (پیشانی) کرنے والوں میں شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، حضرت شیخ الہند، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نیز مولانا عبدالحق حقانی نے منہ کے بل ترجمہ کیا ہے جبکہ حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رہ، علامہ آلوسیؒ، علامہ زمخشری رہ علامہ ابوحیان اندلسی و حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی رہ اور مولانا بدر عالم میرٹھی رہ وغیرہ نے جبین کا ترجمہ کروٹ سے کیا ہے اور یہی صحیح ہے[1]

خیر یہ تو استطراداً ایک بحث درمیان میں آگئی تھی اور اتفاق کہ طویل ہوگئی لیکن چونکہ معلومات افزا ہے اس لئے غیر ضروری بھی نہیں کہی جاسکتی اور بقول حکیم ننو میاں صاحب مدظلہ "کسی چیز کا علم اس کے جہل سے بہتر ہے"، اب میں پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں

علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی کی نسبی اصلیت کے متعلق بھی بعض عوارضات کے سبب یہی صورت حال پیش آئی کہ وہ عرف عام میں غلط مشہور ہوگئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم پنجابی الاصل تھے جو نہایت صاحب عزت وعظمت برادری ہے اور پاکستان کے اس علاقہ (پنجاب) میں جہاں سے علامہ کا خاندان آیا تھا آج بھی دینی اور دنیوی اعتبار سے معاشرے میں ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ صرف علو نسبی نہ قابل شرف ہے اور نہ مدار نجات، ہاں اگر اعلیٰ حسبی کے ساتھ شرافت نسبی بھی حاصل ہو تو باری تعالیٰ کا انعام خصوصی اور نور علیٰ نور ہے، علامہ (محمد ابراہیم بلیاویؒ) کی اعلیٰ حسبی اور فضل وکمال تو اس قدر معروف ومسلم ہے کہ ایک زمانہ اس کا شاہد ومعترف ہے، البتہ چونکہ علامہ مرحوم کی نسبی اصل کے متعلق ایک غلط روایت خلاف واقعہ مشہور رہی ہے اسی کی تردید وتصحیح اور حقیقت کی تنقیح ووضاحت ضروری تھی سو الحمد للہ اب مقصود بے غبار ہوگیا۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مندرجہ بالا حضرات کے تراجم یا ماہنامہ الحق دسمبر ۱۹۹۱ء (مطبوعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پاکستان)

(جاری)

ماہ نومبر ۱۹۹۳ء

از:- مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصورپوری استاذ دارالعلوم دیوبند

سہ روزہ تحفظ ختم نبوّت کانفرنس و تربیتی کیمپ

زیر نگرانی کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

زیر اہتمام مجلس تحفظ ختم نبوت ضلع بھاگلپور و مسلم ایسوسی ایشن

○ محلہ برہ پورہ شہر بھاگلپور میں

○ فقید المثال عظیم الشان سہ روزہ تحفظ ختم نبوت کانفرنس و تربیتی کیمپ کا انعقاد

○ ۵۰ ہزار سے زائد پاسبان ختم نبوت مردوں اور عورتوں کا روح پرور اجتماع

مجلس تحفظ ختم نبوّت ضلع بھاگلپور اور مسلم ایسوسی ایشن برہ پورہ شہر بھاگلپور کے زیر اہتمام ۱۵ تا ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء سہ روزہ تحفظ ختم نبوت کانفرنس و تربیتی کیمپ لگایا گیا جامع مسجد برہ پورہ میں تربیتی کیمپ کے پروگراموں کی روزانہ دو نشستیں ہوتی تھیں، جن میں تین سو کے قریب علماء، دانشور اور نوجوان مسلمان پابندی سے شریک ہوتے تھے اور خصوصی تربیت دہندگان حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم سے عقیدہ ختم نبوت و رفع و نزول عیسیٰ کی صحیح اسلامی تشریح مکمل تحقیق و بسط کے ساتھ سمجھی، اور قادیانی گروہ کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا ازالہ کیا تاکہ اپنے اپنے علاقہ میں جاکر تحفظ ختم نبوت کا فریضہ انجام دے سکیں اسی مقصد کے لئے وہاں کی مجلس استقبالیہ نے ہر مندوب تربیتی کیمپ کو کتب رد قادیانیت کا ایک وقیع اور قیمتی سیٹ ہدیہ کیا جو ۲۸ کتابوں پر مشتمل تھا، پھر اجلاس عام میں جملہ مندوبین تربیتی کیمپ کو کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کی جانب سے سند شرکت عطا کی گئی۔

تربیتی کیمپ کے خصوصی پروگراموں کے علاوہ عیدگاہ برہ پورہ میں بنائے گئے ایک وسیع وعریض شاندار پنڈال میں روزانہ رات میں عام اجلاس ہوتے رہے جبکہ اسی پنڈال

میں ایک عام اجلاس بروز اتوار ۱۰؍اکتوبر کی صبح کو دن میں منعقد ہوا، یوں تو روزانہ ہی عام جلاس میں شرکاء کی تعداد بے حد وحساب رہتی تھی، لیکن آخری اجلاس میں شرکاء کی تعداد نے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے، محتاط اندازہ کے مطابق پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں نے شرکت کی جن میں تقریباً دس ہزار عورتیں تھیں اور ان کے لئے پردہ کا معقول انتظام تھا، رب وجوار کے محلوں میں اونچی جگہوں پر لاوڈاسپیکر لگادیئے گئے تھے ان محلوں کے مسلمان نی اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے اجلاس عام کی تقریریں سن رہے تھے، اس طرح کل سامعین کی ںداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے، یہ آخری اجلاس عام، ۱۰؍اکتوبر کی شب میں ساڑھے سات بجے شروع ہوکر ساڑھے چار بجے فجر کی اذان پر بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا، اس طویل ترین نشست یں حیرت انگیز طور پر پورا مجمع مکمل بیداری اور انتہائی توجہ اور سکون کے ساتھ علماء اسلام سے ردقادیانیت کے موضوع پر علمی وتحقیقی مضامین سنتا رہا۔

سہ روزہ اجلاس عام کی چار نشستوں میں مندرجہ ذیل حضرات نے مختلف مقررہ عنوانات پر ٹھوس باحوالہ تحقیقی مواد پیش فرمایا۔

(۱) حضرت مولانا سید محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی امیر شریعت اڑیسہ ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔
(۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث وناظم اعلیٰ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند
(۳) راقم الحروف محمد عثمان منصورپوری استاذ وناظم کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند۔
(۴) حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب بلندشہری مفتی دارالعلوم دیوبند
(۵) حضرت مولانا محمد یامین صاحب مظفرنگری، مبلغ دارالعلوم دیوبند
(۶) حضرت مولانا محمد عرفان صاحب بہرائچی مبلغ دارالعلوم دیوبند
(۷) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب امروہوی استاذ جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ
(۸) حضرت مولانا طاہر حسن صاحب ہرسولوی استاذ دارالعلوم حسینیہ تاؤلی۔

(۹) حضرت مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری استاذ دارالعلوم اسلامیہ بستی یوپی

ان حضرات کے مسلسل علمی و روحانی بیانات سے قادیانی گروہ کی فریب کاریوں کا پردہ فاش ہوگیا جو مدعی نبوت ملعون، کذاب، دجال مرزا غلام احمد قادیانی کی پیروی کرکے اپنے لئے ہاویہ (جہنم) میں گرنے کا سامان کر رہا ہے، ساتھ ہی بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ اس ملعون دکذاب کو نہ ماننے کے جرم میں دنیا بھر کے دوارب کے قریب سچے مسلمانوں کو اسلام سے خارج قرار دیتا ہے، اور اس کے برخلاف اپنے کفریات کو حقیقی اسلام کا نام دے کر ناواقف مسلمانوں کو دام فریب میں مبتلا کرتا ہے۔

علمائے ربانی کے بیانات سے بفضلہ تعالیٰ یہ حقیقت ہر مسلمان کے قلب و دماغ میں پیوست ہوگئی اور زبردست ایمانی و اسلامی غیرت پیدا ہوگئی، جس کے نتیجہ میں ہر ایک نے تہیہ کرلیا کہ ہر جگہ قادیانی گروہ کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے گا، اور ان کی ریشہ دوانیوں پر کڑی نظر رکھی جائے گی، اور ان کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنے عبادت گاہ کو مسجد کہیں، اور اپنے مذہبی رسوم کو اسلامی نام سے پکار کر مسلمانوں کو دھوکہ دیں، ذات باری تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ اس کانفرنس کے مفید اثرات پورے ملک پر پڑیں گے، دلی دعا ہے کہ اس پروگرام کی کامیابی کیلئے کسی بھی نوعیت کا ایثار و قربانی کرنے والے شخص کو خداوند کریم بہترین بدلہ دے خصوصًا بارہ پورہ کے صحیح العقیدہ بزرگوں اور نوجوانوں کو کئی سال کی مسلسل تحریک کے بعد اس تاریخی کانفرنس کے انعقاد کی نوبت آئی کیونکہ ان کے بہت سے رشتہ دار قادیانی جال میں پھنس کر مرتد ہوچکے ہیں، اور وہیں مقیم ہیں اور دوسرے مسلم نوجوان کو ورغلاتے رہتے ہیں۔

یہ اس تاریخی کانفرنس و تربیتی کیمپ کی انتہائی مجمل رپورٹ ہے اس کی باضابطہ مفصل رپورٹ عنقریب شائع کی جائے گی۔ انشاء اللہ



جدید مطبوعات

مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی

تعارف وتبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے ضروری ہیں

نام کتاب ــــــ حیات الحیوان الکبریٰ اردو عکسی ایڈیشن

ناشر ــــــ شمس پبلشر، ابوالمعالی (علی مسجد) دیوبند

باہتمام ــــــ محمد عظیم جاوید صدیقی

قیمت عام ــــــ مکمل سیٹ (۳ جلدیں) ۳۰۰/-

انسان جس کائنات میں رہتا ہے بلاشبہ اس کے سب سے قریبی پڑوسی حیوانات ہیں اور یہ حیوانات انسان کی جنس قریب میں شریک ہیں یعنی انسان بھی ایک خاص قسم کا حیوان ہے، اگر فرق ہے تو بس عقل وفہم، دانش وبینش اور نطق وگویائی کا، اسلئے بھلا یہ کیونکر ممکن ہوتا کہ انسان علوم انسانی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت حیوانات کو نہ دیتا۔

چنانچہ حیوانات انسان کی دلچسپی کا موضوع شروع سے ہی رہے ہیں، زمانہ قدیم سے حیوانات سے متعلق علم سے دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، مثلاً

۱:۔ الحیوان الکبیر از: ابن بختیشوع قبل مسیح

۲:۔ کتاب الحیوان از:۔ حکیم دیموقراطس

۳:۔ کتاب الحیوان از:۔ شیخ ارسطو۔ شیخ کی اس کتاب کو ابن بطریق نے یونانی زبان سے عربی میں منتقل کیا

۴:۔ کتاب فی الحیوان الغیر الناطق ۔ از شیخ ارسطو۔

۵:۔ کتاب الحیوان از:۔ ابوعثمان الجاحظ۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر کافی شہرت رکھتی ہے

۶:۔ کتاب الحیوان از:۔ امام ابن ابی اشعث ۔ وغیرہ

مگر جو شہرت اور مقبولیت اپنی گوناگوں اور بوقلموں خصوصیات کی بنا پر علامہ دمیری کی حیات الحیوان الکبریٰ کو حاصل ہوئی اس موضوع پر لکھی گئی کسی کتاب کو نہیں مل سکی۔ یہ کتاب اپنی جامعیت اور عجیب

وغریب موضوعات اور مشتملات کا نادر مرقع ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سے علماء دیوبند کے لئے سامان کشش رہی، اور ہر دور میں اکابر علماء کے مطالعہ میں رہی۔ نادرۂ روزگار محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے درس میں اس کا برابر حوالہ دیتے تھے، سابق شیخ الحدیث دارالعلوم حضرت مولانا سید فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مطالعہ میں بڑے اہتمام سے رہتی تھی نیز دیگر علماء مثلاً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی مہدی حسنؒ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہی مدظلہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند وغیرہم، ان سب کے مطالعہ میں یہ کتاب برابر رہی۔

اس عجیب وغریب کتاب کے تراجم دنیا کے متعدد زبانوں میں کئے گئے مگر اردو زبان میں اس کے مکمل ترجمہ کی اطلاع باوجود تلاش بسیار کے نہ ملی، ضرورت تھی کہ اس زبردست موضوع پر انسائیکلو پیڈیا کتاب کا اردو ترجمہ ہو تاکہ اردو جاننے والوں کے لئے اسکے دلچسپ موضوعات سے استفادہ عام ہو۔

یہ خصوصیت بھی مرکز علم دارالعلوم دیوبند کو حاصل ہوئی کہ اس کے ترجمہ کا آغاز اسی ادارہ کے ایک فاضل مولانا محمد عباس فتحپوری نے کیا موصوف اس وقت دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے آپ کے بعد اس سلسلے کو آگے بڑھایا دوسرے مترجم مولانا محمد عرفان صاحب سردھنوی نے اور اختتام ربیع الاول ۱۴۱۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۹۱ء کو پہونچایا مولانا نثار احمد صاحب گونڈوی نے (فجزاہم اللہ احسن الجزاء)

اب تک یہ کتاب قدیم طرز پر لیتھو سے چھپتی ہے، اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے ہمارے محترم دوست جناب جاوید صاحب مالک شمس پبلشرز کو، آپ نے نہ صرف یہ کہ اس کے ترجمے کو اردو زبان میں مکمل کرا کر پہلی بار مکمل طور پر شائع کیا بلکہ ہندوستان میں پہلی بار خوبصورت انداز پر اس کا عکسی ایڈیشن شائع کر رہے ہیں، بلاشبہ آپ تمام اہل علم کی جانب سے مبارکباد اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔

اس ایڈیشن کی خصوصیت

جیسا کہ معلوم ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں اب تک عربی ناموں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اسی لحاظ سے حروف تہجی

کی ترتیب پر تمام جانوروں کے نام اور ان کی تفصیلات مذکور ہیں، عربی میں اس کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے تو اس میں بیشک سہولت ہے مگر اردو دانوں کے لئے عربی فہرست بالکل بیسود ہے اسلئے ضرورت تھی کہ ان جانوروں کے اردو ناموں کی فہرست بھی مرتب کر دیجائے تاکہ حسب تلاش اور ضرورت بآسانی مطلوبہ جانور تک پہونچنا آسان ہو جائے۔

مگر یہ کام جتنا ضروری تھا اتنا ہی اہم اور دشوار بھی تھا مگر داد دیجئے جناب ناشر جاوید صاحب کو آپ اپنی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات کے باوجود اردو حروف تہجی کے لحاظ سے اس کی فہرست کی ترتیب میں مشغول ہو گئے اور اس کی تکمیل کر دی، آپ دیکھیں گے کہ

(۱) اس میں ہر جانور کا اردو نام حروف تہجی کے اعتبار سے درج ہے (۲) اس کے سامنے اس جلد کی تصریح ہے (۳) اس کا صفحہ نمبر درج ہے جہاں اس کا مضمون ہے (۴) ساتھ ہی ہر جانور کا وہ نمبر بھی درج ہے جو اصل عربی کتاب کی ترتیب سے بنتا ہے۔

مثلاً ——— ج ۱۔ الف کے شروع میں آپ دیکھیں گے

نمبر حیوان	نام حیوان	جلد	صفحات
۲	اونٹ الابل	اول	۹۰ تا ۱۰۱

بہر حال اپنے طرز کا لاجواب اور عظیم معلومات و حقائق کا خزانہ، سیکڑوں جانوروں کے نام اور کیفیتیں، لغوی تشریحات، جانوروں کی عادات خصائل و خصوصیات، قرآن کریم اور احادیث میں ان کے تذکرے اور متعلقہ حوالے، شرعی حلت و حرمت، ضرب الامثال طبی فوائد، خواب کی تعبیر، تذکروں کے ذیل میں تاریخی واقعات اور اشعار و وظائف، تعویذات و عملیات اور دیگر فوائد نادر اور دلچسپ واقعات و معلومات، اسلامی کتب میں موضوع کی ندرت کے اعتبار سے عظیم شاہکار کتاب، بیش بہا اور جدید سائنسی و عمومی حواشی اور تحقیقی مقدمات کے ساتھ علامہ کمال الدین دمیری م ۸۰۸ھ کی یہ شہرۂ آفاق کتاب مکمل اردو ترجمہ اور عکسی طباعت مضبوط جلد اور خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے ——— یہ کتاب اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ہر کتب خانہ ہر لائبریری بلکہ ہر پڑھے لکھے آدمی کے مطالعے میں رہنے کے قابل ہے، طابع اور ناشر بجا طور پر اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مسجد جدید دارالعلوم دیوبند

جو اپنی تکمیل کیلئے اہل خیر حضرات کی توجہات کی منتظر ہے

دارالعلوم دیوبند کے ہمدردان ومعاونین حضرات کو جیسا کہ معلوم ہے کہ تقریباً چار سال ہوئے طلبہ کی کثرت تعداد کی بنا پر دارالعلوم میں ایک بڑی جدید مسجد کا کام اللہ تعالیٰ کے فضل پر توکل کرتے ہوئے دارالعلوم سے متصل ایک اراضی خرید کر شروع کر دیا تھا۔

الحمد للہ مسجد کا تعمیری کام بہت آگے بڑھ گیا ہے اور اس وقت فضل خداوندی اور اہل خیر حضرات کی توجہ سے تیسری منزل پر تعمیری کام جاری ہے، اس مسجد سے طلبۂ دارالعلوم اور دیگر مسلمانوں کے لئے ایک وقت میں مسقف (چھت والے) حصہ میں جہاں چار ہزار نمازیوں کے لئے جگہ ہو جائے گی وہیں اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی طرف سے ایک صدقۂ جاریہ ہوگا اور وہ انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد تعمیر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر عطا فرمائیں گے۔

تعمیری کام جاری رکھنے کیلئے اس وقت سرمایہ کی شدید ضرورت ہے

اس لئے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس مسجد کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ یہ مسجد دارالعلوم کے شایان شان جلد تعمیر ہو سکے۔

پتہ

ڈرافٹ و چیک کیلئے] دارالعلوم دیوبند
اکاونٹ نمبر 30076
اسٹیٹ بینک آف انڈیا، دیوبند

منی آرڈر کیلئے] (حضرت مولانا) مرغوب الرحمن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
پن کوڈ نمبر ۲۴۷۵۵۴

(B)

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

Phone: 2429
Code: 0136

Pin: 24755



ماہ جمادی الثانی ۱۴۱۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۹۳ء

شمارہ نمبر ۱۲
جلد نمبر ۷۸
فی شمارہ =/۶
سالانہ =/۶۰

نگراں: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر: مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

یہاں اگر سرخ نشان لگا ہوا ہے تو
اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی
مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہے

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ =/۲۵۰ روپے
پاکستان سے ہندوستانی رقم =/۱۰۰ "
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم =/۸۰ "

(ترسیل زر کا پتہ:- دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، یوپی)

فہرست

ختم خریداری کی اطلاع

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے اس لئے وی، پی میں صرفہ زائد ہوگا
- پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤد والا براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- بنگلہ دیشی حضرات مولانا محمد انیس الرحمٰن سفیر دارالعلوم دیوبند معرفت مفتی شفیق الاسلام قاسمی مالی باغ جامعہ پوسٹ کھیل گاؤں ڈھاکہ ۱۲۱۹ کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

منیجر



ہر قوم اور ملت کا اپنا ایک مخصوص معاشرتی نظام اور اپنی ایک منفرد تہذیب ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی قومی شناخت اور ملی تشخص قائم رہتا ہے اور اس کا معاشرہ شکست و ریخت اور دوسری تہذیبوں میں جذب ہونے سے محفوظ رہتا ہے، البتہ دیگر اقوام و مذاہب کے معاشرتی آئین بالعموم خود ان کے اپنے وضع کردہ عادات و رسوم پر مشتمل ہوتے ہیں جنکا مذہب سے تعلق برائے نام ہوتا ہے جب کہ مسلمانوں کا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ عبادات و معاملات وغیرہ کی طرح اسلامی نظام معاشرت بھی اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہدایات پر مبنی ہیں اس لئے کہ اسلام میں قانون سازی کا حق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے زندگی کے تمام شعبوں میں خدائے واحد ہی کے احکام و قوانین کی عملداری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا صاف اعلان ہے "الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العلمین" (اعراف) یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا، اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں والے ہیں اللہ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

اس سلسلے میں اپنے رسول کو یہ ہدایت دی ہے۔

ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لایعلمون

پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا لہذا آپ اسی طریقہ پر چلیں، اور ان

(حاشیہ) جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلیں

قانون الٰہی کے اساسی مجموعہ قرآن کے مقصد نزول کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰہ (نساء)

بیشک ہم نے آپ کے پاس یہ قرآن بھیجا ہے واقع کے موافق تاکہ آپ اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو بتایا ہے۔

احکام خداوند کو نظر انداز کرنے والوں کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الظالمون (مائدہ)

اور جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے احکام و قوانین کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں

ان آیات قرآنیہ سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) تشریع اور قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے (۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان قوانین کا نفاذ فرماتے ہیں (۳) خدا کے مقرر کردہ احکام میں کسی کو تغیر و تبدل کا حق و اختیار نہیں ہے ایسا کرنے والے اللہ کے نزدیک منکر، ستمگار اور نافرمان ہیں۔

اسلام کا یہ نقطۂ نظر اتنا واضح اور روشن ہے کہ مستشرقین بھی اس سے چشم پوشی نہیں کرسکے اور انھیں اس کا اعتراف کرنا پڑا، چنانچہ مشہور مستشرق "کولسن" اقرار کرتا ہے کہ اسلام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد قانون ساز ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسی کے احکام کا غلبہ ہے" (اے ہسٹری آف اسلامک لا، کولسن ۱۲۰)

فنز جیرالڈ بھی اسے تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکا، وہ لکھتا ہے "اسلام اللہ تعالیٰ کو واحد قانون ساز و صاحب تشریع قرار دیتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ کسی کو بھی اس کا شریک نہیں گردانتا۔

(دی الیجڈ ڈٹ آف اسلامک ٹورومن فنز جیرالڈ ص ۸۲ ج ۶۸)

گوائے ٹائن مستشرق کو بھی اعتراف ہے کہ دقیق قانونی معاملات بھی دین سے مربوط ہیں بلکہ وہ وحی الٰہی کا ناقابل تقسیم حصہ ہیں، شریعت ایسے عصری تقاضوں کا مجموعہ نہیں ہے جو قرآن اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مرتب ہوئے ہوں بلکہ اسلامی معاشرہ میں ان کا باضابطہ نفاذ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زندگی میں کیا۔ (اسٹڈیز ان اسلامک ہسٹری، گوائے ٹائن ص ۱۲۹) [1]

---

[1] مستشرقین کے تینوں حوالے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ سے ماخوذ ہیں۔

آئیے اب دستورِ ہند پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں اور دیکھیں کہ سیکولر ہندوستان میں بسنے والی اکائیوں کو وہ کیا حقوق دیتا ہے، اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ دستورِ ہند کی دفعہ ۲۵ میں یہاں کے ہر شہری کو کسی بھی مذہب کو قبول کرنے، اس پر قائم رہنے اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ اور پرچار کرنے کا حق دیا گیا ہے، دفعہ ۲۶ کی رو سے مسلمانانِ ہند جداگانہ ایک مذہبی گروہ قرار پاتے ہیں اور انھیں اپنے مذہبی امور کے منظم کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، دفعہ ۲۹ مسلمانوں کو اپنے کلچر، زبان اور رسم الخط کے تحفظ کا حق اور اختیار دیتی ہے، اور دفعہ ۳۰ کے تحت انھیں تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام سنبھالنے کا حق ملتا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوچکا ہے کہ مسلمان اپنی کمیونٹی اور انفرادیت کی بقا اور جداگانہ شناخت کیلئے جن عناصر کو تسلیم کرتے ہیں وہ ان کا عالمگیر مذہب، ان کی چودہ سوسالہ قدیم تہذیب اور مخصوص معاشرتی اقدار ہیں اسلئے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

(۱) کیا یکساں سول کوڈ کے نظریہ کو پیش کرنے والے آئینِ ہند کے حق میں وفادار ہیں ؟

(۲) کیا سول کوڈ کے نفاذ کے بعد ہندوستان کی سیکولر حیثیت محفوظ رہ جائے گی۔؟

(۳) کیا مسلمان مسلمان رہتے ہوئے اس نظریہ کو قبول کرسکتے ہیں۔؟

(۴) کیا مسلمانوں کو مذہبی طور پر یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اسلام کے پیش کردہ معاشرتی نظام کے مقابلے میں کسی اور نظام کو اختیار کریں ؟

(۵) کیا اس نظریہ کو قبول کرلینے اور اپنی زندگی میں نافذ کرلینے کے بعد مسلمانوں کی علاحدہ شناخت اور ان کا ملی تشخص باقی بچے گا۔ ؟

امید ہے کہ ان سوالات پر علمائے امت، دانشورانِ قوم اور ملکی وسیاسی رہنما بالخصوص حکومت میں دخیل اصحابِ فکر ورائے ہر قسم کے سیاسی، مذہبی اور قومی تعصب اور جنبہ داری سے بلند ہوکر بالغ نظری کے ساتھ غور وخوض کریں گے۔



مقدمہ

الخلیفۃ المہدی فی الاحادیث الصحیحۃ

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی ایک غیر مطبوعہ نادر علمی تالیف

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی اصحابہ اجمعین۔ اما بعد:-

قیامت ایک امر غیبی ہے جس کا حقیقی علم بجز خدائے عالم الغیب کے کسی کو نہیں ہے قرآن مجید ناطق ہے "اِنَّ اللہ عندہ علم الساعۃ" اللہ تعالیٰ ہی کو قیامت کا علم ہے، ایک دوسرے موقع پر ارشاد الٰہی ہے یسئلونک عن الساعۃ ایان مرسٰھا فیم انت من ذکرٰھا الیٰ ربک منتھٰھا، آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں وہ کب آئے گی، آپ کو اس کے ذکر سے کیا کام اس کے علم کا منتہیٰ تو آپ کے رب کے پاس ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے بھی یہی ثابت ہے کہ قیامت کے وقوع کا علم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں تھا، حدیث جبرئیل میں ہے فاخبرنی عن الساعۃ، قال ما المسئول عنھا باعلم من السائل۔ (مشکوٰۃ ص ۱۱) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے چوتھا سوال کیا، اچھا مجھے قیامت کے وقتِ وقوع کی خبر دیجئے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: اس کے بارے میں مسئول (پوچھا جانے والا) سائل (پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت وقوع کے نہ جاننے میں ہم دونوں برابر ہیں۔

البتہ اس کی کچھ علامتیں ہیں جنھیں بطور پیشین گوئی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، ان میں بعض علامتیں صغریٰ یعنی چھوٹی علامت کہلاتی ہیں، جو معمول و عادت کے مطابق ظہور

پذیر ہوتی رہیں گی، ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے. مثلاً حدیث جبرئیل ہی میں پانچویں سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی جن علامتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ علامتِ صغریٰ ہی کے قبیل سے ہیں، حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں

"قال فاخبرني عن اماراتها. اس کی کچھ علامتیں بتایئے، قال ان تلد الامة ربتها وان ترى الحفاة العراة العالة رعاة الشاة يتطاولون في البنيان۔ لونڈیاں اپنی مالکہ کو جننے لگیں یعنی لڑکیاں اپنی ماؤں پر حکم چلانے لگیں، اور ننگے پیر، ننگے بدن، تنگدست، بکریوں کے چرواہوں کو تو دیکھے کہ عالی شان مکانات پر شیخی بگھار رہے ہیں تو سمجھ لو کہ اب قیامت کا زمانہ قریب آگیا ہے۔

اسی طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل فرمان میں جن علامتوں کا ذکر ہے ان کا تعلق بھی علامت صغریٰ سے ہے ان من اشراط الساعة ان يقل العلم ويكثر الجهل ويفشو الزنا ويشرب الخمر ويقل الرجال ويكثر النساء حتى يكون لخمسين امرأة القيم الواحد۔ (بخاری کتاب العلم)

قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ علم کم ہو جائے گا، جہالت بڑھ جائے گی، حرام کاری عام ہوگی، شراب نوشی بہت ہوگی مرد کم ہو جائیں گے اور عورتوں کی اس حد تک کثرت ہوگی کہ پچاس عورتوں پر صرف فرد واحد نگراں ہوگا۔

ان مذکورہ علامتوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے ظہور کے بعد قیامت بالکل قریب آجائیگی بلکہ یہ مطلب ہے کہ قیامت سے پہلے ان کا وجود میں آنا ضروری ہے اسی لئے بہت سے واقعات وحوادث کے بارے میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت اس وقت تک برپا نہیں ہوگی جب تک یہ واقعات ظہور پذیر نہ ہو جائیں خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی علامتِ قیامت میں شمار کی جاتی ہے حالانکہ آپ کی بعثت کو چودہ سو سال ہو چکے ہیں اور خدا جانے ابھی کتنی مدت کے بعد قیامت قائم ہوگی۔

ان کے علاوہ بعض علامتیں وہ ہیں جنھیں علامتِ کبریٰ کہا جاتا ہے یہ علامتیں بالعموم قیامت کے قریب تر زمانہ میں پے بہ پے ظاہر ہونگی اور عادت ومعمول کے خلاف ہونگی۔ ان علامتوں کا ذکر بھی

بہت سی حدیثوں میں متفرق طور پر موجود ہے اور حضرت حذیفہ بن اُسید الغفاری کی ایک روایت میں اکٹھی دس علامتوں کا بیان ہے۔ حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں۔

اطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم علینا ونحن نتذاکر فقال ماتذ کرون؟ قالوا نذکر الساعۃ قال انہا لن تقوم حتی تروا قبلہا عشر آیات فذکر الدخان و الدجال، و الدابۃ وطلوع الشمس من مغربہا ونزول عیسیٰ ابن مریم ویاجوج وماجوج وثلاثۃ خسوف خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزیرۃ العرب و آخر ذالک نار تخرج من الیمن تطرد الناس الی محشرھم۔

(مسلم باب الفتن واشراط الساعۃ ص۳۹۳ ج ۲)

حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالاخانہ سے ہماری طرف نمودار ہوئے اور ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تم لوگ کس چیز کا تذکرہ کر رہے ہو لوگوں نے عرض کیا قیامت کا آپ نے فرمایا قیامت برپا نہیں ہوگی تاوقتیکہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو پھر آپ نے ان دسوں کو بیان کیا جو یہ ہیں (۱) دھواں (۲) دجال (۳) دابۃ الارض (۴) پچھم سے سورج کا نکلنا (۵) حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا آسمان سے اترنا (۶) یاجوج ماجوج کا نکلنا (۷، ۸، ۹) زمین میں تین مقامات میں لوگوں کا دھنس جانا ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں اور تیسرا عرب میں (۱۰) اور ان سب کے آخر میں آگ یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو گھیر کر انکے محشر میں پہنچا دے گی۔

قیامت کی علامت کبریٰ ہی میں سے مہدی آخر الزماں کا ظہور ان کی خلافت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان کی اقتداء میں ایک نماز یعنی فجر کا پڑھنا وغیرہ بھی ہے۔ اوپر بحوالۂ حدیث جن دس نشانیوں کا ذکر ہے ان سے پہلے حضرت امام مہدی کا ظہور ہوگا چنانچہ امام السفارینی لکھتے ہیں۔

ای من العلامات العظمیٰ وھی اولہا ان یظہر الامام المقتدیٰ الخاتم للائمۃ ..... محمد المھدی (اللہ اعلم وانزالبشؓ) قیامت کی بڑی یعنی قریب تر اور اولین نشانیوں میں خاتم الائمۃ محمد مہدی کا ظہور ہے۔

بخاری میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کو غزوۂ تبوک کے موقع پر قیامت کی چھ نشانیاں بتائیں جن میں بنی الاصفر یعنی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلح ہو جانے کا

بھی تذکرہ فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ عیسائی بدعہدی کر کے تمہارے مقابلے میں آئیں گے اس وقت ان کے اسّی جھنڈے ہونگے اور ہر جھنڈے کے تحت بارہ ہزار سپاہی ہونگے یعنی انکی مجموعی تعداد نو لاکھ ہوگی۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمان ہر طرف سے گھر جائیں گے اور ان کی حکومت صرف مدینہ منورہ سے خیبر تک رہ جائے گی تو مسلمان مایوس ہو کر امام مہدی کی تلاش شروع کر دیں گے۔ اس وقت وہ مدینہ منورہ میں ہونگے اور امامت کے بارگراں سے بچنے کی غرض سے مکہ مکرمہ چلے جائیں گے مکہ کے لوگ انہیں پہچان لیں گے اور انکار کے باوجود ان سے بیعت خلافت کر لیں گے۔ خلافت کی خبر جب مشہور ہوگی تو ملک شام سے ایک لشکر آپ سے مقابلہ کے لئے نکلے گا مگر اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی مقام بیداء میں جو مکہ و مدینہ کے درمیان ہے زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ اس واقعہ کی اطلاع پاکر شام کے ابدال اور عراق کے متقی لوگ حضرت مہدی کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ سے جنگ کے لئے ایک قریشی النسل بنو کلب پر مشتمل ایک لشکر بھیجے گا جس سے حضرت مہدی کی فوج جنگ کرے گی اور فتحیاب ہوگی۔

احادیث میں امام مہدی کا نام ولدیت، حلیہ وغیرہ بھی بیان کیا گیا ہے نیز ان کے زمانۂ خلافت میں عدل و انصاف کی ہمہ گیری اور مال و دولت کی فراوانی کا تذکرہ بھی ہے۔ غرضیکہ امام مہدی کے متعلق اس کثرت سے احادیث مروی ہیں کہ اصول محدثین کے اعتبار سے وہ حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔ چنانچہ امام ابوالحسین محمد بن حسین الآبری السجزی الحافظ المتوفی ۳۶۳ھ اپنی کتاب مناقب الشافعی میں لکھتے ہیں۔

وقد تواترت الاخبار واستفاضت بكثرة رواتها عن المصطفى صلى الله عليه وسلم في المهدي وانه من اهل بيته وانه يملك سبع سنين ويملاء الارض عدلا وان عيسى عليه الصلوة والسلام يخرج فيساعده على قتل الدجال وانه يوم هذه الامة وعيسى خلفه، في طول من قصته وامره (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۱۲۶ فی ضمن ترجمۃ محمد بن خالد الجنبلی المؤذن)

امام مہدی سے متعلق مروی روایتیں اپنے راویوں کی کثرت کی بنا پر تواتر اور شہرت عام کے درجہ میں پہنچ گئی ہیں کہ وہ بیت رسول سے ہوں گے اور سات سال تک دنیا میں حکومت کریں گے اور

اپنے عدل و انصاف سے دنیا کو معمور کر دیں گے، اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہو کر قتل دجال میں ان کی مساعدت اور نصرت کریں گے اور اس امت میں مہدی ہی کی امامت میں عیسیٰ علیہ السلام (ایک) نماز ادا کریں گے وغیرہ، طویل واقعات ان کے سلسلے میں احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔

حافظ آبری کے اس قول کو حافظ ابن القیم نے المنار المنیف میں اور شیخ محمد بن احمد سفارینی نے اپنی مشہور کتاب لوائح الانوار البہیہ میں علامہ مرعی بن یوسف الکرمی کی کتاب فوائد الفکر کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام القرطبی صاحب الجامع لاحکام القرآن نے بھی التذکرۃ فی احوال الموتی وامور الآخرۃ میں اسے نقل کیا ہے۔

شیخ محمد البرزنجی المدنی المتوفی ۱۱۰۳ھ الاشاعۃ لاشراط الساعۃ ص ۱۱۲ پر لکھتے ہیں۔

وقد علمت ان احادیث المهدی وخروجه آخر الزمان وانه من عترة رسول الله صلی الله علیه وسلم من ولد فاطمة رضی الله عنها بلغت حد التواتر المعنوی فلا معنی لانکارها،

محقق طور پر معلوم ہے کہ مہدی سے متعلق احادیث کہ آخری زمانہ میں ان کا ظہور ہوگا، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل اور فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد میں ہوں گے، تواتر معنوی کی حد کو پہنچی ہوئی ہیں لہذا ان کے انکار کی کوئی وجہ اور بنیاد نہیں ہے۔

امام سفارینی کا بیان ہے۔

قد کثرت الاقوال فی المهدی حتی قیل لا مهدی الا عیسی والصواب الذی علیه اهل الحق ان المهدی غیر عیسی وانه یخرج قبل نزول عیسی علیه السلام وقد کثرت بخروجه الروایات حتی بلغت حد التواتر المعنوی وشاع ذلك بین علماء السنة حتی عد من معتقداتهم (لوائح الانوار البهیه ص۸۰)

حضرت مہدی کے بارے میں بہت سارے اقوال ہیں حتی کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ہی مہدی ہیں اور صحیح بات جس پر اہل حق ہیں، یہ ہے کہ مہدی کی شخصیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے الگ ہے، ان کا ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے پہلے

ہوگا، ظہور مہدی سے متعلق روایات اتنی زیادہ ہیں کہ تواتر معنوی کی حد کو پہونچ گئی ہیں اور علماء اہل سنت کے درمیان اس درجہ عام اور شائع ہوگئی ہیں کہ ظہور مہدی کا ماننا اہل سُنت والجماعت کے عقائد میں شمار ہوتا ہے

حضرت جابر، حذیفہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے منقول روایتوں کے ذکر اور نشاندہی کے بعد لکھتے ہیں۔

وقد روی عمن ذکر من الصحابة وغیر ما ذکر منهم رضی الله عنهم روایات متعددة وعن التابعین من بعدهم مایفید مجموعه العلم القطعی فالایمان بخروج المهدی واجب کما هو مقرر عند اهل العلم ومدون فی عقائد اهل السنة والجماعة۔ (ایضاً ص ۲۷)

اور مذکور حضرات صحابہ اور ان کے علاوہ دیگر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ان کے بعد تابعین سے اس قدر روایتیں مروی ہیں کہ ان سے علم قطعی حاصل ہوجاتا ہے، لہذا ظہور مہدی پر ایمان لانا واجب ہے چنانچہ یہ امر اہل علم کے نزدیک ثابت شدہ ہے اور اہلسنت والجماعت کے عقائد میں مدوّن و مرتب ہے۔

یہی بات شیخ الحسن بن علی البربہاری الحنبلی المتوفی ۳۲۹ھ نے بھی اپنے عقیدہ میں لکھی ہے عقیدۃ البربہاری کو ابن ابی یعلی نے طبقات الحنابلہ میں شیخ البربہاری کے ترجمہ میں مکمل نقل کردیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی المتوفی ۱۳۰۷ھ اپنی تالیف الاذاعہ لما کان ویکون بین یدی الساعۃ: میں صراحت کرتے ہیں۔

والاحادیث الواردة فی المهدی علی اختلاف روایاتها کثیرة جداً تبلغ حد التواتر وهی فی السنن وغیرها من دواوین الاسلام من المعاجم والمسانید (ص ۱۱۲)

امام مہدی سے متعلق مختلف راویوں سے مروی روایتیں بہت زیادہ ہیں جو حد تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں، یہ حدیثیں، سنن، معاجم، مسانید وغیرہ اسلامی دفتروں میں موجود ہیں۔

اسی کتاب کے ص ۱۲۵ میں لکھتے ہیں۔

"لاشك ان المهدی يخرج فی آخر الزمان من غير تعيين لشهر وعام لما تواتر من الاخبار فی الباب واتفق عليه جمهور الائمة خلفا عن سلف الامن لا يعتد بخلافه"

اس میں ادنیٰ شک نہیں ہے کہ آخری زمانہ میں ماہ و سال کی تعیین کے بغیر امام مہدی کا ظہور ہوگا کیونکہ اس باب میں احادیث متواتر ہیں اور سلف سے خلف تک جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے، البتہ بعض ایسے لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے جن کے اختلاف کا اہل علم کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں۔

علامہ محمد بن جعفر الکتانی المتوفی ۱۳۴۵ھ اپنی مشہور تصنیف نظم المتناثر من الحدیث المتواتر میں رقم طراز ہیں۔

وتتبع ابن خلدون فی مقدمته طرق احاديث خروجه مستوعبا علی حسب وسعه فلم تسلم له من علة لكن ردوا عليه بان الاحاديث الواردة فيه علی اختلاف رواتها كثيرة جدا تبلغ حد التواتر وهی عند احمد والترمذی وابی داؤد وابن ماجه والحاكم والطبرانی وابی يعلی الموصلی والبزار وغيرهم من دواوين الاسلام من السنن والمعاجم والمسانيد واسندوها الی جماعة من الصحابة فانكارها مع ذالك مما لا ينبغی، ص ۱۴۵۔

مشہور فیلسوف مورخ علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اپنی وسعت علمی کے مطابق جملہ طرق احادیث کی تخریج کے استیعاب کی کوشش کی ہے اور نتیجۃً ان کے نزدیک کوئی حدیث علّت سے خالی نہیں ہے، لیکن محدثین نے علامہ ابن خلدون کے اس خیال کو رد کر دیا ہے کیونکہ امام مہدی کے بارے میں وارد احادیث اپنے راویوں کے مختلف ہونے کے باوجود بہت زیادہ ہیں جو حد تواتر کو پہونچ گئی ہیں جنھیں امام احمد بن حنبل، امام ابو داؤد، امام ابن ماجہ، امام حاکم، امام طبرانی امام ابو یعلی موصلی امام بزار وغیرہ نے دواوین اسلام یعنی سنن، معاجم، مسانید میں روایت کیا ہے اور ان احادیث کو صحابہ کی ایک جماعت کی جانب منسوب کیا ہے، لہٰذا ان امور کے ہوتے ہوئے ان کا انکار کسی طرح مناسب و درست نہیں ہے۔

امام مہدی سے متعلق جن حضرات صحابہ سے حدیثیں منقول ہیں ان میں حسب ذیل اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم شامل ہیں، خلیفہ راشد حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ راشد حضرت علی مرتضیٰ رضؓ

طلحہ بن عبید اللہ، عبد الرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو، عبداللہ ابن عباس، ام المومنین ام سلمہ، ام المومنین ام حبیبہ، ابو ہریرہ، ابوسعید خدری، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، عمران بن حصین، حذیفہ بن یمان، عمار بن یاسر، جابر بن ماجد صدفی، ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عوف بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین۔

علامہ ابن خلدون اگرچہ فن تاریخ اور علم الاجتماع میں بلند مقام و مرتبہ کے مالک ہیں لیکن محدث نہیں تھے اس لئے اس باب میں ان کی بات علمائے حدیث اور ارباب جرح و تعدیل کے مقابلہ میں لائق قبول نہیں ہے، چنانچہ علامہ محمد بن جعفر الکتانی مزید لکھتے ہیں۔

"ولولا مخافۃ التطویل لاوردت ھٰھنا ما وقفت علیہ من احادیثہ لانی رأیت الکثیر من الناس فی ھذا الوقت یتشککون فی امرہ ویقولون یا تری ھل احادیثہ قطعیۃ ام لا وکثیر منھم یقف مع کلام ابن خلدون ویعتمدہ مع انہ لیس من اھل ھذا المیدان والحق الرجوع فی کل فن لاربابہ" نظم المتناثر من الحدیث المتواتر ص۱۴۶)

اگر کتاب کے دراز ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس موقع پر امام مہدی سے متعلق ان احادیث کو درج کرتا جن کی مجھے واقفیت ہے کیونکہ اس وقت بہت سارے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ انھیں امام مہدی کے امر میں تردد ہے اور اس سلسلے میں وہ یقینی معلومات کے متلاشی ہیں اور دیگر بہت سے لوگ ابن خلدون کے قول پر قائم اور اسی پر اعتماد کرتے ہیں، جبکہ ابن خلدون اس میدان کے آدمی نہیں تھے، اور حق تو یہ ہے کہ ہر فن میں اس فن کے ماہرین کی جانب رجوع کیا جائے۔

ان ساری تفصیلات سے یہ بات روز روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ امام مہدی سے متعلق احادیث نہ صرف صحیح و ثابت ہیں بلکہ متواتر اور اپنے مدلول پر قطعی الدلالت ہیں، جن پر ایمان لانا بحسب تصریح علامہ سفارینی واجب اور ضروری ہے اسی بنا پر ظہور مہدی کا مسئلہ اہل سنت والجماعت کے عقائد میں شمار ہوتا ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ اسلام کے اہم ترین و بنیادی عقائد میں داخل نہیں ہے، مسئلہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہر دور کے محدثین و اکابر علماء نے مسئلہ مہدی پر ضمناً و مستقلاً شرح و بسط کے ساتھ مدلل کلام کیا ہے، جن میں

سے بہت سی کتابوں کی نشاندہی خود علامہ ابن خلدون نے بھی مقدمہ میں کی ہے۔
اسی طرح علماء حدیث اور ماہرین نے اس مسئلہ سے متعلق ابن خلدون کے نظریہ کی پرزور تردید کی ہے اور اصول محدثین کی روشنی میں علامہ ابن خلدون کے ظاہر کردہ اشکالات کو دور کرکے ظہور مہدی کی حقیقت اور سچائی کو پورے طور پر واضح کردیا ہے، علمائے امت کی ان مساعی جمیلہ کے باوجود ہر دور میں ایک ایسا طبقہ موجود رہا ہے جو علامہ ابن خلدون کے بیان کردہ اشکالات سے متاثر ہوکر ظہور مہدی کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا رہا۔ اس لئے علمائے دین بھی اپنے اپنے عہد میں حسب ضرورت تحریراً و تقریراً اس مسئلہ کی وضاحت کرتے رہے۔
حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ نے بھی اسی مقصد کے تحت یہ زیر نظر رسالہ مرتب کیا تھا، چنانچہ اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

انه قد جرى ببعض الأندية العلم ذكر المهدى الموعود فانكر بعض الفضلاء الكاملين صحة الاحاديث الواردة فيه فاحببت ان اجمع الاحاديث الصحيحة فى هذا الباب و اترك الحسان و الضعاف رجاء انتفاع الناس وتبليغ ما اتى به النبى عليه السلام ان لا يغتر الناس بكلام بعض المصنفين الذين لا المام لهم بعلم الحديث كابن خلدون وغيره فانهم وان كانوا من المعتمدين فى التاريخ وامثاله فلا اعتداد لهم فى علم الحديث الخ (ص۱)

بعض مجالس علمیہ میں مہدی موعود کا ذکر آیا تو کچھ ماہرین علم نے مہدی موعود سے متعلق وارد حدیثوں کی صحت کا انکار کیا تو مجھے یہ بات اچھی لگی کہ اس موضوع سے متعلق مروی حسن وضعیف روایتوں سے قطع نظر صحیح حدیثوں کو جمع کردوں تاکہ لوگ اس سے نفع اٹھائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تبلیغ بھی ہوجائے نیز ان حدیثوں کے جمع و تدوین سے ایک غرض یہ بھی ہے کہ بعض ان مصنفین کے کلام سے لوگ دھوکا نہ کھائیں جنھیں علم حدیث سے لگاؤ نہیں ہے جیسے علامہ ابن خلدون وغیرہ یہ حضرات اگرچہ فن تاریخ میں معتمد و مستند ہیں لیکن علم حدیث میں ان کے قول کا اعتبار نہیں ہے۔
حضرت شیخ الاسلام نے اپنے اس رسالہ میں بطور خاص اسی بات کا التزام فرمایا ہے کہ جن

صحیح احادیث پر علامہ ابن خلدون نے کلام کر کے ان کی صحت کو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جرح و تعدیل سے متعلق ائمہ حدیث کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں ان کی صحت و حجیت کو مدلل و مبرہن کر دیا ہے، اس اعتبار سے یہ رسالہ ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت کا حامل ہے اور اس موضوع پر لکھی گئی ضخیم کتابوں سے بھی زیادہ مفید ہے۔

کچھ باتیں کتاب کے متعلق

آج سے دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک دن بیٹھا ماہنامہ الرشید ساہیوال کا خصوصی شمارہ مدنی و اقبال نمبر دیکھ رہا تھا، اس میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے غیر مطبوعہ مکاتیب کا ایک مختصر سا مجموعہ مرتبہ جناب محمد دین شوق صاحب بعنوان "مکتوبات مدنیہ" بھی شریک اشاعت ہے (جسے بعد میں الگ سے بھی پاکستان کے ایک مکتبہ نے شائع کر دیا ہے) اس مجموعہ کا تیسرا مکتوب جو ڈربن افریقہ کے کسی صاحب کے جواب میں ۲۲ صفر ۱۳۵۳ھ کو لکھا گیا ہے اس میں امام مہدی آخرالزماں کے بارے میں حضرت شیخ الاسلام تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت امام مہدی قیامت سے پہلے بلکہ نزول عیسیٰ علیہ السلام اور خروج دجال و فتنۂ یاجوج و ماجوج و دابۃ الارض و طلوع شمس من المغرب وغیرہ سے پہلے ظاہر ہوں گے، قیامت میں تو تمام انبیاء اور اولیاء کا اجتماع ہوگا، حضرت مہدی دنیا میں مذہب اسلام کی زندگی اور اس کی تقویت کے باعث ہوں گے وہ اس وقت میں ظہور فرمائیں گے جب دنیا ظلم و ستم سے بھر گئی ہوگی ان کی وجہ سے دنیا عدل و انصاف دین و ایمان سے بھر جائے گی، ان کا اور ان کے باپ کا نام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپ کے والد ماجد[1] کے نام کے مطابق ہوگا، صورت بھی آپ کی صورت کے مشابہ ہوگی، آپ ہی کی اولاد سے ہوں گے یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسل میں سے۔

مکہ معظمہ میں ظاہر ہوں گے اول جو جماعت ان کے ہاتھ پر بیعت کرے گی وہ تین سو تیرہ آدمی ہوں گے، حسب[2] عدد اصحاب بدر و اصحاب طالوت، لوگوں میں یکبارگی انقلاب پیدا ہوگا، حجاز کی

---

[1] کتابت کی غلطی سے مدنی و اقبال نمبر میں "آپ کے والد ماجد" کی بجائے آپ کی والدہ ماجدہ ہے [2] مدنی و اقبال نمبر میں حسب وعدہ ہے جو تصحیح ... کتابت کی غلطی ہے۔

اصلاح کے بعد سیریہ اور فلسطین وغیرہ کی اصلاح کریں گے دارالسلطنت بیت المقدس ہوگا، ان کی حکومت پانچ یا سات یا نو برس ہوگی، اس بارہ میں صحیح روایتیں تقریباً چالیس میری نظر سے گذری ہیں اور حسن وضعیف بہت زیادہ ہیں، ترمذی شریف، مستدرک حاکم، ابوداؤد، مسلم شریف وغیرہ میں یہ روایات موجود ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر قیامت آنے میں صرف ایک دن باقی رہ جائے گا جب بھی اللہ تعالیٰ مہدی کو ضرور ظاہر کرے گا، اور قیامت ان کے بعد لائے گا، لہذا اس میں بجز تسلیم کے کوئی چارہ نہیں بہت سے جھوٹوں نے اب تک مہدی ہونے کا دعوی کیا مگر کسی میں یہ علامتیں نہیں پائی گئیں جو مہدی موعود کے متعلق ذکر کی گئی ہیں۔

میں نے مالٹا جانے سے پہلے مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں تلاش کرکے صحیح صحیح روایتیں جمع کی تھیں مگر افسوس کہ وہ رسالہ روسی انقلاب میں جاتا رہا، اب میرے پاس وہ نہیں رہا اور جن لوگوں نے اس کو نقل کیا تھا وہ بھی وفات پاگئے اور رسالہ پھر مل نہ سکا[1]"

اس مکتوب سے پہلے نہ کسی سے سنا تھا اور نہ ہی کسی تحریر میں دیکھا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی اس موضوع پر کوئی تالیف ہے، اس لئے فطری طور پر اس نئے انکشاف پر بے حد مسرت ہوئی اور ساتھ ہی دل میں یہ خواہش بھی مچلنے لگی کہ اے کاش کسی طرح یہ قیمتی رسالہ دستیاب ہوجاتا تو اسے شائع کردیا جاتا، لیکن حضرت کے اس آخری جملے سے "کہ اب میرے پاس وہ نہیں رہا . . . . . اور رسالہ پھر مل نہ سکا" ایک طرح کی مایوسی طاری ہوجاتی، اسی بیم ورجہ اور امیدی نا امیدی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس درمکنون کی طلب وتحصیل کی تدبیریں سوچنے لگا، ایک دن اچانک دل میں یہ بات آئی کہ اس انقلاب میں حضرت کا سارا اثاثہ حکومت نے ضبط کرلیا تھا، اس لئے ممکن ہے کہ اس ضبطی کے بعد آپ کی کتابیں اور دیگر کاغذات کسی سرکاری کتب خانے میں جمع کردیئے گئے ہوں اس موہوم خیال نے دھیرے دھیرے جڑ پکڑ لی، اور نا امیدی پر امید کا غلبہ ہوگیا، بالآخر اس خیال کا اظہار اپنے لائق صد احترام اور مشفق مہربان رفیق بلکہ بزرگ صاحبزادۂ محترم مولانا سید ارشد مدنی اعلی اللہ مراتبہ سے کیا اور ان سے عرض کیا کہ حرمین شریفین کے سفر میں اہم سرکاری کتب خانوں میں پتہ لگائیں عین ممکن ہے کہ کہیں یہ گمشدہ رسالہ

---

[1] ماہنامہ الرشید ساہیوال مدنی واقبال نمبر ص ۳۴۸ مطبوعہ ۱۳۹۸ھ۔

ملجائے، چونکہ مولانا موصوف کو حضرت شیخ قدس سرہ کے بعض تلامذہ کے ذریعہ یہ بات پہونچی تھی کہ دوران درس حضرت نے اس رسالہ کا تذکرہ فرمایا تھا اس لئے اس تراث علمی کی جس کے وہ سچے حقدار ہیں انھیں خود طلب وجستجو کی فکر تھی، چنانچہ حسب معمول عمرہ وزیارت کیلئے شعبان میں حرمین شریفین حاضر ہوئے تو اہل علم وخبر سے اس سلسلے میں معلومات کی مگر کہیں کوئی سراغ نہ مل سکا، دوسرے سال پھر جب جانا ہوا تو مزید معلومات حاصل کی، وہاں مقیم بعض لوگوں نے نشاندہی کی کہ اگر یہ رسالہ ضائع نہیں ہوا ہے تو اندازہ ہے کہ مکتبۃ الحرم مکہ معظمہ میں ضرور ہوگا، مولانا موصوف مکتبۃ الحرم پہونچ گئے اور خدا کی قدرت کہ مخطوطات کی فہرست میں یہ مل گیا اور خود حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے ہاتھ کا لکھا ہوا، چنانچہ اس کا فوٹو لے لیا، اس طرح تقریبًا پون صدی کی گمنامی کے بعد یہ نادر وقیمتی علمی سرمایہ دوبارہ معرض ظہور میں آگیا۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ امام مہدی سے متعلق صحیح چالیس احادیث پر مشتمل تھا اور لوگوں نے اس کی نقل بھی لی تھی مگر دستیاب مخطوطہ میں کل ۳۷ احادیث ہیں پھر اس میں متعدد مقامات پر حک وفک بھی ہے بعض جگہ سبقت قلمی بھی ہے، اس لئے اندازہ یہ ہے کہ یہ مبیضہ کی بجائے اصل مسودہ ہے، واللہ اعلم بالصواب

مہدی موعود سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بعض نہایت مفصل اور ضخیم بھی ہیں، لیکن یہ مختصر رسالہ اس اعتبار سے خاص اہمیت وافادیت کا حامل ہے کہ اس میں صرف احادیث صحیحہ کو جمع کیا گیا ہے جب کہ دوسری کتابوں میں اس کا التزام نہیں ہے علاوہ ازیں امام خلدون نے اپنے مقدمہ میں مہدیٔ موعود سے متعلق وارد احادیث پر جو ناقدانہ کلام کیا ہے جس سے متاثر ہوکر بہت سے اہل علم بھی مہدی موعود کے ظہور کے بارے میں منکر یا متردد ہیں، حضرت شیخ نے علامہ ابن خلدون کے اٹھائے ہوئے سارے اعتراضات کا اسمائے رجال اور اصول محدثین کی روشنی میں جائزہ لیکر مدلل طور پر ثابت کردکھایا ہے کہ ان کے یہ اعتراضات درست نہیں ہیں اور بلاریب اس باب میں منقول بہت سی احادیث صحیح وحجت ہیں، اس لئے یہ رسالہ بقامت کہتر وبقیمت بہتر کا صحیح مصداق ہے۔

احقر نے اپنی بضاعت وہمت کے مطابق اس نادر وبیش بہا علمی تحفہ کو مفید سے مفید تر

بنانے کی پوری کوشش کی ہے، حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے جن کتب حدیث سے احادیث نقل کی ہیں ان کی جلد وصفحہ کا حوالہ دیدیا ہے، اسی طرح رجال سند پر حضرت نے جہاں جہاں کلام کیا ہے اس کا حوالہ نقل کردیا ہے اور حسب ضرورت بعض رجال پر حضرت کے مختصر کلام کی تفصیل کردی ہے، بعض احادیث کے بارے میں نشاندہی کردی ہے کہ کن کن ائمہ حدیث نے ان کی تخریج کی ہے، غریب ومشکل الفاظ کی کتب لغت سے تشریح بھی نقل کردی ہے، اسی کے ساتھ رسالہ کو مکمل تر بنانے کی غرض سے بطور تکملہ آخر میں چند احادیث صحیحہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، پھر اس قیمتی علمی سرمایہ کو مفید عام بنانے کی غرض سے تمام حدیثوں کا ترجمہ بھی کردیا ہے۔

والحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات وصلی الله علی النبی الکریم وعلی جمیع اصحابه وبارك وسلم۔



بقیه:- حضرت میر علی ہمدانی اور شیعیت

ذہنیت اور نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے وہ حضرت شاہ ہمدانی کے فکر ونظریے کے بالکل برعکس ہے لہذا شیعہ وا کابرین صوفیاء میں شمار کرنا، باور کرنا کرانا خلاف واقعہ اور علمی دیانت کے منافی ہے البتہ ان کے افکار ونظریات اور تحریروں میں دیگر صوفیانہ تحریروں کی طرح شیعی اثرات سے انکار نہیں ہے اور اس امکان کو بھی یکسر غلط نہیں کہا جاسکتا ہے کہ دیگر بہت سارے مصنفین کی طرح ان کی تصانیف میں بھی شیعی افکار کی آمیزش کردی گئی ہو، اس طرح کی سبکدستی اس فرقہ کا طرۂ امتیاز ہے، واللہ اعلم۔

از:- مولانا الحافظ محمد اقبال رنگونی، مانچسٹر،

غیر مقلدین کا سعودی عرب کے ائمہ و مشائخ کے مسلک سے شدید اختلاف

بریلویوں کے کسی عالم مولوی قمرالدین اعظمی نے برمنگھم سے ایک اشتہار شائع کیا ہے جو ہمیں برمنگھم سے بذریعہ ڈاک موصول ہوا ہے اس میں انھوں نے ائمہ حرمین شریفین کے پیچھے نماز نہ ادا کرنے کی کچھ اور وجوہات بھی بیان کی ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ سعودی عرب کے علماء تقلید کو حرام کہتے ہیں، اس لئے ان کی اقتداء میں نماز جائز نہیں ہے اجماع کے منکروں کے پیچھے نماز کیسے درست ہوسکتی ہے، یہ علماء طلاق کے مسئلہ پر اجماع امت کی مخالفت کرتے ہیں اور صحابہ کرام کو حکومت وقت کا آلۂ کار کہتے ہیں اور انھیں سرکاری فتوے دینے والے سمجھتے ہیں، مولوی صاحب نے لندن کے ڈاکٹر صہیب حسن کے جنگ لندن میں شائع شدہ مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ برطانیہ میں سعودی عرب کی نمائندگی کرنے والے علماء نے عوامی سطح پر طلاق کے مسئلے پر اجماع امت کی مخالفت کی ہے۔

بریلویوں کے اس اشتہار سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے سعودی عرب کے ائمہ کو بدنام کرنے کے لئے پھر ایک نیا کھیل شروع کیا ہے، اس سے قبل بریلویوں کے ترکش کے وہ سارے تیر (جس سے امت مسلمہ کو مجروح کیا گیا تھا) یکے بعد دیگرے ختم ہوچکے ہیں، اور دنیا جان چکی ہے کہ ائمہ حرمین شریفین کے خلاف لگائے گئے سب الزامات غلط ہیں، خود بریلوی علماء کو بھی اس کا اچھی طرح احساس ہوچکا ہے، اسی لئے انھوں نے ائمہ حرمین کے خلاف اب یہ نیا حربہ اختیار کیا ہے کہ وہ تقلید کو حرام کہتے ہیں۔

بریلوی علماء کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے سعودی عرب کے ائمہ اور مشائخ کے مسلک کو

ڈاکٹر صہیب حسن سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ خود ائمہ حرمین اور علماء عرب کی تحریرات میں ان کا مسلک و مذہب واضح ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب کے ائمہ اور غیر مقلدین کے مسلک و مذہب میں کوئی مماثلت نہیں بلکہ زمین وآسمان کا فرق ہے، ڈاکٹر صہیب حسن غیر مقلد ہیں اور پاکستان کے غیر مقلد عالم مولانا عبدالغفار حسن کے بیٹے ہیں اور سعودی عرب کے علماء اور مشائخ مقلد اور حنبلی المذہب ہیں، ان کے ہاں حضرت امام ابوحنیفہ کی تقلید ہرگز فعل حرام نہیں ہے حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام احمد بن حنبل کے مقلدین کوئی آج کی پیداوار نہیں، یہ صدیوں سے چلے آرہے ہیں، محدثین و مفسرین، متکلمین و مجددین کی پوری جماعت کسی نہ کسی امام کی تقلید کرتی رہی ہے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی سے منسلک رہے ہیں جب کہ غیر مقلدین ایک جدید فرقہ ہے اور ائمہ اربعہ کے مقابلے پر ایک نئے مسلک کی ایجاد ہے، غیر مقلدوں کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحب کے استاذ مولانا عبدالخالق صاحب (۱۲۴۷ھ) فرماتے ہیں۔

سو بانی مبانی اس فرقہ نواحداث کا عبدالحق ہے جو چند روز سے بنارس میں رہتا ہے حضرت امیرالمؤمنین (یعنی حضرت سید احمد شہیدؒ) نے حرکات ناشائستہ کے باعث اپنی جماعت سے اس کو نکال دیا تھا اور علماء حرمین نے اس کے قتل کا فتویٰ لکھا مگر کسی طرح بھاگ کر وہاں سے بچ نکلا (تنبیہ الضالین، تاریخ التقلید ص۱۱، الحیات بعد الممات ص۳۷)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مقلد فرقہ کا بانی عبدالحق بنارسی ہے اور ائمہ حرمین نے اس کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا تھا۔ قتل کا فتویٰ کوئی معمولی جرم پر نہیں دیا جاتا۔ اس فتویٰ قتل سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالحق بنارسی نے کسی ایسے نئے دین کی بنیاد رکھنے کی سازش کی تھی، جس کا پہلے دین سے کوئی تسلسل نہ تھا آج اگر اس کا کسی سے تسلسل نظر آتا ہے تو اس کے شیخ الکل صرف انگریز کے دور میں آپ کو نظر آئیں گے، جو خود اوپر سے کسی شیخ کے مقتدی نہیں ہیں، اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ مولانا نذیر حسین صاحب کو شیخ الکل کس لئے کہا جاتا ہے، غیر مقلدین کے مشہور پیشوا نواب صدیق حسن خاں صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ ایک جدید فرقہ ہے۔ آپ اس فرقے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فقد نبتت فی هذه الزمان فرقة ذات سمعة ورياء تدعی

انفسها علم الحديث والقرأة والعمل والعرفان (الحطه) ص۶۷

(ترجمہ) اس دور میں ابھی ابھی نمائش اور دکھاوے والا ایک فرقہ پیدا ہوا ہے جو اپنے لئے قرآن وحدیث اور عمل وعرفان کا مدعی ہے۔

اس جدید فرقے کا دعوی یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق عمل کرتے ہیں، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کو اپنا رہنما مانتے ہیں، ان کا یہ دعویٰ عقلاً و نقلاً باطل ہے، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی صاف لکھتے ہیں کہ اس فرقے کو موحدین اور محدثین سے کوئی نسبت نہیں یہ متعصب اور متشدد فرقہ ہے اور اس نو احداث فرقے کا دین سوائے فتنہ فی الارض اور فساد کبیر کے کچھ نہیں

فيا للعجب ان يسمون انفسهم الموحدين المخلصين وغيرهم بالمشركين وهم اشد الناس تعصبا وغلوا فى الدين .... فما هذا دين الا فتنة فى الارض وفساد كبير (الحطه)

پس حیرت ہے کہ یہ اپنا نام موحد مخلصین رکھتے ہیں اور دوسروں کو مشرک کہتے ہیں حالانکہ یہ خود تعصب میں اور غلو فی الدین میں سب سے سخت ہیں .... یہ دین کیا ہے یہ تو ایک فتنہ ہے زمین پر اور بہت بڑا فساد ہے۔

یہ فتنہ فی الارض وفساد کبیر کیا ہے؟ ایک طریقہ جو اس امت میں پہلی صدی سے چلا آرہا ہے جس پر امت کے مفسرین ومحدثین اور سب اکابرین چلتے رہے اسے گمراہی قرار دینا اور امت مسلمہ کو ایک نئے فتنہ میں مبتلا کرکے اس تسلسل سے قطع کرنا، یہ فساد کبیر نہیں تو اور کیا ہے۔؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر مقلدوں کے مسائل ان کی کتابوں میں ملتے ہیں، اور عجیب وغریب ملتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان کا مذہب اکثر مقامات پر شیعوں سے جا ملتا ہے، مولانا عبدالخالق صاحب فرماتے ہیں۔

۔ ان کا مذہب اکثر باتوں میں روافض (شیعہ) کے مذہب سے ملتا ہے (نتائج التقلید ص۳)

جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب کے علماء، اور غیر مقلدوں کے مذاہب میں کوئی اشتراک نہیں، یہ حضرات حضرت امام احمد کے مقلد ہیں۔ اور یہ غیر مقلد۔ ان حضرات کا

مذہب امام ابوحنیفہ کے مذہب سے قریب ہے جبکہ غیر مقلدین روافض کے مذہب کے قریب ہیں، ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

جس طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ صحابی کی بات کو حجت تسلیم کرتے ہیں حضرت امام احمد بن حنبل نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر مالکی (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

جعل للصحابة فى ذلك مالم يجعل لغيرهم واظنه مال الى ظاهر حديث اصحابى كالنجوم والله اعلم والى نحو هذا كان احمد بن حنبل يذهب (جامع بيان العلم جلد۲ ص۱۲۵)

(ترجمہ) امام ابوحنیفہؒ نے صحابہ کے لئے وہ درجہ مانا ہے جو دوسرے راویوں کے لئے نہیں آپ حدیث اصحابی کالنجوم کے ظاہر کی طرف مائل ہیں امام احمد کی بھی یہی رائے ہے

حضرت امام ابوحنیفہ کی طرح حضرت امام احمد بن حنبل کا موقف بھی یہی ہے کہ حدیث ضعیف کو اپنے قیاس و اجتہاد پر مقدم کرنا چاہیئے، حضرت امام اعظم اور حضرت امام احمد کا اس باب میں مسلک ایک ہے۔ علامہ ابن قیمؒ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں۔

فتقديم الحديث الضعيف وآثار الصحابة على القياس والرائ قوله وقول احمد (اعلام الموقعين جلد ۱)

(ترجمہ) سو ضعیف حدیث اور آثار صحابہ کو قیاس اور رائے پر مقدم کرنا امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور یہی قول امام احمد کا ہے۔

مشہور غیر مقلد عالم حافظ عبداللہ روپڑی صاحب بھی اعتراف کرتے ہیں کہ:

حنفیہ تو ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے ہیں (فتاوی اہلحدیث جلد۱ ص۱۳)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام احمدؒ کا آپس میں قریبی علمی رشتہ ہے اور ان کا مذہب آپس میں قریب ہے غیر مقلدین اور شیعہ مذہب کے قریب ہونے کی ایک مثال لیجئے۔

شیعہ کا مذہب ہے کہ حضرت علیؓ شیخین سے افضل و اعلیٰ تھے، صحابہ کرام ہمارے لئے حجت نہیں، حضرت امیر معاویہ کے بارے میں ترضی (رضی اللہ کہنا) غلط ہے شیعوں کی تمام

کتابوں میں اس کے دلائل وشواہد موجود ہیں۔ لیجئے غیر مقلدوں کے مشہور عالم مولانا وحید الزماں (۱۳۳۸ھ) کی مندرجہ ذیل عبارت دیکھئے،

شیخین کو اکثر اہل سنت حضرت علی سے افضل کہتے ہیں اور مجھ کو اس امر پر بھی کوئی قطعی دلیل نہیں ملتی۔ نہ یہ مسئلہ کچھ اصول دین اور ارکان دین سے ہے۔ زبردستی اس کو متکلمین نے عقائد میں داخل کردیا ہے (وحید اللغات مادہ عثم)

پھر یہ بھی دیکھئے!

حضرت علی اپنے تئیں سب سے زیادہ خلافت کا مستحق جانتے تھے اور ہے بھی یہی (ایضاً ۵۰ج)

حضرت امیر معاویہ کے بارے میں ان کا مذہب دیکھئے!

ان کی نسبت کلمات تعظیم مثل حضرت و رضی اللہ عنہ سخت دلیری اور بے باکی ہے (ایضاً)

غیر مقلد علماء نے مولانا وحید الزمان کی ان عبارات سے اختلاف نہیں کیا۔ نہ کہیں ان کے مذہب کی مخالفت میں ان کی آواز اٹھی ہے ان شواہد کی روشنی میں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ روافض اور غیر مقلدین میں قدر ے اشتراک ہے تو اسکے غلط ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

سو سعودی عرب کے علماء ومشائخ حضرت امام احمد بن حنبل کے مقلد ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر صہیب حسن اور اور ان کی جماعت غیر مقلدین کی جماعت ہے۔ پھر یہ دونوں کیسے ایک ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں اشتراک کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم چند مثالوں کے ذریعہ یہ واضح کریں گے کہ سعودی عرب کا مسلک غیر مقلدوں کے مسلک سے بالکل علیحدہ ہے اور انھیں غیر مقلد بتاکران کے پیچھے نماز پڑھنے سے روکنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

مسئلہ تقلید میں اختلاف

سعودی عرب کے علماء اور مشائخ اصول دین میں مسلک اہل السنۃ والجماعۃ اور فروع (یعنی فقہی مسلک) میں حضرت امام احمد بن حنبل کی تقلید کرتے ہیں ائمہ حرمین کا مسلک بھی یہی ہے اور سعودی حکومت اور عدالتیں بھی فقہ حنبلی کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔

ان سب کے شیخ اور استاذ شیخ محمد بن عبد الوہاب ہیں آپ کھل کر کہتے ہیں کہ ہم امام احمد کے مقلد ہیں۔

ونحن ایضاً فی الفروع علی مذهب الامام احمد بن حنبل ولاننکر علی من قلد الائمة الاربعة دون غیرهم لعدم ضبط مذاهب الغیر (سیرۃ الشیخ محمد بن عبد الوہاب ص۔۔)

(ترجمہ) ہم فروعات میں امام احمد بن حنبل کے مذہب پر ہیں اور مذاہب اربعہ میں سے کوئی کسی کی تقلید کرے ہم اس پر کوئی نکیر نہیں کرتے۔

آپ یہ بھی فرماتے ہیں:

فنحن و لله الحمد متبعون لامبتدعون علی مذهب الامام احمد بن حنبل" (محمد بن عبدالوهاب للعلامة احمد بن عبدالغفور عطار طبع بیروت ص۱۷۵)

الحمد للہ ہم امام احمد بن حنبل کے مذہب کی پیروی کرنے والے ہیں، بدعتی نہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے صاحبزادے نے اپنے اور اپنے والد کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا

اصول دین میں ہمارا مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے اور ہمارا طریقہ ائمہ سلف کا طریقہ ہے اور فروع میں ہم امام احمد بن حنبل کے مذہب پر ہیں اور جو کوئی ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کرے ہم اس پر نکیر نہیں کرتے۔

(الہدیۃ السنیۃ ص۳۹ ماخوذ از تقلید کی شرعی ضرورت ص۴۲)

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے سوانح نگار کے الفاظ بھی دیکھیے۔

وانهم الحنابلة متعصبون لمذهب الامام احمد فی فروعه کسکل اتباع المذاهب الاخری فهم لایدعون لا بالقول ولا بالکتابة ان الشیخ اتی بمذهب جدید ولا اخترع علما غیرما کان عند السلف (سیر الشیخ ص۸)

(ترجمہ) اور یہ سب حنبلی المذہب تھے امام احمد کے مذہب پر سختی سے کاربند تھے جیسا کہ دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے اپنے امام کے طریقے پر کاربند ہیں زبانی اور تحریری انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کوئی نیا دین لائے اور انھوں نے کوئی نیا علم دریافت کیا جو پہلوں کے پاس نہ تھا۔

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے۔

واما حقیقة هذه الطائفة فانها حنبلة المذاهب (ایضاً ص۹)

(ترجمہ) اس گروہ کی حقیقت یہی ہے کہ یہ حنبلی مذہب پر چلنے والے ہیں۔

عرب علماء کی ان شہادتوں کے بعد غیر مقلدوں کے علماء کی شہادت بھی ملاحظہ فرمائیے، نواب صدیق حسن

خاں بھوپالی لکھتے ہیں۔

مذہب محمد بن عبدالوہاب کا حنبلی تھا جب سے مسعود وغیرہ اور اس کے مددگار مٹ گئے، پھر کسی نے آج تک اس ملک میں خروج نہیں کیا۔ (ترجمان وہابیہ ص۸۶)

آپ یہ بھی لکھتے ہیں۔

سو مذہب نجدی مذکور کا حنبلی تھا اور اس نے بوہروں اور بدوؤں پر چڑھائی کی تھی اس مذہب (حنبلی مذہب) کی کتابیں ہندوستان میں رائج نہیں ہیں (ایضاً ص۱۱۵)

غیر مقلدوں کے مشہور عالم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری لکھتے ہیں:

محمد بن عبدالوہاب نجد میں پیدا ہوا تھا جو مذہب حنبلی کا پیرو تھا، اہل حدیث کو اس سے مسئلہ تقلید میں اختلاف تھا اور اب بھی ہے محمد بن عبدالوہاب مقلد تھا اور اہل حدیث کے نزدیک تقلید جائز نہیں (فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص۱۴۴)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سعودی عرب کے ائمہ و مشائخ حنبلی المذہب ہیں اور فقہ حنبلی کی پیروی کرتے ہیں، اور ائمہ کی تقلید کو حرام، گناہ اور شرک نہیں کہتے، مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کھل کر دونوں کے درمیان اختلاف بیان کیا ہے سوال یہ ہے کہ کیا یہ اختلاف معمولی نوعیت کا ہے۔؟

نہیں، ہرگز نہیں۔ غیر مقلدوں کے نزدیک جس طرح امام ابوحنیفہؒ کی تقلید میں احناف مجرم ہیں اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبل کی تقلید کے جرم میں سعودی عرب کے ائمہ و مشائخ بھی بہت بڑے گنہ گار ہیں۔

غیر مقلدین علماء نے تقلید اور مقلدین کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں ہیں، ان کے نزدیک حنفی ہوں یا شافعی مالکی ہوں یا حنبلی تقلید کے جرم میں کس سزا کے مستحق ہیں اسے مندرجہ ذیل فتوؤں سے ملاحظہ فرمایئے۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی مشہور غیر مقلد پیشوا ہیں، آپ لکھتے ہیں۔

تحقیق یہ ہے کہ سارے جہاں کے مسلمان دو طرح پر ہیں ایک خالص اہل سنت والجماعت جن کو اہل حدیث بھی کہتے ہیں دوسرے مقلد مذہب خاص وہ چار گروہ

ہیں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ۔ (ترجمان وہابیہ ص ۵۲)

نواب صدیق حسن خاں مقلدوں کو اہل السنۃ والجماعۃ میں نہیں سمجھتے صرف غیر مقلدوں کو خیال کرتے ہیں اس سے سعودی عرب کے علماء و مشائخ اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہوجاتے ہیں حالانکہ شیخ محمد عبدالوہاب اور دوسرے سعودی علماء کی تحریرات سے صاف عیاں ہے کہ یہ حضرات اہل السنۃ والجماعۃ میں سے ہیں۔

نواب صاحب نے حنبلی علماء کو اہل السنۃ سے خارج کیا تھا مگر مشہور غیر مقلد عالم مولانا ابو عبدالقادر صاحب انھیں گمراہ قرار دیتے ہیں، اور ان سے مناکحت ناجائز کہتے ہیں، آپ اپنی مشہور کتاب سیاحۃ الجنان بمناکحۃ اہل الایمان میں لکھتے ہیں۔

حق مذہب اہل حدیث ہے اور باقی جھوٹے اور جہنمی ہیں تو اہل حدیثوں پر واجب ہے کہ ان تمام گمراہ فرقوں سے بچیں اور ان سے خلط ملط میل جول دینی تعلقات نہ رکھیں یعنی باطل مذہب والوں کے پیچھے نماز نہ پڑھیں اور ان کے جنازہ میں شامل نہ ہوں ان سے سلام نہ لیں ان سے مناکحت نہ کریں نہ ان کو اپنی لڑکیاں دیں اور نہ ان سے لیں، ص

آگے لکھتے ہیں:

مقلدین ...... بلاشبہ گمراہ ہیں اور اہل حدیثوں جیسے مسلمان نہیں (ص)

یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

مقلدین موجودہ دس دس وجہوں سے گمراہ اور فرقہ ناجیہ سے خارج ہیں جن سے مناکحت جائز نہیں ہے (ص)

غیر مقلدوں کے مشہور عالم مولانا محمد جوناگڈھی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔

سچا فرقہ اور ناجیہ اہل حدیث ہے باقی سب فی النار والسقر ہیں، لہذا مناکحت فرقہ ناجیہ کی آپس میں ہونی چاہئے اہل بدعت سے نہ ہوتا کہ مخالطت لازم نہ آئے (ص۲۳)

کیا اس دور میں سعودی عرب کے امام کعبہ اور مسجد نبوی کے امام نہیں آتے۔

غیر مقلدوں کے مشہور محدث اور مجتہد مولانا عبداللہ روپڑی صاحب لکھتے ہیں۔

جو شخص تقلید شخصی کو شرعی حکم سمجھتا ہے اس کو امام نہیں بنانا چاہئے، تقلید شخصی کو شرعی

حکم سمجھنے کی وجہ سے وہ اہل بدعت میں شمار ہوسکتا ہے (فتاویٰ اہلحدیث جلد ۱ ص ۱۰۱)
ایک جگہ لکھتے ہیں۔

شرعاً وجوب تقلید شخصی کا قائل انتہاءً ناجی ہوسکتا ہے نہ کہ ابتداءً کیونکہ وہ دین میں امر محدث کا قائل ہے جو بدعت ہے (ایضاً جلد ۱ ص ۷)

مولانا عبداللہ صاحب روپڑی کا مذکورہ فتویٰ کہ تقلید شخصی کو شرعی حکم سمجھنے والے کی اقتدار میں نماز جائز نہیں۔ انتہائی غلط فتویٰ ہے۔ اسی لئے بعض علمار غیر مقلدین ائمہ حرمین کی اقتدار میں نمازیں ادا نہیں کرتے ان کا موقف ہی یہ ہے کہ ائمہ حرمین تقلید شخصی کے قائل ہیں اور اسے شرعی حکم سمجھ کر ہی اس پر عمل پیرا ہیں اسلئے ان کی اقتدار میں نماز درست نہیں۔

ہم اس وقت تقلید شخصی کے شرعی حکم کی بحث نہیں کر رہے ہیں۔ بتلانا صرف یہ ہے کہ غیر مقلدوں کے نزدیک تقلید فعل حرام ہے اور مقلد ہونا بہت بڑا جرم ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ حنفی ہوں یا شافعی۔ علامہ ابن تیمیہ ہوں یا حافظ ابن القیم۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب ہوں یا شیخ عبداللہ بن سبیل۔ شیخ حذیفی ہوں یا شیخ۔

اب آپ ہی غور کریں کہ غیر مقلدوں اور سعودی عرب کے علمار و مشائخ (جو حنبلی ہیں اور مقلد ہیں) میں کوئی بھی اشتراک پایا جاتا ہے؟ غیر مقلدوں کے نزدیک تقلید جرم اور مقلد جہنمی ہے جبکہ سعودی علمار مقلد ہونے کا کھلا اقرار کرتے ہیں اور فقہ حنبلی کے سایے میں چلنا اپنی سعادت خیال کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور موحد عالم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کا عقیدہ بھی مقلدین کی حمایت میں یہ ہے!

اعمال میں ان چار مذہبوں کی متابعت جو اہل اسلام میں رائج ہیں بہت عمدہ ہے لیکن پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو ایک شخص کے علم میں منحصر نہ جاننا چاہیئے بلکہ آپ کا علم تمام جہان میں پھیلا ہوا ہے۔ (صراط مستقیم ص ۹۷)

لیکن مولانا ثنار اللہ امرتسری ان سب کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ!

چار مذہب چوتھی صدی میں پیدا ہوئے ان سب سے پہلے اہل حدیث تھے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل حدیث مذہب پرانا ہے اور یہ نئے ہیں ان کو چاہیئے کہ نئی بات چھوڑ کر اہل حدیث بن جائیں۔
(فتاویٰ ثنائیہ جلد ۱ ص ۲۵۴)

فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں اختلاف

بریلوی علماء کا سعودی عرب کے ائمہ پر یہ الزام کہ وہ لوگ بھی غیر مقلدوں کی طرح امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا فرض قرار دیتے ہیں۔ اور جو لوگ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہیں پڑھتے ان کی نمازوں کو باطل اور ناقص کہتے ہیں۔ غلط الزام ہے۔

ہم پچھلی سطور میں یہ بات بارہا بیان کر چکے ہیں کہ سعودی عرب کے علماء و مشائخ حنبلی المذہب ہیں۔ حضرت امام احمد کی فقہ پر چلتے ہیں۔ حضرت امام احمد اور آپ کے مقلدین ہرگز یہ نہیں کہتے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا فرض ہے۔ حضرت امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ مقتدی کیلئے سورہ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے۔

مشہور غیر مقلد عالم مولانا مبارک پوری صاحب کی شہادت ملاحظہ فرما لیجئے۔

امام مالک اور امام احمد تمام نمازوں میں مقتدی کے لئے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کی قرأۃ کو واجب نہیں سمجھتے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

شیخ الحنابلہ علامہ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ۔

امام احمد کے نزدیک نہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرأت واجب ہے اور نہ سری نمازوں میں (تنوع العبادات ص ۸۶)

متقدمین ائمہ حنابلہ میں سے علامہ شمس الدین ابن قدامہ (۶۸۲ھ) کا مسلک ملاحظہ فرمائیے!

لا تجب القرأۃ على المأموم هذا قول اكثر اهل العلم (شرح مقنع جلد ۱ ص ۱۲ مصری)

(ترجمہ) مقتدی پر قرأۃ واجب نہیں ہے اور یہی اکثر اہل علم کا قول ہے۔

علامہ حافظ ابن القیمؒ (۷۵۱ھ) حنبلی مسلک کے جلیل القدر عالم ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

فقراءۃ الامام وسترته قرأۃ لمن خلفه وسترة له (کتاب الروح ص ۲۲۶)

(ترجمہ) امام کی قرأت اور اسکا سترہ مقتدیوں کی قرأت اور مقتدیوں کا سترہ ہے (یعنی مقتدیوں کو نہ قرأت کی ضرورت ہے نہ سترہ کی)

فقہ حنبلی کے تمام علماء اور محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں اسکی صراحت کر دی ہے کہ مقتدیوں کے لئے

سورہ فاتحہ کی قرأت ضروری نہیں ہے۔ امام کی قرأت مقتدیوں کی قرأت ہے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی حدیث لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بام القرآن الخ ہر نمازی کے لئے نہیں بلکہ اسکے لئے جو انفرادی طور پر نماز پڑھے۔ اور اس روایت سے قرأۃ فاتحہ خلف الامام کو واجب ٹھہرانا اور نہ پڑھنے والے کی نماز کو باطل قرار دینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ حافظ ابن قدامہ حنبلیؒ نے المغنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام۔ تابعین عظام اور اکابرین اسلام کے حوالے سے صاف لکھا ہے کہ۔

ما قالوا الرجل وقرأ امامه ولم يقرأ هو صلاته باطلة (المغنی جلد ا ص۵۶۲)

کسی نے یہ نہیں کہا کہ اگر کسی نے نماز پڑھی اور اس نے امام کے پیچھے قرآن کا کوئی حصہ نہ پڑھا اور اسکے امام نے پڑھ لیا تو اسکی نماز باطل ہے۔

متقدمین ائمہ حنابلہ کی ان تصریحات کے بعد ضرورت نہیں کہ سعودی عرب کے مشائخ و علماء کا مسلک اور واضح کر دیا جائے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متاخرین حنابلہ بالخصوص سعودی عرب کے ممتاز مدرس اور معہد امام الدعوہ ریاض کے مشہور عالم شیخ عبدالعزیز المحمد السلمان کی تازہ تالیف الاسئلة والاجوبة الفقهية " سے سعودی عرب کے مشائخ و علماء کا مسلک واضح کر دیا جائے تاکہ بریلوی علماء پھر کسی مغالطے میں نہ رہیں۔ آپ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

لا تجب القراءة على المأموم لقوله تعالى واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون قال احمد اجمع الناس على ان هذه الآية نزلت فى الصلوة ولما ورد عن ابى هريرة مرفوعًا انما جعل الامام ليؤتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرء فانصتوا رواه الخمسة الا الترمذى وصححه احمد فى رواية الاثرم ومسلم بن الحجاج وقال صلى الله عليه وسلم من كان له امام فقرأته له قرأة رواه احمد فى مسائل ابنه عبد الله ورواه سعيد والدار قطنى مرسلا وعن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم انصرف من صلوٰة جهر فيها بالقراءة فقال هل قرأ معى احد منكم آنفا فقال رجل نعم يا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فانى اقول مالى انازع القرآن قال فانتهى الناس عن القرأة مع رسول الله صلى الله عليه وسلم رواه ابوداؤد والنسائى

والترمذی وقال حدیث حسن وحدیث عبادة الصحیح محمول علی غیر المأموم وکذا الحدیث ابی هریرة وقد جاء مصرحًا به عن جابر مرفوعًا کل صلوة لم یقرأ فیها بام القرآن فهی خداج الا وراء الامام۔

(الاسئلة والاجوبة الفقهية جلد ۱ ص۱۲۷ طبع هفتم ریاض)

اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب کے علماء اور مشائخ قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی فقہ پر چلتے ہیں اور حنفی فقہ کے قریب ہیں، ان کے نزدیک امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت واجب نہیں ہے اور حضرت عبادہ بن صامت سے مروی حدیث مقتدی کیلئے نہیں بلکہ منفرد کیلئے ہے، اور حضرت جابرؓ کی روایت میں الا وراء الامام کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کی قرأت واجب نہیں۔

سو سعودی عرب کے ائمہ کرام کے بارے میں یہ الزام کہ وہ مقتدی کیلئے سورۂ فاتحہ کی قرأت کو فرض قرار دیتے ہیں اور نہ پڑھنے والوں کی نماز باطل ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں ہرگز صحیح نہیں ہے۔

البتہ غیر مقلدوں کے نزدیک مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت نہیں کرتا اس کی نماز باطل ہوجاتی ہے، غیر مقلدوں کے مشہور عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحبؒ لکھتے ہیں۔

- اہل حدیث کا مذہب ہے کہ امام اور مقتدی دونوں پر قرأت فاتحہ فرض ہے۔
  (اہل حدیث کا مذہب ص۶۳)
- امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے بلکہ یہ بھی کہ جہری نمازوں میں بھی فاتحہ پڑھنا اسی طرح ضروری ہے جیسا سری میں (ایضاً ص۶۴)
- یہی ہمارا مذہب ہے کہ مقتدی پر فاتحہ پڑھنا ضروری ہے (ایضاً ص۶۷)
- فاتحہ ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا منفرد یا مقتدی فرض ہوگی (خیر الکلام ص۵۱۲)

نیز مقلدوں کے علماء کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔

"جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے بے کار ہے اور باطل ہے (فصل الخطاب فی قرأة فاتحة الکتاب ص۱ مطبوعہ کتب خانہ اہلحدیث کراچی)

ایک غیر مقلد عالم کا مضمون "تنظیم اہل حدیث" میں شائع ہوا جس میں موصوف نے فتوی دیا تھا کہ :- "مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے لہذا اس کی نماز نہیں، جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے، بے نماز کافر ہے اور وہ مخلد فی النار ہے":

(اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع ص۱ طبع کردہ منیجر رسالہ صحیفہ اہل حدیث)

یعنی اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ جا ملے تو غیر مقلدوں کے نزدیک اس کی وہ رکعت صحیح نہیں ہوئی، اس رکعت کا اعادہ ضروری ہے، فتاویٰ ثنائیہ میں ہے۔

"راجح یہ ہے کہ مدرک رکوع کی رکعت نہیں کیونکہ فاتحہ خلف الامام فرض ہے" (فتاوی ثنائیہ ص۵۳۰ ج۱)

ایک اور سوال کے جواب میں لکھا ہے:

مدرک کی رکعت نہیں ہوتی اسلئے کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے (ایضاً ص۵۳۱ ج۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مقلدوں کے نزدیک "مدرک رکوع" کی رکعت صحیح نہیں اسکو اعادہ لازم ہے جبکہ حضرت امام احمدؒ کے مذہب میں جس شخص نے امام کیساتھ رکوع پالیا اس کی نماز صحیح ہوگئی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام احمدؒ کا اس مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں، علامہ شوکانی ؒ نے بھی اپنے فتاوی "الفتح الربانی" میں جمہور کے مذہب کو ترجیح دی ہے کہ رکوع میں رکعت ہوجاتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے، اگر اس کے برعکس ہوتا تو یہ حضرات رکوع سے رکعت پانے کی ہرگز تصریح نہ کرتے، حنبلی مسلک کے مشہور عالم شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

"جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس کی وہ رکعت ہوگئی (منہاج السنۃ ج۵)

موجودہ دور کے حنبلی عالم اور سعودی عرب کے ممتاز مدرس شیخ عبدالعزیز المحمد السلمان اس سوال کے جواب میں کہ ما الذی تدرک بہ الرکعۃ (کہ وہ کیا عمل ہے جس سے رکعت مل جاتی ہے) لکھتے ہیں:-

تدرك بادراك الركوع مع الامام لحديث ابي هريرة وتقدم قبل هذا السوال وعن ابي بكرة انه انتهى الى النبي صلى الله عليه وسلم وهو راكع فركع قبل ان يصل الى الصف فقال النبي صلى الله عليه وسلم

زادك الله حرصاً ولا تعد (رواه البخاري) وتجزئ تكبيرة الاحرام عن تكبيرة الركوع لفعل زيد بن ثابت وابن عمر ولا يعرف لهما مخالف من الصحابة.

(الأسئلة والاجوبة الفقهية ،جلد ۲ ص ۱۲۵ طبع ہفتم ریاض)

(ترجمہ) امام کے ساتھ رکوع پانے والا رکعت پا لیتا ہے ،حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث میں اسکی دلیل موجود ہے ،اور حضرت ابو بکرہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں صرف رکوع پایا چنانچہ انھوں نے قبل اس کے کہ صف تک پہنچے رکوع کرلیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تیری حرص کو بڑھائے ایسا پھر نہ کرنا (رواہ البخاری) اور تکبیر تحریمہ رکوع کی تکبیر کو کافی کر دیتی ہے ،حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر کا عمل اس پر شاہد ہے ، اور صحابہ کرام سے اس کے خلاف ثابت نہیں.

سو حنبلی فقہ میں قرأۃ فاتحہ خلف الامام واجب نہیں، اور امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہوجانے والے کی نماز صحیح ہوجاتی ہے اس کا اعادہ ضروری نہیں ،سعودی عرب کے علماء ومشائخ کا بھی یہی مسلک ہے ، جبکہ غیر مقلدوں کے نزدیک قرأۃ فاتحہ خلف الامام فرض ہے ،نہ پڑھے تو نماز باطل ہوجاتی ہے ، اور امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہونے والے کو رکعت کا اعادہ بھی لازمی ہے

اس سے اندازہ فرمالیجئے کہ سعودی عرب کے ائمہ اور مشائخ اور غیر مقلدوں کے مسائل میں فرق ہے یا نہیں؟ جب دونوں فریق ایک دوسرے سے مسائل مشہورہ میں ٹکراتے نظر آتے ہیں ،تو پھر ان دونوں کو ایک سمجھنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے ،

.بریلوی علماء کا یہ سمجھنا کہ سعودی عرب کے علماء ومشائخ بھی غیر مقلد ہیں ہرگز صحیح نہیں ۔

طلاق کے مسئلہ میں اختلاف

بریلوی علماء کا سعودی عرب کے ائمہ ومشائخ کے خلاف یہ پروپیگنڈا کرنا کہ وہ تین طلاق کو ایک قرار دے کر اجماع امت کی مخالفت کرتے ہیں، ایک غلط الزام ہے ، بریلوی علماء نے ڈاکٹر صہیب حسن کے روزنامہ جنگ لندن میں شائع شدہ مضمون سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ ہی نظریہ ائمہ حرمین اور علماء حرمین کا ہے، صحیح نہیں، سعودی عرب کے ائمہ ومشائخ کا طلاق کے مسئلے میں وہی موقف ہے جو جمہور امت کا ہے ،حضرت امام ابو حنیفہؒ ،حضرت امام شافعیؒ ،حضرت امام مالکؒ

اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے طلاق کے مسئلے میں جو موقف اختیار کیا ہے، سعودی عرب کے مشائخ نے بھی وہی موقف اختیار کیا ہے جبکہ غیر مقلدوں کا موقف اس معاملے میں بالکل علیحدہ ہے، اور اجماع امت کی صریح مخالفت ہے، ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین قرار دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث سے ثابت ہے حضرات صحابہ کرام نے اس پر اجماع کیا ہے، ائمہ مجتہدین نے اس موقف سے انحراف نہیں کیا۔ البتہ روافض نے اس سے اختلاف کیا ہے اور وہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں) سعودی عرب کے ائمہ اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد ہیں، حضرت امام احمدؒ کا موقف اس باب میں کیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے

من طلق ثلاثاً فی لفظ واحد فقد جهل وحرمت علیه زوجته ولا تحل له ابداً حتی تنکح زوجاً غیره (کتاب الصلوٰۃ ص۴۲)

جس شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی کلمہ میں تین طلاقیں دیدیں تو بے شک اس نے جہالت کا کام کیا مگر اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی اور اس کے لئے وہ اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی کہ وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے، (یعنی بغیر حلالہ کے وہ اس کیلئے جائز نہ ہوگی)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ دیگر تمام ائمہ کرام کا ہے، اور حضرت امام احمد کے مقلدین حنبلی فقہاء اور ائمہ بھی اسی موقف پر ہیں، البتہ حضرت علامہ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلے میں اپنے امام سے اختلاف کیا لیکن حنبلی فقہ کے ممتاز علماء نے آپ کے موقف کو غلط کہا اور اسے آپ کے تفردات میں شامل کیا ہے، غیر مقلدوں کے مشہور رہنما نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے اتحاف النبلاء میں علامہ ابن تیمیہؒ کے منفردات میں طلاق ثلثہ کے مسئلے کو بھی شامل کیا ہے (دیکھئے فتاویٰ ثنائیہ جلد ۲ ص۲۱۹)

اور نواب صاحب التاج المکلل میں لکھتے ہیں کہ علامہ ذہبی باوجودیکہ علامہ ابن تیمیہؒ کے شاگرد اور معتقد تھے مگر طلاق کے مسئلے میں علامہ ابن تیمیہؒ کے سخت مخالف تھے (دیکھئے ص۱۸۹) اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے طلاق کے مسئلے میں حنبلی فقہ کے موقف سے

انحراف کیا تھا، لیکن کسی نے بھی آپ کے موقف کو صحیح نہیں کہا، نہ اس کی تائید کی بلکہ حنبلی فقہاء نے اپنی کتابوں میں اس بات کی تصریح کردی کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہیں، ایک نہیں، اس لئے کہ صحابۂ کرام، جمہور تابعین، ائمہ مذاہب اربعہ اور حضرات اہل بیت سب کا یہی مذہب ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ خود مشہور غیر مقلد عالم مولانا شمس الحق صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ

ائمہ اربعہ اور جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے (دیکھئے عون المعبود ۲۲۹/۲۲)

ہم اس وقت طلاق ثلثہ کے موضوع پر بحث نہیں کر رہے ہیں، تبلانا یہ ہے کہ حضرت احمدؒ کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہیں ایک نہیں، متقدمین ائمہ حنابلہ کی تصریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ (۶۲۰ھ) لکھتے ہیں۔

وان طلق ثلاثا بكلمة واحدة وقع الثلاث وحرمت عليه حتى تنكح زوجاً غيره ولافرق بين قبل الدخول وبعده وروى ذالك عن ابن عباس وابى هريرة وابن عمر وعبدالله بن عمرو وابن مسعود وانس وهو قول اكثر اهل العلم من التابعين والائمة بعدهم (المغنى لابن قدامه ج۷ ص۱۰۲)

(ترجمہ، اگر کسی نے کلمۂ واحدہ میں تین طلاق دی تو تین ہی واقع ہوں گی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی جب تک کہیں اور نکاح نہ کرے (اس کے لئے حلال نہ ہوگی) اور اس میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں میں فرق نہیں، اور یہ فتویٰ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن عمرو، حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت انس سے منقول ہے اور یہی اہل علم تابعین کی اکثریت کا فیصلہ ہے اور یہی ان کے بعد کے اماموں کا فیصلہ ہے۔

آپ ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

ان الرجل اذا قال لامرأته انت طالق ثلاثا فهى ثلاث وان نوى واحدة لانعلم فيه خلافا لان اللفظ صريح فى الثلاث والنية لاتعارض الصريح لانها اضعف من اللفظ ولذالك لاتعمل بمجردها والصريح قوى يعمل بمجرده من غير نية فلا يعارض القوى بالضعيف كما لايعارض

النص بالقیاس (ایضاً جلد، ص۳۶)

کسی شخص نے جب اپنی بیوی سے کہا کہ تجھے طلاق ہے تین دفعہ تو وہ تین دفعہ ہی واقع ہوگی، اگرچہ اس نے ایک کی نیت کی ہو، ہم اس میں سلف میں کوئی اختلاف نہیں پاتے، کیونکہ یہ لفظ تین ہونے میں صریح ہے اور نیت صریح بات سے معارضہ نہیں کرسکتی، کیونکہ نیت لفظ کے مقابلے میں کمزور ہے، اس لئے صرف نیت پر عمل نہیں کیا جاتا اور صریح چیز قوی ہے وہ مجرد بھی ہو تو اس پر بغیر نیت کے عمل کیا جا سکتا ہے، پس اس قوی کا ضعیف سے معارضہ نہ کیا جائے جیسا کہ نص کا قیاس سے معارضہ نہیں کیا جا سکتا۔

حنبلی فقہ کا ایک اور مفتی بہ قول ملاحظہ فرمائیے

وان کانت مدخولا بہا وقع بہا جمیع ما اوقعہ (العدۃ لشرح العمدۃ ص۴۱ طبع مکتبہ ریاض)

ترجمہ، اگر وہ عورت مدخول بہا ہو تو اس پر تمام طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔

علامہ ابن تیمیہ کے جد امجد ابو البرکات مجد الدین عبد السلام الحنبلی منتقی الاخبار میں باب ماجاء فی طلاق البتۃ وجمع الثلاث وتفریقہا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام کے آثار نقل کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں:

وھذا کلہ یدل علی اجماعھم علی صحۃ وقوع الثلاث بالکلمۃ الواحدۃ (منتقی الاخبار ص۲۳۷)

یہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک کلمہ سے دی گئی تین طلاق کے واقع ہونے پر صحابہ کا اجماع ہوچکا ہے۔

عالم اسلام کے مشہور فاضل السید السابق لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے بیک مجلس تین طلاقیں دیدیں تو گو کہ یہ طلاق بدعت ہے اور اس کا مرتکب گنہ گار ہے لیکن تینوں واقع ہونگی

"وذھب جمھور العلماء الی انہ یقع" (فقہ السنۃ جلد۲ ص۲۶۶ و ص۲۶۹، مطبوعہ مصر)

عرب کے ایک اور عالم شیخ احمد عیسیٰ عاشور لکھتے ہیں:

لو قال شخص لزوجتہ انت طالق ثلاثا وقع الثلاث ولو قال انت طالق و نوی اثنتین او ثلاثا وقع ما نوی لحدیث رکانۃ فی تحلیف النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ آللہ ما اردت الا واحدۃ؟ فلو کانت الثلاث واحدۃ لما کان

للتحليف فائدة، وهذا هو مذهب جمهور العلماء من التابعين وكثير من الصحابة وائمة المذاهب الاربعة۔

(الفقه الميسر في العبادات والمعاملات جلد ۲ ص ۱۳۲ طبع مصر)

حافظ ابن رجب حنبلی رح کہتے ہیں

اعلم انه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم في الفتاوى في الحلال والحرام شئ صريح في ان الطلاق الثلث بعد الدخول يحسب واحدة اذا سبق بلفظ واحد (سير الحاث الى علم الطلاق الثلاث ص ۱۳)

جان لو کہ صحابۂ کرام تابعین عظام اور ان ائمہ سلف سے جن کا حلال و حرام کے معاملے میں فتویٰ معتبر و معتمد سمجھا جاتا ہے کسی سے صریح طور پر ثابت نہیں کہ تین طلاق مدخولہ کے باب میں بھی ایک سمجھی گئی ہو جبکہ ایک لفظ سے دی جائے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے صاحبزادے شیخ عبداللہ رح نے طلاق کے مسئلے میں اپنے والد کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا۔

ہمارے نزدیک شیخ الاسلام ابن القیم اور ان کے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اہل حق اہل السنۃ کے امام و پیشوا ہیں اور ان دونوں بزرگوں کی کتابیں ہمیں نہایت عزیز ہیں لیکن ہر مسئلہ میں ہم ان کے بھی مقلد اور پیرو نہیں ہیں اور متعدد مسائل میں ان سے ہمارا اختلاف معلوم و معروف ہے منجملہ ان کے ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے اس میں ہم ائمہ اربعہ کے متفقہ مسلک کا اتباع کرتے ہیں۔ (الہدیۃ السنیۃ)

عالم اسلام کے مشہور عالم فضیلۃ الشیخ محمد الامین الشنقیطی طلاق ثلثہ کے مسئلے پر اکابرین امت کے دلائل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وعلى هذا القول اى اعتبارها ثلاثا جل الصحابة واكثر العلماء منهم الائمة الاربعة اه وقد استدل لهذا المذهب بالكتاب والسنة والاجماع والآثار والقياس (اضواء البيان ۱/۱۷۶)

(ترجمہ) اور یہ قول (یعنی تین طلاق کو تین قرار دینا) جمہور صحابہ اور اکثر علماء جن میں ائمہ اربعہ بھی ہیں سب کا قول ہے۔ اور اس مذہب پر کتاب وسنت، اجماع آثار اور قیاس سے استدلال کیا گیا ہے۔

خود سعودی حکومت اور سعودی عرب کے ممتاز علماء کرام کا اتفاق ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہیں، حکومت سعودیہ نے علماء حرمین اور ملک کے دوسرے مشہور علماء پر جو تحقیقاتی مجلس قائم کر رکھی ہے جس کا فیصلہ تمام ملکی عدالتوں میں نافذ رہتا ہے، اس تحقیقاتی مجلس کے سامنے "طلاق ثلثہ" کا مسئلہ پیش ہوا، مجلس نے اس مسئلہ سے متعلق قرآن وحدیث کی نصوص کے علاوہ تفسیر وشروح احادیث کے مضبوط دلائل اور بحث ومباحثہ کے بعد بالاتفاق یہ فیصلہ دیا کہ ایک لفظ سے دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہیں۔

وبعد دراسة المسألة وتداول الرأي واستعراض الاقوال التي قيلت فيها ومناقشة ما على كل قول من ايراد توصل المجلس باكثريته الى اختيار القول بوقوع الطلاق الثلاث بلفظ واحد ثلاثاً۔

(حكم الطلاق الثلث بلفظ واحد في ضوء الكتاب والسنة ص۲۱ رياض ۱۳۹۷ھ)

اس مسئلہ طلاق کے مذاکرہ اور ایک دوسرے سے آراء لینے کے بعد اور وہ اقوال جو اس سلسلے میں بیان کئے گئے ہیں ان کی تحقیق وتفتیش اور ہر قول پر جو اعتراضات اٹھے اسکے پورے مناقشے کے بعد مجلس کی اکثریت اس قول کو اختیار کرتی ہے کہ ایک لفظ سے تین طلاق دی جائے تو وہ تین ہی واقع ہوں گی (ایک نہیں)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں سعودی عرب کے علماء ومشائخ کا مسلک واضح طور پر سامنے آجاتا ہے کہ یہ حضرات طلاق ثلثہ کے مسئلے میں اسی موقف پر ہیں جس پر صحابہ کرام کا اجماع ہوا، اور تابعین ائمہ مجتہدین (ائمہ اربعہ) اور ان کے ہم عصر جبال العلم ائمہ کرام سب متفق ہوئے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب کے علماء اور غیر مقلدوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے کیونکہ غیر مقلد علماء کا فتویٰ ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک ہوتی ہے تین نہیں۔

مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں۔

" ایک جلسہ میں تین طلاق دینے سے صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوتی ہے "

(فتاوی نذیریہ جلد ۲ ص ۱۷۹)

اس فتویٰ پر غیر مقلدوں کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحب اور مولانا محمد شمس الحق صاحب کے دستخط بھی ہیں — غیر مقلدوں کے شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کا فتویٰ یہ ہے :

" ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں، ایک طلاق رجعی کا حکم رکھتی ہیں. (فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۱۵/۲)

آپ یہ بھی لکھتے ہیں :

اہلحدیث کا مذہب ہے کہ ایک دفعہ کی تین طلاقیں دینے سے جیسا کہ آجکل دستور ہے ایک ہی طلاق ہوتی ہے یعنی عورت مطلقہ خاوند پر حرام نہیں ہوتی بلکہ اگر رجوع کرے تو کر سکتا ہے (اہل حدیث کا مذہب ص ۹۵)

مولانا عبداللہ روپڑی صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے کہ یہ سب اہلحدیث کا مذہب ہے آپ فرماتے ہیں کہ یہ بعض اہل حدیث کا مذہب ہے سب کا نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا اپنا موقف یہ نہ تھا، آپ جمہور اہل حدیث کے ساتھ رہنا پسند کرتے تھے نہ کہ بعض کے ساتھ، آپ لکھتے ہیں :

" اگر تین کی تعداد ایک مجلس میں یا متفرق طور پر پوری ہوگئی تو ائمہ اربعہ کے نزدیک وہ عورت حرام ہو چکی ہے جب تک دوسری جگہ نکاح پڑھ کر دوسرا خاوند ہم بستری نہ کرلے پہلے کے لئے حلال نہیں ہاں بعض اہل حدیث اس طرف گئے ہیں کہ اگر ایک مجلس میں تین طلاقیں اکٹھی دے تو یہ ایک ہی طلاق ہے۔ (فتاویٰ اہل حدیث جلد ۲ ص ۴۹۵)

غیر مقلدوں کے مشہور عالم مولانا عبدالغفار حسن کے بیٹے مولانا صہیب حسن نے روزنامہ جنگ لندن کی اشاعت میں طلاق ثلثہ کے تین ہونے کی تردید میں تفصیلی مضمون لکھا جس میں نہ صرف یہ کہ ائمہ اربعہ اور اجماع امت کی مخالفت کی ہے بلکہ سیدنا حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام کو بھی طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا، اور لکھا کہ صحابۂ کرام حضرت عمر کی حکومت کی وجہ سے یہ فیصلہ دیتے تھے، ورنہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ فیصلہ غلط تھا۔

سو یہ بعض اہلحدیث وہ ہیں جو مسئلہ طلاق میں شیعہ کے ساتھ ہیں اور سعودی عرب کے علماء و مشائخ ہرگز شیعہ نہیں وہ اہل السنۃ والجماعت ہیں۔ (جاری)

مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب
جمعیۃ سنٹرل آفس نئی دہلی ۲

حضرت سید میر علی ہمدانی ۔ اور شیعیت

اسلام مخالف تحریکات میں سے تحریک رفض وسبائیت سب سے زیادہ منظم مربوط اور طاقتور ہے اور خطرناک بھی، اس نے مسلم سماج کے مختلف شعبہائے زندگی پر زبردست اثرات چھوڑے ہیں تاریخ اور تصوف پر اس کی زد دیگر شعبوں سے زیادہ پڑی ہے جس کے اثرات ونتائج بہت ہی دوررس اور معز برآمد ہوئے ہیں میدان تصوف میں اپنے مزاج کے لحاظ سے سبائیت وشیعیت کو اپنا اثر ورسوخ بڑھانے میں سب سے زیادہ کامیابی ملی، وجہ اس کی یہ تھی کہ تاریخ و تصوف میں علم حدیث کی طرح ناقدین رجال فن کی سخت بہرہ داری اور جانچ پڑتال کا اہتمام نہیں تھا، اس لئے اسے مختلف راستوں سے اس میں گھس پیٹھ کرنے کا بآسانی سنہری موقع مل گیا، اس دعویٰ کے بہت سے دلائل وشواہد کتب تصوف سے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اس کے باوجود حضرات صوفیاء کرام کو زمرۂ شیعہ میں شمار کرنا خلاف واقعہ اور منافی عدل وانصاف ہوگا، شیعی سبائی افکار وخیالات سے جزئی طور پر متأثر ہونا الگ بات ہے اور شیعہ ہونا جدا، لیکن کچھ لوگ اس واضح حقیقت سے صرف نظر اور ان دیکھی کرجاتے ہیں ابھی حال ہی میں خدابخش لائبریری پٹنہ نے برصغیر میں تصوف کے نام سے تصوف سے متعلق غیر مطبوعہ تحریروں کے تعلق سے ۴۰۰ صفحہ کا ایک مجموعہ مقالات شائع کیا ہے اس کے صفحہ ۱۲۰ پر جناب پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسینی ہمدانی کا ۷ صفحہ مقالہ اشاعت پذیر ہوا ہے جس میں انھوں نے تصوف کے تعلق سے بہت سی من گھڑت اور انتہائی کمزور باتوں کو شیعی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے، اور بتایا ہے کہ شیعہ علماء کو اپنے خصوصی افکار ونظریات کی اشاعت وترویج کے لئے کیوں تصوف کا سہارا لینا پڑا۔ اور سب سے اہم ایک بات یہ ہے کہ مقالہ نگار نے اہل سنت کے جن مسلمہ ائمہ ودعاۃ اور نامور ہستیوں کو زمرۂ شیعہ میں

شمار کیا ہے ان میں مشہور داعی اور صوفی باصفا سید امیر کبیر علی ہمدانی علیہ الرحمۃ والرضوان بھی ہیں یہ وہی ناشکور ہے جو عہد جہانگیری کے مشہور شیعہ عالم جناب قاضی سید نور اللہ شوستری نے مجالس المؤمنین میں ماضی میں کی تھی اور ماضی قریب میں جناب ڈاکٹر محمد معین الدین مؤلف اعیان الشیعہ اور ڈاکٹر صفا مؤلف تاریخ ادبیات ایران نے کی ہے سید میر علی ہمدانی کی تحریروں میں بلاشبہ کہیں کہیں شیعی فکر ونظر کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ کوئی ان ہی کے ساتھ مخصوص ومحدود نہیں ہے بلکہ دیگر صوفیانہ تحریروں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے علاوہ ازیں رفض وسبائیت کی زرخیز سرزمین عراق کا خطۂ ہمدان جس کی ہوا تک میں شیعیت شامل ہو گئی تھی اس ماحول وفضا میں پروان چڑھنے والا آدمی اگر شیعی افکار سے کسی حد تک متاثر ہو جائے تو کوئی حیرت انگیز اور تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اور حضرات صوفیاء کو ہر اچھے برے آدمی سے جو حسن ظن ہوتا ہے اس کی موجودگی میں تو یہ بات اور بھی قرین قیاس ہو جاتی ہے۔ سیدنا شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں "بے چارے صوفیا جن پر حسن ظن کا غلبہ ہوتا ہے بھلا ان حضرات کو تنقید وتفتیش کی کہاں فرصت اور نہ انہیں اس کی عادت ہے، بس جو سن لیا دیکھ لیا اسے باور کر لیا" (مکتوبات شیخ الاسلام جلد اوّل ص ۳۰۷)۔ لہٰذا ان کے کسی مبہم قول سے کسی ثبوت طلب مدعیٰ پر استدلال معتبر نہیں ہوگا۔ اس لئے شاہ ہمدانی کے ؎

گر مہر علی وآل بتولت نبود   امید شفاعت رسولت نبود
گر طاقت حق جملہ آری بجاں   بی مہر علی ہیچ قبولت نبود

یا

بر سید عزیزی کہ علائی نہ کجائی   گفتم بولایت علی کز ہمدانم۔

جیسے اشعار سے ان کی شیعیت پر بھی استدلال صحیح نہیں ہوگا ایسے حضرت ہمدانی نے اپنی کتب مودۃ القربیٰ روضۃ الفردوس اور اربعین امیریہ میں آنحضرتؐ حضرت علیؓ فاطمۃ الزہراؓ سیدنا حسنؓ وحسینؓ کے متعلق سے جن جذبات وخیالات اور والہانہ تعلقات وعقیدت کا اظہار کیا ہے اس کی بنیاد پر صوفیہ امامیہ اور بزرگان شیعہ میں شمار کرنا کچھ زیادہ مضبوط بات نہ ہوگی کیونکہ اہل سنت کے نزدیک تمام حضرات صحابہ کرام سمیت خلیفہ راشد سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃؓ الزہرہ حسنؓ حسینؓ سے محبت وعقیدت رکھنا جزو ایمان ہے البتہ یہ الگ بات ہے کہ بعض صوفیا کرام کے یہاں اہل بیت سے اظہار محبت وعقیدت

میں مطلوبہ احتیاط کی بجائے غلو کی کارفرمائی نظر آتی ہے یہی بات حضرت ہمدانیؒ کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے وہ سلسلہ کبرویہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا اہل تشیع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ توجہ وغور ہے کہ سید امیر کبیر علی ہمدانیؒ سے قربت رکھنے والے حضرات اور سوانح نگاران کو شافعی المسلک بتاتے ہیں چنانچہ حضرت ہمدانی کے مرید جعفر بدخشی رقمطراز ہیں۔

> موصوف پہلے حنفی تھے۔ لیکن بعد میں شافعی ہوگئے لیکن اپنے کسی مرید کے حنفی رہنے پر ان کو اعتراض نہ تھا اور نہ انہوں نے کشمیر میں حنفی قانون کی مخالفت کی[1]، سید میر علی ہمدانی کی مصنفہ سیدہ اشرف نے بھی جو حوالے دئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہمدانی اہل سنت میں سے تھے کچھ دیگر تحریروں سے بھی ان کا شافعی المسلک ہونا ثابت ہوتا ہے[2]، ڈاکٹر غلام محی الدین نے انہیں مسلکاً حنبلی بتایا ہے ایضاح اور کتاب التہذیب المتین فی تاریخ امیر المومنین کے مصنف نے شاہ ہمدانی کو اہل سنت والجماعت کے بزرگوں میں شمار کیا ہے[3]

اس کے علاوہ حضرت شاہ ہمدانی کے شافعی المسلک اور اہل سنت میں سے ہونے کا ایک ثبوت ان کے متبعین کا کشمیر میں شافعی المسلک ہونا ہے تاریخ کشمیر پر لکھی گئی کتابوں میں ان کے پیروکاروں کو شافعی المسلک اور اہل سنت ہی تحریر کیا گیا ہے کشمیر میں شیعیت کو فروغ سید ہمدانی کی آمد کے دو سو سال بعد ہوا ہے ان کی آمد کشمیر میں سلطان شہاب الدین آٹھویں صدی ہجری مطابق چودہویں صدی عیسوی میں ہوئی[4] اس لحاظ سے زمانہ آمد سے متصلاً کشمیر میں شیعی اثرات ملنے چاہیئے لیکن دو سو سال تک یعنی آٹھویں نویں صدی میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے البتہ دسویں ہجری کے آخر وسط سے تاریخ کشمیر میں شیعوں کا ذکر آنا شروع ہوتا ہے۔

<u>نیز جناب حکیم پروفیسر کمال الدین حسین صاحب ہمدانی نے جس کتاب کا تعارف کرایا ہے</u>

---

[1] کشمیر سلاطین کے عہد میں، ص ۸۱ - بحوالہ مناقب الجواہر، ورق ۳۰ ب، فتوحات کبرویہ، ورق ۱۴۷ ب، سید میر علی ہمدانی ص ۱۲۴، مطبوعہ گلشن پبلیکشنز سرینگر۔ [2] نگارستان فارس ص ۲۷۶، فرہنگ ایران ص ۴۰، ج ۶، [3] دیکھئے کتاب کا ص ۷، ۱۰۵ - [4] تذکرہ شعراء کشمیر از سید حسام الدین راشدی، مقدمہ ذخیرۃ الملوک اردو، اقبال کے ممدوح صوفیاء، پاکستان میں فارسی ادب ج اول از ڈاکٹر ظہور الدین احمد، سید میر علی ہمدانی وغیرہ

اس سے بھی حضرت ہمدانی کا شافعی المسلک ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب میں طریقۂ وضو اور ادائے نماز کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے وہ مذہب شافعی کے موافق ہے آپ وضو کرتے وقت گردن اور کان کا مسح کیا کرتے تھے اور پاؤں آخر میں دھویا کرتے تھے حالاں کہ پیر شیعہ مذہب میں آخر میں دھوئے جاتے ہیں یا مسح کرتے ہیں اس تعلق سے ایک اہم قابل توجہ بات یہ ھیکہ حضرت سید میر علی ہمدانی کی مطبوعہ غیر مطبوعہ تحریروں کے مطالعے سے بھی ان کا اہل سنت میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی سب سے معتبر اور مشہور مطبوعہ فارسی کتاب ذخیرۃ الملوک ہے جو ان کی سب سے مفصل اور مبسوط تصنیف ہے اور اس کی مقبولیت کا حال یہ ہے کہ اردو، لاطینی، ترکی، فرانسیسی وغیرہ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور عام طور پر دستیاب ہے یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے ان میں حضرت ہمدانی نے جن اسلامی احکام و تعلیمات اور امور کو بیان فرمایا ہے وہ مسلک اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں۔

اس کے علاوہ ذخیرۃ الملوک میں دو اور بات بھی ہیں جو سنیت و شیعیت کے متعلق سے بہت ہی اہم اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں، وہ یہ کہ حضرت شاہ ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے مذہب تشیع کے علی الرغم مذہب اہل سنت والجماعت کے مطابق و موافق تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انصار و مہاجرین کو واجب الاحترام و الاتباع اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین خلق بتایا ہے، خصوصاً حضرت علیؓ سمیت حضرات خلفاء ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور عثمان غنیؓ کو صحابہ کرام بعد از نبی بہترین خلق اند و بہترین ایشاں چوں کہ ابوبکر و عمر و عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین و علی جمیع المہاجرین والانصار والتابعین الابرار رضوان اللہ علیہم[1] اپنے دوسرے رسالہ خواطریہ میں ان لوگوں کی مذمت کرتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام پر طعن و تشنیع کرتے ہیں[2] رسالہ "ذکریہ" میں حضرات صحابہ کرام کو آسمان طریقت کے چمکتے ستارے کہا ہے[3]

حتیٰ کہ چوتھے باب میں تعلیم کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ دینی امور کی تعلیم اہل سنت والجماعت کے قواعد کے مطابق کرے، دوسری بات یہ ہے کہ شاہ ہمدانی نے کتابوں کے دسوں ابواب میں ان حضرات صحابہ کرامؓ سے روایات نقل کی ہیں جو اہل تشیع کے نزدیک خائن

---

[1] ذخیرۃ الملوک فارسی ص ۳۴ اردو ترجمہ ص ۴۴ نیز حضرت کا دوسرا رسالہ اعتقادامیریہ [2] سید میر محمد ہمدانی ص ۱۶۷ [3] ایضاً ص ۱۶۵۔

غاصب، منافق، مرتد (نعوذ باللہ)، ہیں ان میں خاص طور سے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق سیدنا حضرت عمر
سیدتنا حضرت عائشہ حضرت عثمان حضرت عبیدۃ بن الجراح حضرت عبداللہ بن عمر کے اسماء گرامی لئے
جا سکتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر باب کے تحت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ سے مذکورہ حضرات صحابہ اور
دیگر مہاجرین و انصار صحابہ کرام سے نسبتاً مقابلتہً بہت ہی کم روایات نقل ہوئی ہیں، کتاب کے باب الایمان
کا آغاز ہی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے کیا ہے جسے حدیث جبرئیل کہا جاتا
ہے اس باب میں آگے چل کر حضرت عمر کا یہ قول مبارک نقل کیا ہے کہ میرے مولیٰ کیا اچھا ہوتا کہ عمر
گھاس کا تنکا ہوتا، بھلا دوزخ کے عذاب سے بچ تو جاتا۔ یا کسی چوپایہ کی خوراک ہی بن جاتا۔ زکوۃ
کے باب میں لکھا ہے حضرت عمر ام سلمہ اور عائشہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب مستحق دعا دیتا تھا تو آپ
مستحق کو قبول کرنے کی خاطر دعا دیتے تھے اور مستحق کے ممنون اور مشکور ہوتے تھے۔

باب سوم کے بیانِ اخلاق میں مہر زیادہ نہ باندھنے والی حضرت عمر کی روایت نقل کی ہے آگے
چل کر سیدنا حضرت عمر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حضرت حذیفہ سلمان اور ابودرداء سے اپنے
عیوب پوچھتے تھے اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ اس آدمی پر رحم کرے جو میرے عیبوں کو میرے
روبرو ہدیہ کے طور پر لائے، چوتھے باب کے بیان نکاح میں بھی ان کا واقعہ بیان کیا ہے۔

ان مذکورہ روایات کے علاوہ کتاب میں متعدد روایات و واقعات نقل کئے ہیں، چونکہ کتاب
کا آغاز ہی روایت عمر سے کیا تھا اس لئے نمونتاً ان سے لی گئی چند روایتیں نقل کر دیں ورنہ ہمیں پہلے
سیدنا حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر کرنا چاہئے تھا اب چند روایات بطور نمونہ سیدنا ابوبکر صدیق اور
ان کی صاحبزادی زوجۂ رسول ام المومنین سیدتنا حضرت عائشہ کے تعلق سے ملاحظہ ہوں۔

حضرت سید میر علی ہمدانی نے ذخیرۃ الملوک کے باب الزکاۃ میں حضرت ابوبکر کی وہ روایت نقل کی ہے
جس میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ایک موقع پر سارا مال و متاع قدم رسول میں لاکر ڈال دیا تھا اس پر آپ نے
فرمایا تھا کہ تم دونوں کے مراتب کا فرق اتنا ہی ہے جتنا کہ تمہاری باتوں میں پایا جاتا ہے یعنی تمہارا مرتبہ
ابوبکر سے نصف ہے باب حسن و اخلاق میں ان کے متعلق سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی نے حضرت
ابوبکر کو برا بھلا کہا تو آپ نے صرف یہی فرمایا کہ میرے عیب تجھ سے بہت چھپے ہوئے ہیں نیز مثالی
حکومت کے ذیل میں لکھا ہے کہ جب ابوبکر صدیق کو صحابہ کرام نے تخت خلافت پر بٹھایا دوسرے ہی

دن کپڑے کے چند ٹکڑے بازار فروخت کرنے کیلئے گئے اس سے پہلے بھی کپڑے بیچا کرتے تھے۔

اور جہاں تک سیدتنا حضرت عائشہؓ سے روایت کا تعلق ہے کتاب کا شاید ہی کوئی باب ہو جس میں ان سے مروی حدیث نقل نہ کی ہو کتاب کا بیشتر حصہ حضرت عائشہؓ سمیت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ابوذرؓ ابو عبیدہ بن الجراحؓ حضرت انسؓ حضرت ابو سعید خدری کی روایات پر مشتمل ہے حتیٰ کہ عمرو بن العاصؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے بھی کتاب میں روایات موجود ہیں۔

اس کے علاوہ سید میر علی ہمدانی کے اہل سنت والجماعت میں سے ہونے کی ایک بین دلیل یہ بھی ہے کہ انہوں نے ذخیرۃ الملوک میں سیدنا ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق، عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت کو عہدِ زریں اور طرزِ حکمرانی کو مثالی قرار دیا ہے۔

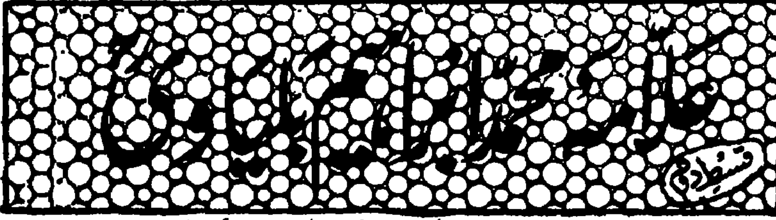
مذکورہ مستند دستیاب کتاب کے علاوہ حضرت شاہ ہمدانی کا ایک رسالہ ہے جس کا نام ہے روضۃ الفردوس یہ رسالہ گرچہ مطبوعہ نہیں ہے تاہم برٹش میوزیم اور تاشقند کے کتب خانے میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے اس رسالے میں بیس (۲۰) ابواب ہیں جو ایک ہزار نو سو اڑسٹھ احادیث پر مشتمل ہیں ان ابواب کے تحت جن حضرات صحابہ صحابیات سے حضرت شاہ ہمدانی نے والہانہ انداز میں روایات نقل کی ہیں وہ چند مع تفصیل روایات یہ ہیں۔

۱	سیدنا حضرت ابوبکرؓ سے	ایک سو اڑسٹھ روایات	بیسواں باب
۲	ام المومنین حضرت عائشہؓ سے	اکیاون (۵۱) "	تیسرا باب
۳	ام المومنین حضرت ام سلمہ سے	تین سو چھہتر (۳۷۶) "	چوتھا باب
۴	حضرت عمر بن الخطابؓ سے	بارہ (۱۲) "	پانچواں باب
۵	حضرت عبداللہ بن عمرؓ	بہتر (۷۲) "	ساتواں باب[1]

ظاہر ہے کہ کوئی شیعہ مذکورہ حضرات صحابہ وصحابیات کا کوئی ذکر خیر نہیں کرسکتا ہے، مذہب شیعہ تو تبرا کا داعی ہے نہ کہ تعظیم و تکریم کا خود کمال الدین حسین صاحب نے جن علامہ علی کا نام بڑے احترام واستدلال کے ساتھ لیا ہے انہوں نے اپنی کتابوں میں[2] حضرات صحابہ کرام کے بارے میں جو (باقی بر صفحہ)

---

[1] سید میر علی ہمدانی ص ۲۷۸-۲۷۸۔ [2] مثلاً دیکھئے منہاج الکرامہ جس کا خوب صورت مدلل و مکمل جواب علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے منہاج السنۃ کی شکل میں دیا ہے۔



از — محمد عمران قاسمی بگیانوی، عربی لیکچرر جامعہ طبیہ دیوبند

مولانا عبد الرحیم

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک طویل عرصہ تک علامہؒ کا خاندان اقتصادی بحران اور معاشی تنگی کا شکار رہا ہے مگر اس ظاہری و مادی بے سروسامانی کے باوجود جونپورؒ کے تعلیمی ماحول کے سبب دولت علم کا گراں قدر سرمایہ اس کے مقدر کا حصہ رہا اور اس خاندان میں متعدد علماء پیدا ہوئے جن میں سے مولانا مظفر حسین اور مولانا عبدالمجید کے اسمار گرامی آپ کی نظر سے گذر چکے ہیں۔

حضرت العلامہ کے والد محترم (مولانا عبدالرحیم صاحب بھی نہ صرف زیور علم سے آراستہ تھے بلکہ ایک جید اور نامور عالم تھے اور آپ جونپور کے اس مشہور مرکز علوم کے تعلیم یافتہ تھے جس میں ملا محمود جونپوریؒ (صاحب شمس بازغہ) جیسے نامور فاضل اور یگانۂ روزگار عالم مدرس رہ چکے ہیں۔

گویا علامہؒ کی پیدائش سے قبل ہی گھر کا ماحول تعلیمی اور دامن پدری علم وفضل کا گہوارہ تھا اور فضا اس شخصیت کے بالکل شایان شان تھی مستقبل میں جس کا مرکز علوم آفتاب ہدایت اور استاذ العلماء ہونا ازل سے مقدر ہو چکا تھا۔

---

[۱] سلطان غیاث الدین تغلق کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفر خاں　اور دوسرے کا فخرالدین جونا تھا پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفر آباد اور دوسرے کے نام پر بعد میں فیروز شاہ تغلق نے جونپور آباد کیا یہ آبادی ۷۶۱ھ سے قبل ہوئی (حیات شبلی ص۹)۔ جونپور کو مرکز علم اور علمی حیثیت وشہرت دینے کا سہرا قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے سر جاتا ہے آپنے یہاں قیام فرما کر اسے اپنے فیوض وبرکات کا مرکز بنایا (حیات شبلی ص۱۲) لکھنؤ جو عرصہ تک علم اور علماء کا مرکز رہا ہے وہ بھی دراصل جونپور کے علمی فیضان کا رہین منت ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ حضرات ہی نے وہاں (لکھنؤ) قیام فرما کر اسے علم وکمال کی روشنی بخشی (ملخصاً از حیات شبلی ص۱۲)

[۲] ملا محمود (صاحب شمس بازغہ) کی وفات ۱۰۶۲ھ میں ہوئی۔

ولادت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کے یہاں سات اولادیں ہوئیں[۱]، علامہ ان میں سب سے چھوٹے تھے کسی کو کیا معلوم اور خود مولانا عبدالرحیم صاحب کے بھی گمان وخیال میں یہ بات نہ ہوگی کہ یہ معصوم بچہ جو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے اس کا مقام کتنا بلند ہے اور وہ آسمان علم وشریعت کا ایسا روشن آفتاب ہے کہ عالم اسلام اور خصوصًا برصغیر کے کونے کونے اس کی ضیاء پاشیوں سے منوّر وروشن ہو اٹھیں گے، اور ایک زمانہ اس کے علم وفضل سے خوشہ چینی اور اس کی چاکری کو اپنی سعادت سمجھے گا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست ✽ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دارالعلوم دیوبند اپنی عمر کی تیسری دہائی میں قدم رکھ رہا تھا[۲] کہ اس کے سب سے قدیم اور مخلص استاذ نے داغ مفارقت دیدیا اور اس طرح ۱۳۰۴ھ میں دارالعلوم کے مدرس اوّل (استاذ شیخ الہندؒ) جناب مولانا ملا محمد محمود صاحبؒ دیوبندی کا انتقال ہوگیا مگر اسرار خداوندی سے کون واقف ہے کسے معلوم کہ اگر آسمان علم کا ایک ستارہ ٹوٹا ہے اور اس کا تعلق اس عالم ناسوتی سے منقطع ہوگیا ہے تو ایسے دو ستاروں نے اس عالم ناسوتی میں قدم رکھ دیئے ہیں کہ زمانہ ان کے فضل وکمال کے گن گائے گا۔

آج دارالعلوم دیوبند اپنے ایک قدیم رفیق کی جدائی پر ملول ہے مگر اسے کیا معلوم کہ تیرے دامن تربیت میں دو ایسے نایاب گوہروں کا آنا مقدر ہو چکا ہے کہ خود علم وفضل اپنی تقدیر پر رشک کریں گے اور وہ تیری نیک نامی کو بام عروج تک پہنچا دیں گے، جی ہاں میری مراد علامہ محمد ابراہیم بلیاوی اور علامہ شبیر احمد عثمانی سے ہے ان دونوں حضرات کی ولادت اسی (۱۳۰۴ھ کے) سال ہوئی۔

---

[۱] سب سے بڑے حافظ محمد سلیمان تھے جو نہایت جید خوش الحان اور جہوری الصوت حافظ تھے، دربھنگہ میں ایک شاندار مسجد آپ کی یادگار کے طور پر تعمیر کی گئی ہے جو آپ کے نام سے موسوم ہے، دوسرے محمد عثمان صاحب یہ نیم عالم ہوئے اور شادی کے بعد عین جوانی میں آپ کا انتقال ہوا تیسرے محمد قربان صاحب، چوتھے محمد سبحان صاحب (ان کے صاحبزادے حکیم محمد مہدی کا علاج کے پاس رہتے ہوئے دیوبند میں انتقال ہوا) پانچویں مسماۃ بتول، چھٹی مسماۃ ـــــــ اور ساتویں صاحب سوانح، محمد ابراہیم۔

[۲] دارالعلوم دیوبند دو محمودوں سے شروع ہوا ایک استاذ جناب مولانا ملا محمود صاحبؒ اور ایک شاگرد محمود الحسن (شیخ الہند)

تعلیم وتحصیل

آپ (علامہؒ) کے والد محترم (مولانا عبدالرحیم صاحب) خود جید عالم تھے اس لئے قرآن پاک اور ابتدائی دینیات کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، اس کے بعد آپ کا داخلہ جونپور کے اسلامی مرکز علوم میں کرایا گیا جہاں آپ کے والد محترم نے تعلیم حاصل کی تھی یہاں (جونپور میں) آپ کو نہایت قابل اور فاضلین کاملین اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا جن میں مولانا حکیم جمیل الدین احمد نگینویؒ[1]، مولانا عبدالغفار صاحبؒ[2] اور مولانا ہدایت اللہ خاں صاحبؒ[3] خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ قریب ۱۳۲۰ھ اور ۱۳۲۴ھ کے درمیانی زمانے کی بات ہے اس کے علاوہ آپ نے مولانا محمد فاروق چریاکوٹی سے بھی شرف تلمذ حاصل کی[4]۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

علامہؒ کی دیوبند میں حاضری اور حضرت شیخ الہندؒ سے وابستگی آپ کی تعمیر شخصیت اور خوش نصیبی کے اس دور کا آغاز ہے جس نے آپ کی شخصیت کو نئی روحانی زندگی بخشی اور معقولات کے اس جال (جو بہتوں کے لئے بدعقیدگی اور اسلافؒ سے بدظنی کا باعث بن گیا) سے نجات حاصل ہوئی یہاں (دارالعلوم دیوبند) کے

---

[1] آپ نے ۱۲۹۹ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی نگینہ (ضلع بجنور) آپ کا مولد تھا علوم دینیہ اور طب دونوں میں رسوخ حاصل تھا، طویل عرصہ تک صاحب الرائے اور قابل احترام رکن کی حیثیت سے مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے ممبر رہے، حکیم صاحب کی ترغیب و تحریک پر حضرت علامہ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اخیر میں حکیم جمیل الدین صاحب نے دہلی سکونت اختیار کر لی اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اور بالآخر ۱۳۵۵ھ میں وفات پائی قدس سرہ العزیز۔

[2] آپ حضرت گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے علامہ نے دینیات اور خصوصاً فقہ کی کتابیں ان سے پڑھیں۔

[3] مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رامپوری سلسلۂ خیرآباد کے نامور مدرس علامہ فضل حق خیرآبادی کے تلمیذ رشید اور مدرسہ حنفیہ امام بخش جونپور کے صدر مدرس تھے، آپ علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے علامہؒ نے معقولات کی انتہائی کتابوں کے ساتھ ساتھ مشکوٰۃ شریف کا کچھ حصہ بھی ان سے پڑھا۔

[4] مولانا محمد فاروق صاحب عباسی اشیوخ میں سے تھے ضلع اعظم گڈھ میں ایک آبادی کا نام چریاکوٹ ہے جو آپ کا مولد و منشاء ہے اسی نسبت سے آپ کو چریاکوٹی کہا جاتا ہے، فقہ اصول فقہ، معقولات میں آپ کو مکمل دستگاہ تھی، آپ نے مختلف مقامات پر تدریسی خدمات انجام دیں آپ سے خصوصی استفادہ کرنے والوں میں علامہ شبلی نعمانیؒ بھی شامل ہیں دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس تعلق کی بنیاد پر علامہ شبلی نے ان کو ندوہ میں بلا لیا جہاں آپ نے پانچ سال نہایت کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ علمی و تدریسی خدمات انجام دیں ۱۳۱۰ھ میں جبکہ بلیا میں آپ کا قیام تھا علامہؒ کو آپ سے فیضیابی کا موقع ملا اور معقولات کی تقریباً تمام کتابیں مولانا چریاکوٹی سے پڑھیں آپ کی وفات ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء مطابق رمضان

کے اساتذہ واکابر کے عارفانہ حقائق بطور محسوسات آپ کے سامنے آئے تو جیسے علامہ کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا اور وہ حقیقی راہ نصیب ہوئی جو صراط مستقیم کی صحیح مصداق اور بلاشبہ فوز و فلاح کی ضامن تھی، خود علامہ رہ بطور تشکر و امتنان خداوندی اور اظہار اطمینان اپنی زندگی کے اس خوشگوار موڑ کے متعلق ارشاد فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہو گیا جو میں دیوبند آ گیا، اور حضرت شیخ الہندؒ کے دامن سے وابستہ ہو گیا، کیونکہ جب میری عمر ۱۲ سال کی تھی اور میں شرح جامی میں پڑھتا تھا تو کچھ ماحول سے متاثر ہو کر طبیعت بدعت کی طرف مائل ہو گئی تھی، چنانچہ میں فاتحہ خوانی وغیرہ کے مراسم میں برابر شریک ہوتا تھا[1]

بہرحال آپ ۲۶-۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند دورۂ حدیث کیلئے حاضر ہوئے حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی رہ کا سفارشی خط ساتھ تھا، مولانا محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے امتحان داخلہ کے واسطے آپ کو شیخ الہندؒ کی خدمت میں پیش کیا، سوالات کے جوابات میں حضرت شیخ الہندؒ کی حقیقت شناس نظروں نے تاڑ لیا کہ ان پر معقولاتی رنگ غالب ہے اور دینیات کا عنصر مغلوب (واقعہ بھی یہی تھا چونکہ آپ نے معقولات میں ہندوستان کے ایک مسلم مکتبۂ فکر سے استفادہ کیا تھا، نیز مولانا محمد فاروق چریاکوٹی بھی معقولات کے امام مانے جاتے تھے) اس لئے شیخ الہندؒ نے (دینیات کی) اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بجائے درجہ مطلوبہ (دورۂ حدیث) کے درجۂ ممتحنہ ہی میں داخلہ کا مشورہ دیا جسے علامہؒ نے بسر و چشم قبول کیا اس سال آپ نے مشکوٰۃ شریف، ہدایہ، جلالین اور متنبی وغیرہ کتب پڑھیں

شیخ الہندؒ سے خصوصی تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے بالمشافہ ملاقات کا اگرچہ یہ پہلا موقع تھا مگر غائبانہ عقیدت قیام جونپور کے زمانے ہی سے قائم تھی چنانچہ امتحان داخلہ کے بعد شام کو حضرت شیخ الہندؒ کے دولت کدے پر حاضر ہوتے مولانا محمد فاروق صاحب کا سلام اور حکیم جمیل الدین کی جانب سے فرستادہ تیل و عطریات کے ہدایا خدمت اقدس میں پیش کئے جن کو شرف قبولیت سے نوازا گیا۔

عشاء کے بعد پھر حاضری ہوئی اور سر میں تیل لگانے کیلئے اپنی خدمات پیش کیں۔ جو بنظر

---

[1] از۔ مولانا عزیز الرحمن صاحب (دارالعلوم مارچ ۱۹۶۸ء نمبر ۲۰-۱۹)

استحسان قبول کرلی گئیں، اور پھر حضرت شیخ الہند سے تعلق و خدمت کا یہ سلسلہ چل نکلا، اور روزانہ بعد العشاء سر میں تیل لگانا مکان سے درس گاہ تک حضرت کی مخصوص کتاب ترمذی شریف اور پانوں کی ڈبیہ لانے لے جانے کی سعادت علامہ کے حصہ میں طویل عرصہ تک آتی رہی۔

سعادت بیعت

دیوبند آئے ہوئے ایک سال مکمل ہو رہا تھا، سالانہ امتحانات جاری تھے، شیخ الہند سے قربت اور خصوصی تعلق و خدمت کے سبب آپ کی عظمت و محبت اور خلوص وللّٰہیت کا گہرا نقش علامہ کے دل پر قائم ہوچکا تھا، آپ حضرت شیخ الہند سے بیعت ہونا چاہتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ حضرت اقدس کسی طالب علم کو بیعت نہ فرماتے تھے، آپ نے اپنی اس قلبی کیفیت، بے پناہ شوق اور دلی جذبے کا اظہار مولانا عبدالصمد صاحب نگینوی (مدرس دارالعلوم دیوبند) سے کیا، وہ علامہ کا خلوص اور قلبی اضطرار کو دیکھ کر تعاون پر رضامند ہوگئے اور فرمایا کہ " آج شیخ الہند میرے کمرے میں سوالات کے پرچے بنائیں گے، تم دودھ لے کر آجانا۔ علامہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا (کیونکہ حضرت شیخ الہند" سے بیعت اور تحصیل حدیث ایسا معمولی شرف نہیں جو ہر ایک کے مقدر کا حصہ بن سکے، گوہر مقصود پانے کی امید بندھ چلی تھی، آپ وقت مقررہ پر دودھ لے کر پہونچے، مولانا عبدالصمد صاحب نے موقع غنیمت دیکھتے ہوئے علامہ کو حضرت شیخ الہند کے سامنے پیش کرکے بیعت کی درخواست کی، شیخ الہند نے حسب معمول عذر فرما دیا مگر مولانا موصوف کی باصرار سفارش اور اس یقین دہانی پر کہ یہ " اپنے علمی راستہ سے نہیں ہٹیں گے ان پر پورا اعتماد ہے" حضرت شیخ خاموش ہوگئے جو "السکوت یدل علی الرضا" والی خاموشی تھی اور بالآخر علامہ کو اسی کمرے میں بیعت فرمایا، اسی واقعہ کے سبب اس روز امتحان کے پرچے میں نصف گھنٹہ کی تاخیر بھی ہوگئی۔

شیخ الاسلام مولانا مدنی سے ملاقات

۲۷-۱۳۲۶ھ کا تعلیمی سال شروع ہوا، امسال علامہ کا دورہ حدیث شریف تھا آپ کے ساتھیوں میں مولانا عبدالشکور بلیاوی کے علاوہ مولانا سید فخرالدین مراد آبادی بھی تھے، ایک روز حسب معمول آپ درس میں حاضر ہوئے اور عبارت حدیث کی قرأت شروع کی کہ ایک نووارد (عربی لباس میں ملبوس) آئے اور علامہ سے کتاب چھین کر بلا تکلف عبارت

پڑھنے لگے، علامہ کو ان کی اس بظاہر غیر اخلاقی حرکت پر غصہ تو بہت آیا جو کہ مذکورہ صورتِ حال میں ایک فطری تقاضا تھا) مگر حضرت شیخ الہند کا ان (نووارد) کے ساتھ انشراح اور تعامل دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ حضرت کے کوئی خاص آدمی ہیں اس لئے خاموش رہ گئے ، یہ تھی شیخ الاسلام حضرت مدنی رح سے علامہ کی پہلی پر لطف ملاقات جو شیخ الاسلام کے مدینہ منورہ سے دوبارہ تشریف لانے پر ہوئی

تکمیل وسفر کلکتہ شعبان ۱۳۲۶ھ میں آپ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اسی موقع پر حضرت شیخ الہند نے علامہ اور دیگر فارغ التحصیل مخصوص طلبہ کو نودرہ سے متصل جنوبی درسگاہ میں جمع فرمایا پہلے تو آپ نے حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندیؒ (مرید خاص حضرت نانوتوی ؒ) کی حکایت بیان کی کہ ان کے یہاں کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی انھوں نے اپنے گذران اور تکمیل ضروریات کیلئے اپنے پاس دس دس پکالے گے نوکر ڈھائے رکھ چھوڑے تھے جن کے کرایہ سے تمام سال کے اخراجات پورے ہوتے تھے وہ کہتے تھے کہ بھائی میرے یہ نوکر ڈھلائے میرے نو کماؤ لڑکے ہیں انھی کو میں اپنی اولاد سمجھتا ہوں۔

شیخ الہند رح نے حکیم صاحب کی یہ حکایت نقل کرنے کے بعد نہایت جذباتی لہجہ اور پرجوش انداز میں فرمایا، بھائی میری بھی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے تم ہی سب میری اولاد ہو جاؤ مدرسہ کے لئے کام کرو اور جلسہ دستار بندی کے واسطے چندہ جمع کرو [1]

چنانچہ دو دو طالب علموں کی جوڑیاں بنا کر مختلف مقامات کے لئے روانہ کی گئیں علامہؒ کا ردیف سفر (ہم درس ہونے کے ساتھ ساتھ ہم وطن ہونے کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے) مولانا عبدالشکور صاحب بلیاوی کو بنا کر اس جوڑی کو کلکتہ کی جانب روانہ کیا گیا اور بفضل خداوندی یہ اپنے مقصد میں شاندار کامیابی کے ساتھ واپس ہوئے ۔

(جاری)



---

[1] یہ (جلسۂ دستاربندی) ۱۳۲۸ھ میں نہایت وسیع پیمانہ پر منعقد ہوا تفصیل آگے آرہی ہے۔

جدید کتابیں

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے دو نسخے ضروری ہیں ورنہ تبصرہ سے معذور سمجھا جائے)

(۱) نام کتاب :- حدائق البیان

مؤلف :- علامہ مولانا محمد عبدالغفور فاروقی محمد آبادی

طباعت :- خواجہ پریس دہلی ۔ اشاعت :- دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء

زیر اہتمام :- جناب مدحت کریم غفور منزل محمد آباد گہنہ اعظم گڈھ۔

قیمت :- ۵۰/- روپے ۔ صفحات ۔ ۳۴۳ ۔ طباعت اور کاغذ بہتر

صدر الصدور مولانا محمد عبدالغفور فاروقی تیرہویں صدی ہجری کے ان علمائے اعظم گڈھ میں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے علوم دینیہ میں تبحر عطا کرنے کے ساتھ دولت وثروت اور جاہ و منصب کی دولت سے بھی بھرپور حصہ مرحمت کیا تھا، مولانا موصوف مفتی محمد یوسف فرنگی محلی کے مخصوص تلامذہ میں تھے، اور جملہ علوم متداولہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، اسی کے ساتھ دین اور علم دین کے فروغ کا جذبہ بھی رکھتے تھے، اسی جذبہ کے تحت مرحوم نے اپنے وطن قصبہ محمد آباد میں دار المصنفین شبلی منزل کے طرز پر ایک علمی ادارہ غفور منزل قائم کیا تھا۔ علامہ عبدالغفور کو سرسید مرحوم کے تفسیری تفردات سے سخت اختلاف تھا وہ انھیں دین صحیح کے حق میں سم قاتل باور کرتے تھے، چنانچہ مثبت انداز میں تفردات کے مقابلے میں راجح و صحیح معلومات امت کے سامنے پیش کرنے کے لئے متعدد کتابیں تصنیف کرکے شائع کیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی حدائق البیان فی معارف القرآن بھی ہے جو سنہ ۱۹۰۹ء مطابق سنہ ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوئی تھی مگر بعد میں یہ کتاب اس طرح سے نایاب ہو گئی تھی کہ نیا طبقہ اس کے نام تک سے بھی واقف نہیں تھا، خدا جزائے خیر دے جناب مصباح الدین فاروقی نبیرہ علامہ عبدالغفور، اور جناب مدحت کریم صاحب کو ان دونوں حضرات کی علم دوستی سے یہ کتاب دوبارہ زیور طباعت

سے آراستہ ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہونچ گئی، کتاب کی زبان اگرچہ قدیم ہے جس کی بنا پر عام طبقہ کو بعض جگہ الجھن ہوگی، لیکن اپنے مضامین کے لحاظ سے نہایت اہم اور لائق قدر ہے۔

(۲) نام کتاب :۔ معاشرتی حقوق و فرائض۔ تالیف :۔ مولانا عبدالرؤف خاں فیض آبادی، ناشر :۔ مکتبہ قاسمی ۶۰۳/۲ حافظ منزل غیبی نگر بھیونڈی ضلع تھانہ۔ صفحات :۔ ۲۰، اشاعت :۔ بار دوم ۱۹۹۱ء / ۱۴۱۲ھ، قیمت ۸/ روپے۔ ملنے کے پتے، مکتبہ صداقت مبارک پور اعظم گڈھ۔ مکتبۃ الفیض جلال پور فیض آباد۔ مکتبہ نعمانیہ دیوبند، طباعت اور کاغذ متوسط۔

اجتماعی زندگی میں صالح معاشرہ کی حیثیت وہی ہے جو انفرادی زندگی میں جسمانی صحت کی ہے، اگر آدمی کی صحت درست ہے تو پھر کارگاہ حیات میں وہ اپنی سعی و کاوش سے کامیابی و کامرانی کی منزلیں طے کرسکتا ہے، لیکن اگر وہ جسمانی اعتبار سے معذور اور بیمار ہو تو وہ حرکت و عمل سے عاجز ہوجاتا ہے اور زندگی کے میدان میں اس کا وجود عدم کے مرادف ہوجاتا ہے، ٹھیک اسی طرح اگر کسی قوم کا معاشرہ صحت مند اور درست ہے تو لازمی طور پر اس کی اجتماعی حیات قوی و پائیدار ہوگی اور بصورت دیگر اس کی اجتماعیت منتشر ہوکر اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہے، اس لئے اسلام نے صالح معاشرہ کے وجود پر کافی زور دیا ہے، اس کتاب میں صالح معاشرہ کس طرح وجود میں آتا ہے، معاشرتی حقوق و فرائض کے عنوان سے اسی کی تفصیل بیان کی گئی ہے، انداز تحریر صاف ستھرا اور قریب الفہم ہے۔

(۳) نام کتاب :۔ ایک مجلس کی تین طلاقیں۔ تالیف :۔ مولانا محمد اصغر قاسمی۔ ناشر :۔ شعبۂ اشاعت مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ غازی آباد، اشاعت ۱۹۹۳ء، طباعت و کاغذ عمدہ۔

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ادھر ایک سال سے ہمارے یہاں اخبار و رسائل کا موضوع بنا ہوا ہے اور خاص طور پر ان لوگوں نے جنھیں نہ دین کا صحیح علم ہے اور نہ دین کی کوئی فکر، اس مسئلہ میں کافی دلچسپی دکھائی اور اس کی آڑ میں مسلم خواتین کو ورغلانے اور حکومت کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت پر ابھارنے کی کوشش کی لیکن علمائے امت نے ان کی اس دین بیزار مہم کو متفقہ طور پر مسترد کردیا، زیر نظر کتاب اسی موقع پر مرتب کی گئی ہے جس میں جمہور کے مسلک کی صحت اور حقانیت کو دلائل شرعیہ سے ثابت کیا گیا ہے، عام طبقہ کیلئے یہ کتاب تین طلاقوں کے مسئلہ کو سمجھنے کیلئے مفید اور بہت کارآمد ہے۔

کا پرتو اور نمونہ تھے، طلبہ پر حد درجہ شفیق تھے، مولانا نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دینیہ ہی میں اپنے مربی مولانا عمر فاروق اور مولانا ابوالحسن صدیقی سے حاصل کی اور پھر دیوبند سے فراغت پائی، حضرت شیخ الاسلام رح سے بے حد محبت کرتے تھے، قرآن کی تفسیر کا درس لاہور جاکر مولانا احمد علی لاہوری سے حاصل کیا، تدریسی زندگی کا آغاز قصبہ بارا سے کیا جہاں ان کے استاذ و مربی مولانا ابوالحسن صدیقی نے ۱۹۴۱ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا تھا، یہ وہی قصبہ ہے جہاں حضرت سید احمد شہید رح نے اپنے قافلہ کے ساتھ قیام کیا تھا اور پھر محلہ کی جامع مسجد میں کئی دن تک وعظ فرمایا تھا، مولانا نے دیوریا میں کئی برسوں تک جمعیۃ علماء کے مبلغ کی حیثیت سے کام کیا، پھر چالیس سال تک مدرسہ دینیہ کی مسندِ صدارت کو رونق بخشی۔



دارالعلوم دیوبند کے معلم دارالصنائع جناب ماسٹر اختر حسین صاحب کی اہلیہ ۱۱ جمادی الثانی یوم جمعہ کو فوت ہوگئیں، مرحومہ تقریباً ایک ماہ سے حیات و موت کی کش میں مبتلا تھیں، مناسب و معقول علاج کے باوجود نوشتہ تقدیر غالب آیا اور علاج و دوا کی ساری تدبیریں بے اثر ہوگئیں، اور مرحومہ آباد خوش حال گھرانے کو روتا سسکتا چھوڑ کر دار آخرت کو سدھار گئیں، مرحومہ پابند صوم و صلوۃ اور ملنسار و خوش اخلاق خاتون تھیں، خدائے رحیم و کریم سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کی سیئات کو مبدل بہ حسنات فرمائے اور اپنے جوار رحمت سے ان کی روح کو شادکام کرے، قارئین ماہنامہ دارالعلوم سے گذارش ہے کہ وہ مرحومہ کی مغفرت کیلئے خصوصیت سے دعا کریں۔



فضیلت وقرابت کا فیصلہ

بخاری ص۵۱۶ باب فضل ابی بکرؓ پر

فرمایا یہ تو حضرت ابن عمرؓ ہی صحابہ کرام کا فیصلہ بتلا رہے
ہیں کہ ہم لوگ حضور علیہ السلام کے زمانہ ہی میں حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ پر
فضیلت دیا کرتے تھے اور پھر حضرت عمرؓ کو حضرت عثمانؓ پر، اسکے بعد یہ ہیکہ حضرت
ابوبکرؓ کی فضیلت امام اشعری کے نزدیک قطعی ہے اور علامہ باقلانی اسکو ظنی کہتے ہیں میری رائے
میں امام اشعری کا فیصلہ راجح ہے صواب ہے کیونکہ اس کیلئے احادیث اتنی زیادہ وارد ہوئیں کہ ان سے تواتر سے
بھی اوپر کا درجہ ثابت ہو سکتا ہے پھر اسیطرح حضور علیہ السلام کے دونوں داماد دوں حضرت عثمانؓ و علیؓ کا بھی
حال ہے لیکن آگے جو ترتیب فضیلت (دخلافت) کی سامنے آئی اسمیں قرابت کے لحاظ سے برعکس صورت نکلی کہ جو قرابت و نسب
کے اعتبار سے حضور علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریب تھے انکی یہ فضیلت آخر میں ظاہر ہوئی یعنی حضرت علیؓ پھر حضرت
عثمان پھر حضرت عمرؓ کیونکہ حضرت علیؓ نسب میں بھی اقرب تھے، پھر داماد بھی تھے حضرت عثمان ذوالنورین ہوئے اور حضرت عمرؓ حضرت
حفصہؓ کی وجہ سے حضور سے قریب تھے معلوم ہوا کہ قرابت و وراثت کا درجہ ذاتی فضائل و مناقب
کے مقابلہ میں مرجوح ہے جس کی وجہ سے خلافت میں معاملہ برعکس ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے
بعد پہلے حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ اور پھر حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے

علامہ انور شاہ کشمیریؒ

از ملفوظات محدث کشمیری
ص ۲۶۹

14-11-95

مسجد جدید دارالعلوم دیوبند

جو اپنی تکمیل کیلئے اہل خیر حضرات کی توجہات کی منتظر ہے

دارالعلوم دیوبند کے ہمدردان ومعاونین حضرات کو جیسا کہ معلوم ہے کہ تقریباً چار سال ہوئے طلبہ کی کثرت تعداد کی بنا پر دارالعلوم میں ایک بڑی جدید مسجد کا کام اللہ تعالیٰ کے فضل پر توکل کرتے ہوئے دارالعلوم سے متصل ایک اراضی خرید کر شروع کر دیا تھا۔

الحمدللہ مسجد کا تعمیری کام بہت آگے بڑھ گیا ہے اور اس وقت فضل خداوندی اور اہل خیر حضرات کی توجہ سے تیسری منزل پر تعمیری کام جاری ہے، اس مسجد سے طلبۂ دارالعلوم اور دیگر مسلمانوں کے لئے ایک وقت میں مسقف (چھت والے) حصہ میں جہاں چار ہزار نمازیوں کے لئے جگہ ہو جائے گی وہیں اس کار خیر میں حصہ لینے والوں کی طرف سے ایک صدقۂ جاریہ ہوگا اور وہ انشاء اللہ اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے مسجد تعمیر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر عطا فرمائیں گے۔

تعمیری کام جاری رکھنے کیلئے اس وقت سرمایہ کی شدید ضرورت ہے

اس لئے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس مسجد کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں تاکہ یہ مسجد دارالعلوم کے شایان شان جلد تعمیر ہو سکے۔

پتہ

ڈرافٹ وچیک کیلئے — دارالعلوم دیوبند — اکاؤنٹ نمبر 30076 — اسٹیٹ بینک آف انڈیا دیوبند

منی آرڈر کیلئے — (حضرت مولانا) مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ پن کوڈ نمبر ۲۴۷۵۵۴

وفیات



غازی پور، ۶/اکتوبر، حضرت مولانا مشتاق احمد غازی پوری صدر مدرس مدرسہ دینیہ کا ۴/ اکتوبر کی شام میں اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا، انتقال سے قبل مولانا بالکل صحت مند تھے، معمولات میں کوئی فرق آیا نہ بیماری کی کوئی علامت ظاہر ہوئی، معمول کے مطابق صبح میں مدرسہ آئے ضروری کاموں کو انجام دیا پھر ظہر کی نماز پڑھائی، معمول کے مطابق عصر کی نماز مدرسہ میں ادا کرنے کے لئے باوضو گھر سے روانہ ہوئے، گھر سے تھوڑی دور پر مدرسہ عظیمیہ کے پاس اچانک چکر آیا اور وہیں بیٹھ گئے، بہت سے جاننے پہچاننے والے آس پاس موجود تھے، سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا، وہیں لٹایا اور پانی پلایا اور منٹوں میں روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

دوسرے دن مقامی ایم، آ، ایچ انٹر کالج کے میدان میں ہزاروں مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی، مولانا محی الدین صاحب مظاہری نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں مدرسہ دینیہ کے اساتذہ وطلبہ اور ضلع کے بہت سے مدارس کے علماء وطلبہ شریک ہوئے، شرکاء جنازہ کی کثیر تعداد مولانا مرحوم کی عنداللہ وعندالناس مقبولیت کی ایسی کھلی ہوئی نشانی تھی جس کو دیکھ کر ہر شخص متاثر ہوا، ایم، آ، ایچ کالج کے پاس آبائی قبرستان میں ہزاروں سوگواروں نے دکھی دل کے ساتھ مولانا مرحوم کو سپرد خاک کیا، بیک وقت مٹی دینے والوں کی کئی قطاریں بنادی گئی تھیں، اس وقائع نگار نے کتنی ہی لوگوں کو سسکیاں لیتے اور آہیں بھرتے دیکھا ایک ضعیف نے رو رو کر مولانا کی کریم النفسی اور خلوص کی تعریف کی۔

مولانا مرحوم صد درجہ منکسر المزاج، متحمل، بردبار اور صحیح معنوں میں نمونہ اسلاف تھے حضرت مولانا مسیح اللہ شروانی رح سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور اپنے شیخ کے اخلاق